مشکوٰۃ المصابیح

کی

کتاب الصلوٰۃ

بامحاورہ ترجمہ اور احادیث کی شرح

از

پروفیسر میاں منظور احمد

ایم اے عربی گولڈ میڈلسٹ ۔ ایم اے اسلامیات گولڈ میڈلسٹ

اسلامیہ یونیورسٹی ◎ بہاولپور

ILMI
علمی کتب خانہ

علمی کتاب خانہ ○ کبیر سٹریٹ، اردو بازار لاہور

مشکوٰۃ المصابیح

کی

کتاب الصّلوٰۃ

بامحاورہ ترجمہ اور احادیث کی شرح

جسے

علامہ علی القاریؒ کی مشہور شرح کے علاوہ

مظاہرِ حق، طیبی، التّعلیق الصبیح، فیض الباری، قسطلانی، نیل الاوطار،
فتح الباری اور حضرت شاہؒ ولی اللہ کی تصانیف کو پیشِ نظر رکھ کر مرتب کیا گیا

پروفیسر میاں منظور احمد

ایم اے عربی گولڈ میڈلسٹ
ایم اے اسلامیات گولڈ میڈلسٹ
اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور

علمی کتاب خانہ کبیر سٹریٹ اردو بازار لاہور

قیمت: -/36

نذرِ عقیدت

اُستاذِ محترم رئیس المتکلمین، سیّد المفسّرین، فخر المحدّثین

شیخ الاسلام علّامہ شبّیر احمد عثمانیؒ

کے

اسمِ گرامی کے نام جن کی نگاہِ شفقت نے مجھ میں مطالعہ کا شوق اور حدیث نبویؐ کے سمجھنے کا ذوق پیدا کیا۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

خاکپائے علّامہ عثمانیؒ

میاں منظور احمد

ندیم یونس پرنٹرز، لاہور

کچھ اس کتاب کے بارے میں

یہ کتاب جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے اسے مشکوٰۃ المصابیح کی مستقل شرح نہیں کہا جاسکتا۔ پنجاب یونیورسٹی کے مقرر کردہ ایم اے علومِ اسلامیہ کے نصاب میں مشکوٰۃ المصابیح کی کتاب الصلوٰۃ کتاب الزکوٰۃ اور کتاب الصوم شامل ہے۔ کتاب الصلوٰۃ سے کتاب الجنائز خارج ہے لیکن اس نصاب میں ہر باب کی صرف پہلی فصل داخل ہے۔ دوسری اور تیسری فصلیں نصاب سے خارج ہیں پنجاب یونیورسٹی نے طلبہ کے مطالعہ کے لیے جو کتاب تجویز کی ہے یعنی مظاہر حق وہ اوّل تو نایاب ہے اور پھر وہ ایسی زبان میں لکھی گئی ہے کہ اس وقت کے طلبہ کے لئے اس سے استفادہ ممکن نہیں ـــــ اس عاجز نے حاجی سردار محمد صاحب مالک علمی کتاب خانہ اردو بازار لاہور کے ارشاد پر مشکوٰۃ المصابیح کے ان حصوں کی سادہ اور مختصر شرح اور بامحاورہ آسان ترجمہ لکھا ہے۔ میں اسے حرفِ آخر کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا لیکن جو کچھ لکھا ہے مطالعہ و تحقیق کے بعد لکھا ہے بلکہ یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ میں نے اس میں اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا، مشہور شراح حدیث کی عبارات کو ایک ترتیب سے جمع کر دیا ہے اور فٹ نوٹ میں ہر تحریر کا حوالہ دے دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ گواہ ہے کہ میں نے اس کتاب کے لکھنے میں کس قدر محنت اور عرق ریزی سے کام لیا ہے اس کا کچھ اندازہ آپ حوالہ کی کتابوں کے ناموں سے کر سکتے ہیں۔

مؤلف چونکہ خود حنفی المسلک ہے اور یقین رکھتا ہے کہ طلبہ کی عظیم اکثریت بھی اسی فقہی مدرسۂ فکر سے تعلق رکھتی ہے لہٰذا اس نے اس مسلک کو نمایاں کرنے اور اس کے دلائل بہم پہنچانے میں کوتاہی نہیں کی۔ لیکن دیگر ائمہ اسلام، فقہاء و محدثین اور شارحین کے ادب و احترام اور عقیدت کے دامن کو بفضلِ خدا کہیں ہاتھ سے نہیں چھوڑا، کیونکہ یہ عقیدت و احترام ہی میرا سرمایۂ حیات ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جو احادیث شافعی، حنبلی اور مالکی مدارس فقہ کے دلائل میں ہیں انہیں برموقع بتانے اور ان بزرگوں کے طرزِ استدلال کو واضح کرنے میں بھی بخل سے کام نہیں لیا۔ اس کتاب میں جو کچھ بھی ہے وہ میرے اساتذہ کی دعاؤں کا فیض ہے اللہ تعالیٰ اسے طلبہ کیلئے مفید فرما دیں تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت ٹھکانے لگی ؎

نہ ز حرف ساختہ سرخوشم ، نہ ز نقش بستہ مشوشم
نفسے بنام تو می زنم ، چہ عبارت و چہ معانیم

احقر پروفیسر میاں منظور احمد
ایم اے، فاضل دیوبند
اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

کتاب اور صاحب کتاب

المصابیح اور اس کے جامع

مؤلف مصابیح ابو محمد الحسینؒ بن مسعود الفراء البغوی پانچویں صدی ہجری کے اواخر اور چھٹی صدی کے اوائل میں ایک مشہور محدث اور باکمال فقیہ گزرے ہیں۔ علامہ علی القاریؒ شارح مشکوٰۃ فرماتے ہیں کہ ہمارے اساتذہ امام بغویؒ کو فن حدیث وفقہ کا متفق علیہ امام مانتے ہیں۔ ان علوم وفنون کے بارے میں بغویؒ کا کوئی حد ثقاہت واعتبار سے گرا ہوا قول نہیں مل سکتا۔ وہ علمِ قرأت وتجوید کے بھی امام تھے۔ بڑے عابد وزاہد اور علم وعمل کا پیکر تھے۔ سادگی، اخلاص اور ریاضت میں بزرگانِ سلف کا نمونہ تھے پہلے پہل روٹی سالن کے بغیر کھایا کرتے تھے، جب عمر زیادہ ہوگئی اور ضعف کا شدید احساس ہونے لگا تو روٹی روغنِ زیتون یا بقولِ بعض کشمش کے ساتھ کھانے لگے۔ بڑے بڑے اکابر محدثین ان کے شاگرد تھے اور انہوں نے ان سے حدیث کی روایت کی ہے جن میں حافظ ابوموسیٰ المدینیؒ اور شیخ ابونجیب سہروردیؒ (جو صاحب عوارف المعارف امام شہاب الدینؒ کے چچا تھے) کا نام بہت مشہور ہے۔

امام بغویؒ نے المصابیح کے علاوہ اور کئی مشہور ومعروف کتابیں بھی لکھی ہیں۔ مثلاً شرح السنہ علم حدیث میں، کتاب التہذیب فقہ میں اور معالم التنزیل تفسیر قرآن میں، روایت ہے کہ جب انہوں نے اپنی کتاب شرح السنہ لکھی تو جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا، حضورؐ ارشاد فرمارہے تھے: اللہ تمہیں زندہ رکھے جیساکہ تم نے میری سنت کو زندہ کردیا ہے۔" اس واقعہ کے بعد محی السنہ کا لقب ان کے لیے علم کی طرح مشہور ہوگیا اور اب تک علمائے امت میں وہ محی السنۃ بغویؒ کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔

امام بغویؒ کی وفات ۵۱۶ھ میں مرو کے مقام پر واقع ہوئی اور انہیں ان کے پیرومرشد اور استاد فقیہ خراسان قاضی حسین المروزیؒ کے پاس دفن کیا گیا۔

علامہ بغویؒ کی کتاب المصابیح علم حدیث میں بڑی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ انہوں نے اس میں نہایت ضروری اور اہم احادیث کو فقہ کی کتابوں کے ابواب کی ترتیب

پر جمع کیا تھا۔ لیکن ائمہ حدیث کی نقل پر اعتماد کرتے ہوئے سندوں کو بالکل چھوڑ دیا تھا۔ اور ہر باب کی احادیث کو صحاح اور حسان میں تقسیم کر دیا تھا۔ ان کی اصطلاح میں، صحاح سے مراد امام بخاریؒ و مسلمؒ کی بیان کردہ احادیث ہیں چاہے دونوں حضرات ان پر متفق ہوں یا ان میں سے کوئی بزرگ ان کے بیان و روایت میں منفرد ہوں۔ اور ارباب صحاح ستہ میں سے بخاری و مسلم کے علاوہ باقی حضرات ابو داؤدؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ اور ابن ماجہؒ اور انہی کے ہم پلہ بزرگوں مثلاً بیہقیؒ، دار قطنیؒ وغیرہم کی روایت کردہ، احادیث کا نام انہوں نے حسان (جمع حسن) رکھا ہے۔ ان کی کتاب مصابیح میں کل ۴۴۳۴ احادیث جمع کی گئی تھیں۔ امام بغویؒ فقہی مسلک کے لحاظ سے شافعی تھے۔

مشکوٰۃ اور اس کے مؤلف

علامہ بغویؒ کے بعد آٹھویں صدی ہجری میں ایک اور محدث و فقیہ شیخ ولی الدینؒ محمد ابن عبداللہ تبریزیؒ نے ان کی کتاب کی تکمیل و تذییل کا اہم کام سرانجام دے کر مشرق و مغرب کے اہل علم سے خراج تحسین و عقیدت وصول کیا۔ علامہ تبریزیؒ نے ان تمام صحابہؓ کے نام درج کر دیئے جن سے مصابیح کی احادیث روایت کی گئی تھیں اور ہر باب میں صحاح اور حسان احادیث میں بھی اضافہ کیا۔ بہت کم باب ایسے ہیں جن پر اضافہ نہیں فرمایا اور اپنی کتاب کا نام مشکوٰۃ المصابیح رکھا۔ علامہ تبریزیؒ مشکوٰۃ کی جمع و تالیف سے رمضان ۷۳۷ھ کے آخری جمعۃ المبارک کو فارغ ہوئے۔ انہوں نے مشکوٰۃ المصابیح کے رجال (راویوں) پر بھی ایک کتاب اسماء رجال المشکوٰۃ نامی تالیف فرمائی۔

مشکوٰۃ المصابیح کے تقریباً ہر باب تین فصلیں ہوتی ہیں۔ جن کی ترتیب حسب ذیل ہے:

۱۔ پہلی فصل جس میں بخاری و مسلم کی احادیث درج کرتے ہیں۔

۲۔ دوسری فصل جس میں ان دونوں بزرگوں کے علاوہ دوسرے ارباب صحاح کی احادیث لاتے ہیں۔

۳۔ تیسری فصل میں مناسب صحاح یا حسان حدیثیں جو اسی باب سے ملحق ہو سکتی ہیں درج کرتے ہیں۔

علامہ تبریزیؒ نے المصابیح کی ۴۴۳۴ احادیث پر ۱۵۱۱ احادیث کا اضافہ کر کے کل ۵۹۴۵ احادیث کا مجموعہ تیار کر دیا۔

مشکوٰۃ المصابیح کی شروح

۱۔ مشکوٰۃ کی سب سے پہلی اور مشہور ترین شرح صاحب مشکوٰۃ کے استاد شیخ علامہ

حسینؒ بن عبداللہ بن محمد الطیبیؒ (سن وفات ۷۴۳ھ) نے لکھی۔ اس کتاب کے قلمی نسخے چار پانچ کی تعداد میں پاک وہند کے مشہور کتب خانوں میں موجود ہیں۔ احقر کو جس نسخہ کی زیارت اور اس سے استفادہ کا شرف حاصل ہوا وہ دارالعلوم الشہابیہ سیالکوٹ کے کتب خانہ میں موجود ہے اور ایک نادر اور قیمتی کتاب سمجھا جاتا ہے۔

۲۔ دوسری شرح علامہ علیؒ بن سلطان القاری الھروی (سن وفات ۱۰۱۴ھ) نے لکھی۔ علامہ قاریؒ مشہور محدث وفقیہ اور مشہور تصانیف کے مؤلف و مصنف تھے۔ مسلکاً حنفی تھے اس لیے مشکوٰۃ کی شرح مرقات المفاتیح میں حنفی نقطۂ نگاہ کو واضح کرنے اور اس کا دفاع کرنے کا فریضہ خوب خوب سرانجام دیا۔ علامہ قاریؒ کے علم وفضل اور تقویٰ وطہارت کا زمانہ معترف ہے۔ وہ ایک واسطہ سے حافظ الدنیا علامہ ابن حجرؒ عسقلانی الشافعی کے شاگرد تھے۔ پاکستان وہندوستان میں اس شرح کی خاص طور پر دھوم ہے۔ کچھ عرصہ ہوا یہ کتاب مکتبہ امدادیہ ملتان سے ازسرنو شائع ہو گئی ہے۔

۳۔ گیارھویں صدی ہجری کے سربرآوردہ عالم، محدث، صوفی اور فقیہ جلیل شیخ عبدالحقؒ دہلوی نے مشکوٰۃ کی شرح لمعات کے نام سے لکھی جسے بہت پسند کیا گیا اب یہ کتاب تقریباً نایاب ہے۔

۴۔ مولانا قطب الدینؒ شاہجہان آبادی (جو مولانا شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی مہاجر مکیؒ کے شاگرد رشید تھے اور شاہ اسحاق حضرت امام ولی اللہ دہلوی کے نواسے تھے) نے اپنے استادِ محترم کے ارشاد پر مشکوٰۃ المصابیح کا ترجمہ اور شرح مظاہر حق کے نام سے تحریر کیا جو خاص وعام میں مقبول ہوا۔ مولانا قطب الدین نے بھی اپنے ترجمہ وشرح میں مسلک حنفی کی نمائندگی کو مدنظر رکھا اور اس کی تالیف میں مرقات، لمعات، حاشیہ سید جمال الدینؒ وغیرہ سے کافی استفادہ کیا۔ مظاہر حق مختصر ہونے کے باوجود نہایت جامع اور مفید شرح ہے۔ لیکن آجکل نایاب ہے۔

۵۔ العلامہ الفاضل مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ نے التعلیق الصبیح کے نام سے مشکوٰۃ کی شرح لکھی جس نے عرب وعجم کے علماء سے خراج تحسین حاصل کیا یہ کتاب کچھ عرصہ قبل مجلس علمی حیدر آباد دکن کے زیر اہتمام دمشق سے چھپ کر شائع ہوئی تھی اور تاحال بازار میں مل سکتی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب الصلوٰۃ

صلوٰۃ کا لفظ[1] امام باقلانیؒ کے نزدیک صَلو سے نکلا ہے۔ صَلو کا معنی ہے چوتڑ اہل عرب گھوڑ دوڑ میں اوّل آنے والے گھوڑے کو سابق اور دوسرے نمبر والے کو مُصلی کہتے تھے کیوں کہ اس کا سر اوّل آنے والے کے چوتڑوں (پچھلی ٹانگوں) کے قریب ہوتا تھا۔ چوں کہ مقتدی امام کے پیچھے کھڑا ہو کر نماز ادا کرتا ہے اور اس کے افعال کا اتباع کرتا ہے لہٰذا اسے مُصلی کہا جاتا ہے۔ گویا اس معنی کے لحاظ سے امام سابق ہوا اور مقتدی مُصلی۔

شیخ کبیر شہاب[2] الدین سہروردی فرماتے ہیں کہ صلوٰۃ کا لفظ صَلیٰ سے نکلا ہے جس کا معنی ہے آگ میں داخل ہونا۔ لکڑی جب ٹیڑھی ہو جائے تو اسے آگ میں تپا کر سیدھا کیا جاتا ہے۔ بندے میں چوں کہ برائی کا حکم دینے والا نفس (نفس امّارہ) موجود ہے لہٰذا اس میں ایک کجی اور ٹیڑھا پن پایا جاتا ہے نماز (صلوٰۃ) میں نمازی کو خدائی، ہیبت و عظمت کی تیز گرمی اور شعلے سیدھا کر دیتے ہیں پس اس کی حالت اس لکڑی جیسی ہے جسے آگ میں تپا کر سیدھا کیا گیا ہو اور جو نماز کی گرمی کو سینک لیتا ہے اور اس کی کجی اس کے ساتھ درست ہو جاتی ہے وہ دوبارہ (جہنم کی آگ میں نہیں ڈالا جائے گا۔

یہ تو تھی لغوی اشتقاق کی بحث۔ محاورۂ عرب میں صلوٰۃ کا لفظ دعا اور عبادت کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ اسلامی اصطلاح میں صلوٰۃ ایک خاص قسم کی عبادت کا نام ہے جو خاص شرائط و ارکان اور آداب کے ساتھ خاص اوقات میں کی جاتی ہے۔ علامہ کبیر سید انور شاہ کشمیری محدث عصر ارشاد فرماتے ہیں کہ مخلوق کی طرف سے اپنے

---

۱ فیض الباری جلد ۲ ص۱

۲ مرقات المفاتیح علامہ علی قاریؒ بحوالہ عوارف المعارف جلد ۲ ص۱۰۹، مظاہر حق جلد اول ص۲۰۱

خالق کی تعظیم اور عاجزی میں جو عبادت بھی ادا کی جائے اسے صلوٰۃ کہا جاتا ہے۔ اور اس معنی میں لفظ صلوٰۃ تمام مخلوقات میں مشترک ہے اگرچہ اس کی صورتیں، مختلف ہوں۔ پس ہر مخلوق کی نماز اس کے مناسب حال ہو گی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَ تَسْبِيحَهُ۔ اس آیت کی رُو سے تمام مخلوق وظیفۂ صلوٰۃ کی ادائیگی میں مشترک ہے گو ہر ایک کی صلوٰۃ کی صورتیں الگ الگ ہیں۔ اسی طرح تمام مخلوق اپنے رب کو سجدہ کرتی ہے لیکن ہر ایک کا سجدہ اس کے حسب حال ہے ارشادِ خداوندی ہے: وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اور ان مخلوقات کا سجدہ یہ ہے کہ ان کے سائے زمین پر بچھ جاتے ہیں۔

[1] معراج کے ذکر میں ایک حدیث میں میں نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے سید الوجود صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا: قِفْ يَا مُحَمَّدُ فَاِنَّ رَبَّكَ يُصَلِّيْ۔ اس سے تو اللہ تعالیٰ کے حق میں بھی صلوٰۃ ثابت ہوتی ہے لیکن اس کی صلوٰۃ اس کی شانِ رفیع کے مناسب ہو گی اور مخلوقات کی صلوٰۃ اُن کے حسبِ حال ہو گی۔

یہیں سے اس آیت کی تفسیر کا راز بھی کھل جاتا ہے جس میں صلوٰۃ کی نسبت اللہ تعالیٰ، فرشتوں اور اہل ایمان سب کی طرف کی گئی ہے: اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ پس اللہ تعالیٰ کی صلوٰۃ اس آیت میں مختلف ہے فرشتوں اور اہل ایمان کی صلوٰۃ سے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کی صلوٰۃ یہ ہے کہ وہ حضورؐ پر رحمت نازل فرماتا ہے۔ فرشتوں کی صلوٰۃ سے مراد رحمت کی طلب و دعا ہے اور اہل ایمان کو بھی حکم دیا گیا ہے کہ حضورؐ کے حقِ رسالت و نبوت کو ادا کرنے اور اپنی محبت و عقیدت کا ثبوت دینے کے لیے اللہ تعالیٰ سے آپؐ کے حق میں رحمت و سلامتی اور فضل[2] و کرم کی دعا کریں۔

---

[1] فیض الباری ج ۲ ص ۱

[2] اسی کے قریب قریب سید عبد العزیزؒ دباغ کا ارشاد ہے ملاحظہ ہو الابریز۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں[1] کہ نماز پنجگانہ اسلام کے ارکان میں سے ایک رکن ہے اور کسی مکلّف پر ان پانچ نمازوں کے علاوہ اور کوئی نماز فرض نہیں ہے۔ جمعہ چوں کہ ظہر کی بجائے ہے لہٰذا وہ بھی نماز پنجگانہ میں ہی داخل ہے۔ نماز کی فرضیت[2] عاقل و بالغ مسلمان کے لیے ہے (حیض و نفاس والی عورت اس سے مستثنیٰ ہے) اگر کوئی کافر مسلمان ہو جائے تو اس پر گزشتہ نمازوں کی قضاء لازم نہیں ہے کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اصحابؓ اور تابعینؒ اور ان کے بعد والے دوسرے بندر گ ہر نئے مسلمان ہونے والے کو گزشتہ نمازوں کی قضاء کا حکم نہیں دیا کرتے تھے اور علماء نے مرتد کے بارے پچھلی نمازوں کی قضاء کے باب میں تردد کیا ہے لیکن فقیر کہتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانے میں عرب کے بہت سے لوگ اسلام سے مرتد ہو گئے تھے اور پھر وہ مسلمان ہوئے ان کا واقعہ بہت مشہور ہے لیکن نمازیں قضاء کرنے کا حکم منقول نہیں ہے اور حدیث اَلاِسْلَامُ يَجُبُّ مَا قَبْلَهٗ (اسلام پہلی زندگی اور اس کے اعمال و افعال کو صاف کر دیتا ہے) مرتد کو بھی شامل ہے۔ بچہ اگر بالغ ہو جائے یا مجنون اور بے ہوش آدمی ہوش میں آجائے تو ان پر گزشتہ نمازوں کی قضاء لازم نہیں ہے[3]۔

بچے کا ولی — باپ ہو یا دادا یا وصی — اسے سات سال کی عمر میں نماز کا حکم دے اور اگر دس سال کی عمر میں وہ نماز ترک کرے تو اسے سزا دینا بھی لازم ہے۔ جیسا کہ ابوداؤد اور ترمذی کی حدیث میں آیا ہے۔

الفصل الاوّل

۱- عن ابی ھریرۃؓ قال قال رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الصلوات الخمس والجمعۃ الی الجمعۃ و

---

[1] مصفّیٰ ص۲۲ [2] مصفّیٰ ص۶۹

[3] حنفیہ کے ہاں جنون اور بے ہوشی کی مقدار کم از کم ایک دن رات سے زائد ہو تو قضاء لازم نہ ہو گی کما فی القدوری وغیرہ۔

رمضان الی رمضان مکفرات لما بینھن اذا اجتنبت الکبائر رواہ مسلم۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ پانچ نمازیں اور ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک اور ایک رمضان سے دوسرے رمضان تک تمام گناہوں کو مٹا دینے والے (ڈھانپ لینے والے، کفارہ بن جانے والے) ہیں جب کہ کبیرہ گناہوں سے پرہیز کیا جائے۔
یہ حدیث امام مسلم نے (اپنی صحیح میں) روایت کی ہے۔

تشریح: حضورؐ[۱] کا یہ ارشاد قرآنِ پاک کی اُن آیات کی شرح و تفسیر ہے جن میں یہ مضمون وارد ہوا ہے کہ اگر بندہ کبیرہ گناہوں سے پرہیز کرے تو اللہ تعالیٰ چھوٹے گناہوں (صغائر) کو محو فرما دیتے ہیں اور دوسری نیکیوں کے باعث صغیرہ گناہ مٹا دیئے جاتے ہیں چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے اِنْ تَجْتَنِبُوْا کَبَآئِرَ مَا تُنْھَوْنَ عَنْہُ نُکَفِّرْ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ (اگر تم ان گناہوں جن سے تمہیں روکا جارہا ہے، بڑے گناہوں سے بچو تو چھوٹے گناہوں کی ہم تکفیر کردیں گے)۔ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّھَارِ وَزُلَفًا مِّنَ اللَّیْلِ اِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْھِبْنَ السَّیِّاٰتِ۔ الآیہ۔ (دن کے دونوں اطراف میں اور رات کی گھڑیوں میں، نماز قائم رکھو بلاشبہ نیکیاں برائیوں (یعنی صغیرہ گناہوں) کو مٹا ڈالتی ہیں۔)
امام ابن عبدالبرؒ[۲] مالکی نے اس مسئلے پر اہل حق کا اجماع نقل کیا ہے کہ کبیرہ گناہوں کو مٹانے والی چیز صحیح توبہ ہے۔ قاضی عیاض شافعیؒ[۳] نے توبہ کے ساتھ رحمتِ الٰہی کا بھی ذکر کیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ اگر چاہیں تو کسی کو توبہ کے بغیر اپنی رحمت سے بھی معاف فرما سکتے ہیں۔
علامہ علی القاریؒ[۴] المحدث فرماتے ہیں کہ جب بعض مکفرات پائے جائیں (مثلاً پانچ نمازیں)، تو دوسرے مکفرات کن چیزوں کو مٹائیں گے؟ (مثلاً جمعہ سے جمعہ تک اور

۱؎ مسوّی شرح مؤطا از شاہ ولی اللہؒ جلد ۱ صـ ۶۹ ۔ ۲؎ مرقات ج ۲ صـ ۱۱۰
۳؎ مرقات ج ۲ صـ ۱۱۰ ۴؎ مرقات ج ۲ صـ ۱۱۰

رمضان سے رمضان تک) اس سوال کا جواب علماء نے یہ دیا ہے کہ تمام نیکیاں صغیرہ گناہوں کو مٹانے اور ان کا کفارہ بننے کی صلاحیت رکھتی ہیں سو اگر کوئی صغیرہ گناہ، باقی نہ رہا ہو تو گناہوں کو مٹانے کی بجائے یہ نیکیاں ثبت نیکیاں شمار ہوں گی، اور ان کی وجہ سے درجات بلند کیے جائیں گے۔ اور امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی صغیرہ گناہ باقی نہ رہا یا سرے سے ہی نہ پایا گیا ہو تو امید ہے کہ ان نیکیوں کی وجہ سے کبیرہ گناہوں کے عذاب میں بھی تخفیف ہو جائے گی۔

کبیرہ گناہوں کی تعریف علماء نے یہ فرمائی ہے[1] کہ ان میں مندرجہ ذیل گناہ شامل ہیں:

۱۔ جنہیں کتاب وسنت یا ان میں سے ایک نے خود کبیرہ کہا ہو، مثلاً حدیث میں ہے: اکبر الکبائر الاشراک باللہ وعقوق الوالدین وقتل النفس التی حرم اللہ الا بالحق والفرار من الزحف وشہادۃ الزور (او کما قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم)۔ سب سے بڑا گناہ یہ ہے: خدا کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، والدین کے ساتھ بدسلوکی کرنا اور ناحق کسی کو قتل کر ڈالنا اور میدانِ جہاد سے بھاگ جانا اور جھوٹی گواہی دینا۔ بعض دوسری احادیث میں غیبت، چغلی، زنا و لواطت اور جھوٹ بولنے کا ذکر بھی آیا ہے۔

۲۔ جن گناہوں پہ کتاب وسنت میں جہنم کی سزا وارد ہوئی ہے۔

۳۔ جن گناہوں پر خدا کی لعنت آئی ہے۔

۴۔ جن گناہوں کو قتل وغیرہ کی مانند قرار دیا ہے مثلاً غیبت کے متعلق فرمایا ہے: اَیُحِبُّ اَحَدُکُمۡ اَنۡ یَّاۡکُلَ لَحۡمَ اَخِیۡہِ مَیۡتًا فَکَرِہۡتُمُوۡہُ۔ الآیہ (کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھالے، تم اسے یقیناً ناپسند جانتے ہو)۔

۵۔ عام طور پہ کتاب اللہ اور حضورؐ کے ارشادات میں جن گناہوں سے نہی کے صیغے

---

[1] تفسیر مظہری از قاضی ثناء اللہؒ پانی پتی

سے روکا گیا ہے مثلاً : یایھا الذین آمنوا لا تقولوا راعنا الآیۃ : لا یسخر قوم من قوم عسی الآیۃ : لا تحسّسوا ولا تجسّسوا ولا تباغضوا ولا یبع بعضکم علیٰ بیع بعض (الحدیث)

۶۔ جن گناہوں کو خدا اور رسول ؐ سے بغاوت اور لڑائی قرار دیا گیا ہے مثلاً : سُود کے متعلق قرآن کہتا ہے : وان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ (البقرہ) اگر تم سود سے باز نہ آئے تو تمہیں خدا اور رسول ؐ سے لڑائی کا چیلنج دیا جاتا ہے۔''

۷۔ جن گناہوں کو نفاق کی علامات قرار دیا گیا ہے مثلاً احادیث میں جھوٹ، وعدہ خلافی، خیانت، گالی بکنا اور عہد سے پھر جانا۔ ان کو علامات نفاق بتایا گیا ہے پس یہ بھی کبائر ہیں۔

۸۔ جن گناہوں پر کفر کا لفظ وارد ہوا ہے مثلاً ترکِ صلوٰۃ اور استطاعت کے باوجود حج نہ کرنا۔ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ۔

۹۔ ارکانِ اسلام میں سے کسی کو ترک کر دینا بھی کبیرہ گناہ ہے اور اس پر شدید سزا کی وعیدیں آئی ہیں۔

۱۰۔ صغیرہ گناہ پر اصرار اور بے خوفی اُسے کبیرہ بنا دیتی ہے[۱]

حدیث ۲ : وعنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارایتم لو ان نہرًا بباب احدکم یغتسل فیہ کل یوم خمسا ھل یبقیٰ من درنہ شیئ ؟ قالوا لا یبقیٰ من درنہ شیئ قال فذالک مثل الصلوات الخمس یمحو اللہ بھن الخطایا۔ متفق علیہ۔

ترجمہ : حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی یہ روایت بھی ہے کہ انہوں نے کہا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بھلا بتاؤ تو سہی اگر تم میں سے کسی کے دروازے پر ایک نہر بہتی ہو وہ روزانہ اس میں پانچ دفعہ غسل کرے تو کیا اس کی میل،

---

[۱] حاشیہ فیض الباری ج ۲ ص ۱۰۳

کچیل کچھ بھی باقی رہ جائے گی؟ صحابہؓ نے کہا اس کی میل کچیل بالکل نہیں رہے گی۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ پھر پانچ نمازوں کی یہی مثال ہے اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ گناہوں کو مٹا ڈالتا ہے۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم دونوں نے بیان کیا ہے۔

شرح: اس حدیث کا مضمون سابق حدیث جیسا ہے اور اس میں جو تمثیل بیان فرمائی گئی ہے وہ نہایت بلند اور بلیغ ہے۔ نماز جہاں باطنی برائیوں کو مٹاتی ہے، وہاں وہ ظاہری تطہیر کا بھی سبب ہے کیوں کہ بدن کپڑوں اور جگہ کی طہارت اس کی شرطوں میں سے ہے اسی لحاظ سے اس نہر میں غسل کرنے سے تشبیہ دینے میں یہ راز بھی ہے کہ نماز ظاہری و باطنی طہارت کی تکمیل کرتی ہے۔ علامہ سید انور شاہ محدث کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں درن (میل کچیل) کا جو لفظ آیا ہے اس کا مصداق صرف صغیرہ گناہ ہی ہو سکتے ہیں کیوں کہ کبیرہ گناہ تو درن نہیں بلکہ صداء (زنگ) ہوتے ہیں اور زنگ لوہے کو بھی کہا جاتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی واضح رہنی چاہیئے کہ نماز کو جو مکفّر ذنوب (گناہ مٹانے والی) فرمایا گیا ہے اس سے مراد وہ کامل نماز ہے جس کا ادا کرنے والا اسے تمام لوازم و آداب سمیت ادا کرے۔ ورنہ جتنی اس میں یہ صفت کم ہوگی اتنی ہی گناہوں کو مٹانے کی صفت کمزور پڑ جائے گی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ: اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْکَرِ۔ بھی یہ تقاضا کرتا ہے کہ صلوٰۃ سے مراد صلوٰۃ کاملہ ہو نہ کہ غفلت و سہو کی نماز یا جسے بوجھ سمجھ کر اتار پھینکا گیا ہو قرآن پاک کے ارشاد کے مطابق تو ریاء اور نام و نمود کی نماز جہنم کا باعث ہے فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ الَّذِیْنَ ھُمْ عَنْ صَلَاتِھِمْ سَاھُوْنَ ۝ الَّذِیْنَ ھُمْ یُرَاۗءُوْنَ وَ یَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝

حدیث ۳: وعن ابن مسعودؓ ان رجلا اصاب من امرأۃ قبلۃ فاتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاخبرہ

۱؎ مرقات ج ۲ ص ۱۱۱ ۲؎ فیض الباری ج ۲ ص ۱۰۴۔

فانزل اللّٰہ تعالیٰ واقم الصلوٰۃ طرفی النہار و زلفا من اللیل ان الحسنٰت یذھبن السیئات فقال الرجل یارسول اللّٰہ ألی ھذا؟ قال لجمیع امتی کلھم ۔ وفی روایۃ لمن عمل بھا من امتی متفق علیہ ۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے ایک عورت کا بوسہ لے لیا پھر وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپؐ کو یہ واقعہ بتایا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اور دن کے دونوں اطراف میں اور رات کی گھڑیوں میں نماز کو قائم رکھ، بلاشبہ نیکیاں بُرائیوں کو دُور کر دیتی ہیں"، تو اس شخص نے کہا اے خدا کے پیغمبرؐ! کیا یہ حکم میرے ہی لیے ہے؟ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ میری ساری اُمت کے لوگوں کے لیے اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ یہ حکم ان سب لوگوں کے لیے ہے جو میری امت میں سے اس پر عمل کریں ۔ اس حدیث پر بخاری و مسلم کا اتفاق ہے ۔

شرح: اس حدیث کا مضمون بھی پہلی حدیثوں کا سا ہے لیکن یہاں ایک اُلجھن ہے جس کا دور کرنا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ اجنبی عورت کو مس کرنا اور اس سے بوس و کنار آیا گناہِ کبیرہ ہے یا صغیرہ؟ حدیث کا ظاہری مضمون تو اسی پر دلالت کرتا ہے کہ یہ صغیرہ گناہ ہے اسی لیے تو اس کا یہ گناہ معاف ہو گیا تھا اگر کبیرہ گناہ ہوتا تو اس سے پہلی احادیث، قرآن کی متعدد آیات اور اجماع امت سے یہ بات روشن ہو چکی ہے کہ کبائر بغیر توبہ کے معاف نہیں ہوتے ۔ اور پھر یہاں اس شخص کی خصوصیت کا بھی احتمال خود حدیث کے الفاظ نے بالکل قطع کر دیا پس ماننا پڑے گا کہ اس شخص کا گناہ کبیرہ نہیں تھا بلکہ صغیرہ تھا ۔

علامہ علی القاریؒ نے طیبیؒ سے نقل کیا ہے کہ اس آنے والے شخص کا نام ابو

---

[1] مرقات ج ۲ ص ۱۱۱ ۔ مظاہر حق جلد ۱ ص ۲۰۲ ۔

الیسرؓ تھا اور ترمذی نے خود ابوالیسرؓ سے روایت کیا ہے کہ ایک عورت میرے پاس کھجوریں خریدنے کو آئی، میں نے کہا کہ گھر میں ان کھجوروں سے بھی بہتر کھجوریں موجود ہیں وہ کھجوریں لینے میرے ساتھ میرے مکان میں داخل ہوئی تو میں نے اسے پکڑ کر جھکالیا۔ اور اس کا بوسہ لے لیا۔ ابن الملکؒ کہتے ہیں کہ اس عورت نے کہا خدا کا خوف کر، تو اس پر وہ شخص شرمندہ ہو گیا۔

حضرت سید انور شاہؒ محدث کاشمیریؒ فرماتے ہیں کہ کنز الدقائق کی شرح میں علامہ زیلعیؒ فرماتے ہیں کہ بوسہ لینا گناہِ صغیرہ ہے۔ لیکن مجھے زیلعیؒ کے اس کلام میں تردد ہے۔ مولانا بدر عالم میرٹھی فیض الباری کے اسی صفحہ کے حاشیہ میں فرماتے ہیں کہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے اس موقع پہ ایک لطیف بات ارشاد فرمائی ہے اور وہ یہ ہے کہ آیت اِنْ تَجْتَنِبُوْا کَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ۔ میں تکفیر ان گناہوں کی ہوتی ہے جو کبیرہ گناہوں کے مقدمات ہوتے ہیں۔ کبیرہ گناہ تو مقاصد و غایات ہوتے اور وہ گناہ جو ان کا وسیلہ اور مقدمہ ہوں اور بذاتِ خود مقصود نہ ہوں وہ صغیرہ ہونگے۔ اس صورت میں آیت کا معنی یہ ہوگا کہ اے لوگو! اگر تم خدا سے ڈر کر کبائر سے اجتناب کرو گے تو ان کبائر کی تمہیدات و مقدمات میں جو کچھ تم نے مخالفتِ احکام کی ہوگی وہ ہم معاف کر دیں گے۔

مولانا میرٹھی فرماتے ہیں حضرت شیخ الہندؒ کے اس کلام کی بنا پر بوس وکنار صغیرہ بھی ہو سکتا ہے اور کبیرہ بھی۔ صغیرہ تو تب ہو گا جبکہ یہ زنا کا مقدمہ و تمہید ہو اور کبیرہ تب ہو گا جبکہ بذاتِ خود مقصود ہو۔ رہا زیلعیؒ کا بوسے کو گناہ صغیرہ کہنا سو یہ اس صورت میں ہے جبکہ اتفاقاً سرزد ہو جائے اور اس میں عمد و ارادہ نہ ہو۔

اس ساری گفتگو کے بعد اب ہم پھر حدیث کے مضمون کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ وہ شخص اپنے فعل پر نادم ہو چکا تھا اسی لیے تو وہ فوراً حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور خود ہی واقعہ بیان کر دیا۔ نیز اس سے قبل ہم مرقات سے ابن الملکؒ کا قول نقل کر آئے ہیں کہ اس عورت کے خوفِ خدا کا ذکر کرتے ہی وہ

---

[1] فیض الباری ج ۲ ص ۱۰۳۔

شخص نادم ہو گیا اور اس کی یہی ندامت توبہ تھی۔ اس کی ندامت اور گناہ کی مغفرت کے لیے بے قراری ظاہر کر رہی ہے کہ اس نے توبہ کر لی تھی۔ اس صورت میں حدیث کے مضمون میں کوئی الجھن نہیں رہتی اور اس کی گزشتہ تقریر بالکل بے غبار ہو جاتی ہے۔

آیتؔ بالا میں طَرَفَيِ النَّهَارِ (دن کی دو طرفیں) کا مطلب بعض کے نزدیک یہ ہے کہ نماز فجر اور ظہر ایک طرف اور نماز عصر اور مغرب دوسری طرف واقع ہیں۔ اور مغرب کو دوسری طرف میں تغلیباً یا بطور مجاز رکھا گیا ہے۔ اسی طرح ظہر کو پہلی طرف رکھنا بھی مجاز سے خالی نہیں اور زُلَفاً مِنَ الَّيْلِ (رات کی گھڑیاں) سے مراد نماز عشاء ہے (زُلفۃؔ کا معنی ہے قطعہ یعنی ٹکڑا یا گھڑی)۔ لیکن اکثر شارحین و مفسرین کے نزدیک طَرَفَيِ النَّهَارِ سے مراد دن کا پہلا اور پچھلا حصہ ہے۔ اس صورت میں نمازِ فجر دن کے پہلے حصے کی نماز اور ظہر و عصر پچھلے حصے کی نمازیں ہیں کیوں کہ زوال کے بعد کا وقت پچھلا حصہ کہلاتا ہے اور زُلَفاً مِنَ الَّيْلِ سے مراد نماز مغرب اور عشاء ہے کیوں کہ رات کی پہلی گھڑی جو دن کے قریب ہے اس میں نمازِ مغرب اور اس کے بعد دوسری گھڑیوں میں نمازِ عشاء ہے۔ علامہ علی القاریؒ کے نزدیک یہ دوسرا معنی ہی زیادہ واضح ہے۔

حدیث ۴: وعن انسؓ قال جاء رجل فقال یا رسول اللّٰہِ انی اصبت حدا فاقمہ علی قال ولم یسألہ عنہ وحضرت الصلوٰۃ فصلی مع رسول اللّٰہِ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فلما قضی النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم الصلوٰۃ قام الرجل فقال یا رسول اللّٰہ انی اصبت حداً فاقم فی کتاب اللّٰہِ قال الیس قد صلیت معنا؟ قال نعم قال فان اللّٰہ قد غفر لك ذنبك او

ؔ مرقات جلد ۲ ص۱۱۱

اوحدلک ۔ متفق علیہ ۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی آیا اور اس نے کہا اے اللہ کے رسولؐ! میں ایک حد کو پہنچا ہوں (یعنی میں نے ایسا گناہ کیا ہے جو حد شرعی یا تعزیر وسزا کا مستوجب ہے) آپؐ مجھ پر وہ سزا قائم فرمائیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے گناہ کے متعلق کچھ نہ پوچھا اور نماز کا وقت آگیا تو اس شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی۔ جب حضورؐ نماز ختم کر چکے تو وہ شخص اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا: یا رسولؐ اللہ! میں نے ایک سزا کے لائق کام کیا ہے آپؐ مجھ پر اللہ کی کتاب کا حکم قائم فرمائیے۔ حضورؐ نے فرمایا: کیا تو نے ہمارے ساتھ نماز نہیں پڑھی؟ اس نے کہا ہاں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تیرا گناہ (یا تیری حد) معاف فرمادیا ہے۔ اس حدیث پر بخاری ومسلم دونوں کا اتفاق ہے۔

شرح: علامہ علی القاریؒ نے فرمایا[۱] ہے کہ ممکن ہے کہ اس حدیث میں بیان ہونے والا واقعہ بعینہٖ وہی ہو جو اوپر والی حدیث میں گزر چکا ہے اور ممکن ہے کہ یہ کوئی اور واقعہ ہو۔

اس روایت میں آنے والے شخص کا یہ کہنا کہ انی اصبت حداً[۲] (میں نے سزا کے لائق کام کیا ہے) اس فقرے میں لفظ حَدّ یا تو صرف گناہ اور تعزیر وسزا کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یا اس شخص نے اپنے خیال کے مطابق کہا تھا کہ مَیں حدِ شرعی کا مستحق ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اوپر کی احادیث سے ثابت ہو چکا ہے کہ نمازوں سے صغیرہ گناہ معاف ہوتے ہیں نہ کہ کبیرہ۔ اور مستوجب حد صرف کبیرہ گناہ ہی ہو سکتا ہے۔

علامہ علی القاریؒ فرماتے ہیں[۳] کہ اس شخص کا غالباً پہلے یہی خیال تھا کہ اس کا گناہ اس درجے کا ہے جس پر حد واجب ہوتی ہے لیکن جب حضورؐ نے اس کی

۱؎ مرقات جلد ۲ صـ۱۱۱ ۲؎ مرقات جلد ۲ صـ۱۱۱، مظاہر حق جلد اول صـ۲۰۳
۳؎ مرقات ج ۲ صـ۱۱۲ ۔

بات سن کر خاموشی اختیار کر لی تو اس نے سمجھ لیا کہ میرا گمان درست نہیں ہے چنانچہ جب دوسری مرتبہ نماز کے بعد اس نے سزا کے قائم کرنے کا مطالبہ کیا تو اپنے کلام کا اسلوب بدل کر فاقم فی کتاب اللہ (میرے بارے میں خدا کی کتاب کا حکم نافذ فرمایئے) کہا، جس کا یہ مطلب تھا کہ اگر حد شرعی واجب نہیں ہے تو جو اور سزا یا تعزیر وغیرہ ہے وہ قائم فرمائیے۔

لیکن یہ سارا کلام اس وقت ہو گا جب کہ لفظ حدؔ شرعی معنوں میں لیا جائے ورنہ لغوی معنوں میں اس کا مطلب صرف سزا و تعزیر ہے اور اس صورت میں یہ بحث بھی نہیں پیدا ہو گی کہ اس شخص کا گناہ واقعی قابلِ حد شرعی تھا۔ نیز اگر یہ واقعہ بھی وہی ہے جو اوپر کی حدیث میں گزر چکا ہے تو لا محالہ حدؔ کو لغوی معنوں میں لیں گے یا یوں کہیں گے کہ اس شخص نے اپنے گمان میں یہی سمجھا تھا ورنہ دراصل اس کا فعل قابلِ حد شرعی نہ تھا بلکہ صغیرہ گناہ تھا اور نماز سے معاف ہو چکا تھا۔

اور اگر حد سے مراد حد شرعی ہی لی جائے تو یوں کہا جائے گا کہ حضورؐ کو اس شخص کی توبہ کا علم ہو چکا تھا (اور اس کی پریشانی، ندامت اور بار بار سزا کا مطالبہ کرنا اس توبہ کی واضح علامت ہے) اس لیے حضورؐ نے نہ تو اس سے اس کے گناہ کی کیفیت بالتفصیل دریافت فرمائی اور نہ اُسے سزا دی۔

علامہ علی القاری رحؒ[1] نے مرقات میں قاضی عیاض رحؒ سے نقل کیا ہے کہ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ صغیرہ گناہ نماز سے محو ہو جاتے ہیں اور اسی طرح وہ کبیرہ گناہ جو مخفی ہوں وہ بھی نماز سے معاف ہو جاتے ہیں۔ علامہ علی القاری رحؒ فرماتے ہیں کہ قاضی عیاضؒ کا یہ قول خود شافعی حضرات کے مسلک اور اجماع امت کے خلاف ہے[2] نیز یہاں اس شخص کی توبہ اور ندامت بالکل واضح ہے، لہٰذا اگر اس کا گناہ کبیرہ تھا تو بھی نماز کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی توبہ و انابت سے معاف ہوا تھا۔ اور حضورؐ کا ارشاد عام تھا جو بطور خبر و تلقین صغیرہ گناہوں کے متعلق تھا۔

ابن الملک[3] نے کہا ہے کہ اس شخص کا گناہ تو کبیرہ ہی معلوم ہوتا ہے لیکن اُس

---

[1] مرقات ج ۲ ص ۱۱۲ [2] ایضاً [3] ایضاً۔

کی بخشش کا حکم اسی کے لیے خاص تھا جو حضورؐ نے بذریعہ وحی الٰہی معلوم کیا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اب ایک اور چیز یہاں قابلِ بحث ہے اور وہ یہ کہ اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ اس شخص نے کبیرہ گناہ کیا تھا اور اسی کے لیے وہ حد شرعی کے قائم کیے جانے کا مطالبہ کر رہا ہے تو حضورؐ خاموش کیوں رہے؟ حالاں کہ حاکم وقت کا فرض ہے کہ مجرم پر سزا نافذ کرے۔ تو اس کا جواب نہایت آسان ہے۔ اوّل تو شرعی قاعدہ ہے کہ حدود شرعیہ شبہات سے ختم ہو جاتی ہیں (الحدود تندری با الشبہات ایک عام قاعدۂ شرعیہ ہے جس پر بہت سے دلائل قائم ہیں) اور یہاں اس شخص نے چوں کہ اپنے گناہ کا اعتراف مبہم الفاظ میں کیا تھا اور وہ الفاظ حد شرعی کے علاوہ سزا و تعزیر وغیرہ کو بھی شامل تھے لہٰذا اسے شک کا فائدہ دیا گیا۔ — دوسری بات یہ ہے کہ حاکم کا فرض لوگوں کے پردوں کو کھولنا اور تجسس کرنا نہیں ہے بالخصوص جب ملزم خود اعتراف کر رہا ہو تو حتی الوسع سزا سے گریز کرنا ہی بہتر ہے جیسا کہ ماعزؓ اسلمی کے قصے میں احادیث میں آیا ہے کہ حضورؐ نے بار بار اس کی طرف سے منہ پھیرا اور جب واضح الفاظ میں چار مرتبہ وہ زنا کا اعتراف کر چکے، تب بھی حضورؐ اسے ٹالتے ہی رہے حتی کہ جب دیکھا کہ سزا دینا ناگزیر ہے تب با دلِ ناخواستہ سزا کا حکم نافذ فرمایا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

جو لوگ اسلامی سزاؤں کو سخت سمجھتے ہیں وہ غور کریں کہ اسلامی قانون سزا دینے میں آجکل کے قانون کی طرح اندھا اور بہرا نہیں ہے۔ آج کل تو عموماً کوشش کی جاتی ہے کہ بے گناہوں کو جرمِ بے گناہی میں حیلے بہانے سے پھانسا جائے اور ہوا میں قانون کی خلاف ورزیوں کی بُو سونگھی جائے یا اپنے سیاسی مخالفین کے اقوال و افعال میں قانون شکنی کے جراثیم تلاش کیے جائیں۔ لیکن اسلامی قانون کا منشا محض اصلاح ہے اندھا دھند انتقام لینا نہیں۔ اسلامی سزائیں بے شک سخت ہیں لیکن ان کا نفاذ شاذ و نادر ہوتا ہے اور جب ہو تو صحیح معنی میں باعثِ عبرت ہوتا ہے۔

حدیث ۵ : وعن ابن مسعودؓ قال سالت النبی صلی اللہ علیہ وسلم ای الاعمال احب الی اللہ ؟ قال الصلوٰۃ لوقتہا قلت ثم ای ؟ قال برالوالدین قلت ثم ای ؟ قال الجہاد فی سبیل اللہ ۔ قال حدثنی بہن ولو استزدتہ لزادنی ۔ متفق علیہ ۔

ترجمہ : حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کونسا عمل اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب ہے ؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ وقت پر نماز پڑھنا ۔ میں نے عرض کیا کہ پھر کونسا عمل ؟ آپؐ نے فرمایا والدین سے نیک سلوک کرنا ۔ میں نے عرض کیا پھر کونسا عمل ؟ آپؐ نے فرمایا اللہ کی راہ میں جہاد کرنا ۔ عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے یہ سب اعمال مجھے بتائے اور اگر میں اور بھی سوال کرتا جاتا تو حضورؐ جواب دیتے ہی جاتے ۔ اس حدیث پر بخاری و مسلم دونوں کا اتفاق ہے ۔

شرح : مختلف[1] احادیث میں مختلف اعمال کو سب سے افضل قرار دیا گیا ہے مثلاً ایک حدیث میں مستحقین کو کھانا کھلانا ، سلام کو عام کرنا اور نماز تہجد پڑھنا ، اِن اعمال کو افضل فرمایا گیا ہے ۔ ایک حدیث میں زبان اور ہاتھ سے لوگوں کو محفوظ رکھنے اور ایذا نہ دینے کو افضل فرمایا ہے ۔ ایک حدیث میں ذِکرِ الٰہی کو افضل فرمایا ہے ان سب احادیث میں تطبیق یوں ہو گی کہ بعض افراد کے حق میں ایک عمل افضل ہے اور بعض کے لیے کوئی اور عمل بہتر ہے ۔ اس طرح اوقات اور ضروریات کا بھی لحاظ ہے ، بعض اوقات میں ایک عمل سب سے بہتر ہوگا دوسرے وقت میں دوسرا عمل ۔ علیٰ ہذا القیاس جب نماز کا وقت آجائے تو وہی سب سے افضل عمل ہے اور جب جہاد فرض عین ہو جائے تو وہی عمل افضل ترین ہے ۔ غرض اوقات ، اشخاص اور ضروریات کے مطابق کبھی ایک عمل کو افضل فرمایا گیا ہے اور کبھی دوسرے کو بہتر قرار

---

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۲۰۳ ، مرقات ناقلاً عن التورپشتی والطیبی ج ۲ ص ۱۱۳ ۔

دیا گیا ہے۔ لہٰذا ان احادیث میں کوئی اختلاف نہیں ہے اس کی مثال یوں سمجھیے کہ جب بات کرنا ضروری ہے تو وہی افضل ہے اور جہاں خاموشی بہتر ہو وہاں سکوت ہی افضل ہے۔ اسی طرح جہاد، صدقہ وغیرہ کا حال بھی ہے۔ نیز بعض ،، حیثیتوں سے ایک عمل افضل ہوتا ہے اور بعض دوسری حیثیتوں سے دوسرا عمل افضل ہو جاتا ہے۔

علامہ محدّث علی القاریؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے مضمون سے علماء نے یہ استدلال کیا ہے کہ کلمۂ شہادت پڑھ کر اسلام قبول کر لینے کے بعد سب سے افضل عبادتِ نماز ہے (یا یوں کہیئے کہ کلمۂ توحید کے بعد دوسرے نمبر پر نماز کا درجہ ہے) اور والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک کو اس حدیث میں نماز کے بعد افضل الاعمال فرمایا گیا ہے جیسا کہ قرآن کا ارشاد ہے: وقضیٰ ربك ان لا تعبدوا الا ایاہ وبالوالدین احسانًا (بنی اسرائیل) اور تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت مت کرو اور ماں باپ کے ساتھ حُسن سلوک سے پیش آؤ۔" اسی لیے کہا گیا ہے کہ جو شخص نماز پنجگانہ ادا کرے اور ہر نماز کے بعد اپنے والدین کے لیے بخشش کی دعا کرے وہ اللہ اور والدین کے حق کو ادا کر دیتا ہے۔

علامہ علی القاریؒ نے [1] میرک سے نقل کیا ہے کہ اس حدیث کو ابو داؤدؒ اور نسائیؒ نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے اور دار قطنیؒ، حاکمؒ، ابن خزیمہؒ، ابن حبانؒ اور بیہقیؒ نے اپنی روایت میں یہ الفاظ بیان کئے ہیں کہ عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کون سا عمل افضل ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ "اوّل وقت پر نماز پڑھنا۔" اس اوّل وقت سے مراد ہر نماز کا مسنون و پسندیدہ (مختار) اوّل وقت ہے۔

حدیث ۶ : وعن جابر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین العبد وبین الکفر ترك الصلوٰۃ رواہ مسلم۔

---

[1] مرقات ج ۲ ص ۱۱۲ [2] مرقات ج ۲ ص ۱۱۳

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ (مسلم) بندے اور کفر کے درمیان صرف نماز کو ترک کر دینے کی ہی کسر ہے۔ اس حدیث کو مسلم نے بیان کیا ہے۔

شرح: یعنی مسلم[1] بندہ اس وقت تک کفر کے قریب نہیں پہنچتا جب تک نماز کو ترک نہ کر دے اور جب وہ ایسا کرے تو کفر کے قریب جا پہنچتا ہے۔ گویا دوسرے لفظوں میں بندے کے اسلام اور کفر کے درمیان نماز کی دیوار حائل ہے۔ ترکِ صلوٰۃ سے یہ دیوار ڈھے جاتی ہے اور بندہ کفر کے قریب جا پہنچتا ہے۔

اس حدیث میں عبد کے لفظ سے مراد مرد مومن ہے۔ مومن کی جگہ عبد کا لفظ رکھ دیا گیا ہے کیونکہ مومن ہی صحیح عبد (بندہ) ہوتا ہے حدیث کا مفاد یہ ہے کہ ایمان اور کفر یا مومن اور کافر کے درمیان نماز ہی باعث امتیاز ہے کیونکہ نماز، مومن کی شان امتیازی ہے۔

علامہ[2] علی القاریؒ نے شرح السنہ سے نقل کیا ہے کہ فرض نماز کو عمداً چھوڑ دینے والے کو کافر قرار دینے میں اختلاف ہوا ہے۔ سیدنا عمر فاروقؓ کا ارشاد ہے کہ جس نے نماز چھوڑ دی اس کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں۔ عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ نماز کا ترک کفر ہے۔ عبداللہ بن شقیقؒ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی اعمال میں سے کسی عمل کے چھوڑ دینے کو نماز کے سوا کفر نہیں جانتے تھے۔

بعض علماء کے نزدیک اس حدیث میں ترک سے مراد ترک انکاری ہے۔ یا یوں کہو کہ یہ سخت الفاظ حضورؐ نے زجر و توبیخ اور دھمکی کے طور پر ارشاد فرمائے ہیں۔ حمادؒ بن زید (فقیہ)، مکحولؒ تابعی اور امام مالکؒ و شافعیؒ فرماتے ہیں کہ تارک الصلوٰۃ مرتد کی طرح ہے گو وہ دین سے خارج نہیں ہوتا (اور مرتد خارج ہو جاتا ہے)، امام ابوحنیفہؒ اور اور محدث زہریؒ فرماتے ہیں کہ تارک صلوٰۃ کافر و مرتد نہیں ہو جاتا لیکن اس سے کفر کا کام سرزد ہوا ہے اور اسے بطور سزا قید رکھا جائے گا جب تک کہ توبہ کر کے پابندِ صلوٰۃ ہو جائے۔

---

[1] مرقات ناقلاً عن الطیبی ج ۲ ص ۱۱۳، مظاہر حق ج ۱ ص ۲۰۳۔
[2] مرقات ج ۲ ص ۱۱۳۔

اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو ان تمام اقوال و مسلک میں صرف لفظی اختلاف ہے جنہوں نے تارک صلوٰۃ کو کافر کہا انہوں نے کفرِ حقیقی، جو ملّت اسلامیہ سے خارج دینے والا ہے، مراد نہیں لیا۔ اور جنہوں نے اسے کافر نہیں کہا ان کے نزدیک بھی تارک صلوٰۃ ایک کفر کے کام کا مرتکب ہو رہا ہے گو مرتد نہیں ہوا لیکن خدشہ ہے کہ اس کی موت اسلام پر نہ ہو کیوں کہ اتنی بڑی معصیت کفر کا پیش خیمہ ہے۔ اور[1] یہ کام کفر کا فعل ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

باب المواقیت

نماز کی شرائط میں سے ایک وقت بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتَابًا مَّوْقُوْتًا۔ نماز اہل ایمان پر بقید وقت فرض کی گئی ہے"۔ یعنی الگ الگ ہر نماز کی فرضیت کا سبب اس نماز کے وقت کا آجانا ہے، جب وقت آچکا تو عاقل و بالغ مکلّف مسلمان پر نماز کی ادائیگی فرض ہو گئی۔ وقت کے داخل ہونے سے پہلے نماز کی ادائیگی بے معنی ہے کیوں کہ وہ نماز تا حال فرض ہی نہیں ہوئی اور وقت نکل جانے کے بعد بحکم شرع شریف نماز کی ادائیگی کا وقت نکل گیا اب وہ قضا ہو گی ادا نہیں۔ حج کے موقع پر جو دو نمازیں آگے پیچھے کی جاتی ہیں وہ خود شارع علیہ السلام سے ثابت ہیں گویا وہ اس عام حکم سے ایک شرعی مصلحت کی وجہ سے مستثنیٰ ہیں۔

مواقیت میقات[2] کی جمع ہے۔ علامہ ابن الہمام فرماتے ہیں کہ میقات کا معنی ہے وقتِ مُعیّن۔ اوقاتِ نماز کا تعین اللہ تعالیٰ کے حکم سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ قرآن پاک میں ان اوقات کی حد بندیاں اِن تفصیلات کے ساتھ نہیں ہیں بلکہ اگر یوں کہا جائے تو اولیٰ ہو گا کہ قرآن مجید سے پانچ نمازوں کا

---

[1] محدث علی القاری، مرقات ج ۲ ص ۱۱۴۔

[2] مرقات ج ۲ ص ۱۱۹۔

ثبوت بھی (سنت وحدیث کی شرح وتفصیل کو نظر انداز کر کے) مشکل ہے بعض آیات سے جو پانچ اوقات ثابت ہوتے ہیں وہ اس مفروضے پر ہیں کہ از روئے سنت یہ اوقات متفق علیہ ہیں اور انہیں (گو بتکلف سہی) قرآن پاک کی فلاں فلاں آیات سے بھی ثابت کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص سنت وحدیث کی رہنمائی سے بالکل بے نیاز ہو کر چلے گا تو اس کے لیے ناممکن ہوگا کہ ان نمازوں کے اوقات (بلکہ تعداد کو بھی) صرف قرآن سے ثابت کر سکے۔ اللہ تعالیٰ نے صرف قرآن ہی نازل نہیں فرمایا بلکہ پہلے رسولؐ مبعوث فرمایا اور بعد میں اس پہ کتاب نازل کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حیثیت کہ آپؐ کتاب اللہ کے معلم ومربی، اس کی حکمت پہ عمل کرنے والے اور کرانے والے، مزکی اور اس کی شرح وتبیین کرنے والے ہیں۔ قرآن پاک کی یہ آیات بتاتی ہیں: البقرہ ۱۲۹، البقرہ ۱۵۱، آل عمران ۱۶۴، الجمعہ ۲، النحل ۴۴، آل عمران ۳۱-۳۲، الاحزاب ۲۱، الاعراف ۱۵۷، الحشر ۷، پھر اس کے ساتھ آپؐ کی حیثیت اللہ تعالیٰ نے بھی یہ بیان فرمائی ہے کہ آپؐ غیر مشروط پہ قاضی اور مطاع ہیں۔ امت کے لیے آپؐ کی اطاعت بلاشرط اور بلاچون وچرا فرض ہے اور آپؐ کے فیصلوں کے سامنے گردن جھکا دینا ہی اصل ایمان ہے۔ یہی حقیقت قرآن پاک کی مندرجہ ذیل آیات میں بیان فرمائی گئی ہے: النساء ۱۰۵، الشوریٰ ۱۵، النور ۵۱، النساء ۵۹ و ۶۱، النساء ۶۴، ۶۵، النساء ۸۰، الفتح ۱۰، محمد ۳۳، الاحزاب ۳۶۔

اللہ تعالیٰ کے حکم وارشاد سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کا جو، ڈھانچہ تیار فرمایا اور عقائد وعبادات اور اعمال ومعاملات وغیرہا میں جو حد بندیاں تشریحات اور تفاصیل بیان فرمادیں وہی ایمان واسلام ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

الفصل الاوّل

حدیث ۱: عن عبداللہ عمروؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وقت الظھر اذا زالت الشمس وکان ظل الرجل کطولہ مالم یحضر العصر

ووقت العصر مالم تصفر الشمس ووقت صلوٰة المغرب مالم يغب الشفق ووقت صلوٰة العشاء الى نصف الليل الاوسط ووقت صلوٰة الصبح من طلوع الفجر مالم تطلع الشمس فاذا طلعت الشمس فامسك عن الصلوٰة فانها تطلع بين قرنى الشيطٰن ۔ رواه مسلم۔

ترجمہ: عبد اللہ بن عمرو ابن العاص رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ظہر کی نماز کا وقت تب ہوتا ہے، جب سورج ڈھل جائے اور (اس وقت تک رہتا ہے) جبکہ آدمی کا سایہ اس کی اپنی لمبائی جیسا ہو جائے جب تک کہ عصر کا وقت نہ آجائے اور عصر کا وقت اس وقت تک ہے جبکہ سورج زرد پڑ جائے اور مغرب کی نماز کا وقت رہتا ہے جب تک کہ شفق غائب نہ ہو جائے اور نمازِ عشاء کا وقت ٹھیک رات کے نصف تک ہے اور نماز صبح کا وقت فجر کے چڑھنے سے لے کر سورج طلوع ہونے تک، ہے پھر جب سورج طلوع ہو تو نماز سے رک جاؤ کیوں کہ سورج شیطان کے دو سینگوں کے درمیان چڑھتا ہے۔ اس حدیث کو مسلم نے بیان کیا ہے۔

شرح: اوقاتِ نماز کے متعلق بہت سی احادیث وارد ہیں۔ بعض میں اجمال ہے بعض میں تفصیل، بعض میں اوّل وقت کا بیان ہے بعض میں آخر وقت کا اور بعض میں مختار (پسندیدہ اور مسنون) وقت کا بیان ہے۔ لہٰذا اوقات کو سمجھنے کے لیے ان تمام احادیث کو پیش نظر رکھنا چاہیئے اور اگر کہیں ان میں اختلاف نظر آئے تو اسے حل کرنے کی کوشش کرنا لازم ہے تاکہ حضورؐ کے تمام ارشادات پر عمل ہو جائے۔ پھر بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک حدیث میں کسی نماز کا اوّل وقت، کسی کا آخر اور کسی کا مختار وقت بیان کر دیا جاتا ہے۔ اس لیے بھی ضروری ہے کہ سب دلائل کو جمع کر کے نتیجہ نکالا جائے۔

اس حدیث[1] میں سب سے پہلے ظہر کا وقت بیان فرمایا گیا ہے کیوں کہ جبرئیلؑ نے سب سے پہلے حضورؐ کو یہی نماز پڑھائی تھی اور اسی لیے اسے پیشین کی نماز بھی کہتے ہیں پس ظہر کا اوّل وقت زوال شمس کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے اور اس وقت تک رہتا ہے جب تک کہ ہر چیز کا سایہ اسی کی مقدار کے برابر ہو جائے۔ لیکن اس میں وہ سایہ شامل نہیں جو عین دوپہر کے وقت ہوتا ہے۔ سایہ کی مقدار معین کرتے وقت یہ سایہ (جسے فقہاء نے سایۂ اصلی کہا ہے) خارج کر دیا جائے گا۔ کیوں کہ یہ مقدار تو اس وقت بھی موجود تھی جب سایہ ناپید ہونا چاہیے تھا (یعنی بوجہ نصف النہار) چنانچہ بعض علاقوں میں جہاں سورج عین سر پہ پہنچ جاتا ہے تو وہاں یہ سایۂ اصلی نظر نہیں آتا) یہی وجہ ہے کہ حساب و کتاب میں یہ سایہ شمار نہیں کیا جاتا (اور اس مسئلے کا تعلق علم ہیئت سے ہے)

ظہر کے وقت کے بیان میں یہ جو ارشاد ہوا مالم یحضر العصر (جب تک عصر نہ آجائے) یہ پہلے جملے کی تاکید ہے اور اس بات کی دلیل بھی ہے کہ ظہر اور عصر کے درمیان کوئی مشترک وقت نہیں ہے جیسا کہ امام[2] مالکؒ کا مسلک ہے اور جب تک سورج زرد نہ ہو جائے (یعنی اس کی شعائیں کمزور پڑ جائیں اور دیکھنے والے کی آنکھ اس کی ٹکیہ پہ ٹھہر سکے) نماز عصر کا وقت بلا کراہت باقی رہتا ہے اور دوسری احادیث سے (جو مؤطا وغیرہ میں موجود ہیں) بصراحت ثابت ہوتا ہے کہ اس کا آخری (جائز) وقت غروب آفتاب تک ہے حدیث میں ہے۔ من ادرک رکعة من العصر قبل[3] ان تغرب الشمس الخ۔ اس سے معلوم ہوا کہ عصر کا آخری وقت غروب آفتاب سے پہلے پہلے تک ہے۔ شاہ ولیؒ اللہ محدث دہلوی نے شرح مؤطا میں[4] اور مولانا قطب الدینؒ نے مظاہر حق میں[5] فرمایا ہے کہ حنفیہ میں سے امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ (صاحبین) اور امام زفرؒ،

---

۱ مظاہر حق جلد اول ص ۲۰۷، ۲ مرقات ج ۲ ص ۱۲۰، مظاہر حق ج ۱ ص ۲۰۷

۳ مؤطا امام مالک باب اواخر اوقات الصلوٰة ص ۶

۴ مسوی و مصفی شرح المؤطا ج ۱ ص ۳

۵ مظاہر حق ج ۱ ص ۲۰۷

الہذیل کے نزدیک اور امام مالکؒ، شافعیؒ اور احمدؒ کے نزدیک ظہر کا آخری اور عصر کا پہلا وقت ایک مثل (یعنی جب سایہ ماسوائے سایۂ اصلی کے، اس چیز کی مثل ہو جائے جس کا وہ سایہ ہے) پر ہو جاتا ہے۔ اور حنفیہ کے نزدیک فتویٰ[1] اسی قول پر ہے۔ امام اعظمؒ ابو حنیفہ نے مؤطا امام مالکؒ کی اس روایت کے مطابق جس میں جبریلؑ نے دوسرے دن حضورؐ کو نماز عصر دو مثل پر پڑھائی تھی اور حضرت ابو ہریرہؓ کا ارشاد مؤطا میں ہے کہ[1] و العصر اذا کان ظلک مثلیک ظہر کا آخری وقت دو مثل پر مانا ہے لیکن ان سے ایک روایت ایک مثل پر بھی ہے اور دو مثل والی سے ان کا رجوع ثابت ہے (فیض الباری ج ۲ ص ۹۵) اسی لیے علماء نے لکھا ہے کہ ظہر کو ایک مثل کے اندر اندر اور عصر کو دو مثل کے بعد پڑھنا چاہیے تاکہ سب اختلافات دور ہو جائیں۔ حنفیہ کے ہاں[2] جو نمازِ عصر کی تاخیر کا مستحب ہونا مانا گیا ہے اس سے مراد وقتِ مکروہ (سورج کی زردی) سے پہلے پہلے ہے اور اس کے دلائل ابو داؤد ص ۱۵۰، ترمذی، مؤطا امام محمد اور بخاری و مسلم میں بھی موجود ہیں۔ مثلاً صحیحین کی وہ روایت جس میں حضورؐ نے فرمایا ہے: انما اجلکم فیما خلا من الامم کما بین صلوٰۃ العصر الی مغرب الشمس "پچھلی امتوں کے مقابلے میں تمہاری مدت بس اتنی ہی ہے جتنی نماز عصر سے لیکر غروبِ آفتاب تک ہے۔" اور صحیح حدیث میں حضورؐ نے یہ بھی فرمایا ہے: بُعِثْتُ انا والساعۃ کھاتین۔ "میں اور قیامت ساتھ ساتھ بھیجے گئے ہیں۔"[3] پس ان احادیث سے نماز عصر کے وقت کی قلت ثابت ہوتی ہے اور اسی لیے حنفیہ نے عصر کی تاخیر (وقت مکروہ سے پہلے پہلے مناسب سمجھی ہے۔

نماز مغرب کا وقت غروبِ[4] آفتاب سے لے کر شفق کے غائب ہونے تک ہے۔ کلام فقط شفق میں ہے پس شفق اکثر ائمہ کے نزدیک اس سرخی کا نام ہے جو غروبِ آفتاب کے بعد ظاہر ہوتی ہے اور امام ابو حنیفہؒ سے بھی ایک روایت

---

[1] مصفیٰ و مسوّیٰ ص ۷۱ [2] فیض الباری ج ۲ ص ۹۰
[3] فیض الباری ج ۲ ص ۹۰ [4] مظاہر حق ج ۱ ص ۲۰۷، فیض الباری ج ۲ ص ۱۰۰

میں یہی آیا ہے اسی لیے شرح وقایہ میں ہے کہ حنفیہ کا فتویٰ اسی پر ہے۔ لیکن امام صاحبؒ اور بعض دوسرے علماء[1] کے نزدیک شفق اس سفیدی کا نام ہے جو سُرخی کے بعد ظاہر ہوتی ہے اور اس کے غائب ہونے تک مغرب کا وقت باقی رہتا ہے۔ علامہ سید انور شاہؒ شاہ محدث کشمیری فرماتے ہیں کہ بہتر یہی ہے کہ سُرخی ختم ہو جانے پر مغرب کا وقت ختم مانا جائے اور عشاء کے وقت کی ابتدا اس وقت سے کی جائے جبکہ سفید شفق بھی غائب ہو جائے اور اگر کبھی مغرب وعشاء کو جمع کرنا پڑے یعنی بیماری یا سفر میں تو اس جمع کا وقت یہی سفید شفق ہوگا یعنی اس سے پہلے پہلے مغرب پڑھ لیں گے اور اس کے بعد عشاء[2] پڑھیں گے۔

نمازِ عشاء کا وقت شفق چھپنے سے لے کر بلا کراہت نصف شب تک باقی رہتا ہے اور اس[3] حدیث میں نصف اللیل کے بعد جو الاوسط کا لفظ ہے وہ اللیل کی صفت واقع ہوا ہے: "ترجمہ ہوگا، اوسط رات کا نصف" یعنی وہ رات جو نہ طویل ہو نہ چھوٹی پس چھوٹی رات کی نسبت سے یہ نصف اس کے اصل نصف سے زیادہ ہوگا اور لمبی رات کے لحاظ سے اس کے نصف سے کم ہوگا۔ لیکن اس سے بھی بہتر ترجمہ اس کا یہ ہے کہ الاوسط کو نصف کی صفت مانا جائے اس صورت میں ترجمہ ہوگا "ٹھیک اور پوری آدھی رات" اور تمام فقہاء نے یہی معنی مراد لیا ہے کیوں کہ پہلے معنی کی رُو سے چھوٹی راتوں میں تقریباً ۲/۳ رات تک نمازِ عشاء بلا کراہت جائز ہوگی اور لمبی راتوں میں صرف ۱/۳ رات تک جائز ہوگی۔ ترمذیؒ سے امام ابن الہمامؒ نے نقل کیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: لولا ان اشق علیٰ امتی لامرتہم ان یؤخروا العشاء الی ثلث اللیل ونصفہ قال الترمذی حدیث حسن صحیح۔ "اگر مجھے اپنی امت کے تنگی میں پڑ جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں انہیں حکم دیتا کہ نمازِ عشاء کو رات کے ۱/۳ اور ۱/۲ تک مؤخر کیا کریں" ہمارے بعض علماء کا کہنا ہے کہ اس سے حضورؐ کی مراد یہ ہے کہ موسم گرما میں ۱/۳ رات تک اور سرما میں ۱/۲ تک مستحب وقت ہے۔ اور وقت جواز اس نماز کا طلوع فجر (صبح صادق) تک

۱؎ حضرت ابو ہریرہؓ، عمرؒ بن عبدالعزیزؒ، امام اوزاعیؒ۔ مرقات ج ۲ ص ۱۲۰
۲؎ فیض الباری ج ۲ ص ۱۰۰ ۳؎ مرقات ج ۲ ص ۱۲۱۔

ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں[1]: ولا یفوت وقتها حتی یصبح قضاءً مالم یطلع الفجر "نماز عشاء کا وقت طلوع فجر سے پہلے پہلے فوت نہیں ہوتا" اور جواز[2] سے مراد مع الکراہیۃ التنزیہیہ ہے۔

اور نماز فجر کا وقت طلوعِ فجر سے شروع ہو کر طلوع آفتاب تک رہتا ہے۔ اس نماز میں حنفیہ کے نزدیک اسفار (سفیدی میں پڑھنا) مستحب ہے اور دوسرے علماء غلس (اندھیرے) میں پڑھنے کے قائل ہیں۔ دونوں کے پاس دلائل موجود ہیں۔ بعض احناف[3] نے اختلاف سے بچنے کے لیے کہا ہے کہ اندھیرے میں شروع کر کے لمبی لمبی سورتیں پڑھی جائیں تاکہ جب نماز ختم ہو تو سفیدی خوب چھا چکی ہو تاکہ سب احادیث پر عمل ہو جائے۔

اور یہ[4] جو فرمایا کہ فانها تطلع بین قرنی الشیطان یہ کلام بطور تمثیل وتشبیہ ارشاد فرمایا گیا ہے۔ قرن سے مراد اگر عزب یعنی جماعت ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ طلوعِ آفتاب کے وقت شیطان کی دو جماعتیں جمع ہوتی ہیں ایک وہ جس کی ڈیوٹی ختم ہو چکی ہوتی ہے اور دوسری وہ جس کی ڈیوٹی اب شروع ہونے والی ہوتی ہے۔ چوں کہ یہ وقت شیاطین کے اجتماع کا ہے اور سورج پرست اس وقت سورج کو سجدہ کرتے ہیں اس لیے اس وقت میں نماز پڑھنے سے منع فرما دیا گیا۔ حدیث کی شرح میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ سورج[5] پرست لوگ اس کے طلوع کے وقت اسے سجدہ کرتے ہیں تو شیطان سورج کے سامنے ڈٹ کر کھڑا ہو جاتا ہے تاکہ مشرکوں کے سجدے سے راحت پائے اور یہ سجدہ اسے ہو جائے اس لیے ایسے وقت میں عبادت سے روک دیا گیا ہے تاکہ مشرکوں سے مشابہت نہ ہونے پائے۔

حدیث ۲: وعن بریدۃ رضی اللہ عنہ قال ان رجلا سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن وقت الصلوٰۃ فقال لہ

ؒ[1] مسویٰ شرح مؤطا ج ۱ ص ۵۶ ۔ [2] فیض الباری ج ۲ ص ۱۳۲ ۔

[3] مثلاً امام طحاوی ؒ کما فی فیض الباری ج ۲ ص ۱۳۳ ۔

[4] مرقات ج ۲ ص ۱۲۱ ۔ [5] مرقات ج ۲ ص ۱۲۱ ، مظاہر حق ج ۱ ص ۲۰۰ ۔

صلِّ معنا هٰذين يعني اليومين فلما زالت الشمس امر بلالا فاذن ثم امره فاقام الظهر ثم امره فاقام العصر والشمس مرتفعة بيضاء نقية ثم امره فاقام المغرب حين غابت الشمس ثم امره فاقام العشاء حين غاب الشفق ثم امره فاقام الفجر حين طلع الفجر فلما كان اليوم الثاني امره فابرد بالظهر فابرد بها فانعم ان يبرد بها وصلى العصر والشمس مرتفعة اخرها فوق الذي كان وصلى المغرب قبل ان يغيب الشفق وصلى العشاء بعد ماذهب ثلث الليل وصلى الفجر فاسفر بها ثم قال اين السائل عن وقت الصلوٰة فقال الرجل انا يارسول الله قال وقت صلوٰتكم بين مارأيتم۔ رواه مسلم۔

ترجمہ: حضرت بریدہ رضؓ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے نماز کے وقت کے متعلق سوال کیا تو حضورؐ نے اس سے فرمایا کہ دو دن ہمارے ساتھ نماز پڑھو۔ پھر جب سورج ڈھل گیا تو آپؐ نے بلال رضؓ کو اذان دینے کا حکم دیا۔ بلال رضؓ نے اذان دی پھر حضورؐ نے اُسے اقامت کا حکم دیا تو انہوں نے ظہر کی نماز کے لیے اقامت کہی۔ پھر آپؐ نے بلال رضؓ کو (عصر کی اذان کا حکم دیا اور اس کے بعد) عصر کی اقامت کا حکم دیا تو بلال رضؓ نے عصر کی اقامت کہی اور اس وقت سورج بلند تھا اور سفید اور صاف تھا (زرد نہیں تھا) پھر آپؐ نے بلال رضؓ کو مغرب کی (اذان و) اقامت کا حکم دیا تو بلال رضؓ نے اقامت اس وقت کہی جبکہ ابھی سورج چھپا ہی تھا۔ پھر آپؐ نے اسے عشاء کی (اذان و) اقامت کا حکم دیا جبکہ شفق غائب ہو چکی تھی پھر آپؐ نے بلال رضؓ کو فجر کی اذان و اقامت کا حکم دیا تو انہوں نے فجر کی اقامت کہی جبکہ ابھی فجر چڑھی ہی تھی۔ پھر جب دوسرا دن ہوا تو آپؐ نے بلال رضؓ کو ظہر کی اذان و اقامت کا حکم دیا تو بلال رضؓ نے (بحکم نبویؐ) ظہر کو خوب ہی ٹھنڈا کیا (یعنی پہلے دن کی بہ نسبت اس میں خاصی تاخیر کر دی) اور حضورؐ

نے عصر کی نماز اس وقت پڑھی جبکہ سورج ابھی بلند تھا لیکن پہلے دن کی نسبت اس میں تاخیر کی۔ اور مغرب کی نماز شفق غائب ہونے سے پہلے پڑھی اور نماز عشاء رات کا تیسرا حصہ گذر جانے پر پڑھی اور نماز فجر پڑھی تو اسے خوب روشنی میں پڑھا۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ نماز کا وقت پوچھنے والا کہاں ہے؟ وہ شخص بولا: یا رسول اللہ! میں ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا: تمہاری نماز کا وقت ان دو (دنوں کے) وقتوں کے درمیان ہے جو تم نے دیکھے ہیں اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا۔

شرح: اس حدیث میں حضورؐ نے دو دنوں میں وقتِ مستحب کی دو طرفیں بیان فرمائیں، اوّل وقتِ مستحب اور آخرِ وقت مستحب۔ اور تعلیم کا یہ طریقہ جو آپؐ نے اختیار فرمایا، نہایت فطرتی طریقہ تھا کہ اس شخص کو دو دن اپنے ساتھ دو وقتوں میں نماز پڑھا کر عملی طور پر ایسی تلقین فرمادی جو کبھی ذہن و دماغ سے اوجھل نہ ہو سکتی تھی۔

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ گو نماز مغرب کا وقت مختصر ہے لیکن اسے شفق کے غائب ہونے سے کچھ دیر پہلے تک بلا کراہت ادا کیا جا سکتا ہے۔ نیز اس حدیث میں ظہر کو ٹھنڈا کرنے اور فجر کو روشنی میں پڑھنے کا ذکر ہے اور دوسری روایات کی بناء پر حنفیہ نے موسم گرما میں ظہر کو دیر سے پڑھنا مستحب قرار دیا ہے۔ فجر پر گفتگو اوپر کی حدیث میں ہو چکی ہے۔ اس حدیث کا مضمون دیکھ کر ثابت ہو جاتا ہے کہ ائمہ فقہ میں جو اوقات نماز میں اختلاف ہوا ہے وہ وقت مستحب کا اختلاف ہے کیوں کہ دوسری متعدد احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نمازوں کا وقتِ جواز ان دونوں دنوں کے بیان کردہ وقت کے بعد بھی باقی رہتا ہے۔ جیسا کہ مظاہر حق جلد اوّل ص۲۰۹ پر ہے

باب تعجیل الصلوٰۃ

ایک نسخے میں الصلوات بصیغۂ جمع آیا ہے۔ اوپر کی حدیث کے پیش نظر اس

---

[1] مرقات ج ۲ ص۱۲۰، مظاہر حق جلد اوّل ص۲۱۱۔

تعجیل سے مراد یہ نہیں ہے کہ وقتِ مستحب ومختار سے بھی پہلے پڑھی جائے کیونکہ وہ وقت تو خود شارع ؑ کی طرف سے بیان ہو چکا ہے۔ ہاں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قصداً اس وقتِ مستحب سے نماز کو مؤخر نہ کرنا چاہیئے۔ ہاں جہاں شارع علیہ السلام نے کسی حکمت کی بناء پر خود ہی تاخیر کا حکم دیا ہو وہاں آپؐ کے حکم سے تاخیر کی جائے گی ورنہ عام طور پر نماز کی ادائیگی میں جلدی کی جانی چاہیئے اور اس سے غفلت نہ ہونی چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وسارعوا الی مغفرۃ من ربکم اور ایک جگہ ارشاد ہے فاستبقوا الخیرات۔

الفصل الاوّل

حدیث ۱: عن سیار بن سلامۃ قال دخلت انا وابی علی ابی برزۃ رضؓ الاسلمی فقال لہ ابی کیف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصلی المکتوبۃ فقال کان یُصلی الھجیرۃ التی تدعونھا الاولی حین تدحض الشمس ولیصلی العصر ثم یرجع احدنا الی رحلہ فی اقصی المدینہ والشمس حیۃ ونسیت ما قال فی المغرب وکان یستحب ان یؤخر العشاء التی تدعونھا العتمۃ وکان یکرہ النوم قبلھا والحدیث بعدھا وکان ینفتل من صلوٰۃ الغداۃ حین یعرف الرجل جلیسہٗ ویقرأ بالستین الی المأۃ وفی روایۃ ولا یبالی بتأخیر العشاء الی ثلث اللیل ولا یحب النوم قبلھا والحدیث بعدھا متفق علیہ:

ترجمہ: سیار بن سلامہ رضؓ فرماتے ہیں کہ میں اور میرا باپ حضرت ابو برزہ رضؓ اسلمی کے پاس حاضر ہوئے تو میرے باپ نے ان سے عرض کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پنجگانہ کیسے ادا فرمایا کرتے تھے؟ انہوں نے فرمایا کہ دوپہر کی نماز (ظہر)، جسے تم پیشین کہتے ہو اسے حضورؐ اس وقت ادا فرماتے تھے جبکہ سورج

ڈھل جاتا تھا۔ اور آپؐ نماز عصر پڑھتے تھے پھر ہم سے کوئی مدینہ شریف کی آخری آبادی میں اپنے گھر واپس آتا تھا اور سورج ابھی زندہ (صاف) ہوتا سیار کہتے ہیں کہ مغرب کے بارے میں جو کچھ انہوں نے فرمایا تھا وہ میں بھول گیا ہوں۔ (اور حضرت ابو برزہؓ نے فرمایا)، کہ نمازِ عشاء جسے تم عتمہ کہتے ہو، حضورؐ اسے دیر سے پڑھنے کو پسند فرماتے تھے اور اس سے پہلے سونا اور اس کے بعد بات چیت کرنا ناپسند فرماتے تھے اور صبح کی نماز سے اس وقت فارغ ہوتے تھے جبکہ آدمی اپنے پاس والے کو پہچان لیتا تھا اور ساٹھ آیتوں سے سو آیتوں تک (نماز فجر میں) پڑھتے تھے۔ اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ حضورؐ رات کے تیسرے حصے تک نمازِ عشاء کو مؤخر کرنے میں کوئی حرج نہ جانتے تھے اور اس سے پہلے سو جانا اور بعد میں بات چیت کرنا ناپسند فرماتے تھے۔ اس حدیث پر بخاری و مسلم کا اتفاق ہے۔

شرح: الهجیر نمازِ ظہر کا دوسرا نام ہے۔ چوں کہ یہ نماز گرمی کے وقت میں پڑھی جاتی ہے اور اس وقت کو الهاجرہ کہتے ہیں لہٰذا اس کا نام ہوا۔ اس نماز کو اولیٰ (پہلی، پیشین) اس لیے کہا گیا کہ حضرت جبریلؑ کی امامت سب سے پہلے اسی میں پیش آئی تھی۔ یا یوں کہیے کہ عرف عام میں دن کے وقت یہی پہلی نماز ہے کیوں کہ صبح کی نماز تو طلوعِ آفتاب سے پہلے ختم ہو جاتی ہے۔ الشمس حیۃ کا مطلب ہے کہ سورج صاف ہوتا نہ ابھی زرد ہوتا نہ غروب ہوتا۔ نماز عصر اگر وقت مختار و مستحب میں پڑھی جائے تو واقعی اس کے بعد اتنا وقفہ ہوتا ہے جتنا اس حدیث میں بیان ہوا ہے۔ عَتَمہ کا معنی ظلمت ہے۔ بدو لوگ نمازِ عشاء کو عتمہ کہتے تھے کیونکہ یہ نماز رات کے اندھیرے میں پڑھی جاتی ہے۔ نماز عشاء سے پہلے بلا عذرِ شرعی اور بلا ضرورت سونا جائز نہیں کیونکہ اس سے نماز کے فوت ہو جانے کا قوی اندیشہ ہوتا ہے۔ ہاں کسی ضرورت (مثلاً سفر کی تکان وغیرہ یا مرض وغیرہ) کے باعث ایسا کرنا جائز[2] ہے بشرطیکہ نماز کے فوت نہ ہونے کا انتظام ہو۔ علامہ علی القاریؒ نے امام نوویؒ سے یہی نقل کیا[3] ہے۔ یہی حال نمازِ عشاء

---

[1] مرقات ج ۲ ص ۱۲۸، مظاہر حق ج ۱ ص ۲۱۲۔ [2] بخاری باب النوم قبل العشاء لمن غلب الخ فیض الباری ج ۲ ص ۱۳۱ [3] مرقات ج ۲ ص ۱۲۸، مظاہر حق ج ۱ ص ۲۱۲۔

کے بعد بات چیت کا ہے کہ اگر ضرورتِ شرعیہ سے ہو مثلاً دینی گفتگو، علم کا تکرار اور گھر والوں سے ضروری بات چیت (جیسا کہ بخاری رحؒ نے اپنی صحیح میں اس پہ باب قائم کیے اور دلائل دیئے ہیں) اور مہمان سے بات چیت وغیرہ تو بلاکراہت جائز ہے۔ ہاں اس سے مراد وہ بات چیت ہے جو عوام میں رائج ہے کہ بلاضرورت قصے کہانیاں اور فضول بات چیت کرتے رہتے ہیں۔

نماز فجر کی قرأت کی جو مقدار اس حدیث میں آئی ہے بالکل حنفی مسلک اس کے مطابق ہے جیسا کہ علامہ علیؒ القاری محدث نے مرقات ج ۲ ص ۱۲۹ میں بیان فرمایا ہے اور یہ جو فرمایا ہے کہ نمازِ فجر سے اس وقت فارغ ہوتے تھے جبکہ لوگ اپنے پاس والوں کو پہچان لیتے تھے اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ خوب روشنی ہو چکی تھی حتی کہ مسجد کے اندر لوگ ایک دوسرے کے چہرے کو اچھی طرح پہچان سکتے تھے۔

حدیث ۲: عن محمد بن عمرو ابن الحسن بن علی قال سألنا جابر بن عبد اللہ عن صلوٰۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال کان یصلی الظھر بالھاجرۃ والعصر والشمس حیۃ والمغرب اذا وجبت والعشاء اذا کثر الناس عجل واذا قلوا اخر والصبح بغلس متفق علیہ۔

ترجمہ: محمد بن عمرو بن الحسنؓ (تابعی)، فرماتے ہیں کہ ہم نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے حضورؐ کی نماز کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے فرمایا کہ حضورؐ ظہر کی نماز دوپہر ڈھلے پڑھتے تھے اور عصر کی نماز اس وقت پڑھتے تھے جبکہ سورج ابھی صاف ہوتا تھا اور مغرب اس وقت پڑھتے تھے جبکہ سورج غروب ہو جاتا۔ اور جب لوگ زیادہ آجاتے تو عشاء کی نماز جلدی پڑھتے تھے اور جب کم ہوتے تو دیر سے پڑھتے تھے اور فجر کی نماز اندھیرے میں پڑھتے تھے۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔

شرح: الہاجرہ کا لفظ یہ تقاضا نہیں کرتا کہ اس حدیث سے ظہر کا مطلقاً اول وقت میں پڑھنا سمجھا جائے۔ کیوں کہ بخاری، طحاوی، نسائی، ترمذی،

دار قطنی، بیہقیؒ، امام احمد اور حاکمؒ کی متعدد روایات میں گرمی کے موسم میں ظہر کو دیر سے پڑھنے کا حکم اور عمل منقول ہے۔ ان روایات کی تفصیل کے لیے دیکھئے زجاجۃ المصابیح جلد اول ص۱۷۰ تا ۱۷۲۔ بخاریؒ کی روایت میں یہ لفظ موجود ہیں واذا اشتد الحر ابرد بالصلوٰۃِ "جب گرمی شدید ہوتی تھی تو آپؐ نماز کو ٹھنڈا کر کے پڑھتے تھے" ایک متفق علیہ حدیث میں یہ لفظ ہیں اذا اشتد الحر فَأَبْرِدُوْا بالصلوۃ۔ جب گرمی شدید ہو تو اس نماز کو ٹھنڈا کرو۔ بخاری کی ایک روایت میں بالصلوٰۃ کی جگہ بالظہر کا لفظ ہے۔ بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ مؤذن نے تین مرتبہ (دو وقفوں کے ساتھ) آپؐ سے اذان کی اجازت مانگی۔ آپؐ ہر بار یہی فرماتے کہ اَبْرِدْ (ٹھنڈا کر) یہاں تک کہ ٹیلوں کا سایہ ان کے برابر ہو گیا تو حضورؐ نے فرمایا کہ گرمی کی شدت جہنم کی پھونک سے ہے[1]

اس حدیث میں عشاء کے متعلق فرمایا ہے کہ جب لوگ زیادہ ہو جاتے تو آپؐ جلدی پڑھا دیتے اور جب کم ہوتے تو دیر سے پڑھاتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کثرتِ جماعت کے انتظار میں ایسا کیا کرتے تھے اور کثرتِ جماعت بھی مطلوب شرع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حنفیہ کے ہاں وقتِ مختار کے اندر اندر نماز باجماعت کا وقت متعین کرتے وقت مقتدیوں کی آسانی اور کثرتِ جماعت کا لحاظ بھی کیا جانا چاہیئے۔

نماز فجر کے متعلق اس حدیث میں غلس کا لفظ آیا ہے اور دوسری حدیثوں میں جو مختلف الفاظ کے ساتھ ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، دارمیؒ، نسائیؒ، طبرانیؒ، بزارؒ، طیالسیؒ اور طحاویؒ نے روایت کی ہیں[2] فجر کی نماز کو اسفار و تنویر کے ساتھ پڑھنے کی فضیلت وارد ہوئی ہے۔ ترمذی کی روایت کے الفاظ ہیں اسفروا بالفجر فانّہ اعظم للاجر (نمازِ فجر کو روشن کر کے پڑھو کیوں کہ اس کا اجر بہت بڑا ہے) اس سے پہلے فیض الباری کے حوالہ سے طحاویؒ کا قول گزر چکا ہے کہ حنفیہ دونوں قسم کی احادیث

---

[1] زجاجۃ المصابیح ج ۱ ص ۱۷۲

[2] مظاہر حق ج ۱ ص ۲۱۲

[3] زجاجۃ المصابیح جلد اوّل ص ۱۷۵ تا ص ۱۷۶۔

کو اس طرح جمع کرتے ہیں کہ اسے شروع تو خوب اندھیرے میں کیا جائے اور لمبی سورتیں پڑھ کر خوب روشنی میں ختم کیا جائے اور حنفیہ[۱] کے ہاں اسفار کی حد یہ ہے کہ اگر کسی وجہ سے نماز لوٹانی پڑ جائے تو وقت میں اتنی گنجائش رہتی ہو کہ سنت کی رعایت کے ساتھ اسے دوبارہ ادا کیا جا سکے۔ بخاری[۲] میں عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضورؐ کو نمازِ فجر بالکل اوّل وقت میں سوائے حج کے موقع پر مزدلفہ کے دن پڑھتے کبھی نہیں دیکھا۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ نماز فجر حضورؐ کے وقت میں بالکل اندھیرے میں نہیں پڑھی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مزدلفہ کے دن فجر کی نماز جو حضورؐ نے طلوعِ فجر کے ساتھ ہی ادا فرمائی تو صحابہؓ نے اسے اس دن کی خصوصیت پر محمول کیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۳ : وعن انسؓ قال کنا اذا صلینا خلف النبی صلی اللہ علیہ وسلم بالظہائر سجدنا علی ثیابنا اتقاء الحر۔ متفق علیہ ولفظہ للبخاری

ترجمہ : حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم جب ظہر کی نماز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پڑھتے تھے تو گرمی سے بچنے کے لیے اپنے کپڑوں پر سجدہ کرتے تھے۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے اور یہ لفظ بخاری کی روایت کے ہیں۔

شرح : صاحب[۳] مشکوٰۃ المصابیح نے یہ حدیث اس باب میں اس لیے درج کی ہے کہ ان کے نزدیک اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضورؐ کے زمانے میں ظہر کی نماز اوّل وقت میں ادا ہوتی تھی اسی لیے صحابہؓ گرمی کی شدت سے بچنے کے لیے کپڑوں پر سجدہ کرتے تھے لیکن اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کیوں کہ گرمی کے دنوں میں اول وقت کے بعد بھی یہی کیفیت ہوتی ہے بلکہ بعد میں فرش زیادہ تپ جاتے ہیں اور اس کے بعد آنے والی حدیث میں صراحت کے ساتھ نماز ظہر کو ٹھنڈا کرنے کا حکم موجود ہے۔

۱؎ فیض الباری ج ۲ ص ۱۲۴۔ ۲؎ فیض الباری ج ۲ ص ۱۲۳۔

۳؎ مظاہر حق ج ۱ ص ۲۱۲۔

علامہ[1] علی القاریؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں جو کچھ مذکور ہے یہ ابراد (ٹھنڈا کر کے پڑھنے) والی حدیث کے خلاف نہیں ہے۔ علامہ کا مطلب یہ ہے کہ ظہر کو ابراد سے پڑھا جائے تب بھی یہی کیفیت پیش آسکتی ہے جو اس حدیث میں مذکور ہے (بالخصوص عرب کی گرمی میں)، علامہ[2] علی القاریؒ فرماتے ہیں کہ پگڑی کے پیچ پر یا کسی اور پہنے ہوئے کپڑے پر سجدہ جائز نہیں، وہ اس حدیث کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ صحابہؓ گرمی سے بچنے کے لیے کپڑے (چادر وغیرہ جو پہنی ہوئی نہ ہوتی)، بچھا لیتے تھے[3] اور ان پہ سجدہ کرتے تھے۔

اس حدیث میں[4] ظہائر کا لفظ ظہیرہ کی جمع ہے جس سے مراد نماز ظہر ہے۔ جمع کا لفظ اس لیے لائے ہیں کہ اس سے مراد ہر روز کی نمازِ ظہر ہے۔

حدیث ۴ : وعن ابی ہریرۃؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا اشتد الحر فابردوا بالصلوٰۃ وفی روایۃ للبخاریؒ عن ابی سعیدؓ بالظہر فان شدۃ الحر من فیح جہنم واشتکت النار الی ربہا فقالت رب اکل بعضی بعضا فاذن لہا بنفسین نفس فی الشتاء ونفس فی الصیف اشد ماتجدون من الحر واشد ماتجدون من الزمہریر۔ متفق علیہ وفی روایۃٍ للبخاری فاشد ماتجدون من الحر فمن سمومہا واشد ماتجدون من البرد فمن زمہریرہا۔

ترجمہ : ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب گرمی سخت ہو تو نماز کو ٹھنڈا کرو اور بخاری کی ایک روایت میں جو حضرت ابوسعیدؓ سے ہے صلوٰۃ کی جگہ ظہر کا لفظ ہے۔ کیوں کہ گرمی کی

---

1. مرقات جلد ۲ صہ ۱۲۹۔ 2. مرقات ج ۲ صہ ۱۲۹۔
3. مظاہر حق ج ۱ صہ ۲۱۳، مرقات ج ۲ صہ ۱۲۹
4. مرقات ج ۲ صہ ۱۲۹۔

، شدت دوزخ[1] کی گرمی کے انتشار کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اور آگ (جہنم) نے اپنے پروردگار سے شکایت کی اور کہا اے میرے مالک! میرے بعض اجزاء نے دوسروں کو کھا لیا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اسے دو سانس (دم، پھونک) نکالنے کی اجازت دیدی ایک سانس موسمِ سرما میں اور ایک سانس موسمِ گرما میں اور یہی وجہ ہے کہ تم گرمیوں میں شدید ترین گرمی اور سردیوں میں شدید ترین سردی محسوس کرتے ہو۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے اور بخاری کی ایک روایت میں آخری فقرہ یوں آیا ہے کہ شدید ترین گرمی جو تم محسوس کرتے ہو وہ جہنم کی زہریلی ہوا کی وجہ سے ہے اور شدید ترین سردی جو تم پاتے ہو وہ دوزخ کی شدید ٹھنڈک (زمہریر) کے باعث ہے۔

شرح: اس حدیث میں نماز ظہر کو موسم گرما میں تاخیر سے پڑھنے کا حکم اور اس کی حکمت بیان فرمائی ہے۔ اور یہ جو فرمایا کہ دوزخ نے اللہ سے شکایت کی الخ سو یہ محاوراتی[2] اور مجازی کلام ہے جس سے کنایہ کے طور پر مبالغہ مراد ہے اور آگ کے اجزاء کے ایک دوسرے کو کھا لینے سے مراد اس کی شدید شعلہ زنی، اُبلنا اور اس کے اجزاء کا باہم اجتماع اور ایک دوسرے سے لپٹنا ہے فیح کا معنی پھونک مارنا دم لینا اور پھیلنا ہے اور اس سے معلوم ہوا کہ سورج کی شعاعوں کے سیدھا زمین پر پڑنے کا کوئی نہ کوئی باطنی تعلق جہنم کے ساتھ ضرور ہے اور یہ چیز مادی دنیا سے پرے ہے جیسے کہ خود جنت و دوزخ کا بھی یہی حال ہے اور یہ اصول مسلم ہے کہ مابعد الطبیعات میں ایمان کا مدار جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ کا ارشاد ہے اور اسی کا نام دوسرے الفاظ میں "ایمان بالغیب" ہے۔

اس ارشاد سے یہ بھی پتہ چلا کہ شدید گرمی اور شدید سردی دونوں کا تعلق جہنم کے دو مختلف طبقات[3] سے ہے نیز جہنم کا عذاب صرف آگ سے ہی نہیں ہوگا بلکہ سخت ترین سردی سے بھی ہوگا۔ واللہ اعلم۔

۱؎ مصفیٰ شرح مؤطا ج ۱ ص ۴۲ ۲؎ مرقات ج ۲ ص ۱۳۰، مظاہر حق ج ۱ ص ۲۱۳

۳؎ مرقات ج ۲ ص ۱۳۰، مظاہر حق ج ۱ ص ۲۱۳

اس حدیث پر محدثین اور شُراح نے علم ہیئت اور فلسفۂ قدیمہ کی رُو سے لمبی چوڑی بحثیں کی ہیں۔ تفصیل کے لیے مرقات اور مظاہر حق وغیرہ دیکھی جا سکتی ہیں۔ لیکن جدید فلسفہ اور سائنس نے معاملہ بہت آسان کر دیا ہے اور اسلام کی صداقتیں یکے بعد دیگرے علم و فن کی روشنی میں ثابت ہوتی جا رہی ہیں۔

بعض شارحین[1] حدیث نے حضورؐ کے ارشاد کو کہ "گرمی کی شدت جہنم کی پھونک یا بھاپ اور اس کی گرمی کے پھیلنے کی وجہ سے ہے" مجازی اور محاوراتی کلام قرار دیا ہے جس سے مراد بطور مبالغہ گرمی کی شدت کا بیان کرنا ہے۔

حدیث[2] ابراد بالظہر صحاح ستہ اور طبرانی میں باختلاف الفاظ آئی ہے

سید المحدثین علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ نے فرمایا ہے[3] کہ اسباب کی دو قسمیں ہیں۔ ظاہری اور باطنی۔ ظاہری اسباب کو تو حواس سے معلوم کیا جا سکتا ہے لہٰذا شریعت اس کا ذکر نہیں کرتی اور باطنی اسباب جو نگاہوں سے مخفی ہوتے ہیں شریعت انہیں کی طرف توجہ کرتی ہے۔ اس حدیث نے بتایا کہ بھلائیوں اور راحتوں کا منبع جنت ہے اور ہلاکتوں اور مصیبتوں کا معدن دوزخ ہے۔ اصل خزانہ جنت و جہنم ہے اور یہ دنیا دونوں (جنت و دوزخ) کی چیزوں سے مل کر بنی ہے۔ پس اگرچہ نظر ظاہر میں گرمی اور روشنی کا منبع سورج ہے لیکن باطنی نگاہ دیکھ سکتی ہے کہ گرمی اور حرارت کا تعلق اس کے اصل منبع یعنی جہنم سے ہے پس وہ جہاں کہیں بھی پائی جائے گی اس کی نسبت اصل معدن کی طرف ہی ہو گی۔ اگر کوئی شخص کہے کہ ایک ہی وقت میں بعض علاقوں میں موسم گرم اور دوسروں میں سرد ہوتا ہے تو جہنم کی بھاپ یا پھونک کو اس پر کیسے منطبق کریں گے؟ میں کہتا ہوں کہ جہنم ایک طرف سے سانس کھینچ کر، دوسری طرف کو چھوڑ دے تو پہلی طرف سردی اور دوسری طرف گرمی ہو گی (یا بالعکس)۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۵ : وعن انسؓ قال کان رسول اللہ علیہ وسلم ،

---

[1] مرقات ج ۲ ص ۱۳۰۔ [2] نصب الرایہ ج ۱ ص ۲۴۸۔

[3] فیض الباری ج ۲ ص ۱۰۶۔

يصلى العصر والشمس مرتفعة حية فيذهب الذاهب الى العوالى فياتيهم والشمس مرتفعة وبعض العوالى من المدينة على اربعة اميال او نحوه۔ متفق عليه۔

ترجمہ: حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ عصر اس وقت پڑھتے تھے جبکہ سورج بلند اور صاف ہوتا تھا اور جانے والا مدینہ کی بیرونی آبادیوں میں جاتا تو سورج ابھی کھڑا ہوتا۔ اور (راوی حدیث امام زہریؒ فرماتے ہیں کہ) مدینہ کی بعض بیرونی آبادیاں چار میل پر واقع ہیں یا اس کے قریب قریب اس حدیث پر بخاری و مسلم کا اتفاق ہے۔

شرح: اس حدیث کے الفاظ والشمس مرتفعة حية کا مطلب پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اس سے مراد سورج کے زرد ہونے سے پہلے پہلے کا وقت ہے۔ موطا کی روایت[1] میں ہے کہ حضرت عمرؓ الفاروق نے ابو موسیٰؓ اشعری کو لکھا کہ "نمازِ عصر اس وقت پڑھو جبکہ سورج روشن اور صاف ہو اور (مکروہ وقت آنے تک) سوار تین میل تک جا سکے"۔ السید المحدث علامہ انور شاہؒ کشمیری فرماتے ہیں[2] کہ یہی وہ وقت ہے جس کے حنفیہ قائل ہیں۔ فیض الباری ج ۲ ص ۱۱۳ کے حاشیہ میں مولانا العلّام سید بدر عالمؒ میرٹھی فرماتے ہیں کہ نمازِ عصر کے بارے میں اتنی تاکید و تہدید اس لیے وارد ہوئی ہے کہ اگر وقت کا خیال نہ رکھا جائے تو مکروہ وقت آ جاتا ہے جسے حدیث میں منافقوں کی نماز کا وقت فرمایا گیا ہے۔ ورنہ مکروہ سے پہلے پہلے اس کا پڑھا جانا خود احادیث سے ثابت ہے اور تشدید و تہدید صرف وقت مکروہ کے بارے میں ہی آئی ہے قرآنِ پاک نے نمازِ عصر پر قبل الغروب کا لفظ بول کر بتا دیا ہے کہ اس کا مسنون و مختار وقت سورج کے زرد پڑ جانے سے پہلے پہلے ہے، چنانچہ ارشاد ہے فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوبِ۔ اس آیت میں نمازِ فجر کا وقت طلوعِ شمس سے قبل اور نمازِ عصر کا وقت غروبِ آفتاب سے قبل فرمایا گیا ہے

---

[1] مصفّٰی ج ۱ ص ۵ [2] فیض الباری ج ۲ ص ۱۱۳

اور عرف میں قبل سے مراد "کچھ پہلے" ہی ہوتا ہے پس مکروہ اوقات کو چھوڑ کر اس آیت سے بھی نماز فجر کا اسفار اور نماز عصر کی تاخیر ثابت ہوئی۔

راوئ حدیث امام زہریؒ کا یہ قول کہ وبعض العوالی من المدینۃ علی اربعۃ امیال۔ اس چیز کو ثابت نہیں کرتا کہ نمازِ عصر بہت ہی جلدی پڑھی جاتی تھی۔ کیوں کہ حسب حدیث مؤطا (جو اوپر گذر رہی) اس سے مراد یہ ہے کہ اِن بیرونی آبادیوں میں ایک سوار نماز عصر مدینہ میں پڑھ کر وقت مکروہ سے پہلے پہلے پہنچ سکے۔ اور یہ بات بالکل ظاہر و باہر ہے کہ شتر سوار یا گھوڑے کا سوار درمیانی رفتار سے بھی جائے تو صرف چند ہی منٹ میں اتنا فاصلہ طے کر لیتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۶ : وعنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تلك صلوٰۃ المنافق یجلس یرقب الشمس حتیٰ اذا اصفرت وکانت بین قرنی الشیطان قام فنقر اربعًا لا یذکر اللہ فیھا الا قلیلا۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ : حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: یہ منافق کی نماز ہے کہ وہ بیٹھا سورج کے نیچے ہونے کا انتظار کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ جب وہ زرد پڑ جاتا ہے اور شیطان کے دو سینگوں کے درمیان ہوتا ہے تو وہ اٹھتا ہے اور چار ٹھونگے مار لیتا ہے ان میں وہ اللہ کو بس برائے نام ہی یاد کرتا ہے۔ اس حدیث کو مسلم نے بیان کیا۔

شرح : اس حدیث سے معلوم ہوا[1] کہ جان بوجھ کر تاخیر کرنا اور عصر کو مکروہ وقت میں داخل کر دینا منافق کا فعل ہے۔ مرقات[2] میں ہے کہ جس شخص نے نماز عصر کو (عمداً) زردی تک مؤخر کر دیا تو اس نے اپنے آپ کو منافق سے مشابہ کر لیا جو نماز کی صحت کا عقیدہ ہی نہیں رکھتا۔ اور جلدی جلدی نماز پڑھنے کو ٹھونگے مارنا فرمایا ہے جس طرح مرغا جلدی جلدی ٹھونگے مار کر دانہ چگتا ہے۔

---

۱ مرقات ج ۲ صـ ۱۳۱ ۔ ۲ ایضاً

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ عصر کا آخری وقت جس سے تاخیر کرنا حرام ہے اور منافقوں کی علامت ہے وہ یہی ہے کہ آفتاب زرد ہو جائے۔[1] لیکن ضرورت اور مجبوری کی حالت اس سے مستثنیٰ ہے کیوں کہ حدیث[2] میں ہے کہ من ادرك ركعة من العصر قبل ان تغرب الشمس فقد ادرك العصر۔

اور[3] چار ٹھونگے اس لئے فرمائے کہ نماز عصر کی رکعات چار ہیں اور نماز عصر کی تخصیص ایک تو اس کی تاکید کی وجہ سے ہے اور دوسری اس لیے کہ اس کا آخری وقت مکروہ وقت ہے اور لا یذکر اللہ فیہا الا قلیلا سے مراد یہ ہے کہ دل میں نماز کی عظمت اور معبود کی ہیبت جاگزیں ہوتی نہیں بس صرف زبان سے جلدی جلدی قرأت وغیرہ کر لیتا ہے۔

حدیث ۷: وعن ابن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الذی یفوتہ صلوٰۃ العصر فکانما وتر اھلہ ومالہ۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کی نمازِ عصر فوت ہو جائے سو گویا کہ اس کے گھر والے اور مال ودولت چھن گئے۔ متفق علیہ۔

شرح: جس طرح وہ شخص جس کے اہل وعیال اور مال ودولت تباہ وبرباد ہو جائیں اور لٹ جائیں تو وہ اکیلا اور بے یار ومددگار رہ جاتا ہے یہی اس شخص کا حال ہے جس نے نماز عصر ترک کر دی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز عصر درمیانی نماز (الصلوٰۃ الوسطیٰ) ہے اور اس کی وجہ تاکید خود قرآنِ پاک میں بیان ہوئی ہے:
حافظوا علی الصلوات والصلوٰۃ الوسطیٰ (البقرہ) "سب نمازوں کی اور علی الخصوص درمیانی نماز کی نگرانی اور محافظت کرو"۔

---

[1] مصفّٰی ج ۱ ص ۷۵ [2] مؤطا امام مالک ص ۶
[3] مرقات ج ۲ ص ۱۳۱

فوت [۱] سے مراد یہی ہے کہ وقت مختارہ و مستحب سے فوت ہو جائے اور اہل و مال کے چھن جانے سے یہاں مراد اس کے اعمال کا ضائع ہو جانا ہے۔ اور تحقیق یہ ہے کہ یہ مسئلہ فرع ہے مسئلہ احباط (اعمال کا ضائع ہو جانا) کی اور بہت سی صحیح حدیثیں اور کثیر روایات اس پہ دلالت کرتی ہیں لہٰذا تاویل کی ضرورت نہیں ہے۔

علامہ [۲] سید انور شاہ محدث فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں نمازِ عصر کے فوت ہو جانے " سے جماعت کا فوت ہو جانا یا وقت مستحب کا فوت ہو جانا یا سرے سے اس کا وقت جاتے رہنا اور سورج غروب ہو جانا مراد لیا گیا ہے کیوں کہ احادیث میں ان تینوں اوصاف پہ وعیدیں آئی ہیں۔ پس کسی نے ایک وصف اور کسی نے دوسرا اور کسی نے تیسرا مراد لے لیا ہے اور یہ سب معنے صحیح ہیں۔ اور میرے نزدیک جماعت کے فوت ہو جانے کے علاوہ نمازِ عصر کا فوت ہو جانا سورج کی زردی سے شروع ہوتا اور غروبِ آفتاب پر مکمل ہو جاتا ہے۔ جب سورج غروب ہو گیا تو نمازِ عصر اپنے تمام مراتب سمیت فوت ہو گئی اور یہ فواتِ کامل ہے اور پہلے مرتبے اس سے ناقص ہیں۔

حدیث ۸: وعن بریدۃؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من ترک صلوٰۃ العصر فقد حبط عملہ رواہ البخاری۔

ترجمہ: حضرت بریدہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے نمازِ عصر چھوڑ دی تو بے شک اس کا عمل باطل (ناقص) ہو گیا اسے بخاری نے روایت کیا۔

شرح: چونکہ اس [۳] شخص نے نمازِ عصر جیسا افضل عمل ترک کیا اس لیے اس دن کے اعمال میں اسے بہت ہی زیادہ نقصان ہو گیا۔ اسی چیز کو حضور نے حبط (باطل ہونا) فرمایا ہے۔ اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ اس شخص کے سب اعمال

۱۔ مصفیٰ ج ۱ ص ۷۶۔ ۲۔ فیض الباری ج ۲ ص ۱۱۵۔
۳۔ مرقات ج ۲ ص ۱۳۲، مظاہر حق ج ۱ ص ۲۱۵۔

ضائع ہو گئے کیوں کہ سب اعمال تو صرف مرتد کے ضائع ہوتے ہیں۔ ارشادِ الٰہی ہے۔ ومن یرتدد منکم عن دینہ فیمت وھو کافر فاولٰئک حبطت اعمالھم۔ الآیہ۔

حضرت سید المحدثین انور شاہؒ الکشمیری نے فیض الباری ج ۲ کتاب الصلوٰۃ میں فرمایا ہے کہ فوت کا لفظ جو اوپر کی حدیث میں وارد ہوا ہے اس سے مراد بلا ارادہ فوت ہونا ہے اور ترک کا لفظ جو اس حدیث میں وارد ہوا ہے اس سے مراد عمداً چھوڑنا ہے۔ اسی لیے پہلی حدیث میں صرف اہل و عیال اور مال کے لٹنے کا ذکر فرمایا اور اس حدیث میں عمل کے حبط (ناقص) ہونے کا ذکر فرمایا اور ظاہر ہے کہ آخرت کے احکام کے لحاظ سے جو اہمیت عمل کی ہے وہ اہل اور مال کی نہیں۔

اور نماز عصر کی تخصیص اس لیے ہے کہ یہ وقت شعار و باری لحاظ سے بڑا نازک ہوتا ہے اور اسی لیے اس نماز کی تاکید زیادہ آئی ہے۔

حدیث ۹: وعن رافعؓ بن خدیج قال کنا نصلی المغرب مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فینصرف احدنا وانہ لیبصر مواقع نبلہ۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت رافعؓ بن خدیج (الانصاری) فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز مغرب ادا کرتے تھے اور ہم میں سے کوئی واپس ہوتا تو اپنے تیر کے جاگرنے کے مقام کو دیکھ لیتا تھا۔ متفق علیہ۔

شرح: نماز مغرب کا وقت نسبتاً کم ہے لہٰذا دلائلِ شرع کی بنا پر فقہاءِ اسلام[2] میں اس امر میں کوئی اختلاف نہیں کہ اسے اوّل وقت میں ادا کیا جائے گو بعض دفعہ حضورؐ نے اس میں لمبی سورتیں بھی (بیان جواز کے لیے) پڑھی ہیں لیکن اسے جلد ہی پڑھ لینا مستحب ہے اور یہی سنتِ متوارثہ[3] ہے۔ ابو داؤد[4] کی ایک مرسل روایت میں جس کی سند قوی ہے ابر کے دن میں حضورؐ نے نماز مغرب کو دیر سے پڑھنے کا حکم دیا ہے۔

---

[1] مرقات ج ۲ ص ۱۳۲ [2] ایضاً
[3] فیض الباری ج ۲ ص ۱۲۸ [4] زجاجۃ المصابیح ج ۱ ص ۱۷۴

حدیث ۱۰: وعن عائشۃ رضی اللہ عنہا قالت یصلون العتمۃ فیما بین ان یغیب الشفق الی ثلث اللیل الاول۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ (حضور اور آپ کے صحابہ) عشاء کی نماز شفق کے غائب ہونے سے لے کر رات کے پہلے ثلث (تیسرے حصے) کے درمیان تک پڑھا کرتے تھے۔ متفق علیہ۔

شرح: علامہ میرک[1] فرماتے ہیں کہ صاحب مشکوٰۃ نے اس حدیث کو متفق علیہ قرار دیا ہے حالاں کہ یہ بخاری کے افراد میں سے ہے یعنی صرف بخاری میں ہے مسلم نے اسے روایت نہیں کیا اور امام نسائی نے بھی اسے روایت کیا ہے۔

اس[3] حدیث میں عشاء کا وقت مختار (مستحب) بیان ہوا ہے۔ دوسری احادیث سے ثابت ہے کہ نصف رات تک بلا کراہت عشاء کا پڑھنا جائز ہے اور اس کے بعد طلوع فجر تک بکراہت جائز ہے۔ دلائل پہلے گزر چکے ہیں۔

نمازِ عشاء کو عتمہ کہنے سے حدیث میں منع فرمایا گیا ہے لیکن اس حدیث میں، حضرت ام المومنین رض سے اس لفظ کا اطلاق ثابت ہوتا ہے۔ سو یا تو کہا جائے گا کہ روایت بالمعنی کی وجہ سے بعد کے کسی راوی نے یہ لفظ بول دیا ہے۔ یا حضرت عائشہ رض کا یہ قول نہی سے پہلے کا ہوگا اور یا انہیں اس وقت تک نہی کا علم نہ ہوا ہوگا۔ علامہ علی القاری رح نے تیسری تاویل کو اظہر (واضح تر) فرمایا[4] ہے۔ امام بخاری رح نے اپنی صحیح میں باب العشاء والعتمہ ومن راہ واسعًا کا باب رکھ کر عتمہ کہنے کے جواز کی تصریح کی ہے۔ ان کے نزدیک نہی غالباً کسی خاص وجہ کی بناء پر ہوئی ہوگی اور پھر نہی کا حکم منسوخ ہو گیا ہوگا۔ واللہ اعلم۔

حضرت شاہ[5] صاحب (محدث کشمیری رح) فرماتے ہیں کہ بخاری نے مَن کا لفظ بول کر ذمہ داری اپنی گردن پر نہیں لی، ہاں یہ کہا ہے کہ اگر کوئی ایسا کہے تو اس کے

---

۱ مرقات ج ۲ ص ۱۳۲ - ۲ ایضاً ۳ مظاہر حق ج ۱ ص ۲۱۵ -

۴ مرقات ج ۲ ص ۱۳۲ - مظاہر حق ج ۱ ص ۲۱۵

۵ فیض الباری ج ۲ ص ۱۲۹ -

لیے گنجائش ہے۔

حدیث ۱۱: وعنھا قالت کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیصلی الصبح فتنصرف النساء متلفعات بمروطھن ما یعرفن من الغلس۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز پڑھتے تھے پھر عورتیں (جو جماعت میں شامل ہوتی تھیں) اپنی چادروں میں لپٹی لپٹائی واپس ہوتی تھیں اور اندھیرے کی وجہ سے پہچانی نہ جاتی تھیں۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔

شرح: مولانا محمد یحییٰ محدث کاندھلوی فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کبھی بہت اندھیرے میں اور کبھی روشنی (اسفار) میں نماز فجر پڑھنے کا ثبوت ملتا ہے۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ آپؐ نے اپنے ان دو فعلوں میں سے ایک کے مستحب ہونے کو اپنے ارشاد اسفروا بالفجر فانہ اعظم للاجر میں خود بیان فرمایا دیا ہے اور اس سے ہماری تسکین ہوگئی کہ آپؐ کے نزدیک پسندیدہ اور محبوب فعل اسفار ہی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ حضورؐ نے جو نماز فجر اندھیرے میں پڑھائی وہ کسی عارض کی بنا پر تھی۔ مثلاً اسی زیر بحث روایت میں وہ عارض یہ ہے کہ وہ زمانہ فتنے کا نہیں تھا اور عورتیں نماز میں حاضر ہوتی تھیں لہٰذا آپؐ جلدی پڑھا دیتے تھے۔ اور بعض[۱] دفعہ کسی سفر وغیرہ پر روانگی کا قصد ہوتا تھا تو اندھیرے میں نماز پڑھا دی جاتی تھی۔

نیز اس حدیث میں جو غلس کا لفظ ہے اس سے مراد مسجد کے اندر کا اندھیرا ہے کیوں کہ اس زمانے میں زیادہ روشنی کا اہتمام تو نہیں ہوتا تھا۔ ورنہ حضورؐ سے جو ہر رکعت میں پچاس یا ساٹھ آیتوں کی قرأت صحیح احادیث میں آئی ہے یہ ممکن نہیں کہ اس طرح پڑھی جانے والی نماز کے بعد بھی اندھیرا باقی رہ جائے۔ اور یہ جو ہم نے کہا ہے کہ اس غلس سے مراد مسجد کا اندرونی اندھیرا ہے تو اس کا قرینہ خود اس حدیث میں موجود ہے۔ اور وہ یہ کہ عورتیں اپنی چادروں میں خوب لپٹی لپٹائی ہوتی تھیں،

---

۱ کوکب دری شرح ترمذی ص ۹۱ ج ۱ - ص ۲ الیضاً حاشیہ

ظاہر ہے کہ اس طرح باپردہ باہر نکلنے والی عورت اگر دن کو بھی نکلے تو ان شاء اللہ
پہچانی نہیں جا سکتی۔ لہٰذا اس کے سوا چارہ ہی نہیں کہ اس سے مراد مسجد کا اندر کا[1]
اندھیرا ہی لیا جائے۔

علامہ سید انور شاہ محدث کشمیری فرماتے ہیں کہ صحابہؓ کا معمول حضورؐ کے
زمانہ میں یہی تھا کہ وہ وقت پر، بلکہ اس سے بھی پہلے، نمازوں کے لیے حاضر
ہوتے تھے۔ آج بھی اگر سب نمازی یا اکثر بالکل صبح سویرے آ جمع ہوں تو نماز فجر
کو جلدی پڑھنا ہی مستحب ہوگا۔ اور جماعت کی قلت و کثرت کا لحاظ خود حضورؐ نے
فرمایا ہے جیسا کہ قبل ازیں ایک حدیث میں گزر چکا۔ مبسوط میں امام سرخسیؒ باب التیمم
میں فرماتے ہیں کہ اگر لوگ جمع ہو جائیں تو فجر کی نماز تغلیس اور ظہر میں تعجیل مستحب
ہے پھر یہ بھی دیکھنا ہے کہ غلس میں نماز فجر کا صرف عملی ثبوت ہے لیکن اسفار کے
بارے میں قولی حکم موجود ہے جس کی موجودگی میں ہماری تو جرأت نہیں کہ اس کی
خلاف ورزی کر سکیں۔

حدیث[2] اسفروا بالفجر فانہ اعظم للاجر سات صحابہؓ سے[3] مروی
ہے اور اسے ابوداؤد، ترمذی، طیالسی، دارمی[4]، نسائی، ابن ماجہ، ابن حبان، طبرانی
مسند احمد، مسند بزار، طحاوی جیسے محدثین عظام نے روایت کیا ہے۔ حافظ زیلعیؒ
نے نصب الرایہ ج ا صفحہ ۲۳۷، ۲۴۰ میں متعدد احادیث و آثار اسی معنی میں یا اس
کی تائید میں نقل کیے ہیں اور ان پر محققانہ کلام ہے۔

**حدیث ۱۲: وعن قتادۃ عن انسؓ ان نبی اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم وزید بن ثابت تسحرا فلما فرغا من
سحورھما قام نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی
الصلوٰۃ فصلی قلنا لانس کم کان بین فراغھما**

---

[1] فیض الباری ج ۲ ص ۱۳۶ ۔ [2] نصب الرایہ ج ا ص ۲۳۵ ۔

[3] رافع بن خدیجؓ، بلالؓ، انسؓ، قتادہ بن نعمانؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، ابوہریرہؓ اور حواء الانصاریہ
نصب الرایہ حوالہ مذکورہ اور حاشیے میں طحاوی اور نسائی کے حوالے سے مزید صحابہؓ کا ذکر بھی ہے۔

[4] زجاجۃ المصابیح ج ا ص ۱۷۵ ۔

من سحورهما ودخولهما فی الصلوٰۃ قال قدر مایقرء الرجل خمسین آیۃ ۔ رواہ البخاری ۔

ترجمہ: قتادہ (بصری تابعی) نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور زید بن ثابتؓ ہر دو نے سحری کھائی ۔ پھر جب وہ سحری سے فارغ ہو گئے تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور نماز پڑھی ۔ قتادہؒ کہتے ہیں کہ ہم نے حضرت انسؓ سے پوچھا کہ ان حضرات کے سحری سے فارغ ہونے اور نماز میں داخل ہونے کے درمیان کتنا وقفہ تھا ؟ انہوں نے فرمایا : اتنا وقفہ جتنی دیر میں کوئی شخص پچاس آیتیں پڑھ لے ۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ۔

شرح: اس حدیث میں سحری سے فارغ ہونے اور نماز شروع کرنے کے درمیانی وقفہ کو محض تقریباً اور اندازے سے پچاس آیات کی قراءت کے برابر فرمایا گیا ہے۔ حالانکہ پچاس آیات کی قراءت اگر تجوید و ترتیل سے کی جائے (جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا) تو کافی وقت درکار ہے بمعلوم نہیں صاحب مشکوٰۃ نے اس حدیث کو تعجیل الصلوٰۃ کے باب میں کیوں درج کیا ہے اور وہ اس سے نماز کی تعجیل کیسے ثابت فرمانا چاہتے ہیں ۔

علامہ علی القاریؒ نے مرقات میں علامہ تورپشتیؒ کا قول اس حدیث کی شرح میں نقل کیا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم خطاء سے معصوم تھے لہٰذا وہ تو اس اندازے کو جان سکتے اور صحیح طور پر نبھا سکتے تھے اور کسی کے بس میں یہ نہیں ۔ حضورؐ کا اندازہ تو اللہ تعالیٰ کی اطلاع کے مطابق ہوتا تھا اور دوسرا کوئی ایسا نہیں کر سکتا ۔ ہاں اگر کوئی شخص صبح صادق کو بخوبی جانتا ہو ، علم ہیئت سے واقف ہو تو اسے بھی اتنی تاخیر جائز ہے (یعنی سحری کھانے میں اتنی تاخیر کرنا کہ بس سحری کھاتے ہی کچھ دیر میں صبح ہو جائے) لیکن اگر غور کیا جائے تو علامہ تورپشتیؒ کا یہ قول مبہم ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال و افعال امت کی اقتداء کے لیے ہوتے تھے جب تک خصوصیت

ؔ مرقات ج ۲ ص ۱۳۳ ، مظاہر حق ج ۱ ص ۲۱۵ ۔

کی دلیل نہ مل جائے آپؐ کا ہر فعل واجب الاتباع ہے اور یہی کتاب و سنت کے عمومی دلائل سے ثابت ہے اصل بات یہ ہے کہ حضرت انسؓ کا یہ ارشاد محض تقریب اور اندازے کے لیے ہے اور ظاہر ہے کہ اس سے تعجیل یا تاخیر کسی کے حق میں یا خلاف استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۱۳: وعن ابی ذرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ کیف انت اذا کانت علیک امراء یمیتون الصلوٰۃ او یوخرونہا عن وقتہا قلت فما تامرنی قال صل الصلوٰۃ لوقتہا فان ادرکتہا معہم فصل فانہا لک نافلۃ ۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ: حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تیرا کیا حال ہوگا جب تجھ پر ایسے حاکم مسلط ہونگے جو نماز کو مٹا دیں گے یا اسے اس کے وقت سے ٹال دیں گے؟ میں نے عرض کیا پھر اس حالت میں آپؐ مجھے کیا حکم دیتے ہیں؟ ارشاد فرمایا کہ تم وقت پر نماز پڑھ لیا کرنا پھر اگر ان کے ساتھ تو جماعت کو پالے تو دوبارہ پڑھ لینا کیوں کہ یہ دوسری نماز تمہارے لیے نفل ہو جائے گی۔ اسے مسلم نے روایت کیا۔

شرح: یمیتونہا کا مطلب بھی وہی ہے جو یؤخرونہا عن وقتہا کا ہے۔ اور اَوْ کے لفظ سے جس شک کا اظہار ہے یہ کسی بعد کے راوی کا شک ہے۔ علامہ ابنؒ حجر کا ارشاد کہ اس حدیث میں اَوْ کے لفظ سے ابوذرؓ کا شک ظاہر ہوتا ہے محلِ بحث ہے۔[۱] دراصل یہ شک کسی بعد کے راوی کا ہے کہ حدیث کا لفظ یمیتونہا تھا یا یؤخرونہا عن وقتہا تھا۔ مآل دونوں کا ایک ہے۔

حضورؐ[۲] کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ تم اس وقت کیا کرو گے جب سہل انگار حاکم مسلط ہو جائیں گے۔ اگر ان کے ساتھ نماز پڑھو گے تو وقتِ مستحب کی فضیلت سے محروم ہو گے اور اگر اکیلے پڑھو گے تو جماعت کی فضیلت بھی گئی اور ان حاکوں

۱؎ مرقات ج ۲ ص ۱۳۴ ۔ ۲؎ ایضاً ، ظاہر حق ج ۱ ص ۲۱۵ ، ص ۲۱۶ ۔

کی طرف سے ایذا رسانی اور مردم آزاری کا خدشہ الگ ہوگا۔ اور ابوذر رضؓ کے دریافت کرنے پر حضورؐ نے فرمایا کہ اوّل تو صحیح وقت پر اپنی نماز پڑھ لو، پھر اگر جماعت کھڑی ہو جائے تو دوبارہ پڑھ لو۔ یہ دوبارہ پڑھی ہوئی نفل ہوگی۔ اس صورت میں وقتِ مستحب اور جماعت دونوں کی فضیلت حاصل ہو جائے گی۔ لیکن یہ حکم ظہر اور عشاء کا ہے کیوں کہ فجر اور عصر کے بعد بحکم احادیث نفل پڑھنا مکروہ ہے اور مغرب کے تین فرض ہیں اور سب جانتے ہیں کہ نفل تین رکعت ثابت نہیں ہوئے۔ لہٰذا دو ہی نمازیں متعین ہو گئیں۔

لیکن اس حدیث میں یہ حکم مطلقاً ہے اس ساتھ کسی نماز کی قید نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس[1] میں بوجہ ضرورت خاصہ کے حکم کو مطلقاً رکھا گیا ہے کیوں کہ اگر حکامِ جور کے ساتھ نماز نہ پڑھی جائے تو فتنہ کا احتمال ہے اور فتنے کو شریعت بالکل پسند نہیں کرتی۔ ظہر و عشاء کے علاوہ باقی نمازوں میں اس حدیث پر عمل کرنا زیادہ سے زیادہ مکروہ ہوتا (بوجہ احکام احادیث متعلقہ) لیکن فتنہ اس سے بھی بدتر ہے بلکہ فتنہ کو تو قتل سے بھی بڑا اور زیادہ شدید فرمایا گیا ہے "وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ (القرآن الحکیم)۔

لیکن اس حدیث کا مطلب یہ نہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ کیا جائے۔ شریعت میں ہر حکم کی کچھ حدود و شرائط ہیں۔ امر بالمعروف اپنی جگہ پر ہے لیکن جماعت سے علٰحدگی کا فتنہ اپنی جگہ پر ہے لہٰذا دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے اور دونوں کے اپنے اپنے محل اور محمل ہیں۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ حکم خاص کر ان لوگوں کے بارے میں ہے جو بوجہ معذوری امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی طاقت نہ رکھتے ہوں اور اتنے کمزور ہوں کہ نہ تو علی الاعلان جماعت چھوڑ سکیں نہ اصلاح کر سکیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اس[2] حدیث میں جو غیبی خبر (پیش گوئی) بیان فرمائی گئی ہے خلافتِ راشدہ کے بعد اس کا ظہور ہوا۔ لہٰذا یہ حدیث بھی ایک معجزہ اور دلیل صداقتِ نبوت ہے۔

---

[1] مظاہر حق ج ا ص ۲۱۶، مرقات ج ۲ ص ۱۳۴ [2] ایضاً، مظاہر حق ج ا ص ۲۱۶۔

حدیث ۱۴: وعن ابی هریرةؓ قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من ادرك ركعة من الصبح قبل ان تطلع الشمس فقد ادرك الصبح ومن ادرك ركعة من العصر قبل ان تغرب الشمس فقد ادرك العصر۔ متفق علیه۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے سورج طلوع ہونے سے پہلے صبح کی ایک رکعت پالی تو اس نے صبح کی نماز پالی اور جس نے غروبِ آفتاب سے قبل عصر کی ایک رکعت پالی اس نے عصر کو پالیا۔ متفق علیہ۔

شرح: اس حدیث میں وقت مختار و مستحب کا بیان نہیں ہے۔ پھر اسے تعجیل الصلوٰۃ کے باب میں درج کرنے سے صاحبِ مشکوٰۃ المصابیح کی غرض شاید یہ ہے کہ وقت مختار تو پہلی احادیث میں آچکا ہے اب یہ بوقت ضرورت واضطرار وقت جواز کا بیان ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ الدھلوی مؤطا کی شرح[1] میں اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ یہاں مجبوری اور ضرورت کے وقت کا بیان ہے۔

احادیث[2] میں طلوع وغروب شمس (اور نصف النہار کے وقت) نماز پڑھنے کی صریح ممانعت وارد ہوئی ہے۔ بخاری[3] میں ہے حضورؐ نے فرمایا لا تحروا بصلاتکم طلوع الشمس ولا غروبها اور دوسری حدیث کے الفاظ ہیں، حضورؐ نے فرمایا اذا طلع حاجب الشمس فاخروا الصلوۃ حتی ترتفع۔ یہ احادیث بھی اسی درجے کی ہیں جس درجے کی یہ حدیث ہے جو زیر شرح ہے اب دونوں قسم کی احادیث میں تعارض ہو گیا لہذا علمائے حنفیہ نے قواعد شرع کے مطابق پہلے تو انہیں جمع کرنے کی کوشش کی، جب تطابق ممکن نہ ہوا تو ترجیح کی صورت اختیار کی۔ یہ ترجیح انہوں نے قیاس

---

[1] مصفّٰی ج ۱ ص ۶ [2] مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ نے تین اوقات مکروہہ کی روایت عقبہ بن عامرؓ سے کی ہے۔ نصب الرایہ ج ۱ ص ۲۵۰

[3] تجرید البخاری مصری ج ۱ ص ۵۳۔

سے دی۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ نمازِ فجر کا سارا وقت (از طلوع فجر تا طلوع آفتاب) کامل وقت ہے لیکن نمازِ عصر کا ایسا حال نہیں ہے بلکہ از روئے احادیث اس کے دو وقت ہیں (۱) مستحب وقت جو سورج کے زرد ہونے تک ہے (۲) مکروہ وقت جو سورج کی زردی سے غروب تک ہے۔ پس ہم نے قیاس سے عصر کی نماز میں تو اس حدیث کو ترجیح دی جو اس وقت سامنے ہے کیوں کہ جب کسی شخص نے مکروہ وقت میں نماز شروع کی اور نماز کے دوران میں ہی سورج غروب ہو گیا تو گویا اس نے ایک ہی جیسے وقت میں نماز پڑھی اور بوجہ ضرورت اس کی نماز اس مکروہ وقت میں ہو گئی۔ لیکن فجر میں حنفیہ کہتے ہیں کہ ہم نے طلوع کے وقت نہی والی حدیثوں کو ترجیح دی کیوں کہ جب ایک شخص نے نماز شروع کی (یعنی طلوع آفتاب سے پہلے) تو نماز کا صحیح وقت تھا اور جب اس کی نماز ختم ہوئی تو اس وقت نماز فجر کا وقت ہی نہ رہا تھا[۱]۔

حنفیہ کے علاوہ دوسرے سب حضرات کا عمل اس حدیث کے ظاہر پر ہے اور وہ اس حدیث کو نہی والی حدیثوں پر ترجیح دیتے ہیں لیکن صرف وقتی نماز کے متعلق ان کی یہ ترجیح ہے کسی اور نماز (نفل وغیرہ) کے متعلق نہیں ہے۔

[۲]اس حدیث کا معنی یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ جس کسی نے نماز کی اہلیت پائی ایسے وقت میں جبکہ نماز فجر یا عصر کی صرف ایک رکعت باقی تھی تو یہ نماز بھی اس پر فرض ہو گئی۔ ——— اہلیت سے مراد یہ ہے کہ مثلاً اسلام قبول کر لیا، بالغ ہو گیا یا بے ہوش تھا تو ہوش میں آ گیا، مجنون تھا تو اسے افاقہ ہو گیا۔

بعض لوگوں نے اس کا معنی یہ بھی بیان کیا ہے کہ جس شخص نے فجر اور عصر کی نماز کی ایک رکعت با جماعت پالی تو اسے جماعت کا ثواب حاصل ہو گیا۔ اس صورت میں حدیث کے یہ الفاظ "قبل ان تغرب الشمس اور قبل ان تطلع الشمس" صرف بطور بیان وقت نماز لیے جائیں گے۔ لیکن یہ معنی بہت تکلف ہی سے لیا جا سکتا ہے اور ضرورت اس کی صرف اس لیے پیش آئی کہ اس حدیث کا دوسری صحیح احادیث سے تعارض ہو رہا ہے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔

---

[۱] مرقات ج ۲ ص ۱۳۴، مظاہر حق ج ۱ ص ۲۱۶۔
[۲] ایضاً مرقات، فیض الباری ج ۲ ص ۱۱۹۔

علامہ سید انور شاہؒ الکشمیری نے فرمایا ہے کہ حنفیہ کے ہاں (دلائل سنت[2] و حدیث کی بناء پر) پانچ اوقات مکروہ ہیں: ۱۔ طلوع آفتاب، غروب آفتاب اور نصف النہار۔ ان تین اوقات میں کسی قسم کی نماز جائز نہیں۔ نہ فرض، نہ نفل نہ سجدۂ تلاوت اور نہ نمازِ جنازہ۔ ہاں اسی دن کی عصر کو بروئے حدیث مذکورہ بالا مستثنیٰ[1] کر دیا گیا ہے۔

ب۔ نماز عصر کے بعد غروب آفتاب تک، اور طلوع فجر کے بعد طلوع آفتاب تک ماسوائے نماز فجر کی رکعات کے۔ ان دو اوقات میں نوافل پڑھنا مکروہ ہے لیکن قضا نماز پڑھنا سجدۂ تلاوت اور نماز جنازہ سب جائز ہیں۔

پہلے تین اوقات کی کراہت ان اوقات کی ذات میں ہے (یعنی مقارنۃ الشیطان) اور دوسرے دو وقتوں کی کراہت محض فرائض کے حق میں ہے۔ خود وقت میں کوئی کراہت نہیں۔ واللہ اعلم۔

حدیث ۱۵ : وعنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا ادرک احدکم سجدۃ من صلوٰۃ العصر من قبل ان تغرب الشمس فلیتم صلوٰتہ واذا ادرک سجدۃ من صلوٰۃ الصبح قبل ان تطلع الشمس فلیتم صلوٰتہ۔ رواہ البخاری

ترجمہ : حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم میں سے کسی نے سورج غروب ہونے سے پہلے ایک سجدہ پالیا (یعنی رکعت پالی) تو وہ اپنی نماز پوری کرے اور جب وہ صبح کی نماز سے سورج چڑھنے سے پہلے ایک سجدہ (رکعت) پالے تو اپنی نماز پوری کرے۔ اس کو بخاری نے روایت کیا۔

شرح : حنفیہ تو اس[3] حدیث کے لفظ فلیتم کا معنی یوں کرتے ہیں کہ "وہ اپنی نماز

---

[1] فیض الباری ج ۲ ص ۱۲۷۔ [2] حدیث عقبہ بن عامرؓ جسے بخاری کے علاوہ تمام ارباب صحاح نے روایت کیا۔ اور ابن عباسؓ کی حدیث صحاح ستہ میں ہے جس میں دوسری قسم کے دو اوقات سے ممانعت آئی ہے۔ اسی طرح ابوہریرہؓ اور ابوسعیدؓ کی روایت جو متفق علیہ ہیں۔ نصب الرایہ ج ۱ ص ۲۵۲۔ [3] مظاہر حق ج ۱ ص ۲۱۶، مرقات ج ۲ ص ۱۳۵۔

پوری پڑھے" یعنی از سرِ نو پڑھے اور اعادہ کرے۔ لیکن دوسرے حضرات کے نزدیک معنی وُہ ہے جو اوپر کی حدیث میں گزرا ہے۔

اگر حنفیہ کے علاوہ دوسرے حضرات کا معنی معتبر سمجھا جائے تو حدیث میں وہی بحث ہوگی جو اوپر کی حدیث میں گزر چکی ہے۔ وہاں ملاحظہ فرمائیے۔

یہ حدیث بھی پہلی کی مانند ترجمۃ الباب (تعجیل الصلوٰۃ) سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی۔ ہاں البتہ اگر یوں کہا جائے تو مناسبت پیدا ہو جائے گی کہ ان احادیث میں نماز کو فوت ہونے سے بچانے کا ذکر ہے اور فی الجملہ[1] یہ بھی ایک عجلت ہی ہے۔

اس روایت میں سجدۃ کا لفظ رکعت کے لیے بولا گیا ہے کیوں کہ سجدے پر رکعت تمام ہوتی ہے یا جزء بول کر کُل مراد لیا گیا ہے (مرقات ج ۲ صـ ۱۳۵)۔

حدیث ۱۶: وعن انسؓ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من نسی صلوٰۃً او نام عنھا فکفارتھا ان یصلیھا اذا ذکرھا وفی روایۃ لا کفارۃ لھا الا ذٰلك۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: انس رضی اللّٰہ عنہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص کسی نماز کو بھول گیا یا اس سے سو گیا (اور نیند میں وقت جاتا رہا)، تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ جب یاد آئے اسے پڑھ لے۔ اور ایک روایت میں یہ لفظ بھی ہیں کہ اس کے سوا اس کا کوئی کفارہ نہیں ہے۔ متفق علیہ۔

شرح: سید المحدثین علامہ انور شاہؒ فرماتے ہیں[2] کہ اس حدیث میں اِذَا ذَکَرَھَا کا معنی یہ ہے کہ جب معہود اوقات میں اسے یاد آئے یعنی وہ اوقات جن میں شرعًا قضاء نماز پڑھنے کی اجازت ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ اگر مکروہ اوقات میں یاد آ جائے تو اسی وقت پڑھنے لگے کیوں کہ وہ وقت تو شرعًا وقت ہی نہیں ہے۔

حدیث میں صرف یاد آنے کا ذکر ہے یہ نہیں فرمایا کہ جب بیدار ہو تو نیند میں جو نماز جاتی رہی، اسے قضاء کرے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بات خود الفاظ حدیث سے استطرادًا سمجھی جا رہی ہے لہٰذا اختصارًا اسے چھوڑ دیا گیا۔

---

[1] مرقات ج ۲ صـ ۱۳۵ [2] فیض الباری ج ۲ صـ ۱۴۷۔

اور یہ جو فرمایا گیا ہے کہ "اس کے سوا اس کا کوئی کفارہ (بدلہ) نہیں"[1] سو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک فوت شدہ نماز کی ایک ہی قضاء آئے گی۔ کوئی صدقہ وغیرہ یا ایک کی بجائے کئی کئی پڑھنی لازم نہیں ہوں گی۔

کفّارہ[2] کا لفظ فعّالہ کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے اور یہ اس خصلت یا فعل کا نام ہے جس میں گناہ کو مٹانے اور محو کرنے کی اہلیت پائی جاتی ہے۔

دوسری روایت کے الفاظ لا کفارۃ لہا الا ذلک پہلے فقرے کی تاکید کے لیے بولے گئے ہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ دوسری روایت میں فقط یہ الفاظ ہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ دوسری روایت میں اس کے بعد یہ لفظ بھی آئے ہیں۔

حدیث ۱۷ : وعن ابی قتادۃ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لیس فی النّوم تفریط انما التفریط فی الیقظۃ فاذا نسی احدکم صلوٰۃ او نام عنہا فلیصلہا اذا ذکرھا فان اللّٰہ تعالیٰ قال واقم الصّلوٰۃ لذکری۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ : حضرت ابو قتادہؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ نیند میں قصور نہیں۔ قصور تو صرف بیداری میں ہے۔ پس جب تم میں سے کوئی شخص کسی نماز کو بھول جائے یا اس سے سو جائے تو جب اسے یاد آئے (اور جب بیدار ہو) تو اسے پڑھ لے کیوں کہ اللّٰہ تعالیٰ فرماتے ہیں "نماز کو میری یاد کے لیے قائم رکھو"۔ اسے مسلم نے روایت کیا۔

شرح : نیند میں تفریط (تقصیر اور قصور) نہیں کیوں کہ وہ اپنے بس میں نہیں اور اسلام کا ایک واضح قانون ہے لا یکلّف اللّٰہ نفسًا الا وسعہا "کسی پر اس کی طاقت سے بڑھ کر بوجھ نہیں ڈالا جاتا۔

اَقِمِ الصَّلوٰۃَ لِذِکرِی کا معنی جو یہاں بیان ہوا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ "نماز جب یاد آئے تو اسے قائم کر لو"، کیوں کہ نماز کا یاد آنا گویا اللّٰہ تعالیٰ کا یاد آنا ہے۔ یا یوں کہا جائے گا کہ اس کا مطلب یہ ہے اَقِمِ الصَّلوٰۃَ لِذِکرِ صَلوٰتی۔ یا یوں کہیے کہ اصل میں تو یوں تھا اقم الصّلوٰۃ لذکرھا لیکن ھا

---

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۲۱۷ ۔ [2] مرقات ج ۲ ص ۱۳۵ ۔

کی بجائے یائے متکلم کی ضمیر تشریفاً رکھ دی گئی کیوں کہ نماز کے شرف اور خصوصیت کا تقاضا یہی تھا کہ اس کا اظہار اس عظیم الشان طریقے سے کیا جائے۔

[1] اس آیت کی ایک قرأت کے الفاظ ہیں أَقِمِ الصَّلوٰةَ لِلذِّكْرٰی یہ قرأت اوپر کے بیان کردہ معنوں کی تائید کرتی ہے۔

یہ تمام معانی جو بیان ہوئے اس حدیث کے مطابق ہیں۔ آیت کے معانی دیگر دلائل شرع کی رُو سے اور بھی بیان ہوئے ہیں جن کا موقع علم تفسیر ہے۔ یہاں گنجائش نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

باب فضائل الصلوٰۃ

مشکوۃ المصابیح کے ایک نسخے میں یہاں صرف باب کا لفظ ہے[2]۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ یہ باب نمازوں کے فضائل و اوقات کا تتمہ ہے۔ ایک نسخے میں باب فضلِ الصَّلوَاتِ فِی مَوَاقِیْتِهَا" کا لفظ ہے اور مصابیح میں یہاں پر صرف فصل کا لفظ لکھا ہے۔ ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ صاحب مصابیح نے یہ فصل ماقبل کی احادیث سے الگ رکھی کیوں کہ اس کی احادیث ایک دوسری جنس سے تعلق رکھتی ہیں۔

کتاب الصلوۃ کی ابتداء میں جو احادیث وارد ہیں وہ بھی نماز کی فضیلت ہی کے متعلق ہیں۔ اسی لیے اس باب کو اس کا تتمہ قرار دیا گیا ہے۔ وہ احادیث عام تھیں اور ان میں نماز کی فضیلت بیان ہوئی ہے لیکن اس باب کی احادیث کا تعلق فرداً فرداً ہر نماز کے ساتھ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

الفصل الاوّل

حدیث ۱: عن عمارة بن رويبة قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول لن يلج النار احد صلى قبل طلوع

---

[1] مرقات ج ۲ ص ۱۳۵ [2] مرقات ج ۲ ص ۱۳۲، مظاہر حق ج ۱ ص ۲۲۲۔

الشمس وقبل غروبها یعنی الفجر والعصر ۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ : حضرت عمارہؓ بن رویبہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ کوئی شخص جس نے طلوعِ آفتاب سے قبل اور غروبِ آفتاب سے قبل نماز پڑھی یعنی نمازِ فجر اور عصر، وہ ہرگز آگ میں داخل نہ ہوگا یہ حدیث مسلم نے روایت کی۔

شرح : اس حدیث کی شرح میں علماءؒ نے فرمایا ہے کہ دخولِ نار سے مراد یہاں دخول علی وجہ التعذیب او علی وجہ التأبید ہے یعنی ایسا شخص، چونکہ کافر نہیں لہٰذا اس کے بُرے اعمال کی وجہ سے اسے بطور ہمیشگی جہنم میں نہیں ڈالا جائے گا اور گناہوں سے پاک کر کے پھر اسے جنت میں لایا جائے گا۔

علامہ علیؒ القاری فرماتے ہیں کہ صحیح حدیث میں وارد ہے کہ ایک شخص کو میدان قیامت میں لایا جائے گا اور اس کے نامۂ اعمال میں نماز و روزہ وغیرہ اعمال ہونگے۔ لیکن لوگوں کے حقوق کی دنیا میں عدمِ ادائیگی کے باعث اسے جہنم میں پھینک دیا جائے گا اور اس کے نیک اعمال اہلِ حقوق میں بانٹ دیئے جائیں گے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نمازی بھی جہنم میں جائیں گے اسی لیے اس کا معنی یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس دخول سے مراد ہمیشہ کا دخول ہے۔

علامہؒ مذکور نے مشہور شارح طیبی سے نقل کیا ہے کہ اس حدیث میں فجر اور عصر کی نمازوں کو خاص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ فجر کا وقت میٹھی نیند کے مزے لینے کا وقت اور عصر کا وقت کاروبار میں مشغولیت کا ہوتا ہے۔ پس جو آدمی ان موانع کے باوجود ان دو نمازوں کی حفاظت و نگرانی کرتا ہے تو وہ یقیناً دوسری نمازوں اور دوسرے نیک اعمال کی ضرور حفاظت کرے گا کیونکہ ارشادِ الٰہی ہے ان الصّلوٰۃ تنھٰی عن الفحشآء والمنکر۔ اور نیز یہ دونوں وقت ایسے ہیں جن میں بموجب دلائل شرع رات اور دن کے فرشتوں کی ڈیوٹیاں بدلتی ہیں اور بندوں کے اعمال کو حضور خداوندی میں لے جاتے ہیں اس خصوصیت کی بناء پر ان دونوں نمازوں کا ذکر کیا گیا۔

---

[1] مرقات ج ۲ ص ۱۴۲۔ [2] مرقات ج ۲ ص ۱۴۲، مظاہر حق ج ۱ ص ۲۲۳۔

حدیث کا مطلب یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ ان دو نمازوں کا اجر دخولِ جنت ہے اور دلائل شرع میں فضائل اعمال میں وارد ہونے والے ارشادات سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اگر کوئی اور رکاوٹ اور مانع موجود نہ ہو تو اس عمل کا اجر یہی ہے جیسے فرمایا: من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ ۔ یعنی اگر کوئی مانع موجود نہ ہو — جس کا بیان دیگر دلائل سے ہوا ہے — تو اس عمل کا اجر دخولِ جنت ہے۔ جیسے کہا جائے کہ جو شخص کھانا کھائے گا اسے قوت حاصل ہوگی۔ اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ عمومی قاعدہ یہی ہے لیکن بعض دفعہ کسی رکاوٹ مثلاً مرض وغیرہ کی وجہ سے ایسا نہیں بھی ہوتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

علامہ سید انور شاہ محدث کشمیری نے اس مسئلہ کی تحقیق میں ایک طویل تقریر فرمائی ہے جو فیض الباری ج ۲ ص ۵۲، ص ۵۳ پر موجود ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ بعض اعمال جنت کا باعث ہیں اور بعض جہنم کا سبب۔ اور یہ ایک مسلم قاعدہ ہے کہ نتیجہ سبب پر صرف اس صورت میں متحقق ہوتا ہے جبکہ اس کے تحقق کے شرائط پائے جائیں۔ اگر یہ شرائط نہ پائے جائیں یا نہایت کمزور ہوں یا ان کے مقابلے میں منافی شرائط اور موانع موجود ہوں تو ظاہر ہے کہ اسباب کے باوجود نتیجہ کا تحقق نہیں ہوگا۔ مثلاً ایک چیز دخولِ جنت یا دخول نار کا سبب ہے لیکن اس کے باوجود نتیجہ ظاہر نہیں ہوگا کیوں کہ اس کے شرائط موجود نہیں ہیں۔ اسباب کے ارتکاب سے مسبب (نتیجہ) کا وجود لازم نہیں آجاتا تاوقتیکہ کچھ دوسرے امور بھی نہ پائے مثلاً موانع (رکاوٹوں) کا نہ پایا جانا اور شرائط کا وجود۔ انتہیٰ ملخصاً۔

اس سے قبل کتاب الصلوٰۃ کی ابتدائی احادیث میں یہ مضمون گزر چکا ہے کہ نماز صغیرہ گناہ کو محو کر دیتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ موجودہ حدیث کی شرح میں اگر اس سے یہ مراد لی جائے کہ تین نمازیں بے شک نہ پڑھی جائیں صرف فجر اور عصر ہی دخولِ جنت کے لیے کافی ہیں تو یہ مطلب دیگر بہت سی احادیث کے خلاف پڑے گا۔ کیوں کہ ان میں ترک صلوٰۃ کو کفر قرار دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنا بڑا گناہ جسے کفر تک فرمایا گیا ہو محض دوسری نمازوں سے معاف نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اہل حق کے اجماع سے یہ بات ثابت ہے کہ بڑے گناہوں کے لیے توبہ کی ضرورت ہے۔

اور یہ بات بھی مُسلّم ہے کہ کسی مضمون کی تمام احادیث اور دیگر دلائلِ شرع مثلاً قرآن پاک کو جمع کرکے ہی اس مضمون کے بارے میں صحیح نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ ہم باب تعجیل الصلوٰۃ کی ابتداء میں بھی اس طرف اشارہ کر چکے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۲ : وعن ابی موسیٰؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من صلی البردین دخل الجنۃ۔ متفق علیہ۔

ترجمہ : حضرت ابوموسیٰؓ اشعری فرماتے ہیں کہ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص دو ٹھنڈی نمازیں پڑھے جنت میں داخل ہوگا۔ بخاری و مسلم دونوں نے اسے روایت کیا۔

شرح : بَرْدَیْن کا معنی ہے[1] دو ٹھنڈے وقت یعنی پہلا اور پچھلا پہر۔ یعنی دوپہر کے لحاظ سے یہ دونوں ٹھنڈے وقت ہیں اور مراد[2] اس سے یا تو صبح اور عصر کی نمازیں ہیں، جیسا کہ سابق حدیث میں گزرا، کیوں کہ یہ دونوں نمازیں دن کے دو حصوں میں واقع ہیں۔ یا مراد صبح اور عشاء کی نمازیں ہیں کیوں کہ یہ باقی نمازوں کے اول و آخر میں واقع ہیں۔

قسطلانی اور تجرید بخاری مصری کے حاشیہ[3] میں بَرْدَیْن سے مراد فجر اور عصر کی نمازیں لی گئی ہیں۔ سابق حدیث میں چوں کہ لن یلج النار احد کے الفاظ تھے اس لیے اس کی شرح میں طویل گفتگو کی گئی۔ اس حدیث کی شرح اس کی نسبت آسان ہے کیوں کہ اس میں دخل الجنۃ کے الفاظ ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اہلِ ایمان بفضلِ خدا ضرور جنت میں داخل ہوں گے۔ اگر کوئی مانع نہ ہوا تو یہ دخول بلا دخولِ نار ہوگا۔ ورنہ بعد از خروجِ نار تو سب مومن جنت میں جائیں گے۔ مزید تشریح کے لیے اوپر کی حدیث کی شرح دیکھیے۔

حدیث ۳ : وعن ابی ھریرۃؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یتعاقبون فیکم ملائکۃ باللیل وملائکۃ بالنھار

---

[1] مرقات ج ۲ صفحہ ۱۴۲، ۱۴۳۔ [2] مظاہر ج ا صفحہ ۲۲۳، مرقات ج ۲ صفحہ ۱۴۳۔

[3] التجرید الصریح مصری ج ا صفحہ ۵۳، قسطلانی ج ا صفحہ ۵۸۲۔

ویجتمعون فی صلوٰۃ الفجر وصلوٰۃ العصر ثم یعرج الذین باتوا فیکم فیسألہم ربہم وھو اعلم بہم کیف ترکتم عبادی فیقولون ترکناھم وھم یصلون واتیناھم وھم یصلون۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے اندر کچھ فرشتے رات کو اور کچھ فرشتے دن کو باری باری آتے ہیں۔ اور وہ فجر کی نماز میں اور عصر کی نماز میں اکٹھے ہوتے ہیں۔ پھر وہ فرشتے جو رات کو تمہارے پاس رہے تھے چلے جاتے ہیں تو انہیں ان کا پروردگار پوچھتا ہے۔ حالاں کہ وہ بندوں کے حالات کو خوب جانتا ہے۔ کہ تم نے میرے بندوں کو کیسے چھوڑا؟ وہ کہتے ہیں کہ جب انہیں چھوڑ کر آئے تھے تو وہ نماز پڑھ رہے تھے اور جب ہم ان کے پاس گئے تھے تو اس وقت بھی نماز پڑھ رہے تھے۔ متفق علیہ۔

شرح: یتعاقبون[۱] کا مادہ عقبہ ہے جس کا معنی ہے نوبت یعنی باری مطلب یہ ہوا کہ دن اور رات کے فرشتے اپنی اپنی نوبت اور باری پر آتے ہیں۔

یہاں[۲] اس حدیث میں اختصار ہے۔ حافظ ابن حجرؒ عسقلانی نے اسی حدیث کو امام نسائیؒ اور صحیح ابن خزیمہ کی روایت سے (فتح الباری میں) نقل کیا ہے اس میں یہ الفاظ ہیں: تجتمع ملائکۃ اللیل وملائکۃ النہار فی صلوٰۃ الفجر وصلوٰۃ العصر فیجتمعون فی صلوٰۃ الفجر فتصعد ملائکۃ اللیل وتثبت ملائکۃ النہار ویجتمعون فی صلوٰۃ العصر فتصعد ملائکۃ النہار وتثبت ملائکۃ اللیل فیسألہم ربہم کیف ترکتم عبادی؟ "رات کے فرشتے اور دن کے فرشتے نماز فجر اور عصر میں جمع ہوتے ہیں پس جب وہ نماز فجر میں جمع ہوتے ہیں تو رات والے فرشتے چلے جاتے ہیں اور دن والے یہیں رہ جاتے ہیں اور وہ نماز عصر میں جمع ہوتے ہیں تو دن والے فرشتے اوپر کو چلے جاتے ہیں اور رات والے فرشتے دنیا میں رہ جاتے ہیں۔ (سو جب یہ دن اور رات کو آنے جانے والے

۱؎ فیض الباری ج ۲ ص ۱۱۱۔ ۲؎ ایضاً۔

دونوں فریق یہاں سے واپس جاتے ہیں تو ان کا پروردگار ان سے پوچھتا ہے کہ تم نے میرے بندوں کو کیسے چھوڑا ہے؟

یہ[1] فرشتے بندوں کے اعمال لکھنے والے ہیں۔ یا باذن[2] الٰہی بندوں کی حفاظت کرنے والے ہیں جن کا ذکر قرآن پاک میں ہے: لَہٗ مُعَقِّبَاتٌ مِّنْ بَیْنِ یَدَیْہِ وَمِنْ خَلْفِہٖ یَحْفَظُوْنَہٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰہِ، یا سیّاح ہیں (جن کا ذکر ایک حدیث میں آیا ہے اِنَّ لِلّٰہِ ملائکۃ سیاحین فی الارض۔ الحدیث۔ اور وہ جو زمین گھومتے رہتے ہیں اور ذکر الٰہی کی مجلس کو تلاش کرتے رہتے ہیں (ان کا ذکر بھی احادیث میں موجود ہے)۔

اللہ تعالیٰ کو فرشتوں سے سوال کی حاجت نہیں وہ تو خود ہی سب کچھ جانتا بوجھتا ہے۔ اس سوال[3] کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر انسان کی فضیلت کو ثابت فرماتا ہے گویا یہ ان کے اس سوال کا جواب ہے جو انہوں نے آدمؑ کی خلافت کے اعلان وقت کیا تھا: "اَتَجْعَلُ فِیْہَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْہَا وَیَسْفِکُ الدِّمَآءَ" (البقرہ)

سید[4] المحدثین مولانا انور شاہؒ کشمیری فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے اور قرآنِ پاک کی آیت اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ کَانَ مَشْہُوْدًا سے یہ تو ثابت ہو گیا کہ فرشتے نماز ول میں موجود ہوتے ہیں۔ اسی طرح جمعہ کے سلسلے میں حضورؐ کی حدیث ہے کہ جب امام منبر پر بیٹھتا ہے تو فرشتے بندوں کے اعمال نامے (جو وہ لکھ رہے ہوتے ہیں) لپیٹ دیتے ہیں اور بیٹھ کر ذکر سننے لگ جاتے ہیں، لیکن یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ نماز میں بھی شامل ہوتے ہیں۔ مؤطا امام مالکؒ میں حضرت سعیدؒ بن المسیب کا قول نقل کیا گیا ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے جو شخص جنگل میں اکیلا نماز پڑھے اس کے دائیں بائیں ایک ایک فرشتہ بھی نماز پڑھتا ہے اور اگر وہ یہی نماز اذان اور اقامت کہہ کر پڑھے تو اس کے پیچھے پہاڑوں کی مانند (یعنی بڑی تعداد میں) فرشتے نماز پڑھتے ہیں لیکن زیر بحث حدیث کے الفاظ ترکنا ھُم وھم یُصَلُّوْنَ بھی یہی ظاہر کرتے ہیں کہ فرشتے نماز،

۱؎ مرقات ج ۲ ص ۱۴۳، مظاہر حق ج ۱ ص ۲۲۴ ۲؎ فیض الباری ج ۲ ص ۱۱۷

۳؎ مرقات ج ۲ ص ۱۴۳، مظاہر حق ج ۱ ص ۲۲۳ ۴؎ فیض الباری ج ۲ ص ۱۱۸

میں شامل نہیں ہوتے۔ اور مجھے اس بات کا بھی یقین ہے کہ فرشتے جماعت کی نماز میں حاضر ہوتے ہیں منفرد کی نماز میں نہیں۔ اور فجر کی نماز کا خصوصی ذکر قرآن میں مَشْهُوْد ہونے کی صفت کے ساتھ اس لیے آیا ہے کہ اس میں قرآن بآوازِ بلند پڑھا جاتا ہے اس لیے ملائکہ کا ذکر وہاں اہم تھا کیوں کہ انہیں قرآن سننے کا بہت شوق ہوتا ہے اور وہ اسے غور سے سننے میں محو ہوتے ہیں۔

اس حدیث سے بھی فجر اور عصر کی نمازوں کی فضیلت اور عظمت ثابت ہوتی ہے۔

حدیث ۴: وعن جندب رضؓ القسری قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من صلی صلوٰۃ الصبح فھو فی ذمۃ اللّٰہ فلا یطلبنّکم اللّٰہ من ذمتہٖ بشیئٍ فانہ من یطلبہ من ذمتہٖ بشیئٍ یدرکہ ثم یکبہ علی وجہہٖ فی نار جھنّم۔ رواہ مسلم۔ و فی بعض نسخ المصابیح القشیری بدل القسری۔

ترجمہ: حضرت جُندب رضؓ قسری فرماتے ہیں کہ جنابِ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے صبح کی نماز پڑھی تو وہ اللّٰہ کی ذمہ داری میں ہے پس ایسا نہ ہو کہ اللّٰہ تعالیٰ تم سے اپنی ذمہ داری کے بارے میں کوئی مطالبہ کرے کیونکہ جس سے خدا تعالیٰ اپنی ذمہ داری کا مطالبہ کرے گا اس پر قابو پا لے گا پھر اسے منہ کے بل دوزخ کی آگ میں پھینک دے گا۔ اس حدیث کو مُسلم نے روایت کیا اور مصابیح کے بعض نسخوں میں القسری کے بجائے القشیری کا لفظ آیا ہے۔

شرح: ایک مسلمان کا خون، مال اور عزت و آبرو دوسرے کے لیے قابلِ صد احترام ہے۔ اس احترام کو توڑ ڈالنا اسلامی اتحاد و یکانگت کو پارہ پارہ کر دیتا ہے۔ اسی لیے حضور صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے مختلف طرزِ بیان سے متعدد بار اہلِ اسلام کو ان کی اس عظیم ذمہ داری کی طرف متوجہ فرمایا ہے۔ زیرِ بحث حدیث بھی ان ارشادات میں سے ہے جن میں مسلمانوں کو ایک دوسرے کے حقوق کی ادائیگی اور ایک

دوسرے کے اکرام و تعظیم کا حکم دیا گیا ہے۔ ایک اسلامی (یا مسلم) حکومت میں تمام شہریوں کے بنیادی حقوق کی ادائیگی کی ذمہ داری حکومت پر ڈالی گئی ہے۔ لیکن ثانوی حیثیت سے یہی ذمہ داری مسلم معاشرے کے تمام افراد پر بھی ہے۔ اور جو بھی اس ذمہ داری کی ادائیگی میں کوتاہی کرے گا یا اس ارشاد کی خلاف ورزی کرے گا وہ اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری میں رخنہ اندازی کا باعث بنے گا لہٰذا اس کی سزا یہی ہے کہ اسے اُلٹا جہنم میں پھینک دیا جائے۔ کیوں کہ مسلمان کا خون، جان و مال اور عزت و ناموس بہت قیمتی چیز ہے۔

علامہ[1] علی القاریؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں جس ذمہ داری اور عہد و امان کا ذکر ہے وہ اس ذمہ داری کے علاوہ ہے جو کلمۂ توحید سے ثابت ہو جاتی ہے۔

اس[2] حدیث کا معنی یوں بھی بیان کیا گیا ہے کہ چونکہ نمازِ صبح پڑھنے والا دن بھر کے لیے اللہ کی ذمہ داری، حفظ و امان اور عہد و امان میں داخل ہو جاتا ہے پس اہل اسلام کو اس کی اہمیت کے پیش نظر نمازِ فجر کی خصوصی پابندی کی طرف متوجہ ہونا لازم ہے ایسا نہ ہو کہ وہ اس ذمہ داری (نمازِ فجر) کے بارے میں کوتاہی کریں اور اللہ تعالیٰ اُن سے اس ذمہ داری کی عدمِ ادائیگی کے باعث انہیں مبتلائے عذاب کر دے۔

حدیث کا معنی چاہے کسی طرح بیان کرو اور اس عہد و امان کی چاہے کوئی تفسیر کرو بہر صورت اس حدیث سے نمازِ فجر کی خصوصی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ صرف اسی نماز پر اکتفاء کیا جائے اور باقی ترک کر دی جائیں۔ کیوں کہ پیچھے گزر چکا ہے کہ ترکِ صلوٰۃ کو کفر قرار دیا گیا ہے اور وہ ایک بہت بڑا گناہ ہے۔

صحابی[3] کے نام کے ساتھ جو قسری کی نسبت ہے اسے قُشیری یا قشری بھی پڑھا گیا ہے۔ امام نوویؒ نے یہ لفظ القسری ثابت کیا ہے۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اسے قشری کہنا یا قشیری پڑھنا بالکل غلط ہے۔

---

[1] مرقات ج ۲ ص ۱۴۳۔ [2] مرقات ج ۲ ص ۱۴۳، مظاہر حق ج ۱ ص ۲۲۴۔
[3] ایضاً۔

حدیث ۵ : عن ابی ھریرۃؓ قال قال رسول اللہ علیہ وسلم لو یعلم الناس ما فی النداء والصف الاول ثم لم یجدوا الا ان یستھموا علیہ لا استھموا ولو یعلمون ما فی التھجیر لا استبقوا الیہ ولو یعلمون ما فی العتمۃ والصبح لاتوھما ولو حبواً ۔ متفق علیہ۔

ترجمہ : ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ اذان دینے اور پہلی صف میں کتنا بڑا اجر ہے اور پھر انہیں ان پر قرعہ اندازی کے سوائے کوئی چارہ نہ ملے تو ضرور ہی ان پر قرعہ اندازی کریں ۔ اور اگر انہیں معلوم ہو کہ نماز ظہر کے لیے جلدی آنے میں کتنا اجر ہے تو اس کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جائیں اور اگر انہیں پتہ چل جائے کہ نماز عشاء اور نماز فجر کا کیا مقام ہے تو اس کے لیے اگر انہیں گھسٹ کر آنا پڑے تو بھی آئیں ۔ بخاری و مسلم دونوں نے اسے روایت کیا۔

شرح : اس ارشادِ گرامی میں اذان (یا اقامتِ صلوٰۃ[1]) کی فضیلت کے علاوہ تین نمازوں — ظہر، عشاء اور فجر — کی فضیلت بھی بتائی گئی ہے ۔ نداء سے مراد عام طور پر اذان ہوتی ہے لیکن علامہ علی القاریؒ نے یہاں اس سے اقامتِ صلوٰۃ کا مراد لینا زیادہ مناسب اور موقع محل کے مطابق قرار دیا ہے ۔ ان کا کہنا ہے کہ اس کے فوراً بعد صفِ اول کا ذکر بتاتا ہے کہ نداء سے یہاں مراد اقامت لینا اَولیٰ ہے۔

اس حدیث میں تہجیر کا لفظ ظہر کے لیے استعمال ہوا ہے کیونکہ اہل عرب کے محاورے میں یوں ہی اس لفظ کا استعمال ہوتا تھا ۔ اس کی طرف ایک اشارہ گزشتہ باب کے مباحث میں کیا جا چکا ہے ۔ اگر تہجیر سے مراد نماز ظہر کے لیے جلدی آنا لیا جائے تو اس سے مراد وقتِ مختار و مستحب میں جلدی کرنا ہوگا ۔ یا یہ فضیلت[2] موسم فضیلت موسمِ گرما کے لیے علاوہ دوسرے موسموں کے ساتھ خاص ہوگی کیونکہ اس سے پہلے صحاح کی احادیث گزر چکی ہیں جن میں گرمی کی شدت کے زمانہ میں ظہر کو ٹھنڈے وقت میں پڑھنے

---

[1] مرقات ج ۲ ص ۱۴۴ ۔ [2] مظاہر حق ج ۱ ص ۲۲۴ ، مرقات ج ۲ ص ۱۴۴ ۔

کا حکم دیا گیا ہے۔ اور اگر اوّل وقت میں آنا ہی مراد لیا جائے تو جمعہ کی نماز میں آنا مراد لیا جائے گا۔ علامہ علی القاریؒ نے مرقات ج ۲ ص ۱۴۵[1] میں اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ ایک حدیث میں جمعہ کی ترغیب دیتے ہوئے حضورؐ کا یہ ارشاد وارد ہوا ہے: مَثَلَ المهجّر کالذی یهدی بدنة (بہت جلدی آنے والے کی مثال یوں ہے جیسے کہ اونٹ کی قربانی دینے والا) پس مُهَجّر سے جب نماز جمعہ میں بہت جلد آنے والا مراد لیا گیا ہے تو تہجیر کا معنی ہوگا نماز جمعہ کے لیے جلدی کرنا۔

گھسٹ کر آنا بطور مبالغہ بیان ہوا ہے۔ یا اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ان نمازوں کی فضیلت کا صحیح علم حاصل ہو جائے تو بیمار اور معذور لوگ بھی گھروں سے نکل کھڑے ہوں تاکہ اس فضیلت کو پالیں (حالاں کہ معذوروں کو گھروں میں اکیلے نماز پڑھ لینے کی اجازت دے دی گئی ہے)۔

اور نماز عشاء اور فجر کو اس فضیلت سے خاص کرنے کا باعث یہ ہے کہ ان کے اوقات ظلمت و غفلت اور نیند کے اوقات ہیں اور خدشہ تھا کہ عبادت سے سستی واقع نہ ہو جائے۔ لہٰذا ان دونوں نمازوں کی یہ عظیم فضیلت بیان فرمادی گئی ہے۔

اس حدیث میں عشاء کے لیے عتمہ کا لفظ بولا گیا ہے حالاں کہ مسلم کی ایک صحیح حدیث میں، جو آگے آرہی ہے، عشاء کو عتمہ کہنے سے منع فرمایا گیا ہے۔ پس اس حدیث میں یا تو کسی راوی کی طرف سے یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ اور پھر چل پڑا ہے۔ یا بیانِ جواز کے لیے حضورؐ نے ہی بولا ہے کہ اس لفظ کا استعمال مستحب نہیں پھر بھی اسے حرام ہی نہ سمجھ لیا جائے۔ امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں یہی فرمایا ہے۔[2] چنانچہ باب العشاء والعتمہ ومن رآہ واسعًا کہہ کر انہوں نے اسی طرف اشارہ فرمایا ہے گو اس کی ذمہ داری بھی نہیں لی۔

عتمہ کے بارے میں یہی یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ جس طرح نماز ظہر کے لیے بطور محاورۂ عرب ہجیر کا لفظ بولا گیا ہے اسی طرح عشاء کے لیے بطور محاورۂ اعراب (بدّو حضرات) عتمہ کا لفظ بول دینا مناسب جانا گیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

---

[1] مرقات ج ۲ ص ۱۴۵، مظاہر حق ج ۱ ص ۲۲۴ ۔ [2] فیض الباری ج ۲ ص ۱۲۹۔

حدیث ۶ : وعنہ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لیس صلوٰۃ اثقل علی المنافقین من الفجر و العشاء ولو یعلمون ما فیہما لاتوھما ولو حبوًا ۔ متفق علیہ۔

ترجمہ : حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ علیہ و سلم نے ارشاد فرمایا کہ فجر اور عشاء کی نمازوں سے زیادہ منافقوں پر اور کوئی نماز بوجھل نہیں۔ اور اگر وہ جانتے کہ ان دونوں میں کیا فضیلت ہے تو وہ ان میں ضرور آتے چاہے انہیں سُرین کے بل گھسٹ کر آنا پڑتا۔ بخاری و مسلم نے اس حدیث کو بیان کیا۔

شرح : منافق[1] چونکہ صرف دکھاوے کی نماز پڑھتے تھے کہ قرآن پاک میں ان کے لیے یُرَاۗءُوْنَ النَّاسَ کا لفظ وارد ہے اور فجر و عشاء میں بوجہ سُستی اور نیند وغیرہ ان کو آنا دوبھر معلوم ہوتا تھا اس لیے ان دونوں نمازوں کی فضیلت بیان فرمائی گئی ہے۔ اس حدیث کی روشنی میں اوپر والی حدیث کا مطلب بھی سمجھ میں آجاتا ہے کہ اہلِ ایمان کو منافقوں جیسی عادتوں سے بچنے کے لیے کیسے کیسے عنوانوں سے ڈرایا گیا ہے اور کن کن الفاظ میں انہیں نیکیوں کی ترغیب دی گئی ہے۔

حدیث ۷ : وعن عثمانؓ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ وسلم من صلی العشاء فی جماعۃ فکانما قام نصف اللیل ومن صلی الصبح فی جماعۃ فکانما صلی اللیل کلہ ۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ : حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جناب رسولِ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا : جس شخص نے عشاء کی نماز باجماعت پڑھی گویا وہ آدھی رات تک (نفل) نماز پڑھتا رہا اور جس شخص نے صبح کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی تو گویا کہ وہ رات بھر نماز پڑھتا رہا۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا۔

شرح : اس ارشاد میں نماز باجماعت کی فضیلت بیان ہوئی ہے ارشاد کا خلاصہ یہ ہے کہ نمازِ عشاء اور نمازِ فجر اگر باجماعت پڑھی جائے تو اس کا اجر اس رات

---

[1] مرقات ج ۲ ص ۱۴۵ ، مظاہر حق ج ۱ ص ۲۲۴ ۔

بھر کی نفلی نماز سے زیادہ ہے جس کا پڑھنے والا ان دونوں کو باجماعت ادا نہ کرے بلکہ اکیلا ہی پڑھ لے۔ نفلوں کی نسبت فرضوں کی طرف توجہ زیادہ ہونی چاہیے کیونکہ فرض تو مومن کے ذمہ ہیں اور ان کی نماز کو باجماعت ادا کرنا سنتِ مؤکدہ ہے بلکہ بعض ائمہ ۔ مثلاً امامِ شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ ۔ نے وارکعوا مع الرّٰکعین سے نمازِ باجماعت کی فرضیت کا استدلال بھی کیا ہے لیکن صحیح تر یہی ہے کہ جماعت سنتِ مؤکدہ ہے اور ایسی سنت کی عملی حیثیت فرض ہی کی مانند ہوتی ہے یہ تو ہوئی فرض اور نماز باجماعت کی تاکید اور حیثیت۔ قیام اللیل (نماز تہجد) چاہے کتنی زیادہ فضیلت کی حامل ہے پھر بہر حال وہ ایک نفلی نماز ہی ہے اس لیے جو شخص سنت مؤکدہ کو تو چھوڑ دیتا ہے لیکن ساری رات یا آدھی رات بھر نفل ادا کرتا رہتا ہے تو وہ اس مومن کی مانند کیسے قرار دیا جا سکتا ہے جو فرض کو کامل طریقے سے (باجماعت) ادا کرے؟

اس حدیث کا مطلب دو طرح سے بیان کیا گیا ہے: ایک تو یہ کہ عشاء[1] کی نماز باجماعت پڑھنے سے آدھی رات تک نفل پڑھنے کا ثواب ملا اور نمازِ فجر کی باجماعت ادائیگی سے بقیہ آدھی رات کا ثواب بھی مل گیا۔ سو ایسا شخص گویا رات بھر ہی نماز پڑھتا رہا لیکن اگر اس نے ایک نماز کی جماعت کو ترک کر دیا تو صرف آدھی رات کے ثواب کا مستحق رہ گیا۔

دوسرا[2] مطلب یہ ہے کہ نمازِ عشاء اور نمازِ فجر دونوں کا اجر بہت بڑا ہے کیوں کہ ان دونوں کے لیے رات کے اندھیرے میں چل کر آنا پڑتا ہے۔ دونوں کا وقت نیند اور آرام کا ہے۔ لیکن دونوں میں سے مقابلۃً فجر کا اجر زیادہ ہے کیوں کہ وہ نفس پر زیادہ شاق ہوتی ہے اور اس میں شیطان کا مقابلہ زیادہ ہے اس لیے کہ نیند سے بیدار ہونا اس میں داخل ہونے کے ارادے سے زیادہ شدید اور شاق ہوتا ہے لہٰذا اس میں نفس کی ریاضت اور مجاہدہ عشاء کی نسبت زیادہ ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ عشاء کی نماز باجماعت پڑھو تو نصف رات تک نماز پڑھتے رہنے کا ثواب ہے۔ لیکن اگر نمازِ فجر کو باجماعت ادا کرو تو رات بھر نفلی نماز پڑھتے رہنے کے۔

---

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۲۲۴، مرقات ج ۲ ص ۱۴۵ [2] ایضاً

ہے۔ اس دوسرے معنی کی رُو سے نصف اللیل کا تعلق عشاء کے ساتھ اور اللیل کلہ کے لفظ کا تعلق نمازِ فجر کے ساتھ ہے۔

اس حدیث سے عبادات میں فرقِ مراتب کا سبق حاصل ہوتا ہے۔ نفل انسان کی مرضی پر منحصر ہے اور زیادہ تر اس کا مقصد فرائض وسنن کی تکمیل ہے لیکن فرض اہلِ ایمان کے ذمہ لازم ہے اور نفل اس کے مقام ہرگز نہیں پا سکتا۔

حدیث ۸ : وعن ابن عمر رضی اللّٰہ عنہما قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لا یغلبنکم الاعراب علی اسم صلوٰتکم المغرب قال ویقول الاعراب ھی العشاء وقال لا یغلبنکم الاعراب علی اسم صلوٰتکم العشاء فانہا فی کتاب اللّٰہ العشاء فانہا تعتم مجلاب الابل۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ : حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بادیہ نشین لوگ (بدو۔ دیہاتی) تمہاری نمازِ مغرب کے نام میں تم پر غالب نہ آجائیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ بدو اس نماز کو عشاء کہتے ہیں اور آپؐ نے فرمایا کہ بدو لوگ تم پر تمہاری نمازِ عشاء کے بارے میں غالب نہ آجائیں کیونکہ اللہ کی کتاب میں اس کا نام عشاء ہے اور بدو لوگ اونٹوں کے دوہنے کی وجہ سے اس نماز میں تاخیر کرتے ہیں (اور اسے عتمہ کا نام دیتے ہیں) یہ حدیث مسلم نے روایت کی۔

شرح : اسلام نے نظریات کے ساتھ ساتھ اصطلاحات اور ناموں میں بھی اصلاح کی ہے اور اسلام کی ایک اپنی اصطلاحی زبان ہے، اگر اسے چھوڑ کر عرفِ عام کو اختیار کر لیا جائے تو بہت سے شرعی مقاصد کے فوت ہونے کا اندیشہ ہے لہٰذا نمازوں کے جو نام خود شریعت کی زبان سے ثابت ہیں انہی کو استعمال کرنا چاہیئے۔ اور حتی الوسع دوسرے ناموں سے پرہیز کرنا چاہیئے تاکہ اسلامی اور غیر اسلامی اصطلاحات گڈمڈ نہ ہو جائیں اور اسلام نے خاص خاص الفاظ کو جن خاص معانی کے لیے استعمال کیا ہے وہ فوت نہ ہو جائیں۔

ؑ مظاہر حق ج ۱ ص ۲۲۵۔

بدّو لوگ نمازِ مغرب کو عشاء کہا کرتے تھے حالاں کہ کتاب[1] الٰہی میں من بعد صلوٰۃِ العشاء کا لفظ خاص عشاء کے لیے آیا ہے اور مغرب کی نماز کا نام اسلام نے مغرب ہی رکھا ہے۔ اگر بدوؤں کی اصطلاح چل پڑتی تو ان دونوں نمازوں میں گڑبڑ ہو جاتی اور یہ چیز مقاصدِ شرع کے خلاف تھی لہٰذا اس سے منع فرما دیا گیا۔

علیٰ[2] ہٰذا القیاس بدوؤں کی اصطلاح میں نمازِ عشاء کا نام قرآنی اصطلاح کے مطابق عشاء نہ تھا بلکہ وہ اسے عتمہ کہتے تھے۔ عتمہ کا معنی ہے ظلمت۔ چونکہ وہ اس نماز کے وقت میں ـــ شفق غائب ہو جانے کے بعد ـــ اونٹ دوہتے تھے اور اس وقت کا نام عتمہ تھا۔ پھر وہ نماز جو اس وقت میں پڑھی جاتی اس کے اصل نام کو چھوڑ کر انہوں نے اسے عتمہ کہنا شروع کر دیا تھا لہٰذا اسے بھی اہلِ اسلام کو منع کر دیا گیا۔

حدیث میں لا یغلبنکم کا لفظ ارشاد ہوا ہے کہ بادیہ نشین تم پہ ان ناموں کے بارے میں غالب نہ آجائیں۔ مطلب اغلباً یہ ہے کہ اگر کبھی کبھار اس لفظ کا استعمال ہو جائے تو حرج نہیں لیکن ان بدوی ناموں کا غلبہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ ہم اس لیے کہہ رہے ہیں کہ عشاء کے لیے عتمہ کا لفظ خود بعض احادیث میں گزر چکا ہے۔ گو پسندیدہ نام اب بھی عشاء ہی ہے لیکن اگر کبھی کبھار عتمہ کہہ دیا جائے تو ان شاء اللہ حرج بھی نہ ہوگا۔ ہاں مغرب کا نام چوں کہ الگ ہے اور عشاء ایک دوسری نماز کا نام ہے لہٰذا ان دونوں کے ناموں میں گڑبڑ کی اجازت کسی صورت میں نہیں دی جا سکتی۔ یہی وجہ ہے عشاء پہ عتمہ کا اطلاق تو ثابت ہوا ہے لیکن مغرب پر عشاء کا کہیں نہیں آیا کیوں کہ اس طرح دو نمازیں گڈمڈ ہو جاتیں

[3] فانہا تعتم بصیغۂ معروف تھا ہو تو ھا کی ضمیر کا مرجع اعراب ہوں گے یعنی بدو لوگ اونٹ تاریکی میں دوہتے تھے اور نمازِ عشاء کا بھی چوں کہ یہی وقت تھا لہٰذا اس نماز کا نام بھی انہوں نے عتمہ رکھ دیا۔ اور اگر تعتم کو بصیغۂ مجہول پڑھا جائے تو ھا کی ضمیر کا مرجع صلوٰۃِ عشاء ہوگا۔ یعنی یہ نماز اونٹوں کے دوہنے کے وقت

---

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۲۲۵، مرقات ج ۲ ص ۱۴۶۔

[2] ایضاً، ایضاً [3] مرقات ج ۲ ص ۱۴۶، مظاہر حق ج ۱ ص ۲۲۵۔

میں پڑھی جاتی تھی اور یہ وقت تاریکی کا ہوتا تھا۔ پہلے زمانہ جاہلیت میں اس وقت کا نام عتمہ تھا پھر اس وقت میں پڑھی جانے والی نماز کو عتمہ کہا جانے لگا۔

جن احادیث میں عتمہ کا لفظ آیا ہے یا تو بیانِ جواز کے لیے ہے یا وہ اس نہی سے پہلے کی ہیں۔ اس سے قبل ہم بحوالہ امام بخاری بیان کر چکے ہیں کہ ان کے نزدیک دلائل کی بناء پر عتمہ کا لفظ بولنا جائز ہے گو اتنا اچھا بھی نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۹ : وعن علی رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال یوم الخندق حبسونا عن صلوٰۃ الوسطی صلاۃ العصر ملأ اللہ بیوتھم وقبورھم نارًا۔ متفق علیہ۔

ترجمہ : حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جنابِ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ خندق کے دن فرمایا: ان کافروں نے ہمیں درمیانی نماز یعنی عصر کی نماز سے روک دیا ہے اللہ تعالیٰ ان کے گھروں اور قبروں کو آگ سے بھر دے۔ بخاری ومسلم دونوں نے یہ حدیث بیان کی۔

شرح : اس حدیث پاک نے قرآن کی اس آیت میں وارد ہونے والے ایک لفظ کی واضح شرح کر دی: حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى (سب نمازوں کی اور خاص کر درمیانی نماز کی پوری نگرانی کرو)۔ اس سے پتہ چل گیا کہ، الصّلٰوۃ الوسطیٰ سے مراد نماز عصر ہے کیوں کہ اس کے ایک طرف دن کی دو نمازیں ہیں: فجر اور ظہر۔ اور دوسری طرف رات کی دو نمازیں ہیں: مغرب اور عشاء۔ اکثر علماء صحابہ وتابعین کا یہی قول ہے کہ نمازِ وسطیٰ سے مراد نماز عصر ہے جن لوگوں سے اس کے خلاف منقول ہوا ہے انہیں یا تو حدیث نہیں پہنچی اور یا شاید انہوں نے اس موجودہ حدیث کو قرآن پاک کی اس آیت کی تفسیر قرار نہیں دیا یا ممکن ہے ان کے پاس کوئی اور دلیل بھی موجود ہو۔

حضورؐ نے اپنی جان کو تکلیف دینے والوں کے لیے کبھی بد دُعا نہیں فرمائی بلکہ

۱؎ مرقات ج ۲ ص ۱۴۶، مظاہر حق ج ۱ ص ۲۲۵۔

۲؎ مظاہر حق ج ۱ ص ۲۲۵ ۔ مرقات ج ۲ ص ۱۴۷ ۳؎ ایضاً مظاہر حق

جنگ احد میں جس شخص نے آپؐ کے دانت مبارک کو شہید اور چہرہ انور کو زخمی کر دیا تھا اس کے حق میں بھی دعائے خیر ہی کی۔ علی ہذا القیاس طائف والوں نے آپؐ کو انہ سر تاپا لہو لہان کر دیا اور بڑی بڑی گستاخیاں کی تھیں پھر بھی آپؐ نے ان کے لئے دعائے خیر ہی فرمائی۔ لیکن جہاں دینِ خدا کو مٹانے اور نماز سے روکنے کا معاملہ پیش آیا تو زبانِ رحمت سے یہ الفاظ بد دعا بن کر نکلے۔

جنگ[1] خندق کا دوسرا نام جنگ احزاب بھی ہے۔ یہ ۴ یا ۵ ہجری میں پیش آئی۔ مشرکین مکہ اپنے حلیفوں سمیت یک لخت مدینہ پہ یورش کر کے چڑھ آئے حضورؐ نے سلمان فارسیؓ کے مشورے سے مدینہ کے گرد خندق کھدوائی خود بھی کھودنے میں شریک رہے۔ اس کھائی میں پانی چھوڑ دیا گیا اور بعض مقامات پہ اس میں آگ جلائی گئی۔ اس طرح حضورؐ نے قلعہ بند اور محصور ہو کر یہ جنگ لڑی۔ مشرکوں کی تیر اندازی اور پیہم یورش کے باعث آپؐ کی نماز فوت ہو گئی بلکہ ایک دن نمازِ عصر فوت ہوئی اور دوسرے دن مسلسل چار نمازیں جن میں عصر بھی تھی فوت ہو گئیں اور یہ واقعہ صلوٰۃ الخوف کے نزول سے پہلے کا تھا یا یوں کہیے کہ جنگ بالفعل شروع تھی اور کسی وقت بھی اتنا وقفہ نہ مل سکا کہ نماز پڑھ سکیں اور صلوٰۃِ خوف بھی ایسے شدید وقت میں ملتوی ہو جاتی ہے جیسا کہ احادیث اور کتبِ فقہ میں مفصل مذکور ہے۔

مشرکوں[2] کے گھروں کے آگ سے بھرے جانے سے مراد ان کی تباہی و بربادی، لٹ جانا اور ان کا گرفتار و ذلیل ہونا ہے۔ چنانچہ یہ دعا حرف بحرف پوری ہوئی اور جو لوگ ان مخالفوں میں سے اسلام نہ لائے تھے ان پر یہ سب کچھ وارد ہو کر رہا ان کے قبروں کے آگ سے بھرے جانے کا مطلب ان کے لیے عذابِ آخرت اور جہنم کی سزا ہے۔ آگ کا لفظ یہاں بطور استعارہ استعمال ہوا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

---

[1] مرقات ۲ ص ۱۴۷، مظاہر حق ج ۱ ص ۲۲۵۔ [2] ایضاً مرقات۔

باب الأذان

اذانؔ کا لفظی معنی اِعلام (اطلاع دینا، خبردار کرنا) ہے۔ قرآنِ پاک میں ہے وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ (التوبہ) اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے خبردار کیا جاتا ہے۔ ایک اور جگہ فرمایا ہے وَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌ بَیْنَھُمْ "اور ان کے درمیان ایک پکارنے والے نے پکار کر کہا"۔ اور شرعی اصطلاح میں ایک خاص قسم کے اعلام و اطلاع کو جو خاص اوقات میں کیا جاتا ہے، اذان کہتے ہیں۔

قرآن مجید میں سورۂ جمعہ کی اس آیت میں اذان کا ذکر ہے: اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ وَذَرُوا الْبَیْعَ۔ (الجمعہ) اسی طرح ایک اور آیت میں فرمایا: وَاِذَا نَادَیْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ اتَّخَذُوْھَا ھُزُوًا وَّلَعِبًا۔ لیکن کلماتِ اذان کا ذکر قرآن پاک میں نہیں ہے۔ یہ سنت و حدیث سے ثابت ہوئے ہیں جو قرآن کی شرح و تفصیل ہے اگر اس حقیقت کو تسلیم نہ کیا جائے تو بتانا پڑے گا کہ وہ نداء کونسی ہے جس کا ذکر اِن آیات میں آیا ہے؟ اور اس نداء کے الفاظ کہاں سے ثابت ہوئے ہیں۔

علامہؒ علی القاریؒ فرماتے ہیں کہ: اذان کی جو تعریف اوپر گذری کہ وہ اوقاتِ مخصوصہ میں کلماتِ مخصوصہ کے ساتھ نماز کے لیے ایک خاص قسم کا اعلام و اطلاع ہے۔
چنانچہ حافظ ابن حجرؒ نے اس کی تعریف میں فرمایا ہے: ھو لغۃ الاعلام وشرعًا قول مخصوص یعلم بہ وقت الصلوٰۃ۔ پس اس تعریف کی رُو سے وہ اذان جو نماز کے علاوہ دی جاتی ہے خارج ہو گئی۔ مثلاً نئے پیدا ہونے والے بچے کے کان میں جو اذان و اقامت کہی جاتی ہے اور غم و الم اور گھبراہٹ کی اذان بھی مسنون ہے اور بد خلق انسان اور جانور کے کان میں بھی اذان کہی جاتی ہے۔
(اس کے علاوہ بھی بعض مواقع پر اذان ثابت ہے)

۱؎ مرقات ج ۲ صـ ۱۴۹، قسطلانی ج ۲ صـ ۲، نیل الاوطار ج ۱ صـ ۳۳۱۔
۲؎ ایضاً مرقات۔

اذان[1] ہجرت کے پہلے ہی سال شروع ہوئی تھی اذان کے تقرر سے پہلے لوگ ایک دوسرے کو آواز دے کر بلایا کرتے تھے اور ایک منادی کرنے والا بلند آواز سے کہہ دیا کرتا تھا الصّلوٰۃ جَامِعَۃٌ ۔ اور لوگ جمع ہو جایا کرتے تھے ۔ مسند بزار میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے شبِ معراج میں اذان دیتے ہوئے فرشتے) کو دیکھا تھا لیکن ابھی تک اذان کا حکم نہیں ملا تھا لہذا مکہ میں اذان نہ دی گئی ۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ مکہ میں اسلام کمزور تھا ، مسلمان کم تھے ، اس کی ضرورت بھی محسوس نہ ہوئی ۔ جب مدینہ میں اس کی ضرورت محسوس ہوئی ۔ مسجد نبویؐ تیار ہو چکی ۔ اسلام بفضل خدا قوی ہو گیا تو صحابہؓ نے آپؐ سے عرض کیا کہ لوگوں کو اطلاع دینے کا کوئی ذریعہ ہونا چاہیئے ۔ اور حضرت عمر فاروقؓ ، عبداللہ بن زیدؓ اور بعض دیگر صحابہؓ کو اذان خواب میں سکھائی گئی ۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ یہ بر حق خواب ہے ۔ اور بعض دیگر احادیث میں وحی کا لفظ بھی وارد ہے ۔ ممکن ہے کہ اس سے مراد وہی شبِ معراج والی اذان کا دکھایا جانا ہو یا بذریعہ وحی خفی حضورؐ کو بتایا گیا ہو کہ اس اذان کو جاری کر دیا جائے ۔

حضرت[2] شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ اذان اور اقامت تمام اہل اسلام کے اجماع و اتفاق سے اسلام کے شعائر میں سے ہے ۔ اگر کسی علاقے کے لوگ اذان و اقامت کے ترک پر اصرار کریں تو حاکم اسلام کا فرض ہوگا کہ اس جماعت کے ساتھ قتال کرے ۔ اور صحیح حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی قوم پر چڑھائی کرتے تھے تو اچانک حملہ نہ کرتے بلکہ صبح تک انتظار فرماتے تھے ۔ پھر اگر اذان کی آواز اس بستی سے سنتے تو حملہ نہ کرتے ورنہ چڑھائی کر دیتے تھے ۔ حضرت شاہؒ صاحب کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اذان و اقامت گو سنت مؤکدہ ہیں لیکن ان کی حیثیت اتنی اہم ہے کہ وہ اسلامی شعائر ہیں ، جیسے قربانی وغیرہ ۔

علامہ[3] علی القاریؒ فرماتے ہیں کہ اذان فرائض (فرض نماز دں) کے لیے سنت ہے اور اسے واجب بھی کہا گیا ہے کیوں کہ امام محمدؒ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا

---

[1] فیض الباری ج ۲ ص ۱۵۶ ، ایضاً حاشیہ ۔

[2] مصفّی ج ا ص ۸۲ ۔ [3] مرقات ج ۲ ص ۱۴۹ ۔

کہ اگر کسی علاقے کے لوگ اس کے ترک پر اتفاق کر لیں تو میں ان سے قتال کروں گا اور اگر ان میں سے ایک اس کے ترک پر اصرار کرے تو میں اسے ماروں پیٹوں گا اور قید کر دوں گا۔ علامہ علی القاریؒ فرماتے ہیں کہ امام محمدؒ کے اس قول سے اذان کا واجب ہونا ثابت نہیں ہوتا گو اس کی تاکید اور اہمیت ثابت ضرور ہوتی ہے کیونکہ امام محمدؒ سے یہ بھی منقول ہیں کہ اگر کسی علاقے کے لوگ جان بوجھ کر ایک سنت کو چھوڑ دیں تو میں ان سے قتال کروں گا[1]

لیکن حنفیہ میں سے امام ابن ہمامؒ جیسے عظیم عالم اور محدث نے اس کے وجوب پر اصرار کیا ہے۔

علامہ شوکانیؒ[2] نے فرمایا ہے کہ حافظ ابن حجرؒ نے قرطبیؒ سے نقل کیا ہے کہ اذان تھوڑے سے الفاظ ہونے کے باوجود عقائد اسلامیہ کے مسائل پر مشتمل ہے۔ علامہ موصوف نے مسند احمدؒ کی ایک حدیث کی شرح کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ اس حدیث سے اذان اور اقامت کے واجب ہونے پر استدلال کیا گیا ہے اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا: ما من ثلاثة لا يؤذنون ولا تقام فيهم الصلوٰة الا استحوذ عليهم الشيطان۔

الفصل الاوّل

حدیث ۱: عن انس ذكروا النار والناقوس فذكروا اليهود والنصارٰى فامر بلال ان يشفع الاذان وان يوتر الاقامة قال اسمٰعيل فذكرته لايوب فقال الا الاقامة۔ متفق عليه۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ صحابہؓ نے آگ اور ناقوس کا ذکر کیا۔ پھر انہوں نے یہود و نصاریٰ کا ذکر کیا۔ پس بلالؓ کو حکم ملا کہ وہ اذان کو دوہرا کہے اور اقامت کو اکہرا کہے۔ راوی حدیث اسمٰعیل بن عُلیّہ فرماتے ہیں کہ میں نے یہ حدیث ایوب سختیانی سے بیان کی تو انہوں نے فرمایا

---

[1] فیض الباری ج ۲ ص ۱۵۶۔ [2] نیل الاوطار ج ۱ ص ۳۳۱۔

کہ اقامتِ صلوٰۃ میں قد قامت الصَّلوٰۃ کا لفظ دو مرتبہ ہے لہٰذا اس کے علاوہ اقامت اکہری ہوگی۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔

شرح: اس[1] حدیث میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے وہ مدینہ منورہ میں پیش آیا تھا جبکہ نمازیوں کو جمع کرنے اور اطلاع دینے کے لیے کسی ذریعے کی ضرورت پیش آئی۔ حضورؐ کا یہ قاعدہ تھا کہ جس امر میں کوئی وحی نازل نہ ہوئی ہوتی اس میں مشورہ فرمایا کرتے تھے۔ قرآن کا ارشاد ہے: وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ۔ اور ایک آیت میں صریح حکم ہے وَشَاوِرْھُمْ فِی الْاَمْرِ۔ اسی قاعدے کے مطابق، اذان کے لیے بھی مشورہ ہوا تھا۔ بعض لوگوں کی رائے تھی کہ نماز کے وقت کسی بلند جگہ پر آگ جلادی جائے تاکہ اس کا دھواں دیکھ کر (دن کو) یا خود آگ کو دیکھ کر (رات کو) لوگ جمع ہو جایا کریں۔ بعض کی رائے تھی کہ ناقوس بجایا جائے اور اس کی آواز سن کر لوگ جمع ہو جایا کریں۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ آگ جلانے میں آتش پرستوں کی مشابہت پائی جاتی تھی اور ناقوس بجانے میں یہود و نصاریٰ کی مشابہت تھی۔ لہٰذا ان تجاویز کو ناپسند کیا گیا اور کسی فیصلہ پر پہنچے بغیر مجلس برخاست ہوگئی۔ پھر رات کو عبداللہ بن زیدؓ حضرت عمر فاروقؓ اور بعض اور روایات کے مطابق نو اور صحابیوں نے خواب میں فرشتے کو اذان کہتے سنا۔ عبداللہ بن زیدؓ سب سے پہلے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور ان کے خواب کو حضورؐ نے من جانب اللہ قرار دے کر حضرتِ بلالؓ کو ان سے اذان سیکھ کر باآواز بلند اسے پکارنے کا حکم دیا۔ اذان سن کر حضرت عمرؓ بھی بھاگم بھاگ حضورؐ کی خدمت میں پہنچے اور اپنا خواب بیان کیا (اسی طرح اور لوگوں نے بھی اپنا اپنا خواب بیان کیا ہوگا)۔

اس[2] حدیث سے اذان کے کلمات کا دوہرا ہونا اور اقامت کے کلمات کا سوائے قد قامت الصَّلوٰۃ کے اکہرا ہونا ثابت ہوتا ہے۔ صحابہؓ، تابعین اور ائمۂ فقہ میں سے اکثریت کا یہی مسلک ہے۔ امام مالکؒ، زہریؒ، شافعیؒ، اوزاعیؒ، احمدؒ اور اسحاق اسی کے قائل ہیں۔ حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ اذان اور اقامت

---

1. مظاہر حق ج ۱ صـ۲۲۳، مرقات ج ۲ صـ۱۴۹۔
2. مظاہر حق ایضاً۔ مرقات ج ۲ صـ۱۵۰۔

ہر دو کے کلمات برابر ہیں اور ان کے پاس اس کے لیے دلائل موجود ہیں۔ اسی مشکوٰۃ کی تیسری فصل میں ابوداؤد، مسند، دارمی، ابن ماجہ اور ترمذی کی ایک حدیث بیان کی ہے جس میں حضرت عبداللہؓ بن زید فرماتے ہیں کہ خواب میں مجھے فرشتے نے اذان، سکھائی اس کے کلمات یہ تھے (اس کے بعد اذان کے کلمات بتائے ہیں) اور پھر فرماتے ہیں وَکَذَا الاِقَامَۃ اور اسی طرح اقامت کے بھی الفاظ یہی کلمات فرشتے نے بیان کیے تھے۔

اس حدیث میں اذان کے لیے شفع اور اقامت کے لیے وتر کا لفظ آیا ہے۔ لیکن مشکوٰۃ کے اسی باب کی دوسری فصل میں ترمذی کی روایت میں اذان کے لیے ترسّل اور اقامت کے لیے حدر کا لفظ وارد ہوا ہے۔ حنفیہ ان احادیث کو یوں جمع کرتے ہیں کہ اذان کے کلمات میں سے ہر ایک کو الگ الگ کہا جاتا ہے لیکن[۱] اقامت میں وہ کلمات جو ایک ہی طرح کے ہوں انہیں ملا کر ایک ہی سانس میں ادا کیا جائے چنانچہ امام محمدؒ نے اہل مدینہ سے اذان پر گفتگو کرتے ہوئے ایتار کا معنی بیان کیا تھا کہ اقامت کے ایک قسم کے کلمات کو جلدی جلدی ایک ہی سانس میں کہا جائے۔ پھر یہ بھی[۲] معلوم رہنا چاہیئے کہ احناف کے ہاں بھی کلماتِ اقامت میں ایتار (اکہرا اکہرا کہنا) جائز ہے۔ جیسا کہ شیخ نورالدین طرابلسیؒ سے حضرت سید انور شاہؒ محدث کاشمیری نے نقل کیا ہے۔ گو عام حنفیہ کا عمل یہی ہے کہ اذان اور اقامت کے کلمات ایک ہی جیسے اور ایک ہی جتنے کہے جائیں۔ اقامت کا دوہرا ہونا آسمانی فرشتے کی تکبیر کے علاوہ ابومحذورہؓ کی اقامت سے بھی ثابت ہوتا ہے اور بلالؓ کی عام روایات گو ایتار کی ہیں لیکن بعض روایات ان سے شفع و تثنیہ کی بھی موجود ہیں جنہیں[۳] مصنف عبدالرزاق، دارقطنی، طحاوی، اور طبرانی میں بیان کیا گیا ہے۔

عبداللہ بن زیدؓ کی روایت جس میں اذان اور اقامت دونوں کے کلمات دوہرے بتائے گئے ہیں اسے امام بیہقیؒ نے بھی بیان کیا ہے اس پر[۴] مفصل کلام نصب الرایہ میں موجود ہے۔

۱۔ فیض الباری ج ۲ ص ۱۶۰ ۲۔ فیض الباری ج ۲ ص ۱۶۱۔

۳۔ نصب الرایہ ج ۱ ص ۲۶۹، ص ۲۷۰۔ ۴۔ نصب الرایہ ج ۱ ص ۲۶۹، ص ۲۷۰۔

علامہ شوکانیؒ نے نیل الاوطار میں کیفیتِ اذان پر گفتگو کے دوران اذان کے کلمات کے دوہرا اور اقامت کے کلمات کے اکہرا ہونے کے دلائل بیان کیے ہیں، جس کا جی چاہے ان دلائل کو وہاں ملاحظہ کرے۔[1]

حدیث ۲: وعن ابی محذورۃؓ قال القی علی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم التاذین ھو بنفسہٖ فقال قل اللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر، اشھد ان لا الہ الا اللّٰہ، اشھد ان لا الہ الا اللّٰہ، اشھد ان محمداً رسول اللّٰہ، اشھد ان محمداً رسول اللّٰہ، ثم تعود فتقول اشھد ان لا الہ الا اللّٰہ اشھد ان لا الہ الا اللّٰہ، اشھد ان محمداً رسول اللّٰہ، اشھد ان محمداً رسول اللّٰہ، حی علی الصلوٰۃ، حی علی الصلوٰۃ، حی علی الفلاح، حی علی الفلاح، اللّٰہ اکبر، اللّٰہ اکبر لا الہ الا اللّٰہ. رواہ مسلم.

ترجمہ: ابو محذورہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود مجھے اذان، سکھائی اور فرمایا کہ کہو اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر، اشہد ان لا الہ الا اللہ، اشہد ان لا الہ الا اللہ، اشہد ان محمد ارسول اللہ، اشہد ان محمدارسول اللہ، پھر دوبارہ کہو اشہد ان لا الہ الا اللہ، اشہد ان لا الہ الا اللہ، اشہد ان محمدارسول اللہ، اشہد ان محمداً رسول اللہ، حی علی الصلوٰۃ، حی علی الصلوٰۃ حی علی الفلاح، حی علی الفلاح، اللہ اکبر، اللہ اکبر، لا الہ الا اللہ، اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا۔

شرح: حضورؐ کی مسجد میں جو اذان دی جاتی تھی اور حضورؐ نے جو بلالؓ کو عبداللہ بن زیدؓ کے ذریعے سکھائی تھی۔ پھر مسجد نبویؐ کے دوسرے مؤذن عبداللہ بن ام مکتومؓ جو اذان دیا کرتے تھے وہ وہی ہوتی تھی جس کا ذکر بلالؓ کی اذان میں بہت سی احادیث میں موجود ہے۔ لیکن ابو محذورہؓ کی روایت میں ترجیع بھی آئی ہے اور اس میں شک نہیں کہ صحیح احادیث سے یہ ترجیع[2] بلا ریب ثابت ہے۔ اس لیے ترجیع اور

---

[1] نیل الاوطار ج ۱ ص ۳۴۷ - [2] فیض الباری ج ۲ ص ۱۶۱۔

عدمِ ترجیع دونوں امر کا اقرار ضروری ہے ۔ گفتگو صرف اختیار و استحباب میں رہ جاتی ہے اور جو لوگ ترجیع کا بالکل انکار کرتے ہیں وہ غلط کار اور حق سے نکلنے والے ہیں۔ کیوں کہ اس کے ثبوت میں کوئی شک و شبہ نہیں ۔ اور مکہ میں امام شافعیؒ کے زمانہ تک اذان میں اس کا ثبوت علی الاعلان مسجد کے میناروں سے ملتا رہا ہے پس اختلاف صرف افضلیت میں رہ جاتا ہے ۔ اس بارے میں حنفیہ یہ کہتے ہیں کہ آسمان سے نازل ہونے والے فرشتے کی اذان اور حضرت بلالؓ اور حضورؐ کے دیگر مؤذنوں کی اذان ہمارے لیے حجت ہے اگر ترجیع افضل ہوتی تو حضورؐ بلالؓ کو بھی اس کا حکم دیتے لیکن یہ ثابت نہیں ہو سکا ۔

حضرت سید انور شاہؒ محدث کاشمیری فرماتے ہیں کہ غالباً ترجیع اہل مکہ کے حال کے زیادہ مناسب تھی کیوں کہ وہاں ۱۳ سال تک توحید و رسالت کی آواز کو برسرِ عام کہنے سے شدت کے ساتھ روکا گیا تھا ۔ اس لیے جب اللہ تعالیٰ نے مکہ کو فتح کرنے کی توفیق دی تو حضورؐ نے شہادتین کو بآوازِ بلند اور دہرا دہرا کر پکارنے کا حکم دیا۔ لیکن مسجدِ نبویؐ میں اسی اذان پر عمل درآمد رہا جو آسمانی فرشتے نے صحابہؓ کو سکھائی تھی اور حضورؐ نے اس کی تصدیق فرما کر بلالؓ کو بآوازِ بلند پکارنے کا حکم دیا تھا اور اکثر قولی و فعلی احادیث اسی کی تائید میں ہیں ۔

علامہ[1] شوکانیؒ نے ابو محذورہؓ کی حدیث پر مفصل کلام کیا ہے اور اسے کئی وجوہ سے قابلِ ترجیح قرار دیا ہے ۔ لیکن یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں رہا کہ بلالؓ کی اذان اور آسمانی فرشتے کی اذان میں ترجیع نہیں تھی ۔

علمائے[2] حنفیہ نے کہا ہے کہ حضورؐ نے ابو محذورہؓ کو تعلیم و تلقین کے لیے شہادتین کا اعادہ کرایا تھا اس کی غرض تشریع نہ تھی ورنہ بلالؓ کی اذان بھی ایسی ہی ہوتی اور اس کی دلیل وہ یہ بھی دیتے ہیں کہ خود ابو محذورہؓ سے ایک روایت میں ترجیع کا ذکر نہیں ہے ۔ اسی طرح مسجدِ قباء کے مؤذن سعدؓ قرظ کی اذان میں بھی ترجیع نہ تھی بات[3] یہ ہوئی کہ ابو محذورہؓ نے پہلے شہادتین کو آہستہ آہستہ پڑھا تو حضورؐ نے پھر از سرِ نو

---

[1] نیل الاوطار ج ۱ ص ۳۲۷، ص ۳۳۹ ۔ [2] مظاہر حق ج ۱ ص ۲۲۹ ۔
[3] مرقات ج ۲ ص ۱۵۱ ۔

بلند آواز سے یہ کلمات پڑھوائے تھے۔ چنانچہ طبرانی کی روایت میں جو ابو محذورہؓ سے ہے ترجیع کا کوئی ذکر نہیں ملتا اسی لیے امام ابن ہمامؒ نے فرمایا ہے کہ یہ ترجیع والی حدیث بہت سی صحیح قولی و فعلی احادیث سے متعارض ہے۔

لیکن اس سلسلے میں حق و انصاف کی بات وہی ہے جو اوپر سید المحدثین حضرت انور شاہؒ کشمیری کے حوالہ سے گزری۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ابو محذورہؓ کو اذان حضورؐ نے اس وقت سکھائی تھی جبکہ وہ بالکل نئے نئے اسلام لائے تھے۔ ان کے دل میں شہادتِ توحید و رسالت کو پکا کرنے کے لیے حضورؐ نے کلماتِ شہادت کو دو بار کی بجائے چار بار دُہرایا تھا تاکہ اسلام اچھی طرح ان کے دل میں بیٹھ جائے۔ انہوں نے سمجھا کہ اذان کے کلمات ہی اس قدر ہیں۔

باب فضل الاذان واجابۃ المؤذن

مولانا قطب الدینؒ فرماتے ہیں کہ اذان کی فضیلت میں بہت سی احادیث آئی ہیں۔ اگر امام امامت کے حقوق پورا کرنے کا گمان غالب رکھتا ہے تو اس کے لیے امامت کرانا افضل ہے۔ بعض احادیث میں حضورؐ کے خود اذان دینے کا ذکر آتا ہے۔ لیکن اکثر احادیث کی بنا پر ان کا معنی یہی ہے کہ آپؐ نے اذان کا حکم ارشاد فرمایا اور یہ محاورہ ہے کہ حاکم نے قلعہ بنایا۔ مراد اس سے یہی ہوتی ہے کہ اس نے قلعہ بنانے کا حکم دیا ورنہ وہ خود تو قلعہ نہیں بنایا کرتا۔

اذان[۳] کا جواب دینا واجب ہے اگر کئی اذانیں سُنے تو پہلی اذان کا جواب دینا واجب ہے اگر کئی طرف سے بیک وقت اذان کی آواز آئے تو اپنی مسجد کے مؤذن کا جواب دینا چاہیئے اور جو شخص بوقت اذان اسی مسجد کے اندر موجود ہے۔ اس نے چونکہ عملی طور پر اجابتِ اذان کر رکھی ہے لہذا زبانی طور پر اس پر اجابت

۱؎ نصب الرایہ ج ۱ ص ۲۶۳ بحوالہ علامہ ابن الجوزی۔ ۲؎ مظاہر حق ج ۱ ص ۲۳۳

۳؎ ایضاً۔ لیکن واجب سے مراد یہاں واجبِ اصطلاحی نہیں صرف تاکید مراد ہے۔ مفصل آگے آرہا ہے۔

واجب نہیں ہے۔ اور جو شخص قرأتِ قرآن میں مصروف ہو اس کے متعلق اختلاف ہوا ہے کہ اذان کا جواب دے یا نہ دے۔ مختار یہی ہے کہ نہ دے کیونکہ وہ اس سے زیادہ اہم عبادت میں مصروف ہے۔

الفصل الاوّل

حدیث ۱: عن معاویۃ رضؓ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول المؤذنون اطول الناس اعناقا یوم القیامۃ۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ: حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے سُنا کہ قیامت کے دن اذان دینے والوں کی گردنیں سب لوگوں سے زیادہ لمبی ہوں گی۔ اسے مسلم نے روایت کیا۔

شرح: اطول الناس اعناقاً[1] کا معنی یا تو یہ ہے کہ ان کے اعمال بہت زیادہ ہوں گے۔ محاورہ ہے لِفلان عنق من الخیر ای قطعۃ منہ۔ خلاصہ یہ ہے کہ عنق سے مراد یہاں حصہ اور ٹکڑا ہے۔ تو حدیث کا معنی یوں ہوا کہ سب لوگوں سے مؤذنوں کا حصہ اعمال میں سے زیادہ ہوگا۔ یا گردن کا لمبا ہونا سرداری سے کنایہ ہے یعنی ان لوگوں کی قیامت میں عزت افزائی ہوگی اور ان کی حیثیت وہاں سرداروں کی سی ہوگی۔ (غود لفظ سردار بھی اسی عربی محاورے سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم)۔ یا اس سے مراد اللہ تعالیٰ سے بہت زیادہ امیدوار رحمت وفضل ہونا ہے کیوں کہ جو شخص کسی چیز کی امید رکھے اس کی طرف گردن اٹھا اٹھا کر دیکھتا ہے۔ یا اس سے مراد قربِ الٰہی ہے کیونکہ گردن کی لمبائی غالباً قد کی لمبائی پر دلالت کرتی ہے۔ سو اس سے مراد یہ ہوا کہ وہ دوسروں کی نسبت خدا تعالیٰ سے زیادہ قریب ہوں گے اور ان کی شان اوروں پہ بلند ہوگی یا اس سے مراد یہ ہے کہ خجالت اور شرمندگی سے جن کی گردنیں خم ہوں گی مؤذن ان میں سے نہیں ہونگے بلکہ خدا کے فضل سے گردن اٹھا کر رحمتِ الٰہی کی طرف جا رہے ہونگے۔

---

[1] مظاہر حق ج اص۲۳۳، مرقات ج ۲ ص۱۵۸۔

اذان کی فضیلت اس لیے ہے کہ اس میں عقائدِ اسلام کی تشہیر و اعلان ہے۔ اور مؤذن اس اعلان کا سبب بنتا ہے۔ واللہ اعلم۔

حدیث ۲ : وعن ابی ھریرۃ رضؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا نودی للصلوٰۃ ادبر الشیطان لہ ضُراط حتی لا یسمع التاذین فاذا قضی النداء اقبل حتی اذا ثوب بالصلوٰۃ ادبر حتی اذا قضی التثویب اقبل حتی یخطر بین المرء ونفسہٖ یقول اذکر کذا اذکر کذا بما لم یکن یذکر حتی یظل الرجل لا یدری کم صلیٰ متفق علیہ۔

ترجمہ : حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب نماز کے لیے اذان دی جاتی ہے تو شیطان پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلتا ہے اور وہ گوز مارتا ہوا جاتا ہے تاکہ اذان کی آواز کو نہ سُنے پھر جب اذان ہو چکتی ہے تو پھر آجاتا ہے حتیٰ کہ جب نماز کے لیے اقامت کہی جاتی ہے تو پھر پیٹھ پھیر کر بھاگ جاتا ہے حتیٰ کہ جب اقامت ہو چکتی ہے تو پھر آجاتا ہے اور آدمی اور اس کے دل میں حائل ہونے لگتا ہے اور وسوسے (خطرات) ڈالنے لگتا ہے۔ اسے کہتا ہے فلاں بات یاد کر فلاں چیز یاد کر اور فلاں کام یاد کر۔ جو چیزیں آدمی کو یاد نہیں ہوتی وہ اسے یاد دلاتا ہے یہاں تک کہ آدمی یہ تک بھولنے لگتا ہے کہ اس نے کتنی نماز پڑھی ہے۔ متفق علیہ۔

شرح : اذان[1] میں بعض خصوصیات ایسی ہیں جو کسی اور عبادت میں نہیں مثلاً عقائدِ حقہ کا اعلان و اظہار اور شہادتین کا برسرِ عام بیان۔ یہی سبب ہے کہ شیطان اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ اور نماز میں گو اللہ تعالیٰ کی مناجات اور دعا ہے لیکن اس میں اتنا اظہار و اعلان نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قیامت کے دن ہر خشک و تر چیز مؤذن کے لیے شہادت دے گی اور شیطان لعین پر یہ چیز بھی بہت بوجھل ہے کہ کسی مومن کا یہ مقام بنے۔

---

[1] فیض الباری ج ۲ صـ ۱۶۳۔

[1] شیطان کی گوز زنی یا تو حقیقت پر مبنی ہے جس طرح کہ گدھے پر بہت بوجھ لاد دیں تو اس کی بھی یہی حالت ہو جاتی ہے۔ اور اس سے یہ بھی مراد لیا گیا ہے کہ یہ محاوراتی کلام ہے اور شیطان کی گھبراہٹ پر، جو کلماتِ اذان کی ہیبت و عظمت سے اس پر طاری ہو جاتی ہے، ان الفاظ سے بطور استعارہ تبصرہ فرمایا گیا ہے۔ یا یوں کہیے کہ وہ کلماتِ اذان کے سماع سے بچنے کے لیے کوئی مکروہ قسم کی آواز نکالتا ہے، اس کی تعبیر گوز زنی سے فرمائی گئی ہے۔

[2] حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں اس حدیث کی شرح میں علامہ ابن الجوزی سے نقل کیا ہے کہ اذان کی آواز شیطان پر بہت بوجھل ہے کیونکہ اذان میں ریا کاری یا غفلت کا شائبہ بہت کم ہوتا ہے لیکن نماز میں نفس انسانی غفلت، وسوسے اور ریاکاری کا شکار ہو سکتا ہے۔ اسی لیے محدث ابو عوانہ نے اس حدیث پر یہ عنوان رکھا ہے: الدلیل علیٰ ان المؤذن فی اذانہ واقامتہ منفی عنہ الوسوسۃ و الریاء لتباعد الشیطان عنہ۔

[3] حافظ ابن حجرؒ نے ابن بطال سے نقل کیا ہے کہ ہو سکتا ہے اذان کے بعد مسجد سے نکلنے کی جو ممانعت آئی ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ اس فعل سے شیطان کی مشابہت لازم آتی ہے جو اذان کی آواز سے گھبرا کر بھاگ اٹھتا ہے۔ حافظ صاحبؒ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ بزرگوں نے اس حدیث سے بعض ایسے مواقع پر بھی اذان دینے کا استدلال کیا ہے جہاں اس کا بھگانا مدِّ نظر ہو اذان دینی چاہیئے (مثلاً خوف کا وقت یا جنگل و صحرا کی تنہائی اور راستہ بھول جانا وغیرہ)

نماز میں[4] شیطان کی وسوسہ اندازی سے امام ابو حنیفہؒ نے (بقول حافظ ابن حجر عسقلانی، فتح الباری ج ۲ ص ۵۸) ایک عجیب استنباط کیا۔ ہوا یوں کہ کسی شخص نے ان کے سامنے شکایت کی کہ اس نے اپنے مکان میں کہیں مال دفن کیا تھا لیکن اب وہ جگہ یاد نہیں آرہی۔ فرمائیے مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ امامؒ نے فرمایا کہ اپنے گھر میں نماز

---

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۲۳۴، مرقات ج ۲ ص ۱۵۹۔ [2] فیض الباری ج ۲ ص ۱۶۳ (حاشیہ)
[3] فیض الباری ج ۲ ص ۱۶۲ (حاشیہ) [4] فیض الباری ایضاً۔

پڑھو اور پوری کوشش کرو کہ کوئی وسوسہ نہ آنے پائے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ آخر شیطان اس پر حملہ آور ہوا اور اسے مال کی جگہ بتا کر نماز سے ہٹا دیا۔

حدیث ۳ : وعن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لایسمع مدیٰ صوت المؤذن جن ولا انس ولا شیئ الا شہد لہ یوم القیامۃ۔ رواہ البخاری

ترجمہ : ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اذان دینے والے کی آواز جہاں تک پہنچتی ہے وہاں تک جس قدر جن، انسان اور دوسری چیزیں ہوتی ہیں وہ سب قیامت کے دن اس کے حق میں گواہی دیں گے۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا۔

شرح : مدیٰ کا معنیٰ ہے غایت، انتہا، جسے اردو میں بھنک کہتے ہیں یعنی آواز تو آئے لیکن اس سے کچھ سمجھا نہ جا سکے۔ آواز کی بجائے مدیٰ کا لفظ بولنے سے یہ بتانا مدنظر ہے کہ مؤذن کی غیر مفہوم آواز بھی جہاں تک پہنچے گی وہاں تک ساری مخلوق اس کی گواہ بن جائے گی۔ اس حدیث میں اذان میں آواز کو بلند کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔

علامہ علی القاری[۲] نے اس حدیث سے اس بات پر بھی استدلال کیا ہے کہ حیوانات نباتات اور جمادات میں بھی ایک گونہ علم و ادراک اور شعور پایا جاتا ہے جیسا کہ قرآنِ پاک میں ہے: وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ (البقرہ) وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ۔ اور حدیث میں ہے کہ ایک پہاڑ دوسرے سے پوچھتا ہے کیا تمہارے پاس (یا اوپر سے) کوئی خدا کو یاد کرنے والا گزرا ہے؟ تو اگر دوسرا پہاڑ کہے ہاں تو پہلا خوش ہوتا ہے۔ اسی طرح حدیث میں بھیڑیے اور بیل کا بات کرنا بھی مذکور ہے۔

میدانِ[۳] قیامت میں ساری مخلوق کی شہادت زبانِ حال سے ہی نہیں ہوگی جیسا کہ حافظ ابن حجر نے فرمایا ہے بلکہ یہ گواہی زبانِ قال سے ہوگی، قرآن کہتا ہے وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ ایک اور آیت میں ہے يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا۔ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا

---

[۱] مظاہر حق ج ۱ ص ۲۳۴، مرقات ج ۲ ص ۱۶۰۔ [۲] ایضاً۔ [۳] ایضاً

اور میدانِ قیامت خرقِ عادات کا محل ہے - وہاں وہ کچھ ہو گا جو کبھی اور کہیں نہیں ہوا ہو گا -

حدیث ۴ : وعن عبد الله بن عمرو بن العاص قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا سمعتم المؤذن فقولوا مثل ما یقول ثم صلوا علی فانه من صلی علی صلاةً صلی الله علیه بها عشراً ثم صلوا الله لی الوسیلة فانها منزلة فی الجنة لا تنبغی الا لعبد من عباد الله وارجوا ان اکون انا هو فمن سأل لی الوسیلة حلت علیه الشفاعة - رواه مسلم -

ترجمہ : حضرت عبداللہ بن عمرو ابن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ حضور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم مؤذن (کی آواز) کو سنو تو جس طرح وہ کہے تم بھی کہو - پھر مجھ پر صلوٰۃ بھیجو (یعنی اذان کے بعد) کیونکہ جو شخص مجھ پر ایک دفعہ صلوٰۃ بھیجے اللہ تعالیٰ اس پر دس مرتبہ رحمت بھیجتا ہے - پھر تم میرے لیے اللہ سے وسیلہ طلب کرو کیونکہ وہ جنت کا ایک مقام ہے جو خدا کے بندوں میں سے ایک کے سوا کسی کے لیے روا نہیں (لائق نہیں) اور میں امید کرتا ہوں کہ وہ بندہ میں ہوں گا - پس جو شخص میرے لیے وسیلہ مانگے گا اس کے لیے شفاعت حلال (یا واجب) ہو گئی - اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے -

شرح : سید محمد انور شاہ[1] کشمیری فرماتے ہیں کہ اذان کا جواب دینے والے کے وظائف تین ہیں -

الف : جو کچھ مؤذن کہے وہ بھی صرف وہی کہے - اور ساری اذان میں ایسا ہی کرے -

ب : حی علی الصلوٰۃ اور حی علی الفلاح کو سن کر لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ الخ پڑھے جیسا کہ آئندہ حدیث میں آرہا ہے اور باقی تمام کلمات کو مؤذن سے سن کر دوہراتا رہے -

ج : ان دونوں کو جمع کرے اور امام ابن الہمامؒ نے اسی کو پسند کیا ہے اور اسے

---

[1] فیض الباری ج ۲ ص ۱۶۳ -

شیخ اکبر ابنِ عربی کی طرف منسوب کیا ہے۔

لیکن حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک زیادہ بہتر یہی ہے کہ جس مقام پر دو قسم کے اوراد و وظائف وارد ہوئے ہیں وہاں کبھی ایک کو اور کبھی دوسرے کو پڑھنا چاہیئے اور ہمیشہ انہیں جمع بھی نہیں کرنا چاہیئے پس کبھی تو مؤذن کی طرح حی علی الصلوٰۃ، حی علی الفلاح پڑھنا چاہیئے اور کبھی ان دونوں جگہوں پر لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ الخ پڑھنا چاہیئے[1] تاکہ دونوں احادیث پر عمل ہو جائے۔

صبح کی اذان میں جب مؤذن اَلصَّلوٰۃ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْم کہے تو اس کے جواب میں یوں کہنا چاہیئے صَدَقْتَ وبَرِرْتَ وَبِالحَقِّ نطقتَ۔ علامہ قسطلانیؒ نے فرمایا ہے کہ اوپر کے استثناد کے علاوہ اقامت میں قد قامتِ الصّلوٰۃ پر اَقَامَھَا اللّٰہُ وَاَدَامَھَا کہنا چاہیئے[2]۔ علامہ مذکور یہ بھی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا حکم استحبابی ہے وجوب کے لیے نہیں ہے اور سب علماء اس پر متفق ہیں سوائے حنفیہؒ میں سے صاحب محیط کے اور مالکیہؒ میں سے ابن وہب کے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ دونوں حضرات اس حکم کے وجوبی ہونے کے قائل ہیں۔

وسیلہ کا لفظی معنی ہے قریب ہونا۔ آیتِ قرآنی وَابْتَغُوْا اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ کا یہ معنی کیا گیا ہے کہ خدا کا قرب (وسیلہ) تلاش کرو، یعنی ایسے عقائد و اعمال کو لازم پکڑو جو قربِ خداوندی کا باعث ہوں۔ اس حدیث[3] میں وسیلہ سے مراد جنت کا ایک مقام لیا گیا ہے۔ وجہ یہ کہ یہ مقام بھی قربِ خداوندی کا اعلیٰ ترین مقام ہونے کی وجہ سے وسیلہ کہلایا۔

اس حدیث میں جو حضورؐ پر درود و صلوٰۃ اور وسیلہ طلب کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔[4] اس کی تشریح خود صحیح احادیث میں آگے آرہی ہے۔ حضرت سید انور شاہ محدث کشمیری نے فرمایا[5] ہے کہ لوگ جو اذان میں اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ سن کر صلوٰۃ

---

[1] مظاہر حق ج ا صـ ۲۳۳، مرقات ج ۲ صـ ۱۶۱۔
[2] ارشاد الباری ج ۲ صـ ۸، نیل الاوطار ج ا صـ ۳۵۳ حسب روایت ابی داؤد
[3] قسطلانی ج ۲ صـ ۸، [4] مظاہر حق ج ا صـ ۲۳۴، مرقات ج ۲ صـ ۱۶۱۔
[5] فیض الباری ج ۲ صـ ۱۶۹۔

وسلام پڑھتے ہیں تو کوئی حدیث خاص اس موقع پہ درود پڑھنے کی نہیں آئی وہ اِن عام احادیث پر عمل کرنے کے لیے ایسا کرتے ہیں جن میں حضورؐ کے اسمِ گرامی کو سن کر صلوٰۃ وسلام پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ لیکن وہ نہیں جانتے کہ شریعت نے خود اس کا اہتمام کیا ہے اور وہ اس طرح کہ اذان کے بعد پہلے درود وسلام اور پھر ادعیۂ ماثورہ پڑھی جائیں۔ اس سے ایک تو اس حدیث پر عمل ہوگا اور دوسرے ہر دعا سے پہلے درود پڑھنا ثابت ہے پس اذان کے بعد صلوٰۃ پڑھ کر دعا پڑھی جائے تو دونوں امر حاصل ہو جاتے ہیں۔

علامہ علی القاریؒ[1] فرماتے ہیں کہ اذان دینے والے اذان کے بعد جو بلند آواز سے صلوٰۃ وسلام کئی مرتبہ پڑھتے ہیں اس کی اصل تو سنت ہے لیکن کیفیت بدعت ہے کیونکہ مسجد میں آواز بلند کرنا — خواہ ذکر کے لیے ہی ہو — مکروہ ہے بالخصوص مسجدِ حرام میں، کیونکہ اس سے طواف کرنے والوں، نمازیوں اور اعتکاف والوں کو تشویش ہوتی ہے۔ اور آجکل جو اذان سے قبل صلوٰۃ وسلام کا رواج چل نکلا ہے اس کا تو شرعاً کوئی ثبوت کسی طور پر بھی نہیں مل سکتا۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ہدایت دے جو دین میں اپنی خواہشاتِ نفس کو داخل کرتے، محض ضد اور تعصب کی بنا پہ نئے نئے طریقے عبادات کے ایجاد کرتے اور حبِ رسولؐ کے نام کو استعمال کر کے محض اپنے گروہی اور فرقہ وارانہ مقاصد پورے کرتے ہیں۔ العیاذ باللہ۔

اس حدیث میں اُرجُو اکا لفظ حضورؐ نے بطور تواضع بولا ہے کیونکہ جب سید الانام اور افضل الکائنات آپؐ ہیں تو قرب کا یہ انتہائی مقام بھی آپؐ ہی کو ملے گا اور حلّت کا لفظ یا تو "حلال ہو گئی" کے معنوں میں ہے یا یہ "حلول" سے ہے اور مطلب یہ ہے کہ وہ شخص میری شفاعت کا حقدار ہو گیا۔ یا حلت بمعنیٰ وَجَبَتْ ہے۔[2]

علامہ شوکانی[3] فرماتے ہیں کہ جناب پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کی کئی قسمیں اور ان کے حصول کے کئی طریقے اور اسباب ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے جو اس حدیث میں بیان فرمایا گیا ہے۔

حدیث ۵ : وعن عمرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و

---

[1] مرقات ج ۲ ص ۱۶۱   [2] ایضاً، مظاہر حق ج ۱ ص ۲۳۴۔

[3] نیل الاوطار ج ۱ ص ۳۵۴۔

سلم اذا قال المؤذن اللہ اکبر اللہ اکبر فقال احدکم اللہ اکبر اللہ اکبر ثم قال اشہد ان لا الہ الا اللہ قال اشہد ان لا الہ الا اللہ ثم قال اشہد ان محمداً رسول اللہ قال اشہد ان محمداً رسول اللہ ثم قال حی علی الصلوٰۃ قال لاحول ولاقوۃ الا باللہ ثم قال حی علی الفلاح قال لاحول ولاقوۃ الا باللہ ثم قال اللہ اکبر اللہ اکبر قال اللہ اکبر اللہ اکبر ثم قال لا الہ الا اللہ قال لا الہ الا اللہ من قلبہ دخل الجنۃ ۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ : جناب عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب مؤذن کہے اللہ اکبر اللہ اکبر تو تم میں سے کوئی اللہ اکبر اللہ کہے پھر مؤذن اشہد ان لا الٰہ الا اللہ کہے تو وہ بھی اشہد ان لا الہ الا اللہ کہے پھر مؤذن اَشْہَدُ اَنَّ محمداً رسول اللہ کہے تو وہ بھی اشہد ان محمداً رسول اللہ کہے پھر مؤذن حی علی الصلوٰۃ کہے تو وہ لاحول ولاقوۃ الا باللہ کہے پھر مؤذن حی علی الفلاح کہے تو وہ لاحول ولاقوۃ الا باللہ کہے پھر مؤذن اللہ اکبر اللہ اکبر کہے تو وہ بھی اللہ اکبر اللہ اکبر کہے پھر مؤذن لا الٰہ الا اللہ کہے تو وہ بھی لا الہ الا اللہ کہے اذان کا جواب دینے والا دل کی گہرائی سے یہ سب کہے تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔ اسے مسلم نے روایت کیا۔

شرح : یہ حدیث پچھلی حدیث کے لیے بطور شرح وتفصیل ہے اور اس میں کلمات اذان بغرض اختصار اکہرے وارد ہوئے ہیں۔ پچھلی حدیث میں فقولوا مثل ما یقول کے الفاظ تھے لیکن اس میں حی علی الصلوٰۃ اور حی علی الفلاح پہ لاحول ولاقوۃ الخ کا حکم ہے۔ شرح ان دونوں کی پہلے گذر چکی ہے۔

علامہ شوکانی رح نے فرمایا ہے کہ ابن المنذر رح کے قول کے مطابق کبھی تو مؤذن کی، مانند کہنا چاہیئے اور کبھی لاحول الخ کہنا چاہیئے۔ اور بعض حنابلہ کے نزدیک ان دونوں کو جمع کرنا چاہیئے اور مؤذن کی اجابت بوقت مصروفیت صلوٰۃ یا بوقت جماع یا

ف نیل الاوطار ج ا ص ۳۵۱ ۔

جب کوئی شخص صحرا میں ہو (یعنی رفع حاجت کر رہا ہو) مکروہ ہے بلکہ فراغت کے بعد اجابت ہو۔

دخل الجنۃ[۱] سے مراد یہ ہے کہ وہ جنت میں جائے گا ضرور چاہے بعد از سزا ہی کیوں نہ ہو یا اس عمل کی جزا دخولِ جنت ہے بشرطیکہ کوئی اور مانع موجود نہ ہو۔

لاحول[۲] کا معنی یہ ہے کہ نیکی کی طاقت اور گناہ سے بچنے کی ہمت اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ یہ جواب حی علی الصلوٰۃ اور حی علی الفلاح کا نہایت ہی مناسب اور گویا خدا کا شکر یہ بھی ہے کہ جس نے نماز کی توفیق بخشی اور اذان کا جواب ہر ایک پر واجب ہے۔ خواہ باوضو ہو یا بے وضو، جُنبی ہو یا حائضہ عورت۔ ہاں وہ موانع جن کا ذکر اوپر ہوا وہ اس سے مستثنیٰ ہوں گے۔ واللہ اعلم۔

حدیث ۶: وعن جابرؓ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من قال حین یسمع النداء اللھم رب ھذہ الدعوۃ التامۃ والصلوٰۃ القائمۃ اٰت محمدا ن الوسیلۃ والفضیلۃ والبعثہ مقامًا محمودًا ن الذی وعدتہ حلت لہ شفاعتی یوم القیامۃ۔ رواہ البخاری۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اذان سن کر یہ دعا مانگے (اللھم ربّ ھذہ الدعوۃ الخ) اے اللہ! جو اس پوری پکار کا مالک ہے اور قائم ہونے والی نماز کا رب ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو وسیلہ اور فضیلت عطا فرما اور آپؐ کو اس مقامِ محمود پہ مبعوث فرما جس کا تو نے ان سے وعدہ فرمایا ہے؛ اس کے لیے قیامت کے دن میری شفاعت ثابت ہو گئی۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔

شرح: یہ حدیث اس سے پہلے والی عبداللہؓ بن عمرو بن العاص کی روایت کی شرح ہے اس میں صرف یہ الفاظ تھے کہ ثم سلوا اللّٰہ لِیَ الوَسیلۃَ۔ اس حدیث میں اس وسیلہ کے طلب کرنے کا طریقہ ارشاد فرمادیا گیا ہے۔ اس[۳] دعا میں اذان کو دعوتِ

---

[۱] مرقات ج ۲ ص ۱۶۲ [۲] مظاہر حق ج ۱ ص ۲۳۵، مرقات ایضاً۔

[۳] مظاہر حق ج ۱ ص ۲۳۵۔

تامّہ فرمایا گیا ہے کیونکہ یہ نماز اور ذکر کی طرف بلانے کا ایک بے مثال طریقہ ہے جو اسلام کی خصوصیات میں سے ہے۔ علامہ علی القاریؒ نے حافظ تورپشتیؒ سے نقل کیا ہے کہ اذان کی پکار کو تامّہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اذان اور اس کی متعلقہ چیزیں (نماز ذکر و تسبیح وغیرہ) ہی اس بات کی مستحق ہیں کہ انہیں تام و کامل کہا جائے، دنیا کی باقی تمام اشیاء کو نقص و فساد لاحق ہو جاتا ہے اور اسے اس وجہ سے بھی کامل و تام کہا گیا کہ خدا کی حجت کو قائم کرنے میں اور نماز جیسی عظیم عبادت کی طرف بلانے میں یہ بے نقص ہے۔[1]

علامہ سید انور شاہ محدث کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ اس دعا میں ہاتھ اٹھانا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے اور صرف انہی کلمات پر اکتفاء کرنا چاہیئے جو حدیث میں آچکے ہیں۔ ہاں کشمیہنی کے نسخہ میں آخر میں اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيعَادَ کا اضافہ ہے اسے اپنا لینے میں حرج نہیں ہے لیکن وَالْفَضِيلَةَ کے بعد وَالدَّرَجَةَ الرَّفِيعَةَ کے الفاظ میرے نزدیک کسی حدیث میں ثابت نہیں ہوئے۔[2] اسی طرح علامہ علی القاریؒ[3] اور مولانا قطب الدینؒ[4] نے بھی فرمایا ہے کہ اس اضافے کی کوئی دلیل نہیں اور سعایہ[5] میں ہے کہ بیہقی نے اپنی روایت میں اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيعَادَ کا اضافہ کیا ہے اور بقول ابن عابدین شامیؒ ابن حجر ہیثمیؒ نے شرح منہاج میں وَالدَّرَجَةَ الرَّفِيعَةَ کا اضافہ نقل کیا ہے اور دعا کا اختتام يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ پر کیا ہے مگر ان دونوں کی کوئی اصل (دلیل) نہیں ہے۔

اس دعا میں الصلوٰۃ کی صفت القائمۃ فرمانے کی وجہ یہ ہے کہ یہ عبادت قیامت تک اپنی اصل حیثیت میں قائم رہنے والی ہے۔ یہ ایک دائمی عبادت ہے۔ کوئی آنے والی شریعت نہیں جو اسے منسوخ کرے اور نہ حضورؐ کے دین کے بعد کوئی دین ہوگا جو اس میں تبدیلی کرے۔[6]

علامہ قسطلانیؒ اور علامہ شوکانیؒ[7] فرماتے ہیں کہ یہ دعوتِ تامّہ اس لیے ہے کہ

---

[1] مرقات ج ۲ ص ۱۶۳۔ [2] فیض الباری ج ۲ ص ۱۶۷۔ [3] مرقات ایضاً۔
[4] مظاہر حق ج ۱ ص ۲۳۵۔ [5] حاشیہ فیض الباری ج ۲ ص ۱۶۷۔ [6] مظاہر حق ج ۱ ص ۲۳۵
مرقات ج ۲ ص ۱۶۳۔ [7] نیل الاوطار ج ۱ ص ۳۵۳، قسطلانی ج ۲ ص ۹۔

دعوتِ توحید اور دعوتِ حق ہے اس میں کوئی تغیر و تبدل اور نسخ نہیں ہوگا اور قیامت تک باقی رہے گی۔

مقامِ محمود[1] جس کا وعدہ ہے اس کا ذکر قرآن میں بھی ہے: عَسٰٓی اَنْ یَّبْعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (بنی اسرائیل) اور اس سے مراد مقامِ شفاعت ہے عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ مقامِ محمود اس لیے ہے کہ اس پہ فائز ہونے والے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف اگلے اور پچھلے کریں گے۔

اور یہ[2] مقامِ محمود تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مخصوص ہو چکا ہے اس کے لیے دعا اس لیے سکھائی گئی تاکہ امت مستحق شفاعت ہو سکے اور اپنے امتی ہونے کا حق ادا کرنے کی کوشش کرے۔

علامہ[3] شوکانیؒ کا ارشاد ہے کہ عسیٰ کا لفظ اللہ تعالیٰ کے کلام میں وقوع کے لیے ہوتا ہے۔ علامہ علی[4] القاریؒ نے بھی اسی کے قریب کہا ہے۔

حضرت[5] سید انور شاہؒ محدث کاشمیری فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والاصفات کو حمد کے ساتھ خصوصی تعلق ہے۔ وہ یوں کہ آپؐ کا نامِ نامی محمدؐ و احمدؐ ہے آپؐ کا جھنڈا قیامت میں لواء الحمد ہے اور آپؐ کا مقامِ محشر میں مقامِ محمود ہے اور آپؐ کی امت کا لقب حمّادون ہے اور حضورؐ مقامِ محمود پہ کھڑے ہو کر خدا کی وہ حمد و ثنا کریں گے جو کسی نے کبھی نہ کی ہوگی اور آپؐ کی وہ حمد و ثناء ہوگی جو بے مثال ہوگی۔ شیخ اکبرؒ نے فرمایا ہے کہ حمد آخر میں ہوتی ہے مثلاً کھانے سے فارغ ہو کر الحمد للہ کہا جاتا ہے۔ جنت میں داخلے کے بعد جنتی کہیں گے الحمدُ للہ ربّ العالمین اور پیغمبر صلی اللہ کا نام محمدؐ و احمدؐ ہے کیوں کہ آپؐ سب پیغمبروں کے بعد تشریف لائے۔

حدیث ۷: وعن انسؓ قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یغیر اذا طلع الفجر وکان یستمع الاذان فان سمع اذاناً امسك

---

[1] نیل الاوطار ج ۱ صـ ۳۵۳۔ قسطلانی ج ۲ صـ ۹۔

[2] فیض الباری ج ۲ صـ ۱۶۸، مرقات ج ۲ صـ ۱۶۳۔ [3] نیل الاوطار ج ۱ صـ ۳۵۴۔

[4] مرقات ج ۲ صـ ۱۶۳۔ [5] فیض الباری ج ۲ صـ ۱۶۸۔

والا اغار فسمع رجلاً یقول اللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم علی فطرۃ ثم قال اشہد ان لا الٰہ الا اللّٰہ فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم خرجت من النار فنظروا الیہ فاذا ھو راعی معزًی ۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللّٰہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور رسولِ اکرم صلی اللّٰہ علیہ وسلم اس وقت چڑھائی کیا کرتے تھے جب فجر طلوع ہو جاتی اور غارت سے پہلے اذان کو غور سے سننے کی کوشش فرماتے سو اگر اذان سن لیتے تو رک جاتے ورنہ حملہ کر دیتے۔ پس ایک شخص کو آپؐ نے اللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر کہتے سُنا تو حضور صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ شخص دینِ فطرت پر ہے۔ پھر اس نے کہا اشہد ان لا الہ الا اللّٰہ تو رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ نے فرمایا کہ تو آگ سے نکل گیا۔ صحابہؓ نے اس شخص کی طرف دیکھا تو پتہ چلا کہ وہ بھیڑ بکریوں کا چرواہا تھا۔ اسے مسلم نے روایت کیا۔

شرح: [۱] حضورؐ کی یہ عادت شریفہ کہ ایسے وقت میں کسی علاقے پر حملہ آور ہوتے جب مومن و کافر میں امتیاز ہو سکے، اس وجہ سے تھی کہ غارت میں کوئی مسلمان بھی نہ پس جائے۔ اس حدیث سے پتہ چل گیا کہ اذان گو سنت ہے لیکن اس کی حیثیت شعارِ اسلام کی ہے اسی لیے حضورؐ نے اسے ایمان و کفر میں امتیاز کی علامت ٹھہرایا تھا۔ اور امام محمدؒ کا قول جو اس سے قبل گزر چکا ہے وہ بھی غالباً یہیں سے ماخوذ ہے۔

اس [۲] حدیث سے معلوم ہوا کہ بوقت ضرورت بلا اطلاع کفار پر حملہ کر دینا جائز ہے اور امام سفیان ثوریؒ، ابو حنیفہؒ، شافعیؒ، احمدؒ اور اسحاقؒ کا یہی مسلک ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ گو مستحب یہی ہے کہ حملہ اطلاع دے کر کیا جائے لیکن اگر مصلحتاً ایسا نہ ہو تب بھی جائز ہے۔

حدیث: وعن سعیدؓ بن ابی وقاص قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من قال حین یسمع المؤذن اشہد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہٗ لا شریک لہ وان محمداً عبدہٗ ورسولہٗ

---

[۱] مرقات ج ۲ ص ۱۶۳، مظاہر حق ج ا ص ۲۳۶ ۔ [۲] مرقات ایضاً۔

رضيت بالله ربًا و بمحمدٍ رسولا و بالاسلام دينا غفرله ذنبه ۔ رواه مسلم ۔

ترجمہ: حضرت سعید بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص مؤذن (کی اذان) کو سُن کر یوں کہے: اشہد ان لا الہ الا اللہ الخ: میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں اور یقیناً محمدؐ اللہ کے رسول ہیں میں اللہ سے راضی ہوا کہ وہ میرا رب ہے محمدؐ سے راضی ہوا کہ وہ میرا رسولؐ ہے اور اسلام پر راضی ہوا کہ وہ میرا دین ہے" اس کے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ مسلم نے اسے روایت کیا۔

شرح: یہ دوسری دعا ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہوئی ہے کہ اذان ختم ہونے کے بعد پڑھی جائے اور اذان کے ساتھ اس کا جواب بھی دیا جائے۔ امام بیہقیؒ کی روایت میں اس دعا کے کئی لفظ زائد ہیں۔ اور اس دعا پر بخشش کا وعدہ اسی ندسے پر ہے جو کئی دفعہ قبل ازیں گزر چکا ہے۔ رب ہونے کی حیثیت سے اللہ پر راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ شرک سے مکمل برأت اور توحیدِ خالص کا اعلان کیا جا رہا ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر بحیثیت رسولؐ راضی ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ دل اندر سے آپؐ کی رہنمائی اور صداقت پر جھک جائے اور ہر طرف سے منہ پھیر کر آپؐ ہی کی طرف کر لیا جائے۔ اسلام پر دین ہونے کی حیثیت سے راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اپنی زندگی کو اسلام کے سپرد کر دیا جائے اور اسے اپنی زندگی کا دستور العمل اور نصب العین بنا لیا جائے۔ واقعی جو شخص اتنے خلوص سے اسلام کی دعوت کو بلند کر دے تو اس کی بخشش میں شک و شبہ نہیں ہو سکتا۔ صغائر تو معاف ہونگے ہی لیکن اگر دل کی گہرائی سے از سر نو اس کلمۂ اخلاص کا اعلان کیا جائے تو انشاء اللہ کبائر سے بھی بچ ہی جائے گا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۹: وعن عبد اللہ بن مغفل قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین کل اذانین صلاۃ بین کل اذانین صلوٰۃ

ؒ مرقات ج ۲ ص ۱۶۴ ۔

ثم قال فی الثالثۃ لمن شاء . متفق علیہ ۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مغفل فرماتے ہیں کہ حضور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہر دو اذانوں کے درمیان نماز ہے، ہر دو اذانوں کے درمیان نماز ہے۔ پھر تیسری مرتبہ آپ نے فرمایا کہ اس شخص کے لیے جو چاہے۔ بخاری و مسلم دونوں نے اسے روایت کیا۔

شرح: دو[1] اذانوں سے مراد اذان و اقامت ہیں۔ تغلیباً و مشاکلۃً انہیں دو اذانیں کہہ دیا گیا جیسے کہ ابوبکرؓ و عمرؓ کو عمرینؓ کہہ دیا جاتا ہے اور بار بار تاکید، ترغیب کے لیے فرمائی اور آخر میں لِمَن شَاءَ کا لفظ بول کر اس نماز کو ایک تو عام کر دیا اور دوسرے اس کا مستحب ہونا واضح فرما دیا۔

تمام[2] علماء ان نوافل کے قائل ہیں لیکن امام ابوحنیفہؒ نے بریدہ اسلمیؓ کی روایت کی وجہ سے مغرب کو اس سے مستثنیٰ مانا ہے۔ اس روایت کے الفاظ یہ ہیں: عند کل اذانین رکعتان خلا صلوٰۃ المغرب۔ ویسے بھی مغرب کا وقت بہت کم ہے اور سنتِ متوارثہ یہی چلی آ رہی ہے کہ اس سے پہلے نفل نہ پڑھے جائیں۔ صحابہؓ نے بعض دفعہ یہ نفل پڑھے تھے لیکن آہستہ آہستہ یہ رواج مٹ گیا، معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات نے حضورؐ کے اپنے عمل سے اندازہ کر لیا ہوگا کہ نمازِ مغرب اس حکم سے مستثنیٰ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

باب

حافظ ابن حجرؒ نے فرمایا[3] ہے کہ یہ باب پچھلے دو بابوں کا تتمہ ہے۔ مصابیح میں باب کے بجائے فصل کا لفظ ہے اور اس باب یا فصل کی احادیث سب صحاح کی ہیں اور پچھلے باب کے علاوہ اور احادیث اس میں بیان ہوئی ہیں لہٰذا الگ باب رکھا گیا اور مظاہر حق میں[4] اس باب کے بعد یہ لفظ ہیں: "باب بیچ بیان کرنے

---

[1] مرقات ج ۲ ص ۱۶۵، مظاہر حق ج ۱ ص ۲۳۶ ۔ [2] ایضاً ۔ [3] مرقات ج ۲ ص ۱۶۷ ۔
[4] مظاہر حق ج ۱ ص ۲۴۷ ۔

بعض احکام اذان کے" پس اس باب میں اذان کے کچھ اور احکام بیان کیے جائیں گے۔

الفصل الاوّل

حدیث ۱: عن ابن عمرؓ قال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم ان بلالاً ینادی بلیل فکلوا واشربوا حتی ینادی ابن ام مکتوم قال وکان ابن ام مکتوم رجلا اعمیٰ لاینادی حتی یقال لهٗ اصبحت اصبحت۔ متفق علیه۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ اللہ کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یقیناً بلالؓ رات کو اذان دیتا ہے سو تم کھاؤ پیو جب تک کہ عبداللہ بن ام مکتومؓ اذان دیدے۔ ابن عمرؓ نے فرمایا کہ ابن ام مکتومؓ نابینا شخص تھے جب تک انہیں یہ نہ کہا جاتا کہ صبح ہوگئی، صبح ہوگئی، اس وقت تک وہ اذان نہ دیتے تھے متفق علیہ۔

شرح: اس حدیث میں نمازِ فجر کی اذان سے پہلے ایک اور اذان کا ذکر ہے اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ماہِ رمضان کا ہے کیونکہ حضورؐ اس میں نمازِ فجر کی اذان (جو عبداللہؓ بن ام مکتومؓ دیتے تھے) تک کھانے پینے کی اجازت دے رہے ہیں۔

علامہ شوکانیؒ نے ترمذی کے علاوہ تمام اربابِ صحاح کی ایک روایت درج کی ہے کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا: لا یمنعن اُحدکم اذان بلالؓ من سحورہ فانه یؤذن او قال ینادی لیرجع قائمکم ویوقظ نائمکم۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ یہ اذان وقت سحر کے بتانے کے لیے ہوتی تھی تاکہ تہجد پڑھنے والے فارغ ہو آئیں اور نیند میں مصروف لوگ اٹھ کھڑے ہوں۔ اور ابن عمرؓ والی روایت میں صاف مذکور ہے کہ نمازِ فجر کے لیے اِن دنوں میں ابن ام مکتومؓ اذان دیا کرتے تھے۔[۱]

علامہ شوکانیؒ نے نیل الاوطار میں مسلم اور احمد کی ایک اور روایت بیان کی ہے کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا: لا یغرنکم من سحورکم اذان بلال ولا بیاض الافق المستطیل ھٰکذا حتی یستطیر ھٰکذا یعنی معترضاً اس حدیث میں[۲]

---

[۱] نیل الاوطار ج اص ۳۴۸۔ [۲] ایضاً ص ۳۴۹۔

بلالؓ کی اس اذان کے ساتھ ساتھ صبح کاذب (مستطیل) اور صبح صادق (معترض) کا بھی ذکر ہے کہ پہلی صبح کے وقت سحری کھانا جائز ہے اور دوسری صبح کے وقت نماز فجر کا وقت داخل ہو جاتا ہے۔ علامہ شوکانیؒ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث سے فجر کی اذان قبل از وقت دینے کا جواز نکلتا ہے اور جمہور کا مسلک یہی ہے لیکن امام سفیان ثوریؒ، ابو حنیفہؒ، محمدؒ، ہادیؒ، قاسمؒ، ناصرؒ اور زیدؒ بن علی کا مسلک یہ ہے کہ یہ اذان نماز فجر کے لیے نہ تھی یہی وجہ ہے کہ فجر کے لیے دوسری اذان کا، ثبوت خود ان حدیثوں میں موجود ہے پھر جن حضرات نے وقت فجر سے پہلے اذان کا جواز اس حدیث سے ثابت کیا ہے ان میں سے صرف امام شافعیؒ، مالکؒ، احمدؒ نے فرمایا ہے کہ نماز فجر سے پہلے اگر اذان دی جائے تو وقتِ فجر کے لیے وہ کافی ہوگی۔ لیکن ابن المنذرؒ اور محدثین کی ایک جماعت اور امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ وقت سے پہلے والی اذان فجر کی نماز کے لیے کافی نہیں ہوگی بلکہ فجر کے لیے اور اذان دی جائے جیسا کہ احادیث میں موجود ہے۔

پھر ان[1] دونوں اذانوں کا درمیانی فاصلہ بھی زیادہ نہیں ہوتا تھا جیسا کہ بخاری میں ہے: ولم یکن بینھما الا ان یرقی ھذا وینزل ھذا۔ پس امام نوویؒ نے جو فرمایا ہے کہ فجر کی پہلی اذان آدھی رات کو بھی دی جاسکتی ہے یہ محض کھینچا تانی اور تکلف ہے۔ حنفیہ کے نزدیک اگر کبھی اذان وقت سے پہلے ہو جائے تو وقت پر بھی اذان دی جانی لازم ہے جیسا کہ خود ان احادیث میں نماز فجر کے لیے دوسری اذان کا صریحاً حکم موجود ہے۔ امام طحاویؒ نے اس پہلی اذان کا مقصد سحری کے لیے جگانا بتایا ہے اور استدلال میں عبداللہؓ بن مسعود کی روایت پیش کی ہے جو ہم نے اوپر ترمذی کے علاوہ تمام صحاح کے حوالہ سے نیل الاوطار سے نقل کی ہے۔

حضرت[2] سید انور شاہؒ محدث کشمیری فرماتے ہیں کہ یہ پہلی اذان صرف رمضان سے خاص تھی۔ امام احمدؒ سے اس کی تصریح مغنی ابن قدامہ میں موجود ہے اور ابنؒ القطان سے اس کی تصریح فتح الباری میں اور ابنؒ دقیق العید سے تخریج زیلعی (نصب الرایہ) میں موجود ہے۔

---

[1] فیض الباری ج ۲ صہ ۱۷۱ ۔ [2] ایضاً صہ ۱۷۲ ۔

[1] شیخ اکبر محی الدین ابن العربیؒ نے فرمایا ہے کہ کسی نماز کی اذان وقت سے پہلے جائز نہیں اور نمازِ فجر میں جو اذان وقت سے پہلے ثابت ہے وہ میرے نزدیک معروف اذان نہیں بلکہ صرف اطلاع کے لیے ذکر وغیرہ کے کچھ کلمات ہیں اور اس کی دلیل یہی ابن عمرؓ والی حدیث ہے۔

علامہ [2] حافظ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے عبداللہ بن ام مکتومؓ کی اذان کو وقتِ سحر کی انتہا اور کھانا پینا بند کرنے کی غایت فرمایا ہے لیکن ابن عمرؓ کے اِس قول اَصْبَحْتَ اَصْبَحْتَ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ دوسری اذان طلوعِ فجر کے بعد ہوتی تھی۔ پس اس سے لازم آیا کہ سحری کھانا طلوعِ فجر کے بعد بھی جائز ہو اس سوال کا جواب خود حافظ صاحب نے یہ دیا کہ اَصْبَحْتَ سے مراد قَارَبْتَ الصَّبَاحُ ہے۔ اور ایسے آدمی موجود تھے جو ابن ام مکتوم کو طلوعِ فجر کا ابتدائی وقت بتائیں اور حدیث میں جو بَزَغَ کا لفظ ہے اس سے یہی مراد ہے کہ طلوعِ فجر ہو جائے۔

اَصْبَحْتَ [3] کا یہی معنی علامہ علی القاریؒ اور مولانا قطب الدینؒ نے بھی بیان کیا ہے کہ قَارَبْتَ الصَّبَاحَ کو بطور مبالغہ اَصْبَحْتَ کہہ دیا گیا ہے۔

حدیث ۲ : وعن سمرة بنؓ جندب قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لا یمنعنّکم من سحورکم اذان بلال و لا الفجر المستطیل ولکن الفجر المستطیر فی الافق۔ رواہ مسلم و لفظہ للترمذی۔

ترجمہ : حضرت سمرۃ بن جندبؓ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہیں سحری کھانے سے نہ تو بلالؓ کی اذان روکے اور نہ وہ فجر جو آسمان کی طرف سیدھی دراز ہوتی ہے بلکہ سحری کا آخری وقت وہ فجر ہے جو آسمان کے کنارے پر پھیلتی ہے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے اور اس کے الفاظ ترمذی کے ہیں۔

شرح : اوپر [4] کی حدیث کی شرح میں گزر چکا ہے کہ حضورؐ نے بلالؓ کی اذان کے

---

[1] حاشیہ فیض الباری ج ۲ صـ۱۵۱ بحوالہ سعایہ۔ [2] فتح الباری ج ۲ صـ۳۴۴۔
[3] مظاہر حق ج ۱ صـ۲۴۱، مرقات ج ۲ صـ۱۷۳۔ [4] ایضاً مرقات۔

متعلق فرمایا کہ وہ رات رہے اذان دیتا ہے۔ فجر مستطیل سے مراد صبح کاذب ہے جو صبح صادق سے قبل آسمان کو بلند ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور تھوڑی دیر کے بعد غائب ہو جاتی ہے جس کے ساتھ نمازِ فجر کا وقت داخل ہوتا ہے۔ اذانِ فجر پکاری جاتی ہے اور سحری کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔ اور یہی فجر ہے جس کا ذکر سورۂ البقرہ میں صیام کے ضمن میں آیا ہے: وکلوا واشربوا حتی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود من الفجر۔ الآیۃ۔

ولفظه للترمذی کا معنی یہ ہے کہ اسی روایت کی ہم معنی حدیث مسلم میں بھی آئی ہے اور یہ حدیث جو یہاں درج کی گئی ہے اس کے الفاظ ترمذی کی روایت کے مطابق ہیں۔

حدیث ۳ : وعن مالک بن الحویرث رضی اللہ عنہ قال اتیت النبی صلی اللہ علیه وسلم انا وابن عم لی فقال اذا سافرتما فاذنا واقیما ولیؤمکما اکبرکما۔ رواہ البخاری۔

ترجمہ: مالک رضی اللہ عنہ بن الحویرث فرماتے ہیں کہ میں اور میرا ایک چچا زاد بھائی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے تو حضور نے فرمایا کہ جب تم دونوں سفر پر ہو تو اذان دو اور اقامت بھی کہو۔ اور تم میں سے جو بڑا ہے وہ امام بنے۔ اسے بخاری نے روایت کیا۔

شرح: مطلب یہ ہے کہ فرض نماز کی جماعت حتی الوسع ترک نہ کی جائے اگر صرف دو آدمی بھی ہوں تو بھی باجماعت نماز پڑھیں۔ اس سے نہ صرف نماز اور اس کی جماعت کی اہمیت معلوم ہوئی بلکہ اسلام میں اجتماعی زندگی کی اہمیت کا بھی پتہ چل گیا کہ دو آدمی بھی ہوں تو بھی بلا امیر و امام نہ رہیں۔

فاذنا واقیما[1] کا مطلب یہ نہیں کہ تم دونوں اذان دو اور دونوں اقامت کہو۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ تم میں سے ایک اذان دے اور اقامت کہے۔ لیکن چونکہ دونوں سے بات ہو رہی تھی اس لیے دونوں کو خطاب فرمایا۔ یا یوں کہیئے کہ اذان میں

---

[1] مرقات ج ۲ صـ ۱۷۶۔

تو ان دونوں کے اختیار اور پسند پر چھوڑ دیا کہ جو چاہے اذان واقامت کہہ لے۔ مگر امامت کے لیے صاف فرما دیا کہ جو تم میں سے بڑا ہے وہ امامت کرائے۔ دوسری احادیث میں امامت کے زیادہ حقدار کے لیے اَعْلَم، اَقْرَأ وغیرہ الفاظ آئے ہیں۔ سب احادیث کو ملا کر نتیجہ جو نکلتا ہے وہ یہی ہے کہ زیادہ عالم اور اچھا قاری ہی، دوسروں سے زیادہ حقدار ہے، ہاں ان کے بعد عمر کا لحاظ بھی کیا جائے گا جیسا کہ فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے۔ خاص اس واقعہ میں وہ چونکہ علم وفضل اور قرأت میں برابر تھے اس لیے حضورؐ نے امامت کے لیے بڑے کے انتخاب کا حکم فرمایا۔

علامہ[1] علی القاریؒ فرماتے ہیں کہ جو عمر میں بڑا تھا وہ چونکہ پہلے اسلام لا چکا تھا یا جو رتبہ اور درجہ میں بڑا تھا غالباً وہ احکامِ اسلام کو زیادہ ہی سیکھ چکا ہوگا۔ اور مراد اس سے یہ ہے کہ جو تم دونوں میں سے افضل ہو وہ امام بنے۔ ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ اذان اکبر وافضل کے ساتھ مخصوص نہیں بخلاف امامت کے۔ کیونکہ امامت میں شرعاً پسندیدہ یہی ہے کہ رتبہ یا عمر میں جو بڑا ہے وہ امام بنے۔

اس حدیث[2] سے امام داؤد ظاہریؒ نے استدلال کیا ہے کہ اذان واقامت فرض عین ہیں لیکن ان کا قول اجماعِ امت کے خلاف ہے۔ امام احمدؒ اور محدثین وفقہاء کی ایک جماعت نے اس حدیث سے یہ استدلال کیا ہے کہ اذان واقامت فرض کفایہ ہیں لیکن باقی سب ائمہ انہیں سُنت ہی مانتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ محض صیغۂ امر کو دیکھ کر فرضیت ووجوب کا حکم نہیں لگایا جا سکتا بلکہ سب دلائل شرع کو جمع کرنا چاہیے تب فیصلہ ہوگا کہ فلاں امر کی حیثیت کیا ہے۔ اگر اس چیز کو مدنظر رکھا جائے تو بہت سے مسائل کے اختلافات خود بخود ختم یا حل ہو جائیں گے۔

حافظ[3] ابن حجرؒ عسقلانی فرماتے ہیں کہ وہ دونوں بھائی فضیلت میں مساوی تھے اور اذان میں عمر کا لحاظ نہیں ہوتا لہٰذا حضورؐ نے فرمایا کہ یہ دونوں میں سے ایک

۱؎ مرقات ج ۲ ص ۱۲۶، مظاہر حق ج ۱ ص ۴۴۱۔ ۲؎ ایضاً مرقات۔ ۳؎ فتح الباری ج ۳ ص ۲۵۰

اذان کہے۔ لیکن امامت میں چونکہ فضیلت میں برابری کی صورت میں عمر کا لحاظ بھی کیا گیا ہے اس لیے فرما دیا کہ تم میں سے جو عمر میں بڑا ہے وہ نماز پڑھائے۔

علامہ قسطلانی[1] فرماتے ہیں کہ یہ دونوں بھائی (بلکہ ان کی قوم کے اور لوگ بھی) فضیلت میں برابر تھے کیونکہ سب ایک جیسی مدت حضورؐ کی خدمت میں رہے تھے لہٰذا امامت میں مقدم کرنے کے لیے عمر کے سوا کوئی چیز باقی نہ رہی تھی اور اس حدیث سے امامت کی افضیلت کی دلیل نکلتی ہے۔ اور جن لوگوں نے اس سے اذان واقامت کے وجوب کا استدلال کیا ہے وہ خلافِ اجماعِ امت ہے۔

حدیث ۴ : وعنہ قال قال لنا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم صلوا کما رأیتمونی اصلی واذا حضرت الصلوٰۃ فلیؤذن لکم احدکم ثم لیؤمکم اکبرکم۔ متفق علیہ۔

ترجمہ : اور انہیں مالک بن الحویرثؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے فرمایا کہ تم لوگ اس طرح نماز پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے دیکھا ہے۔ تم میں سے ایک اذان کہے، پھر تم میں سے جو بڑا ہو وہ امامت کرائے۔ متفق علیہ۔

شرح : اوپر کی حدیث میں گزرا ہے کہ مالک بن الحویرثؓ اپنے چچازاد بھائی سمیت حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور حضورؐ نے رخصت کرتے وقت انہیں بصیغۂ تثنیہ وہ احکام دیئے تھے جو اوپر گزرے۔ لیکن اس حدیث میں یہ احکام بصیغۂ جمع ہیں اس کی وجہ کیا ہے؟

حضرت سید انور شاہ الکشمیریؒ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جب تم اپنے وطن میں پہنچ جاؤ تو اس طرح نماز پڑھنا جس طرح مجھے پڑھتے ہوئے دیکھا ہے الخ۔ لیکن بخاری کی روایت میں صاف مذکور ہے اتیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی نفر من قومی، الحدیث، سو اگر حضرت مالکؓ اپنی قوم کی ایک جماعت سمیت آئے تھے تو اس زیر بحث حدیث میں دو سے خطاب کا باعث کیا ہے؟ حافظ ابن حجرؒ کا کلام اس حدیث پر باعث تشویش ہے۔ اس سے کچھ پتہ نہیں چلتا۔[2]

---

[1] قسطلانی ج ۲ ص ۱۸۔ [2] فیض الباری ج ۲ ص ۱۸۵۔

ایک ہے یا متعدد؟ اب یا تو یہ کہا جائے گا کہ واقعہ متعدد ہے یا یہ کہ رخصت ہوتے وقت قوم کا نمائندہ اور سردار ہونے کی حیثیت سے حضورؐ نے مالکؓ اور ان کے چچازاد بھائی کو خطاب فرمایا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

علامہ[1] علی القاریؒ نے سیّد کے حوالہ سے فرمایا کہ صاحب مشکوٰۃ نے اس حدیث کو متفق علیہ کہا ہے حالانکہ مسلم کی روایت میں صلوا کمی رائیتمونی اصلی کے الفاظ نہیں ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ متفق علیہ کے الفاظ حدیث کے زیادہ تر الفاظ کے ایک ہی ہونے کی وجہ سے ہیں۔ یا اس کا مطلب یہ ہے کہ مصنف جس جگہ یا جس لفظ سے استدلال کرنا چاہتا تھا وہ الفاظ متفق علیہ ہیں۔

مولانا[2] قطب الدینؒ فرماتے ہیں کہ اکبرکم سے مراد علم میں بڑا یا عمر میں بڑا ہے۔ اگر علم میں بڑا مراد لیا جائے تو علم سے مراد احکامِ نماز کا علم ہوگا۔ اور عمر میں بڑا مراد لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ شخص جسے اسلام لائے دیر ہو چکی ہے چاہے وہ درحقیقت دوسروں سے چھوٹا ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ جس کی عمر دوسروں کی نسبت اسلام میں زیادہ بسر ہوئی ہے اس نے علم واحکامِ صلوٰۃ بھی زیادہ ہی سیکھ لیے ہوں گے اور دین کے بارے میں اس کا علم دوسروں سے زیادہ ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۵ : وعن ابی ھریرۃؓ قال ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حین قفل من غزوۃ خیبر سار لیلۃ حتی اذا ادرکہ الکری عرّس وقال لبلالٍ اکلأ لنا اللیل فصلی بلال ماقدر لہ ونام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ فلما تقارب الفجر استند بلالؓ الی راحلتہٖ موجہ الفجر فغلبت بلالا عیناہ وھو مستند الی راحلتہٖ فلم یستیقظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولا بلال ولا احد من اصحابہ حتی ضربتھم الشمس فکان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اولھم استیقاظًا ففزع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال اَی فقال بلال اخذ بنفسی الذی اخذ بنفسک قال اقتادوا فاقتادوا رواحلھم شیئًا ثم توضأ رسول اللہ

---

[1] مرقات ج ۲ ص ۱۰۲۔ [2] مظاہر حق ج ۱ ص ۲۴۱۔

صلی اللہ علیہ وسلم وامر بلالاً فاقام الصلوٰۃ فصلی بہم الصبح فلما قضی الصلوٰۃ قال من نسی الصلوٰۃ فلیصلہا اذا ذکرھا فان اللہ تعالیٰ قال واقم الصلوٰۃ لذکری۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ: اور حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا جنابِ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم جب غزوہ خیبر سے واپس ہوئے تو ایک رات کو چلتے رہے حتی کہ جب آپؐ کو نیند آ گئی تو رات کے پچھلے حصے میں آرام کے لیے پڑاؤ کیا اور بلالؓ سے فرمایا کہ آج رات ہماری چوکیداری کرو۔ سو حضرت بلالؓ جتنی دیر ان کو مقدر میں تھا نماز پڑھتے رہے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھی سو گئے۔ پھر جب فجر چڑھنے کو تھی تو بلالؓ نے اپنی سواری کے ساتھ مشرق کی طرف منہ کر کے سہارا لگا لیا تو بلالؓ کی آنکھیں بے اختیار بند ہو گئیں اور وہ اسی طرح اپنی سواری کے ساتھ تکیہ لگائے ہوئے سو گئے پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، بلالؓ اور آپؐ کے ساتھیوں میں سے کوئی اور بھی اس وقت تک نہ جاگا جب تک کہ ان پر دھوپ نہ آ گئی پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے پہلے جاگے اور حضورؐ اس صورتِ حال سے گھبرا گئے اور فرمایا: اے بلالؓ! (یہ کیا معاملہ ہے؟ تم کیوں سو گئے تھے؟) تو بلالؓ نے عرض کیا کہ جس طرح آپؐ کو نیند آ گئی تھی اسی طرح مجھے بھی نیند نے آ لیا تھا حضورؐ نے فرمایا کہ یہاں سے کوچ کرو۔ پس وہ سب حضرات کچھ دور تک اپنی سواریاں لے گئے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو فرمایا اور بلالؓ کو نماز کی اقامت کا حکم دیا۔ پس بلالؓ نے اقامت کہی تو حضورؐ نے انہیں صبح کی نماز پڑھائی سو جب نماز قضا کر لی تو ارشاد فرمایا کہ جو کوئی نماز کو بھول جائے (اور نیند بھی بھول کی مانند ہے) تو جب اسے یاد آئے پڑھ لے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ نماز کو میری یاد کے لیے قائم کر۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔

شرح: اس رات کا نام علمِ حدیث کی اصطلاح میں لیلۃ التعریس رکھا گیا[۱] خیبر مدینہ منورہ سے تین منزل پر واقع ہے۔ محرم ۷ھ میں حضور صلی اللہ

۱۔ مرقات ج ۲ ص ۱۷۱، مظاہر حق ج ۱ ص ۲۱۲

علیہ وسلم نے دس دن سے کچھ اوپر تک اس کا محاصرہ کیا اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے وہ فتح ہو گیا۔ مدینہ کے یہودیوں کی بار بار عہد شکنی، سازشوں اور بغاوت کے باعث خود ان کی مرضی کے مطابق حضورؐ نے انہیں جلاوطن کر دیا تھا وہ وہاں سے خیبر میں آ آباد ہوئے تھے اور فطرتِ کج کے مظاہرے یہاں بھی شروع کر دیئے تھے۔ آخر فتح مکہ سے تقریباً ایک سال قبل ان کی سرکشی کی انہیں سزا دی گئی۔ لیلۃ التعریس کا واقعہ اسی غزوہ سے واپسی پر پیش آیا تھا۔ واضح رہے کہ یہ خیبر وہ درہ خیبر نہیں جو پاکستان کی سرحد پر واقعہ ہے بلکہ ایک عربی مقام کا نام ہے۔

علامہ علی القاریؒ نے طیبیؒ سے نوویؒ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ اس حدیث سے ایک شبہ پیدا ہوتا ہے، وہ یہ کہ حضرت عائشہؓ کی صحیح حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا: میری آنکھیں سوتی ہیں لیکن دل نہیں سوتا۔ پھر یہ کیسے ممکن ہوا کہ حضورؐ سو گئے اور آپؐ کو نماز جیسی عبادت سے بھی ذہول ہو گیا؟ نوویؒ فرماتے ہیں کہ اس کے دو جواب ہیں — پہلا یہ کہ ان دونوں حدیثوں کا مضمون اپنی اپنی جگہ صحیح ہے اور دل کی بیداری کے باوجود نیند کی حالت میں نماز سے غفلت ممکن تھی کیونکہ دل تو صرف باطنی امور کا ہی ادراک کر سکتا ہے جیسے راحت و آرام اور رنج و الم وغیرہ اور حسی و مادی چیزوں کا ادراک دل کو نہیں ہوتا اور ظاہر ہے کہ فجر کا طلوع ہونا حسی امور سے ہے اور یہ صرف آنکھوں سے ہی معلوم ہو سکتا ہے اور آنکھیں اس وقت سو رہی تھیں۔ لہٰذا آپؐ کو طلوع فجر کا علم نہ ہو سکا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ عام حالات میں گو آپؐ کی نیند ناقضِ وضو نہ تھی لیکن اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ آپؐ کی نیند ناقضِ وضو ہوتی تھی یہی وجہ ہے کہ اس میں آپؐ کے وضو فرمانے کا ذکر موجود ہے اور شاید اس، دوسری قسم کی نیند میں آپؐ کا دل بیدار نہ رہتا ہو۔ لہٰذا نماز کے وقت سے ذہول ہو گیا اور نماز فوت ہو گئی۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ یہ جواب کمزور ہے۔

پھر علامہ علی القاریؒ[۲] شارح طیبیؒ سے نقل فرماتے ہیں کہ حضورؐ پر بحالتِ نوم نسیان طاری ہو گیا تا کہ قضا نماز کے بارے میں بھی سنت قائم فرما دیں۔ پس اس واقعہ

۱؎ مرقات ج ۲ صـ ۱۷۱، مظاہر حق ج ۱ صـ ۲۴۲ ۲؎ مرقات ج ۲ صـ ۱۷۹۔

میں آپؐ نے قضاء نماز کے متعلق ایک فعلی سنت قائم کی جو قولی دلیل سے زیادہ قوی ہے اور یہی[1] سبب ہے کہ اس حالت میں آنجنابؐ کو بذریعہ وحی یا کشف والہام بھی آگاہ نہ فرمایا گیا تاکہ احکامِ قضاء آپؐ کی فعلی سنت سے معلوم ہو جائیں۔

امام[2] ابن الہمامؒ نے ابوداؤد اور مسلم سے دوسری روایات سے ثابت کیا ہے کہ اس واقعہ میں حضورؐ نے بلالؓ کو صرف اقامت کا حکم نہیں دیا تھا بلکہ اذان اور اقامت دونوں ہوئی تھیں۔ ابوداؤد کی روایت جو عمروؓ بن امیہ اور عمرانؓ بن حصین سے ہے اس میں اذان واقامت دونوں کا ذکر ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس جنگ خندق کی قضاء نمازوں کو بھی حضورؐ نے اذان واقامت دونوں سے ادا فرمایا تھا لیکن امام شافعیؒ کا قول جدید یہ ہے کہ قضاء نماز کے لیے اذان کی ضرورت نہیں صرف اقامت کافی ہے۔ اور انہوں نے اس حدیث کے ظاہر سے استدلال فرمایا ہے۔

علامہ[3] حافظ جمال الدینؒ زیلعیؒ فرماتے ہیں کہ لیلۃ التعریس کی نماز فجر اذان واقامت دونوں کے ساتھ قضاء کی گئی اس باب میں ابوہریرہؓ، عمرو بن امیۃ الضمریؓ ذی فجرؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ سے روایات موجود ہیں۔ ابوہریرہؓ کی روایت ابوداؤد میں ہے۔ عمران بن حصینؓ کی روایت بھی ابوداؤد میں موجود ہے۔ علاوہ ازیں یہی روایت ابن حبانؒ اور ابن خزیمہؒ نے بھی بیان کی ہے۔

عمرو[4] بن امیہ الضمریؓ کی حدیث بھی ابوداؤد میں موجود ہے۔ اور ذی فجر الحبشیؓ، (خادمِ خاص جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی روایت بھی ابوداؤد میں موجود ہے۔ عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت صحیح ابن حبان میں موجود ہے۔

اس[5] حدیث میں یہ جو آیا ہے کہ حضورؐ نے اس جگہ سے کوچ کرنے کا حکم دیا اور آگے جا کر نماز قضاء کی، سو اس کا باعث یہ تھا کہ سورج اچھی طرح طلوع ہو لے اور کراہت کا وقت نکل جائے۔ نیز حضورؐ نے پسند نہ فرمایا کہ جس جگہ غفلت ونسیان سے نماز فوت ہو گئی تھی وہاں زیادہ ٹھہریں۔ واللہ اعلم۔

---

۱ مظاہر حق ج ۱ صہ ۲۴۲۔ ۲ مرقات ج ۲ صہ ۱۷۸، مظاہر حق ایضاً۔

۳ نصب الرایہ ج ۲ صہ ۲۸۱۔ ۴ نصب الرایہ ج ۲ صہ ۲۸۲۔

۵ مظاہر حق ج ۱ صہ ۲۴۲، مرقات ج ۲ صہ ۱۷۸۔

قضاء نماز کے متعلق اس حدیث کے آخر میں جو ارشاد ہے وہ اس سے پہلے بھی گزر چکا ہے اور وہاں اس کی مناسب شرح لکھی جا چکی ہے۔ فلیراجع۔

حدیث ۶ : وعن ابی قتادۃؓ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اذا اقیمت الصلوٰۃ فلا تقوموا حتی ترونی قد خرجت۔ متفق علیہ۔

ترجمہ : حضرت ابو قتادہؓ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب نماز کی اقامت ہو جائے تو اس وقت تک مت اٹھو جب تک مجھے آتا نہ دیکھ لو۔ اس پر بخاری و مسلم کا اتفاق ہے۔

شرح : سید المحدثین سید انور شاہؒ الکشمیری فرماتے ہیں کہ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہؓ اقامت کے ختم ہونے پر کھڑے ہوتے تھے اور بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ تکبیر (اقامت) کے دوران میں کھڑے ہوتے تھے اور مسئلہ اس میں یہ ہے کہ امام اگر مسجد سے باہر ہو تو مقتدیوں کے لیے مناسب یہی کہ وہ صفیں سیدھی کرنے کے لیے اس وقت اٹھیں جب امام مسجد میں داخل ہو۔ لیکن اگر امام مسجد کے اندر ہو تو اس کا اپنی جگہ سے اٹھنا معتبر سمجھا جائے گا۔ اور کچھ بھی ہو بہر حال یہ مسئلہ نفس صلوٰۃ کے مسائل میں سے نہیں بلکہ آداب میں سے ہے۔ پس اگر کوئی شخص امام کے آنے سے پہلے ہی اٹھ کھڑا ہو تو وہ گنہ گار نہ ہوگا۔ اور علماء نے کہا ہے کہ بلالؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے کا انتظار کرتے تھے۔ جب آپؐ کو تشریف لاتا دیکھتے اقامت کہتے اور دوسرے لوگ حضورؐ کو اس وقت دیکھتے تھے جب آپؐ صف تک آپہنچتے تھے اور آپؐ کا گھر بالکل مسجد سے متصل تھا۔ آپؐ کا پہلا قدم گھر سے مسجد میں پڑتا تھا اور صفیں اس وقت تک درست ہو چکی ہوتی تھیں۔ صحابہؓ قبلہ رخ بیٹھے ہوتے تھے لہٰذا صفیں سیدھی کرنے میں کوئی تکلیف پیش نہ آتی تھی۔ حضرت علامہ کے ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر صفیں درست نہ ہو چکی ہوں تو امام پہلے صفیں بنوائے پھر نماز شروع کرے اور بعض احادیث میں یہ حکم موجود بھی ہے۔[1]

علامہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ[2] فرماتے ہیں کہ جب امام مسجد میں موجود ہو تو اقامت

---

[1] فیض الباری ج ۲ ص ۱۸۷۔ [2] فتح الباری ج ۲ ص ۳۵۴۔

کے بعد یا قد قامت الصلوٰۃ پر اور یا حی علی الصلوٰۃ پر اٹھنا چاہیئے۔ لیکن جب امام مسجد سے باہر ہو تو جمہور کی رائے یہی ہے کہ اس حدیث کے مطابق اس وقت کھڑے ہوں جب امام کو دیکھ لیں۔ اس کے بعد حافظ صاحبؒ کا کلام وہی ہے جو اوپر سید انور شاہؒ محدث سے گزر رہا ہے۔

علامہ قسطلانیؒ ارشاد الباری میں اس کے قریب فرماتے ہیں علماء نے دلائل شرع کو جمع کر کے وہ وقت متعین کرنے کی کوشش کی ہے جب لوگ کھڑے ہوں۔ امام مالکؒ اس میں کوئی حد بندی نہیں فرماتے کیونکہ وہ اسے لوگوں کی طاقت پر مبنی سمجھتے ہوں بعض کمزور ہوتے ہیں، بعض قوی، بعض بوجھل ہوتے ہیں بعض ہلکے پھلکے۔ ہاں بہتر ان کے نزدیک یہی ہے کہ اقامت کے اول ہی میں ہی سب لوگ کھڑے ہو جائیں۔ (یعنی جب امام مسجد کے اندر موجود ہو) اور امام شافعیؒ اور جمہور فقہاء نے اس کی حد اقامت کا اختتام قرار دی ہے اور یہی امام ابو یوسفؒ کا قول بھی ہے۔ اور امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نزدیک حی علی الصلوٰۃ پر صف بندی اور قد قامت الصلوٰۃ پر امام کو تکبیر تحریمہ کہہ دینی چاہیے۔ اور امام احمدؒ کے نزدیک بھی حی علی الصلوٰۃ ہی قیام کی حد ہے واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۷: وعن ابی هريرةؓ قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا اقيمت الصلوٰة فلا تاتوها تسعون واتوها وعليكم السكينة فما ادركتم فصلوا وما فاتكم فاتموا متفق علیه۔ وفی رواية لمسلم فان احدكم اذا كان يعمد الی الصلوٰة فهو فی صلوٰة۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب نماز کے لیے اقامت کہی جائے تو دوڑتے ہوئے اس کی طرف مت آؤ بلکہ سکون اور وقار کے ساتھ آؤ پھر جتنی نماز مل جائے پڑھ لو۔ اور جو رہ جائے اسے پورا کر لو۔ متفق علیہ۔ اور مسلم کی ایک حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ جب تم میں سے کوئی نماز کا ارادہ کرتا ہے تو وہ نماز ہی میں ہوتا

۱؎ ارشاد الباری ج ۲ ص ۲۴ ۲؎ مظاہر حق ج ۱ ص ۲۱۲۔

ہے۔

شرح: اسلام اپنے پیروؤں کو ہر چیز میں تہذیب اور سکون و وقار کا حکم دیتا ہے۔ نماز جیسی اہم عبادت کے لیے بھاگم بھاگ آنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اگر اس کا راستہ کھول دیا جاتا تو خدا جانے روزانہ مسجدوں میں کتنے تصادم ہوتے اور کس قدر لوگ باہم دست وگریبان ہوا کرتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وقار اور سکون واطمینان کی ہر عمل و فعل میں کس قدر اہمیت ہے۔

شارح طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا حکم قرآن پاک آیت فاسعوا الیٰ ذکر اللہ کے منافی نہیں ہے کیوں کہ سعی سے مراد آیت میں قصد ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ اس کے بعد فرمایا ہے وَذَرُوا البَیْعَ یعنی لاحضہ کلام یہ ہوا کہ کام کاج چھوڑ کر ذکر الٰہی کا قصد کرو۔ امام حسن بصریؒ کا ارشاد ہے کہ سعی صرف قدموں پر منحصر نہیں ہے بلکہ نیتوں اور دلوں پر منحصر ہے۔

علماء[۱] نے فرمایا ہے کہ نماز کی طرف دوڑنا عقل کی سبکی اور غفلت کی دلیل ہے۔ کیونکہ اگر جلدی کرتا ہے اور پہلی تکبیر کے حصول کے لیے بھاگتا ہے تو اسے پہلے سے مستعد رہنا چاہیئے تھا۔ اور حدیث میں دوڑنے سے منع فرمایا ہے۔ اگر کوئی شخص سکون و وقار کے ساتھ تیز تیز چل کر آئے تو نماز بھی زیادہ سے زیادہ مل جائے گی اور حدیث پر بھی عمل ہو جائے گا۔

حافظ[۲] علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے استدلال کیا گیا ہے کہ مقتدی امام کے ساتھ چاہے کسی جزء میں شامل ہو جائے اسے جماعت کی فضیلت حاصل ہو جاتی ہے۔ اور حدیث میں اس امر کی دلیل بھی موجود ہے کہ امام کو جس حال میں بھی پائے اسی حالت میں اس کے ساتھ مل جانا چاہیئے۔ حافظ صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اکثر روایات حدیث میں فَاَتِمُّوا کا لفظ اور بعض میں فَاقْضُوا کا لفظ آیا ہے اور اس جگہ اتمام اور قضاء ایک ہی معنی میں بولے گئے ہیں یعنی جتنی نماز رہ گئی ہے اسے قضاء کر لیا جائے اور قضاء کا لفظ کبھی ختم کرنے کے معنوں میں بھی آتا ہے مثلاً ارشادِ الٰہی ہے: فَاِذَا قُضِيَتِ

۱؎ مرقات ج ۲ ص ۱۷۹ - ۲؎ مظاہر حق ج ۱ ص ۲۲ - ۳؎ فتح الباری ج ۳ ص ۳۵۳ -

الصَّلٰوۃَ فَانْتَشِرُوْا۔

علامہ قسطلانیؒ فرماتے ہیں کہ سکون و وقار سے چل کر نماز کی طرف آنا چاہیئے چاہے امام آنے والے کے پہنچنے تک فارغ ہی کیوں نہ ہو جائے۔ کیونکہ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ جب تم نماز کی طرف آرہے ہوتے ہو تو نماز ہی میں ہوتے ہو پس مقصود تو تمہیں بہر حال حاصل ہی ہے اور تم نمازیوں ہی کے حکم میں ہو۔

حنفیہ نے حدیث کے ان الفاظ سے کہ فرمایا "افاتکم فاتموا" اور روایات میں ہے فَاقْضُوْا (جیسا کہ فتح الباری کے حوالہ سے ابھی گزرا) سمجھا ہے کہ یہ نمازی جو بعد میں شامل ہوا ہے یہ ان رکعات کو پڑھے گا (یعنی امام کے سلام کے بعد) جو پہلی تھیں۔ پس یہ اٹھ کر ثناء سے شروع کرے گا اور قرأتؐ کے لحاظ سے اس کی یہ رکعات پہلی شمار ہوں گی۔ گو ترتیبِ عملی کے لحاظ سے یہ آخری رکعات ہوں گی۔ پس تشہد وغیرہ اسی ترتیب سے ہوگا۔ واللہ اعلم۔

باب المساجد و مواضع الصّلٰوۃ

مسجد کا لفظی معنی سجدہ گاہ ہے اور اصطلاح میں اس سے مراد وہ خاص مکان ہے جسے نماز کے لیے وقف کر دیا گیا ہو۔ جہاں تک نماز کے جواز کا تعلق ہے سوائے کسی رکاوٹ اور مجبوری کے حضورؐ کے ارشاد کے مطابق ساری دنیا آپؐ کے لیے مسجد قرار دیدی گئی ہے۔ پہلی امتوں کی نماز صرف عبادت گاہوں تک محدود ہوتی تھی لیکن امتِ محمدیہؐ کو بوقت ضرورت ہر پاک و صاف جگہ میں ادائے نماز کی اجازت دے دی گئی ہے۔ سورۂ نور کی آیت فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنْ تُرْفَعَ کی تفسیر میں حضرت ترجمان القرآن عبداللہؓ بن عباس فرماتے ہیں کہ آسمان والوں کے لیے زمین کی مسجدیں یوں چمکتی ہیں جس طرح ہمارے لیے آسمان کے ستارے۔ اور مسجدوں کی تعمیر اور انہیں بلند کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔[۳] حضور صلی اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ مسجدیں ہی دراصل

---

[۱] قسطلانی ج ۲ ص ۳۳۔ [۲] مرقات ج ۲ ص ۱۸۰۔ [۳] مرقات ج ۲ ص ۱۸۳، مظاہر حق ج ۱ ص ۲۴۴۔

متقین کے گھر ہیں اور جس شخص کا گھر مسجد ہو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے راحت و رحمت اور پلصراط سے گزر کر جنت تک جا پہنچنے کی ذمہ داری لے لی ہے۔ عبدالرحمن بن معقل رضؓ فرماتے ہیں کہ ہم آپس میں بات چیت کیا کرتے تھے کہ مسجد شیطان کی دراندازی سے محفوظ قلعہ ہے۔ عبداللہ بن عمر رضؓ فرماتے ہیں کہ مسجدیں زمین پر خدا کے گھر ہیں اور جو کوئی کسی سے ملنے آئے اس پر لازم ہے کہ آنے والے کا اکرام کرے (پس اللہ تعالیٰ مسجدوں میں آنے والوں کا اکرام فرماتا ہے)۔

مواضع الصلوٰۃ کے لفظ سے صاحبِ مشکوٰۃ کی مراد یہ ہے کہ وہ کون کونسی جگہیں ہیں جہاں نماز جائز ہے اور کن کن مقامات و مواضع میں نماز جائز نہیں؟ چنانچہ اس باب میں ان دونوں چیزوں کا بھی ذکر آئے گا اور چونکہ یہ مضمون مساجد کے ذکر و عظمت والی احادیث کے علاوہ تھا لہٰذا مواضع الصلوٰۃ کا لفظ رکھ دیا گیا ہے۔

الفصل الاوّل

حدیث ۱: عن ابن عباس رضؓ قال لما دخل النبی صلی اللہ علیہ وسلم البیت دعا فی نواحیہ کلھا ولم یصل حتی خرج منہ فلما خرج رکع رکعتین فی قبل الکعبۃ وقال ھذہ القبلۃ۔ رواہ البخاری ورواہ مسلم عنہ عن اسامۃ بن زید رضؓ۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ میں داخل ہوئے تو اس کے تمام اطراف میں آپؐ نے دُعا مانگی اور باہر تشریف لانے تک نماز نہیں پڑھی۔ پھر جب باہر نکلے تو کعبہ کے سامنے دو رکعتیں پڑھیں اور فرمایا یہ قبلہ (نماز کا رخ) ہے۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے اور مسلم نے اس حدیث کو عبداللہ بن عباس رضؓ کی معرفت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

شرح: محدثین کے نزدیک اس حدیث اور آئندہ حدیث میں تعارض ہے کیوں کہ اس حدیث میں حضرت ابن عباس رضؓ حضورؐ کی کعبہ میں نماز کی نفی فرما رہے ہیں اور آئندہ حدیث میں حضرت بلال رضؓ حضورؐ کی کعبہ میں نماز کا اثبات فرما رہے ہیں پس دونوں

حدیثوں میں تعارض ہوگیا ہے۔ محدثین نے ترجیح کا طریقہ اختیار کیا ہے اور فرمایا ہے کہ حضرت بلالؓ والی حدیث راجح ہے کیوں کہ اس میں اثبات ہے۔ علاوہ ازیں عبداللہ بن عباسؓ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کعبہ میں داخل نہیں ہوئے تھے[1]، لہٰذا انہیں معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ حضورؐ نے نماز نہیں پڑھی تھی یا نہیں۔ لیکن صاحب مشکوٰۃ نے تصریح کر دی ہے کہ یہ روایت مسلم میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے حضرت اسامہ بن زید سے کی ہے اور اگلی روایت کے مطابق اسامہ بن زید حضورؐ کے ساتھ کعبہ میں داخل ہوئے تھے۔ اس اشکال کا جواب علامہ قسطلانیؒ نے یہ دیا ہے کہ اسامہؓ خود اس وقت دعا میں مصروف تھے اور حضورؐ کے قریب بھی نہ تھے لہٰذا بلالؓ والی روایت کو ہی ترجیح دی جائے گی۔

حافظ ابن حجرؒ[2] نے فتح الباری میں اس حدیث پر دو جگہ کلام فرمایا اور بلالؓ کی روایت کو ترجیح دینے کے علاوہ وجوہ ترجیح بھی بیان کی ہیں۔

علامہ سید انور شاہؒ[3] الکشمیری نے دونوں روایتوں کو تطبیق دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ حضورؐ دو مرتبہ کعبۃ اللہ میں داخل ہوئے ہیں: ایک مرتبہ فتح مکہ کے موقع پر اور دوسری مرتبہ حجۃ الوداع میں۔ پس حضرت بلالؓ والی روایت الگ واقعہ کے لیے اور ابن عباسؓ والی روایت الگ موقع کے لیے۔ اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت ابن عباسؓ سے تاریخ ازرقی میں منقول ہے کہ کعبہ کے اندر نماز ہے لیکن اس میں رکوع و سجود نہیں بلکہ صرف تکبیر، تسبیح اور استغفار ہے اور قرأت بھی نہیں جیسا کہ نماز جنازہ ہے۔

آنے[4] والی عبداللہ بن عمرؓ کی روایت کے مطابق جمہور علماء کا مسلک یہ ہے کہ کعبۃ اللہ کے اندر نفل جائز ہیں۔ فرض نماز میں اختلاف ہے۔ جمہور کا مذہب جواز کا ہے اور امام مالکؒ اور امام احمدؒ فرض کو جائز نہیں قرار دیتے۔ محمد بن جریر طبریؒ فرض و نفل کسی کے بھی قائل نہیں اور انہوں نے ابن عباسؓ کی اس روایت سے استدلال کیا ہے هٰذه[5] القبلہ سے مراد یہ ہے کہ باہر والے لوگ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھیں

---

۱ قسطلانی ج ۱ ص ۴۷۸ ۲ فتح الباری ج ۲ ص ۲۴۹ ، ایضاً کتاب الحج۔
۳ فیض الباری ج ۲ ص ۳۲ ۴ مظاہر حق ج ۱ ص ۲۴۵ ، مرقات ج ۲ ص ۱۸۳ ۵ مظاہر حق ج ۱ ص ۲۴۵ ، مرقات ج ۲ ص ۱۸۳۔

چاہے وہ کعبہ سے کسی جانب بھی بستے ہوں۔ اس سے مراد صرف ایک ہی رخ نہیں ہے۔

حدیث ۲: وعن عبد اللّٰہ بن عمرؓ ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم دخل الکعبۃ ھو واسامۃ بن زید وعثمان بن طلحۃ الحجبی وبلال بن رباح فاغلقھا علیہ ومکث فیھا فسالت بلالا حین خرج ماذا صنع رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقال جعل عمودا عن یسارہٖ وعمودین عن یمینہٖ وثلاثۃ اعمدۃ ورائہٖ وکان البیت یومئذٍ علی ستۃ اعمدۃٍ ثم صلی۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ شریف میں داخل ہوئے اور آپؐ کے ساتھ اسامہؓ بن زید، عثمان بن طلحہ حجبیؓ اور بلال بن رباحؓ بھی تھے۔ پس بلالؓ نے (یا عثمانؓ نے) کعبہ شریف کا دروازہ (حضورؐ کے حکم سے) بند کر دیا اور حضورؐ کچھ دیر اس میں ٹھہرے رہے پھر جب حضورؐ (صحابہ سمیت) باہر تشریف لائے تو میں نے بلالؓ سے پوچھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ میں کیا کیا؟ تو بلالؓ نے کہا کہ حضورؐ نے ایک ستون اپنے بائیں، دو ستون اپنے دائیں اور تین ستون پیچھے رکھے اور کعبۃ اللہ ان دنوں چھ ستونوں پر قائم تھا۔ پھر حضورؐ نے اس جگہ نماز پڑھی۔ بخاری و مسلم نے اس حدیث پر اتفاق کیا ہے۔

شرح: عثمانؓ بن طلحہ کعبہ شریف کے کنجی بردار تھے۔ فتح مکہ کے موقع پر حضورؐ نے انہیں طلب فرما کر کعبہ کا دروازہ کھلوایا تھا اور انہیں اور بلالؓ اور اسامہؓ کو ساتھ لے کر اندر داخل ہوئے تھے۔ بعد میں کچھ لوگوں کے اصرار کے باوجود کعبہ کی کنجی عثمانؓ کو واپس دے دی گئی تھی۔ یہ شرف ان کے خاندان میں دیر سے چلا آرہا تھا۔ اور اب بھی یہ خدمت اُن ہی کے خاندان میں ہے۔ حجبی کا معنی ہے حاجب یعنی بوّاب اور اس سے مراد کعبہ شریف[1] کا دروازہ کھولنے والا ہے۔

---

[1] مرقات ج ۲ ص ۱۸۴۔

اور[1] دروازہ بند کر لینے سے غرض یہ تھی کہ لوگوں کا ہجوم نہ ہو جائے کیونکہ سب لوگ آپؐ کے افعال کو دیکھنے اور ان کے مطابق عمل کرنے کے مشتاق تھے (جیسا کہ خود ابن عمرؓ کا بلالؓ سے سوال بھی ظاہر کر رہا ہے)۔ اور عثمانؓ کو ساتھ لے جانے کا باعث ان کی دلداری تھی تاکہ وہ یہ نہ سمجھ لیں کہ بیت اللہ کی تولیت ان سے چھین لی گئی ہے اور حضرت بلالؓ اور حضرت اسامہؓ دونوں حضورؐ کے پیارے ساتھی اور خادم تھے اس لیے وہ بھی ساتھ ہی داخل ہوئے تھے۔

اس حدیث میں صراحتاً حضورؐ کے کعبہ میں نماز ادا کرنے کا ذکر موجود ہے ہم نے اوپر کی حدیث کی شرح ابن عباسؓ کی حدیث کی اس سے تطبیق یا اس حدیث کی ترجیح پر مختصر کلام کیا ہے اسے پھر دیکھ لیا جائے۔

شارح[2] کرمانیؒ اور محدث ابن حبانؒ نے حضور صلی اللہ علیہ کے کعبۃ اللہ میں داخل ہونے کو متعدد مانا ہے، ایک دن فتح مکہ کے موقع پر اور دوسری مرتبہ حجۃ الوداع میں۔ پہلی مرتبہ حضورؐ نے کعبہ میں نماز پڑھی تھی اور دوسری مرتبہ صرف دعا و تکبیر پر اکتفاء فرمائی تھی۔ بلکہ دارقطنی نے تو حجۃ الوداع کے موقع پر دو مرتبہ کعبہ میں داخل ہونا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے بیان کیا ہے۔ اس صورت میں ابن عباسؓ کی حدیث کو چھوڑنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی، ہاں اتنا ماننا پڑے گا کہ انہیں دوسری روایت کا علم نہ تھا یا وہ دلائل کی بنا پر کعبہ شریف میں نماز کے عدمِ جواز کے قائل تھے۔ اس لیے بلالؓ والی روایت کی تاویل کرتے ہوں گے۔ یا کسی وجہ سے نسخ کے قائل ہوں گے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

وکان[3] البیت یومئذٍ علی ستۃ اعمدۃٍ۔ یہ تصریح کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ اس حدیث میں کعبۃ اللہ کے چھ ستونوں کا ذکر ہے۔ بعد میں عبداللہؓ ابن زبیر کی شہادت کے بعد حجاج بن یوسف ثقفی نے جب کعبہ کی عمارت کو از سر نو بنوایا تو عمارت صرف تین ستونوں پر قائم کی گئی تھی۔

حدیث ۳۴ وعن ابی ھریرۃؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ

---

[1] نیل الاوطار ج ۲ صـ ۲۷ [2] مرقات ج ۲ صـ ۱۸۵، نیل الاوطار ج ۲ صـ ۲۹۔
[3] مرقات ایضاً۔

وسلم صلاۃ فی مسجدی ھذا خیر من الف صلوٰۃ فی ما سواہ الا المسجد الحرام۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا کہنا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میری اس مسجد میں نماز دوسری مسجدوں میں نماز کی نسبت ایک ہزار گنا زیادہ بہتر ہے۔ ہاں مسجد حرام اس سے مستثنیٰ ہے۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔

شرح: مسجد حرام[1] کے متعلق ابن ماجہ کی ایک حدیث کے الفاظ ہیں وصلوٰۃ بمکۃ بمأۃ الف لہٰذا اس مسجد میں ایک نماز ایک لاکھ کے برابر ہوئی۔ پھر اس میں کلام ہوا ہے کہ مسجد حرام کی کونسی جگہ ہے جس کے متعلق فضیلت نماز آئی ہے۔ بعض کے نزدیک سارا حرم ہے اور بعض کے نزدیک حرم شریف میں وہ جگہ جہاں نماز پڑھی جاتی ہے۔ حنفیہ اور بعض شافعیہ کا بھی یہی قول ہے اس لیے ان حضرات کے نزدیک یہ بیان شدہ فضیلت فرائض کے لیے ہے نہ کہ نوافل کے حق میں۔ تیسرا قول یہ ہے کہ مسجد حرام سے مراد مکہ مکرمہ ہے اور چوتھا لیکن ضعیف قول یہ بھی ہے کہ مراد کعبۃ اللہ ہے۔

مسجدی ھذا[2] کے الفاظ نے اس فضیلت کو مسجد نبوی کے ساتھ خاص کر دیا ہے اور مسجد قباء اور مدینہ منورہ کی دوسری مساجد اس سے خارج ہو گئی ہیں۔ گو ان کی بھی اپنی جگہ بہت فضیلت ہے لیکن اس حدیث کی بیان کردہ فضیلت صرف مسجد نبوی کے لیے ہے۔ اور امام نووی کے نزدیک اس سے مراد صرف اتنی مسجد ہے جو حضور کے زمانہ میں تھی بعد کے اضافے اس میں شامل نہیں (یعنی اس فضیلت میں) لیکن امام ابن تیمیہ نے اس خیال کے رد میں ایک طویل تقریر کی ہے۔ اسی طرح محب طبری نے بھی ایک لمبا کلام اس باب میں وارد کیا ہے جس میں دلائل قاہرہ سے ثابت کیا ہے کہ اس سے مراد مسجد نبوی ہے چاہے وہ جس زمانے میں جس شکل میں بھی موجود ہو کیونکہ اگر فضیلت صرف اس حضور کے زمانے والی مسجد سے خاص ہوتی تو آپ کے خلفائے راشدین سے یہ توقع نہیں ہو سکتی تھی کہ اس مسجد پر اضافہ کرتے اور اسے

---

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۲۴۶، مرقات ج ۲ ص ۱۸۹ - [2] مرقات ج ۲ ص ۱۸۷ -

از سرِ نو تعمیر کرتے۔ اور تاریخ مدینہ میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب مسجدِ نبوی کے اضافے کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو فرمایا اگر ذی الحلیفہ یا جبانہ تک بھی اضافہ ہو جائے تو یہ ساری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد ہو گی۔ ابو ہریرہؓ کی روایت میں خود حضورؐ سے منقول ہے کہ فرمایا میری مسجد میں جتنا بھی اضافہ ہوتا رہیگا وہ ہر حال میں میری ہی مسجد رہے گی۔ اور ایک روایت میں حضورؐ کا ارشاد ہے کہ اگر بالفرض، صنعائے یمن تک اسے پھیلا دیا جائے تب بھی یہ میری ہی مسجد رہے گی۔ صاحبِ[1] مرقات فرماتے ہیں کہ یہ ابن حجرؒ کے ارشادات کا خلاصہ ہے جو انہوں نے الجوہر المنظم فی زیارۃ القبر المکرم میں فرمائے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ثواب کی کمی بیشی ایک معنوی چیز ہے اسے مادی پیمانوں سے ناپا تولا نہیں جا سکتا اور اس باب میں معصوم پیغمبرؐ کا ارشاد ہی دلیلِ قاطع ہے۔ یہیں سے بعض احادیث میں آپؐ کی مسجد کے اندر ایک نماز کے ثواب کا پچاس ہزار نمازوں کے برابر ہونے کا ذکر موجود ہے اس کا راز بھی کھل گیا۔ شاید نماز پڑھنے والے کے خلوص اور خشوع وخضوع کا بھی اعتبار ہو اسی لیے کسی کا ثواب پچاس ہزار اور کسی کا صرف ایک ہزار فرمایا گیا ہے۔

علامہ[2] علی القاریؒ فرماتے ہیں کہ ثواب کی کمی بیشی میں مختلف احادیث میں کوئی تعارض نہیں ہے کیونکہ ممکن ہے کہ کم ثواب والی حدیث پہلے فرمائی گئی ہو پھر رحمت خداوندی نے ثواب کی کثرت کا علم دیا ہوگا تو حضورؐ نے کثرتِ ثواب کا ذکر فرمایا ہوگا اور یہ بھی ممکن ہے کہ عددوں کا اختلاف احوال کے اختلاف کی وجہ سے ہو کیوں کہ حدیث میں ہے کہ نیکی کا اجر دس گنا سے لے کر سات سو تک ہے۔ اور بعض کا اجر بے انتہا بھی ہوتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ ایک گھڑی کا غور و فکر ایک سال کی عبادت سے بہتر ہے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ مختلف روایات کو نفل، فرض اور فرض باجماعت پر محمول کر کے ان سب کا ثواب الگ الگ کر دیا جائے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۴: وعن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللہ صلی

١؎ مرقات ج ٢ صـ ١٨٧ ٢؎ مرقات ج ٢ صـ ١٨٨ ..

اللہ علیہ وسلم لا تشد الرحال الا الی ثلاثۃ مساجد مسجد الحرام والمسجد الاقصی ومسجدی ھذا۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کجاوے نہ کسے جائیں (سفر نہ کیا جائے) مگر تین مسجدوں کی طرف۔ ایک تو مسجدِ حرام (کعبۃ اللہ کی مسجد) دوسری مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) اور تیسری میری یہ مسجد۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم دونوں نے بیان کیا ہے۔

شرح: شد رحال کنایہ ہے دور دراز کا سفر کرنے سے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ یہ تین مسجدیں اپنی عظمت و فضیلت میں بہت بڑھی ہوئی ہیں۔ چنانچہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے حدیث کا یہی معنی بیان کیا ہے کہ یہ تینوں مقامات مقدس ترین ہیں لہٰذا اگر سفر کرنا ہو تو ان کی طرف کیا جائے اس سے ان مقامات کی شان اور اہمیت واضح ہوتی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کی زیارت کے سوا کسی اور مقصد کے لیے سفر کرنا ہی روا نہیں ہے۔[1]

[2] حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں زمانۂ جاہلیت کی بعض رسوم سے منع فرمایا گیا ہے۔ اہل جاہلیت بعض مقامات کا بطورِ تبرک (عبادت) سفر و قصد کیا کرتے تھے۔ جن مقامات کو وہ بزعمِ خویش مقدس و بابرکت جانتے تھے حضورؐ نے جاہلیت کی اس رسم سے منع فرما دیا تاکہ دینِ الٰہی کے شعائر غیر دینی شعائر سے ممتاز ہو جائیں اور غیر اللہ کی عبادت کا وسیلہ نہ ہو جائیں۔ اور میرے نزدیک حق یہی ہے کہ قبر اور کسی ولی اللہ کی بندگی کرنے کی جگہ اور طور وغیرہ اس بارے میں سب کا ایک ہی حکم ہے کسی کی طرف اس قصد سے سفر نہ کیا جائے۔

[3] مولانا قطب الدینؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا ظاہر تو تقاضا کرتا ہے کہ ان تین مسجدوں کے سوا کسی طرف بھی سفر کو روا نہ سمجھا جائے لیکن مقصود اس سے یہ ہے کہ بطور

---

۱ مظاہر حق ج ۱ ص ۴۶۲۔

۲ مصفّٰی دہلویؒ ج ۱ ص ۸۵، مظاہر حق ج ۱ ص ۴۶۲ بحوالہ حجۃ اللہ البالغہ۔

۳ مظاہر حق ایضاً۔

تقرب وعبادت ان تین جگہوں کے سوا کسی موضع کا قصد نہ کیا جائے۔ پس دیگر ضروری حاجات مثلاً طلبِ علم، تجارت، ادائے حقوق وغیرہ کے لیے سب جائز رہے گا اور نیک لوگوں کی قبروں کی زیارت کے لیے دور دراز کا سفر اختیار کرنے میں اختلاف ہوا ہے، بعض نے اس حدیث کی وجہ سے مطلقاً ناجائز کہا ہے اور بعض نے دوسری احادیث ودلائل کی بناء پر اس مقصد کو اس حدیث کے عموم سے خارج کر کے جائز قرار دیا ہے۔

اور بعض علماء نے اس حدیث کا معنی یہ بیان کیا ہے کہ بطریق نذر ان تین مسجدوں کے علاوہ اور کسی جگہ کا سفر جائز نہیں ہے اور اگر کسی نے نذر مان لی تو اس کا ایفاء واجب نہیں ہے۔ اور کچھ اور علماء نے اس حدیث سے مراد صرف مساجد لی ہیں۔ یعنی اس حدیث کی نہی صرف تین مسجدوں کے علاوہ اور مساجد کے لیے ہے دوسرے مقامات کا یہاں ذکر ہی نہیں ہے۔ لہٰذا اس حدیث سے ان کا جواز یا حرمت کچھ ثابت نہیں ہوتی ان کے سفر کے لیے اثباتاً یا نفیاً دوسرے دلائل درکار ہوں گے۔

امام نوویؒ نے احیاء العلوم سے نقل کیا ہے کہ اس حدیث سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان تین متقدس ومتبرک مقامات کے علاوہ کسی اور مسجد کے لیے بغرضِ زیارت وعبادت اور تبرک سفر نہ کیا جائے۔ اس سے زیارتِ قبور کی نہی ثابت نہیں ہوتی کیوں کہ اس کی ترغیب خود احادیث صحیحہ سے ثابت ہوتی ہے۔ اِن مساجد ثلاثہ کے علاوہ چونکہ سب مساجد بزرگی وتقدس میں مساوی ہیں لہٰذا کسی مسجد کی زیارت اور اس میں عبادت کے ثواب کے حصول کی خاطر سفر کرنا عبث و بے کار ہے لہٰذا اس سے منع فرمایا گیا ہے۔[1]

علامہ علی القاریؒ نے ابن الملکؒ سے نقل کیا ہے کہ اس صحیح حدیث کے مضمون سے ثابت ہو گیا ہے کہ قرآن کی آیت لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى (التوبہ) سے مراد مسجد نبویؐ ہے اور مسجد قباء آپؐ کی مسجد کے تابع ہے یا اس کے ساتھ ملحق ہے۔[2]

اگر اس حدیث کی نہی کو عام لیا جائے تو کاروبار مختل ہو جائیں گے اور کسی غرض

---

[1] مرقات ج ۲ ص ۱۹۰ [2] ایضاً۔

کے لیے کوئی سفر بھی جائز نہ رہے گا اور ظاہر ہے اس کا کوئی بھی قائل نہیں۔ نہ حضورؐ کے اس ارشاد کی یہ غرض ہے کہ طلبِ علم، زیارتِ احباب، ادائے حقوق، زیارتِ روضۃ النبیؐ اور جہاد و تبلیغ کے سفروں پر پابندی لگادی جائے حالانکہ بے شمار مقامات میں ان کی ترغیب موجود ہے۔ قرآن نے تو لغرض عبرت و نصیحت سیر و سفر کا حکم دیا ہے۔ قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ الآیہ۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۵ : وعن ابی ھریرۃؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم ما بین بیتی و منبری روضۃ من ریاض الجنۃ و منبری علی حوضی۔ متفق علیہ۔

ترجمہ : حضرت ابو ہریرہؓ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے اور میرا منبر میرے حوض پر ہے۔ متفق علیہ۔

شرح : اس حدیث میں بیتی سے مراد حضورؐ کا رہائشی گھر ہے اور اسی میں حضورؐ اس وقت آرام فرما رہے ہیں۔ پس دوسری حدیث میں جو ما بین قبری و منبری کے لفظ آئے ہیں ان میں اور اس حدیث میں کوئی اختلاف نہیں۔ بعض علماء نے فرمایا ہے کہ ما بین سے مراد حضورؐ کی مسجد کا محراب ہے کیونکہ وہ منبر اور آپؐ کے گھر کے درمیان واقع تھا کیونکہ آپؐ کے گھر کا دروازہ مسجد کے اندر ہی کھلتا تھا اور طبرانی کی ایک روایت میں ہے: ما بین حجرتی و مصلای۔ دراصل یہ سب الفاظ قریب قریب ہیں۔[۱]

مولانا قطب الدینؒ[۲] فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اس جگہ میں عبادت کرے گا جو میرے گھر اور منبر کے درمیان ہے وہ جنت کے باغوں میں سے کسی باغ میں جا پہنچے گا۔ اور جو کوئی میرے منبر کے پاس عبادت کرے گا وہ قیامت کے دن حوضِ کوثر سے پانی پیئے گا۔ اور امام مالکؒ[۳] کا ارشاد ہے کہ یہ حدیث اپنے ظاہر پر ہے اور روضہ کا معنی قطعہ اور ٹکڑا ہے۔ پس یہ ٹکڑا جنت سے نقل کیا گیا ہے اور وہیں

۱۔ مرقات ج ۲ ص ۱۹۱۔ ۲۔ مظاہر حق ج ۱ ص ۲۴۷۔

۳۔ مرقات ایضاً۔

واپس چلا جائے گا اور زمین کے باقی حصوں کی مانند قیامت کے وقت اسے فنا نہیں ہوگی۔ اور حافظ تورپشتی نے فرمایا ہے کہ حضور نے قطعۂ مسجد کا نام روضہ اس لیے رکھا ہے کہ حضور کی قبر کی زیارت کرنے والے اور اس ٹکڑے میں عبادتِ الٰہی میں، مصروف رہنے والے انس و جن ہر وقت ذکر و تسبیح اور نماز میں مصروف رہتے ہیں اور فرشتوں اور انسانوں کی جماعتیں یکے بعد دیگرے یہاں زیارت و عبادت کے لیے آتی رہتی ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ[1] فرماتے ہیں اس حدیث کی مانند اور احادیث بھی ہیں مثلاً: الجنۃ تحت ظلال السیوف اور عائد المریض علی مخارف الجنۃ۔ اور اس قسم کے ارشادات کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو کوئی یہ عبادت سرانجام دے گا یا اس جگہ ذکر و عبادت بجا لائے گا وہ جنت میں پہنچے گا اور حوضِ کوثر سے پانی پیے گا اور اس کی نظیر کتاب اللہ میں یہ ہے: انما یاکلون فی بطونہم ناراً اھ اور اس حدیث کا معنی یوں بھی کیا گیا ہے کہ حضور کے گھر اور منبر کا درمیانی حصہ جنت کے ایک باغ کے بالمقابل واقع ہے۔

علامہ علی القاری[2] محدث فرماتے ہیں کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ان جگہوں میں نماز اور ذکر و تسبیح جنت کے باغوں میں داخلے کا سبب ہوگی جیسے حضور کا ارشاد ہے: الجنۃ تحت اقدام الامہات، الجنۃ تحت ظلال السیوف اور ایک حدیث میں ہے وما ریاض الجنۃ یا رسول اللہ قال المساجد۔ اور ایک روایت میں ذکر الٰہی کے حلقوں کو ریاض الجنت فرمایا گیا ہے۔

اور منبری علیٰ حوضی پر کچھ گفتگو تو گزری۔ محدث علی القاری[3] فرماتے ہیں کہ جس طرح قیامت میں حوضِ کوثر پیاسوں کی تشفی و سیرابی کا باعث ہوگا اسی طرح حضور کا منبر بھی صدائے حق کا مرکز اور روحانی پیاسوں کی شدت پیاس بجھانے کا باعث رہا ہے۔ علامہ حافظ ابن حجر نے فرمایا ہے کہ آپ کے منبر کو اللہ تعالیٰ حوضِ کوثر پر نصب کر دے گا۔ پس حدیث کا یہ لفظ اپنے حال پر ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

---

[1] مصفّٰی دسوی ج ۱ ص ۸۸۔ [2] مرقات ج ۲ ص ۱۹۱۔

[3] ایضاً۔

حدیث ۶ : وعن ابن عمرؓ قال كان النبي صلى الله عليه وسلم ياتي مسجد قباء كل سبتٍ ماشيًا وراكبًا فيصلي فيه ركعتين ۔ متفق عليه ۔

ترجمہ : حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہر ہفتہ کے دن پیدل یا سوار ہو کر مسجد قباء میں تشریف لاتے تھے اور اس میں دو رکعت نماز پڑھا کرتے تھے اس حدیث پر بخاری و مسلم کا اتفاق ہے ۔

شرح : اس حدیث سے مسجد قباء کی فضیلت ثابت ہوتی ہے اور شدِ رحال والی حدیث کے خلاف نہیں ہے کیونکہ شدِ رحال سے مراد دور دراز کا سفر ہے نیز شدِ رحال والی حدیث میں ہی گزر چکا ہے کہ مسجد قباء بھی مسجدِ نبوی کے تابع ہے یا اس کے ساتھ فضل و عظمت میں ملحق ہے ۔

مولانا قطب الدین[۱] فرماتے ہیں کہ ابن حجرؒ نے مسجد قباء کی فضیلت میں احادیث نقل کی ہیں ۔ مثلاً حضورؐ نے ایک صحیح حدیث میں فرمایا ہے کہ مسجدِ قباء میں نماز پڑھنا عمرہ کرنے کی مانند ہے ۔ اور سعدؓ بن ابی وقاص فرماتے ہیں کہ مسجدِ قباء میں دو رکعت نماز پڑھنا مجھے بیت المقدس کا سفر کرنے سے زیادہ محبوب ہے، اگر لوگوں کو معلوم ہو کہ اس مسجد کی کیا فضیلت ہے تو اس کی طرف سفر کر کے اپنے اونٹوں کے جگر مار دیں ۔ یعنی دور دراز سے مشقتِ سفر اٹھا کر آئیں ۔

علامہ محدث[۲] علی القاریؒ فرماتے ہیں کہ حضورؐ کی یہ نماز جو مسجد قباء میں ادا فرماتے تھے تحیۃ المسجد ہوتی تھی یا کوئی اور نماز ۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مسجدوں سے خدا کا تقرب حاصل کرنا اور صلحاء کے مقامات (قبور وغیرہ) سے برکت حاصل کرنا مستحب ہے اور ہفتہ کے دن زیارتِ مساجد یا زیارتِ احباب یا زیارتِ قبور سنت ہے ۔

قباء مدینہ منورہ سے تین میل کے فاصلے پر ایک بستی کا نام ہے ۔ حضورؐ ہجرت کے موقع پر مدینہ میں وارد ہونے سے پہلے یہیں ٹھہرے تھے اور یہ مسجدِ قباء بھی حضورؐ ہی کی بنا کردہ ہے ۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اسے بھی مسجد نبویؐ سے ملحق یا اس کے تابع

---

۱ مظاہر حق ج ۱ ص ۲۴۷ ، مرقات ج ۲ ص ۱۹۲ ۲ ایضاً ، ایضاً ۔

قرار دیا گیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۷ : وعن ابی ھریرۃؓ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم احب البلاد الی اللّٰہِ مساجدھا و ابغض البلاد الی اللّٰہ اسواقھا۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ جنابِ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ جگہیں مساجد ہیں اور سب سے ناپسند جگہیں بازار (یا منڈیاں، میلے ٹھیلے) ہیں۔ اسے مسلم نے روایت کیا۔

شرح: اس حدیث پاک میں مسجدوں کی فضیلت بازاروں اور میلوں ٹھیلوں یا منڈیوں کے مقابلے میں بیان فرمائی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ بازار شرعًا بالکل ہی مطلوب نہیں۔ حضورؐ کے زمانے میں بازار، منڈیاں اور میلے وغیرہ سب موجود تھے۔ صحابہؓ ان میں کاروبار کرتے تھے۔ خود حضورؐ بارہا بازاروں اور منڈیوں وغیرہ میں تشریف لے گئے ہیں۔

مسجدوں[1] کی فضیلت اس حدیث میں بطریق اغلبیت بیان ہوئی ہے ورنہ بعض دفعہ مسجدوں میں جانے والے بھی مذموم مقاصد مثلاً ریاکاری، غیبت اور چوری وغیرہ کے ارادے سے جاتے ہیں۔ اسی طرح بازاروں میں چونکہ بالعموم جھوٹ، خیانت، دھوکہ دہی، طمع و حرص وغیرہ کا ظہور ہوتا ہے اس لیے انہیں ناپسندیدہ فرمایا گیا۔ اور یہ بھی بقاعدۂ اغلبیت ہے (یعنی اغلبًا ایسا ہوتا ہے) ورنہ بعض دفعہ بازار میں بھی بہت سے نیک کام ہوتے ہیں اور بعض لوگ وہاں نیک مقاصد لے کر جاتے ہیں۔ مثلاً رزقِ حلال کی تلاش، نیکیوں کی تبلیغ وغیرہ۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ ان لوگوں میں سے بنو جو ہوتے تو بازار میں ہیں لیکن ان کے دل مسجد میں ہوتے ہیں اور ان لوگوں میں سے مت بنو جو ہوتے تو مسجد میں ہیں مگر ان کے دل بازار میں ہوتے ہیں۔

یہاں[2] ایک شبہ وارد ہوتا ہے کہ بازار کو مبغوض ترین جگہ کہا گیا اور بت خانے

---

[1] مرقات ج ۲ ص ۱۹۲، مظاہر حق ج ۱ ص ۲۴۷۔ [2] ایضًا۔

شراب خانے، قمار خانے اور چکلے وغیرہ کو بدترین یا مبغوض ترین جگہیں کیوں قرار نہ دیا گیا ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بازاروں کے رکھنے، منڈیاں قائم کرنے اور کاروباری ادارے بنانے کا شارع کی طرف سے حکم و اذن موجود ہے لیکن ان جگہوں کا حکم یا اذن ہی نہیں لہذا ان کا ذکر نہ فرمایا گیا۔ خلاصہ کلام یہ نکلا کہ وہ جگہیں جن کی شرع نے اجازت دی ہے ان میں سے بازار مبغوض ہیں۔ اور مسجدیں محبوب۔

حدیث ۸ : وعن عثمان رضی اللّٰہ عنہ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من بنی للّٰہ مسجداً بنی اللّٰہ لہ بیتاً فی الجنۃ۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اللہ کے لیے مسجد بنائے اللہ اس کے لیے جنت میں ایک گھر بنا دیتا ہے۔ بخاری و مسلم دونوں نے یہ حدیث روایت کی۔

شرح : شارح طیبیؒ نے فرمایا کہ مسجداً کی تنکیر (نکرہ لانا) تقلیل کے لیے ہے اور بیتاً کی تنکیر تکثیر کے لیے ہے۔ کیونکہ بعض احادیث میں آیا ہے کہ جس شخص نے ٹٹیھری، (دیا بٹیر) کے گھونسلے جتنی مسجد بھی بنا دی تو اس کے لیے جنت میں ایک گھر بنایا جاتا ہے۔ گو اس حدیث میں گھونسلے کا ذکر مبالغے کے لیے ہے اور لِلّٰہ کی شرط اس لیے لگائی گئی ہے تاکہ وہ لوگ جو نام و نمود اور شہرت و ریاکاری کے لیے مسجد بنائیں وہ اس سے خارج ہو جائیں۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ جو شخص مسجد بنوا کر اس پہ اپنا نام لکھوائے تو یہ چیز اس کے عدمِ اخلاص پہ دلالت کرتی ہے۔ پس مسجد کی تعمیر محض خداوند تعالیٰ کی خوشنودی اور اسلام و اہل اسلام کی سرفرازی کی نیت سے ہونی چاہیئے۔

بخاری میں یہی حدیث ان الفاظ سے آئی ہے : من بنی مسجداً ...... یبتغی بہ وجہ اللّٰہ بنی اللّٰہ لہ مثلہ فی الجنۃ۔[۲] حافظ عسقلانیؒ فرماتے ہیں کہ ترمذی میں اس کی روایت سے مسجداً کے بعد صغیراً او کبیراً کا لفظ آیا ہے۔

---

[۱] مرقات ج ۲ ص ۱۹۳، مظاہر حق ج ا ص ۲۸۷ [۲] فتح الباری ج ۲ ص ۲۷۱۔

اور ابن ابی شیبہ، ابن حبّان اور بزار کی روایت ہیں ولو کمفحص قطاۃ کا لفظ موجود ہے۔ علماء نے اس لفظ کو مبالغہ پر محمول کیا ہے حالانکہ اگر سوچا جائے تو مسجدوں میں عموماً مسلمانوں کی تعمیر کا حصہ اتنا اتنا ہی نکلتا ہے اس لیے یہ لفظ حقیقت پر مبنی ہے۔ پھر حافظ صاحب نے مثلہ کے لفظ پر عجیب بحث کی ہے اور مثلیت فی التعمیر والبناء مراد لی ہے۔

حافظ عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مثلہٗ سے مراد یہ ہے کہ اس کے اخلاص کی مقدار کے مطابق کم از کم دس گنا جزاء ہو گی کیونکہ نیکی کی کم از کم جزاء کی مقدار یہی ہے اور عدل کے لحاظ سے تو ایک نیکی کی ایک ہی جزا ہے جو کچھ زیادہ ہے وہ فضلِ الٰہی کی بناء پر ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۹: وعن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من غدا الی المسجد او راح اعد اللہ لہ نزلہ من الجنۃ کلما غدا او راح۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ انہوں نے کہا کہ جنابِ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص مسجد کی طرف پہلے پہر یا پچھلے پہر گیا اللہ تعالیٰ جنت میں اس کی مہمانی (یا منزل) تیار کر دیتا ہے جب بھی وہ پہلے یا پچھلے پہر جائے۔ اس حدیث پر بخاری و مسلم کا اتفاق ہے۔

شرح: غدا کا لفظ غدوۃٌ سے اور راحَ کا رَوَاحَ سے نکلا ہے۔ غدوۃ کا معنی ہے طلوعِ فجر سے لے کر زوال تک کا وقت اور رواح کا معنی ہے زوال کے بعد کا وقت مراد اس سے ہے پانچ نمازوں کے لیے مسجد کی آمد و رفت رکھنا۔ کیونکہ مسجد کی طرف جانا بالعموم نماز ہی کے لیے ہوتا ہے لیکن حدیث کے لفظ کا اطلاق نماز کے علاوہ دیگر مقاصد کو بھی شامل ہے۔ مثلاً کسی دینی محفل میں شامل ہونے یا درس و وعظ اور تعلیم و تعلّم وغیرہ کی غرض سے مسجد کو جانا بھی اس میں داخل ہے۔

ؔ ارشاد الساری ج ۲ ص ۵۱۱

نُزُل[۱] کا معنی ہے مہمان کی خدمت کے لیے اس کی ضروریات کو مہیا کرنا اور جس جگہ مہمان کو اتارا جائے اسے بھی نُزُل کہتے ہیں۔ مسجد[۲] خانہ خدا ہے، جو لوگ اس میں آتے ہیں اللہ تعالیٰ کریم ہے وہ آنے والوں کو مہمان جان کر ان کی ضیافت کا بندوبست کرتا ہے۔

کلما[۳] کے لفظ کا معنی یا تو یہ ہے کہ جتنی مرتبہ بھی کوئی مسجد میں آمد و رفت کا عمل کرے گا اتنی مرتبہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی یہ جزا ثابت ہو جائے گی۔ اور یا یہ کہ جتنی دیر کوئی شخص اس آمد و رفت میں لگائے گا اتنی دیر کے لیے وہ خدا کی مہمانی کا مستحق بن جائے گا۔

حدیث ۱۰ : وعن ابی موسیٰ الاشعری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعظم الناس اجرًا فی الصلوٰۃ ابعدھم فابعدھم ممشیً والذی ینتظر الصلوٰۃ حتی یصلیہا مع الامام اعظم اجرًا من الذی یصلی ثم نام۔ متفق علیہ۔

ترجمہ : حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ نماز میں سب لوگوں سے بڑا اجر ان کا ہے جن کو دور سے چل کر آنا پڑتا ہے۔ پھر ان کا ان سے بھی زیادہ اجر ہے جنہیں ان سے بھی زیادہ دور سے آنا پڑتا ہے۔ اور جو آدمی نماز کا انتظار کرتا ہے تاکہ اسے امام کے ساتھ پڑھے وہ اجر کے لحاظ سے اس آدمی سے عظیم تر ہے جو نماز پڑھ کر سو رہتا ہے۔ متفق علیہ۔

شرح : مولانا قطب الدین[۴] فرماتے ہیں کہ امام کا انتظار کرنے والے کا ثواب زیادہ ہے اگرچہ پہلا شخص (یعنی اکیلا پڑھ کر سو رہنے والا) وقتِ مستحب و مختار ہی میں پڑھے اسی طرح جو شخص چھوٹی سی جماعت سے نماز پڑھے یا ایسے شخص کی امامت میں پڑھے جو امامت کا مستحق نہیں ہے اس کی نسبت بڑی جماعت کا انتظار کرنے والا یا ایسے امام کی امامت کا انتظار کرنے والا جو امامت کا حقدار ہے زیادہ اجر کا مستحق ہے۔ بالخصوص اس وقت جبکہ یہ پڑھنے والا سستی و کسل کے باعث ایسا کرے۔

---

۱ مرقات ج ۲ ص ۱۹۳۔ ۲ مظاہر حق ج ۱ ص ۲۴۸۔ ۳ مرقات ج ۲ ص ۱۹۴
۴ مظاہر حق ایضاً۔

علامہ علی القاریؒ نے بھی شارح طیبی سے اس قسم کا کلام نقل کیا ہے۔
دور سے نماز کے لیے آنے والا زیادہ مشقت کی وجہ سے زیادہ اجر کا مستحق ہے۔
یعنی اگر مسجد کے قریب والے اذان کی آواز سن سکتے ہیں جب چاہیں جلدی سے مسجد میں آسکتے ہیں تو دور سے آنے والا بھی ایک فضیلت کا مستحق ہے۔ دوسری احادیث سے بھی اس مضمون کی تائید ہوتی ہے۔ حضورؐ نے کچھ ایسے لوگوں سے جو مسجدِ نبویؐ کے قریب آبسنا چاہتے تھے ارشاد فرمایا تھا کہ ایسا مت کرو کیوں کہ مسجد کی طرف آنے جانے میں تمہارے قدم بھی شمار ہوتے ہیں۔ جیسا کہ آگے آرہا ہے۔

حدیث ۱۱: وعن جابرؓ قال خلت البقاع حول المسجد فاراد بنو سلمة ان ينتقلوا قرب المسجد فبلغ ذلك النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقال لهم بلغنی انكم تريدون ان تنتقلوا قرب المسجد قالوا نعم يارسول اللّٰہ قد اردنا ذلك فقال یا بنی سلمة دیاركم تكتب آثاركم. دیاركم تكتب آثاركم - رواہ مسلم۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مسجدِ نبویؐ کے ارد گرد کچھ مکان خالی ہوئے تو بنو سلمہ نے چاہا کہ مسجد کے قریب منتقل ہو آئیں۔ جب یہ خبر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ملی تو آپؐ نے ان سے فرمایا مجھے خبر پہنچی ہے کہ تم مسجد کے قریب منتقل ہو جانا چاہتے ہو۔ انہوں نے عرض کیا کہ ہاں اے اللہ کے رسولؐ ہم نے یہی ارادہ کیا ہے۔ تو حضورؐ نے ارشاد فرمایا اے بنی سلمہ! اپنے گھروں میں رہو تمہارے قدموں کے نشانات بھی لکھے جاتے ہیں۔ دوبارہ فرمایا کہ اپنے گھروں میں ٹھہرے رہو تمہارے قدموں کے نشان بھی لکھے جاتے ہیں۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا۔

شرح: بنو سلمہ مسجد کے قریب حضورؐ کی ہمسائیگی میں آکر بسنا چاہتے تھے اتفاقاً کچھ مکان خالی ہوئے تو انہوں نے منتقل ہو جانے کا ارادہ کیا کیوں کہ ان کے محلہ اور مسجدِ نبویؐ میں کافی فاصلہ تھا۔ تب حضورؐ نے انہیں ترغیباً ایسا فرمایا تاکہ وہ مسجد

۱؎ مرقات ج ۲ ص ۱۹۲ ۲؎ مظاہر حق ج ۱ ص ۲۷۸۔

سے دور رہنے کو باعثِ محرومی نہ جانیں۔

علامہ علی القاری رح[1] فرماتے ہیں کہ بنو سلمہ (بکسر لام) کو دور سے آنا پڑتا تھا اور سردی بارش اور اندھیری رات میں انہیں بہت تکلیف ہوتی تھی۔ جب انہوں نے مسجد کے قریب آ رہنے کا ارادہ کیا تو حضور ﷺ نے یہ پسند نہ فرمایا کہ مدینے کے اطراف و جوانب خالی ہو جائیں لہٰذا انہیں ایسا کرنے سے روک دیا اور دور سے آنے کی وجہ سے جو تکلیف اور جد و جہد انہیں برداشت کرنا پڑتی تھی اس کا اجر بتا دیا۔

بعض[2] احادیث میں مسجد کے قریب رہنے والوں کو بوجہ اذان کی آواز سننے کے کچھ بشارتیں دی گئی ہیں۔ اور ایک حدیث میں ہے کہ وہ گھر جس میں اذان کی آواز سنائی نہ دے منحوس ہے ان دونوں قسم کی احادیث میں کوئی تعارض نہیں کیوں کہ حیثیتیں مختلف ہیں۔ یعنی قریب رہنے والے اس وجہ سے خوش نصیب ہیں کہ اذان کی آواز سنتے ہیں اور دُور رہنے والے اس وجہ سے اجر میں بہتر ہیں کہ انہیں دور سے چل کر آنا پڑتا ہے۔

موطا[3] امام مالک کی حدیث ہے کہ سردی میں اچھی طرح وضو کرنا، مسجدوں کی طرف زیادہ قدم چل کر آنا (یا زیادہ آمد و رفت رکھنا) اور ایک نماز کے بعد دوسری کا انتظار کرنا گناہوں کے معاف ہونے اور درجات کی بلندی کا باعث ہے اور یہ شیطانی طاقتوں کے خلاف جہاد کی تیاری ہے (یہ لفظ تین مرتبہ فرمایا)۔

حدیث ۱۲۱: وعن ابی ھریرۃ رضی قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم سبعۃ یظلھم اللّٰہ فی ظلہ یوم لاظل الا ظلہ امام عادل وشاب نشا فی عبادۃ اللّٰہ ورجل قلبہ معلق بالمسجد اذا خرج منہ حتی یعود الیہ ورجلان تحابا فی اللّٰہ اجتمعا علیہ وتفرقا علیہ ورجل ذکر اللّٰہ خالیاً ففاضت عیناہ ورجل دعتہ امراۃ ذات حسب وجمال فقال انی اخاف اللّٰہ ورجل تصدق

---

[1] مرقات ج ۲ ص ۱۹۴ ۔ [2] ایضاً

[3] مصفّٰی و مسوّٰی ج ۱ ص ۸۹ ۔

بصدقة فاخفاها حتى لا تعلم شماله ما تنفق يمينه ۔ متفق علیہ ۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سات شخص ایسے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ اپنے خاص سائے میں جگہ دے گا۔ اس دن جبکہ اس کے سائے کے سوا کوئی سایہ نہیں ہوگا۔ ایک تو عادل حاکم ہے۔ دوسرا وہ جوان جو اللہ کی عبادت میں پروان چڑھا۔ تیسرا وہ شخص جس کا دل مسجد میں اٹکا ہوا ہو، جب مسجد سے نکلے تو اس میں واپس آنے تک اسی کے دھیان میں رہے۔ چوتھے وہ دو شخص جو محض خدا کے لیے محبت رکھیں، اسی پر جمع ہوں اور اسی پر جدا ہوں۔ پانچواں وہ شخص جو تنہائی میں اللہ کو یاد کرے تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ جائیں۔ چھٹا وہ آدمی جسے کوئی حسب و نسب والی اور خوبصورت عورت بُرے ارادے سے بلائے تو وہ کہہ دے کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں۔ ساتواں وہ شخص جس نے صدقہ کیا اور اس میں اتنی پوشیدگی رکھی کہ جو کچھ اس کے دائیں ہاتھ نے خرچ کیا اسے بایاں ہاتھ بھی نہ جان سکا۔ متفق علیہ۔

شرح: اللہ تعالیٰ کے سائے سے مراد یا تو رحمت و فضل خداوندی ہے جس کے باعث یہ لوگ میدانِ حشر کی سختیوں اور جہنم کے عذاب سے محفوظ ہوں گے۔ اور یا عرشِ الٰہی کا سایہ مراد ہے اور یہی لفظ بعض احادیث میں بھی آیا ہے۔ اس حدیث میں سات کا عدد آیا ہے اور بعض دوسری احادیث میں کچھ اور لوگوں کا ذکر بھی آیا ہے پس اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ ایسے لوگوں کی تعداد بس صرف اتنی ہی ہے یا وہ انہی سات قسموں کے لوگ ہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ خدا کی خاص رحمتوں سے حصہ پانے والے لوگوں میں یہ سات قسم کے اشخاص بھی داخل ہیں۔[1]

اور ظل کے لفظ سے حمایت، حراست، بچاؤ اور حفاظت مراد ہے۔ امام راغب[2] اصفہانی نے یہی لکھا ہے۔ پس اس معنی کی رو سے یہ ضروری نہیں کہ وہ سایہ سورج کی کرنوں سے بچانے کے لیے ہو بلکہ ہر قسم کی حفاظت و حمایت مراد ہے

---

[1] مظاہر حق ج ۱ صـ ۲۴۹، مرقات ج ۲ صـ ۱۹۵ ۔ [2] مرقات ج ۲ صـ ۱۹۶، ۱۹۷ ۔

حاکم عادل نے جس طرح لوگوں کو اپنی حفاظت وحمایت کے سائے میں رکھا ہو گا محشر میں اسی طرح اسے اپنے عمل کی جزا ملے گی۔ اور عبادت میں نشو ونما پانے والا جوان چونکہ اپنے نفس کو مخالفتِ الٰہی سے محفوظ رکھتا ہے اس لیے حفاظت وحراست خداوندی کا اجر ملا اور جس کا دل حبِ خداوندی کے باعث مسجد میں اٹکا یا لٹکا ہوا ہے اسے اس محبت کی جزا رحمت وفضل اور حمایت وحفاظت کی صورت میں ملی۔ اور جو آدمی خدا کے لیے محبت کرتے ہوں وہ چونکہ ایک دوسرے کی نگرانی اور حفاظت کرتے رہے کہ ان میں سے کوئی بھی خلافِ شرع کاموں میں مبتلا نہ ہو لہٰذا انہیں حفاظتِ خداوندی کی جزا دی گئی۔ اور جمع وجدائی سے مراد زندگی وموت ہے۔ یعنی اسی پر زندہ رہے اور اسی پر ان کی موت واقع ہو گئی، یا دنیا میں ملاقات اور جدائی مراد ہے کہ جب ملے اور جدا ہوئے تو حبِ الٰہی کے تقاضے سے ہوئے اور ایک دوسرے کے سامنے بھی اور ایک دوسرے کی نگاہوں سے دور بھی اس مخلصانہ محبت کی شمع کو انہوں نے جلائے رکھا۔ اور اللہ کو تنہائی میں یاد کر کے اس کی محبت میں یا اپنے گناہوں کی یاد میں رونے والے نے چونکہ اخلاص اور محبت کی انتہا کر دی لہٰذا اس پر خدا کی رحمت وحراست کی انتہاء ہو گی۔ اور غیر عورت کے مطالبے پر اپنے آپ کو تھام لینے والے نے خوفِ خدا اور تقویٰ کی حدود کو بکمال درجہ ملحوظ رکھا۔ لہٰذا اسے خدا کی حفاظت کا کمال مل گیا اور آخری شخص نے ریاکاری سے بچ کر اور خلوص کا ثبوت دے کر اپنے آپ کو خدا کی حمایت میں دے دیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۱۳۱: وعنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صلوٰۃ الرجل فی الجماعۃ تضعف علی صلوٰتہ فی بیتہ و فی سوقہ خمسا وعشرین ضعفا وذلک انہ توضأ فاحسن الوضوء ثم خرج الی المسجد لا یخرجہ الا الصلوٰۃ لم یخط خطوۃ الا رفعت لہ بہا درجۃ وحط عنہ بہا خطیئۃ فاذا صلی لم تزل الملائکۃ تصلی علیہ مادام فی مصلاہ اللہم صل علیہ اللہم ارحمہ ولا یزال احدکم فی صلوٰۃ ما انتظر الصلوٰۃ وفی روایۃ قال اذا دخل

المسجد کانت الصلاۃ تحبسہ وزاد فی دعاء الملائکۃ اللھم تب علیہ مالم یؤذ فیہ یحدث فیہ۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: اور حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جماعت میں آدمی کی نماز اس کی گھر اور بازار والی نماز پر پچیس گنا زیادہ اجر رکھتی ہے اور یہ اس لیے کہ جب وہ اچھی طرح وضو کرے پھر مسجد کی طرف جائے اور اس جانے میں صرف نماز ہی مدنظر ہو تو وہ کوئی قدم بھی نہیں اٹھاتا مگر اس کی وجہ سے اس کا ایک درجہ بلند کیا جاتا ہے اور ایک گناہ معاف کیا جاتا ہے پھر جب وہ نماز پڑھے تو جب تک وہ جائے نماز میں رہے فرشتے اس پر رحمت و سلام بھیجتے رہتے ہیں وہ کہتے ہیں اے اللہ اس پر رحمت بھیج، اے اللہ اس پر رحم فرما۔ اور تم میں سے کوئی آدمی جب تک نماز کے انتظار میں رہے وہ نماز ہی میں ہوتا ہے اور ایک روایت کے مطابق حضورؐ نے یوں فرمایا کہ جب وہ شخص مسجد میں داخل ہو گیا تو نماز ہی اسے وہاں روکے رکھتی ہے (یعنی کسی اور غرض کے لیے نہیں صرف نماز کے لیے مسجد میں رکا رہتا ہے) اور اس روایت میں فرشتوں کی دعا میں اس لفظ کا اضافہ فرمایا: اے اللہ اسے بخش، اے اللہ اس کی طرف نظرِ رحمت سے توجہ فرما (اور اسے یہ فضیلت حاصل رہتی ہے) جب تک کہ مسجد میں وہ کسی کو ایذاء نہ دے اور جب تک بے وضو نہ ہو جائے۔ اس حدیث پر بخاری و مسلم کا اتفاق ہے۔

شرح: امام بخاریؒ نے اس حدیث سے یہ استدلال کیا ہے کہ بے وضو آدمی جنبی کی مانند نہیں ہے بلکہ بے وضو کے لیے مسجد میں داخل ہونا جائز ہے چنانچہ انہوں نے اس پر باب رکھا ہے: باب الحدث فی المسجد۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ بعض کا خیال ہے کہ حدث کے لفظ سے اس حدیث میں صرف بے وضو ہونا نہیں بلکہ ہر برائی مراد ہے جیسا کہ مسلم کی روایت میں مالم یؤذ فیہ کے الفاظ بھی ہیں اور خود بخاری کی

---

[1] فتح الباری ج ۲ ص ۲۶۷، ۲۰۶۸۔

دوسری روایت میں بھی یہ لفظ موجود ہیں۔ پس یہ الفاظ حدیث کی تفسیر و تشریح ہیں۔ دوسری حدیث میں فی مُصلّاہ کا لفظ نہیں بلکہ فرمایا ہے لا یزال فی صلوٰۃٍ ما انتظر الصلوٰۃ پس مصلّٰی سے مراد خاص اس شخص کی جائے نماز نہیں بلکہ مسجد مراد ہے۔ اس معنی کی رُو سے دونوں حدیثوں میں کوئی اختلاف نہیں رہ جاتا۔

اس حدیث میں نماز باجماعت (جو مسجد میں ہو) کو گھر اور بازار کی اکیلے پڑھی جانے والی کے مقابلے میں رکھا گیا ہے۔ بعض احادیث میں پچیس گنا اور بعض میں[۲] ستائیس گنا کا ذکر آیا ہے۔ ابن الملک[۱] فرماتے ہیں کہ مراد اس سے محض کثرتِ ثواب ہے کسی خاص عدد میں حصر مراد نہیں ہے۔ حافظ ابن حجرؒ[۳] نے ۲۵ اور ۲۷ کے عدد پہ ایک طویل کلام کیا ہے اور آخر میں فرمایا ہے کہ ۲۷ کا عدد جہری نمازوں کے لیے اور ۲۵ کا عدد سری نمازوں کے لیے ہے اور میرے نزدیک یہی قول زیادہ مناسب ہے پھر حافظ توریشتی سے نقل فرماتے ہیں کہ ثواب کا کئی اعداد تک بڑھنا کوئی ایسی چیز نہیں جسے کسی ضابطے کے ماتحت لایا جاسکے۔ یہ چیز علمِ نبوت سے تعلق رکھتی ہے اور نورِ باطن سے ہی معلوم ہو سکتی ہے۔ اس قسم کا کلام علامہ قسطلانیؒ نے ارشاد الباری[۴] میں کیا ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ فرض نمازیں پانچ ہیں۔ ان کی تکثیر میں مبالغہ کے لیے ان کو پانچ کے عدد سے ہی ضرب دیا تو پچیس ہو گیا اور فرائض و سنن رواتب کی رکعات کی تعداد کے لحاظ سے ستائیس کا عدد وارشاد فرمایا گیا ہے۔ صحاح کی عام روایات میں پچیس ہی کا عدد آیا ہے لیکن ستائیس والی روایات بھی بالکل صحیح ہیں۔ اسی وجہ سے اِن اعداد پہ کلام کی ضرورت پیش آتی ہے۔

حدیث ۱۴۳: وعن ابی اُسیدؓ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اذا دخل احدکم المسجد فلیقل اللّٰھم افتح لی ابواب رحمتک واذا خرج فلیقل اللّٰھم انی اسالک من فضلک رواہ مسلم۔

ترجمہ: حضرت ابو اُسیدؓ فرماتے ہیں کہ جنابِ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے ارشاد

---

[۱] مرقات ج ۲ ص ۱۹۶۔ [۲] بخاری باب فضل صلوٰۃ الجماعۃ۔

[۳] فتح الباری ج ۲ ص ۲۶۰۔ [۴] قسطلانی ج ۱ ص ۵۲۹، ج ۲ ص ۳۰۔

فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی آدمی مسجد میں داخل ہو تو یوں کہے: اللّٰھم افتح لی ابواب رحمتك (اے اللہ میرے لیے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے)، اور جب باہر نکلے تو کہے: اللّٰھم انی اسألك من فضلك [1] (اے اللہ میں تجھ سے تیرا فضل مانگتا ہوں)۔ اسے مسلم نے روایت کیا۔

شرح: شارح طیبیؒ فرماتے ہیں کہ مسجد کے اندر داخل ہوتے وقت رحمت کی دُعا اور اس سے باہر نکلتے وقت فضل کی دعا مانگنے میں راز یہ ہے کہ مسجد میں دعا و عبادت کے لیے داخل ہوتے ہیں پس وہاں آتے وقت رحمتِ خداوندی اور حصولِ ثواب و قربِ الٰہی کی دعا ہی مناسب تھی اور وہاں سے باہر جاتے وقت چوں کہ رزق کی تلاش اور کاروبار کی طرف جانا ہوتا ہے لہٰذا فضل کی دعا مناسب ہے کیوں کہ فضل سے مراد رزقِ حلال ہے۔ قرآن میں ہے: وابتغوا من فضل اللّٰہ

حدیث ۱۵: وعن ابی قتادۃؓ ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال اذا دخل احدکم المسجد فلیرکع رکعتین قبل ان یجلس متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت ابو قتادہؓ سے روایت ہے کہ بے شک جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص مسجد میں داخل ہو تو بیٹھنے سے پہلے دو رکعت نماز پڑھ لے۔ متفق علیہ۔

شرح: حافظ ابن حجر عسقلانیؒ، علامہ قسطلانیؒ، محدث علی القاریؒ سب فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں امر استحباب کے لیے ہے وجوب کے لیے نہیں حافظ ابن حجرؒ عسقلانی اسے تمام اہل فتویٰ کا مذہب قرار دیتے ہیں: اتفق ائمۃ الفتویٰ علی ان الامر فی ذلك للندب (فتح الباری) [2] اس بنا پر صاحب مظاہر حق کو شاید وہم ہوا یا سہو یا انہیں کسی دلیل سے ہی یہ معلوم ہوا کہ امامِ شافعیؒ تحیۃ المسجد کے وجوب کے قائل ہیں۔ [3]

---

[1] مرقات ج ۲ صفحہ ۱۹۸، مظاہر حق ج ۱ صفحہ ۲۵۰۔

[2] فتح الباری ج ۲ صفحہ ۲۶۷، قسطلانی ج ۱ صفحہ ۵۰۶، مرقات ج ۲ صفحہ ۱۹۸۔

[3] مظاہر حق ج ۱ صفحہ ۲۵۰۔

ہاں اربابِ ظواہر کے نزدیک واقعی تحیۃ المسجد واجب ہے اور اس حدیث میں امر وجوب کے لیے ہے جیساکہ ان کا مسلک صاحبِ مرقاتؒ[1] نے بیان فرمایا ہے اور علامہ شوکانیؒ نے نیل الاوطار (ج ۲ ص ۳۱۴) میں تسلیم کیا ہے کہ ظاہریہ کا یہی مسلک ہے گو حافظ ابن حجرؒ نے بقول ابن حزمؒ اس کے خلاف بھی نقل کیا ہے۔ امام نوویؒ نے تحیۃ المسجد کے سنت ہونے پر "اجماع المسلمین" نقل کیا ہے اور قاضی عیاضؒ کے حوالہ سے امام داؤد ظاہریؒ اور ان کے ساتھیوں کا مسلک وجوب کا بیان کیا ہے خود علامہ شوکانیؒ بھی اس مسئلہ میں جمہور کے ساتھ ہیں۔

[2] قبل اَنْ یجلس کا مطلب یہ ہے کہ مسجد کی تعظیم کا تقاضا یہی ہے کہ بیٹھنے سے قبل ہی تحیۃ المسجد پڑھی جائے لیکن خطیب اس سے بدلائل شرع مستثنیٰ ہے اور ان دو رکعتوں کے علاوہ بعض دیگر اعمال ضروری ہیں مثلاً جو فرض پڑھنے مسجد میں داخل ہو اس کے لیے فرض نماز یا سننِ رواتب۔ اور یہ حکم وقتِ مکروہ کے لیے نہیں ہے کیونکہ اس وقت کے لیے بالخصوص نہی وارد ہو چکی ہے اور مسجد حرام میں داخلے کے بعد پہلا کام طواف ہے۔ لیکن تحیۃ المسجد کی بھی اجازت ہے بشرطیکہ طواف کی نیت نہ ہو۔

علامہ علی القاریؒ فرماتے ہیں کہ ظاہر حدیث بتاتی ہے کہ بیٹھ جانے سے تحیۃ المسجد فوت ہو جائے گی لیکن ابن حبانؒ نے ایک صحیح روایت بیان کی ہے کہ ابو ذرؓ[3] حضورؐ کے پاس مسجد میں حاضر ہوئے اور حضورؐ کے پاس بیٹھ گئے حضورؐ نے انہیں تحیۃ المسجد کی تلقین کی۔ تو انہوں نے دوبارہ اٹھ کر دو رکعت نماز ادا کی۔

اگر کوئی شخص بے وضو مسجد میں داخل ہو تو اس کے لیے تحیۃ الوضو نہیں ہے۔ صرف زبان سے تہلیل و تکبیر اور لاحول پڑھ لے۔

حدیث ۱۶: وعن کعبؓ بن مالك قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا یقدم عن سفر الا نہاراً فی الضحیٰ فاذا اقدم بداء بالمسجد فصلی فیہ رکعتین ثم جلس فیہ۔

---

[1] مرقات ج ۲ ص ۱۹۸ [2] ایضاً۔ [3] ایضاً ص ۱۹۸، ۱۹۹۔

متفق علیہ ۔

ترجمہ : حضرت کعبؓ بن مالک فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر سے صرف دن کو چاشت کے وقت واپس تشریف لایا کرتے تھے جب مدینہ پہنچتے تو پہلے مسجد میں آتے پھر دو رکعت نماز پڑھتے اور مسجد میں بیٹھتے بخاری و مسلم اس پر متفق ہیں ۔

شرح : حضرت کعبؓ کی یہ حدیث غزوۂ تبوک کے متعلق ہے لمبی چوڑی لمبی ہے اور بخاری کے ابواب المغازی کے آخر میں آئی ہے ۔ یہاں اس حدیث کو مختصر کر دیا گیا ہے ۔[۱]

حضورؐ مدینہ میں داخل ہونے کے لیے یہ وقت پسند فرماتے کیونکہ یہ نشاط کا وقت ہوتا ہے، پس جو لوگ ملنا چاہتے آسانی سے حاضر ہو سکتے تھے ۔ دوپہر کا وقت نیند اور غفلت کا وقت ہے اور پچھلے پہر کاروباری مصروفیتیں زیادہ ہوتی ہیں اور یہیں سے آپؐ کے مسجد میں بیٹھنے کا راز بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ لوگوں کو ملنے اور آپؐ کی زیارت کا موقع مل جائے ۔ نیز آپؐ اچانک گھر میں تشریف نہیں لایا کرتے تھے اس میں بہت سی مصلحتیں ہیں ۔[۲]

حدیث ۱۷۱ : وعن ابی ھریرۃؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من سمع رجلاً ینشد ضالۃ فی المسجد فلیقل لا ردھا اللہ علیک فان المساجد لم تبن لھذا ۔ رواہ مسلم ۔

ترجمہ : حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص کسی کو مسجد میں کوئی گمشدہ چیز ڈھونڈتا پائے تو کہے، اللہ وہ چیز تجھے واپس نہ دے کیونکہ مسجدیں اس غرض کے لیے نہیں بنائی گئیں ۔ مسلم نے اسے بیان کیا ۔

شرح : ینشدؔ[۳] کا معنی ہے بلند آواز سے اسے تلاش کر رہا ہو لوگوں سے پوچھ رہا ہو اور طلب کر رہا ہو ۔

---

[۱] فتح الباری ج ۲ صہ ۲۶۷ ۔ [۲] مرقات ج ۲ صہ ۲۰۲ ۔

[۳] ایضاً ۔

یہ جو فرمایا کہ لا ردھا اللہ علیک کہا جائے یہ یا تو بطور زجر و توبیخ ہے اس صورت میں بددعا نہ ہوگی، اور یا دل سے بددعا ہے بطور سزا۔ کہ تو نے ایک ایسا کام کیا ہے جو مسجد کے احترام کے خلاف ہے، پس اس کی سزا یہی ہے کہ تیری چیز نہ ملے۔ یہی الفاظ بعض احادیث میں حضورؐ سے منقول ہیں کہ آپؐ نے کسی گمشدہ چیز ڈھونڈنے والے سے فرمائے تھے۔ اور ترمذی میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا جب تم کسی کو مسجد میں، خرید و فروخت کرتے دیکھو تو کہو اللہ تیری تجارت فائدہ مند نہ کرے اور اسی طرح کسی مذموم شعر پڑھنے والے سے کہے کہ اللہ تیرا منہ توڑ ڈالے۔ اور علت ان تمام باتوں کی خود اس حدیث میں یہ فرمائی گئی ہے کہ مسجدیں اس کام کے لیے نہیں بنائی گئیں بلکہ وہ عبادت، ذکر و تلاوتِ قرآن اور وعظ و تبلیغ اسلام کے لیے ہیں۔ اور امام ابو حنیفہؒ اور دُوسرے علمائے امت نے ضرورتِ شرعیہ کی بناء پر علمی بحث کو مسجد میں جائز قرار دیا ہے۔ امام مالکؒ اسے بھی مکروہ فرماتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس مسجد میں سوال جائز نہیں اور اس بارے میں بڑی تشدید آئی ہے۔

حدیث ۱۸: وعن جابرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من اُکل من ھذہ الشجرۃ المُنتِنَۃِ فلا یقربن مسجدنا فان الملائکۃ تتاذی مما یتاذی منہ الانس۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص اس بدبودار پودے (لہسن یا پیاز) میں سے کچھ کھائے تو وہ ہماری مسجد کے قریب مت آئے کیونکہ جس چیز سے آدمیوں کو تکلیف ہوتی ہے اس سے فرشتوں کو بھی تکلیف ہوتی ہے۔ متفق علیہ۔

شرح: یعنی جس طرح بدبو سے انسان بیزار ہوتے ہیں فرشتوں کو بھی تکلیف ہوتی ہے اور مسجدیں فرشتوں کے حاضر ہونے کی مقدس جگہیں ہیں۔ ہر بدبودار چیز لہسن اور پیاز ہی کے حکم میں ہے چاہے کھانے کی ہو یا نہ ہو۔ علیٰ ہذا گندہ دہنی، گندہ بغلی وغیرہ کا بھی یہی حکم ہے (فی زمانہ حُقہ، سگریٹ وغیرہ کا بھی یہی حکم ہے) اور دینی علم و

۱؎ مظاہر حق ج ۱ ص ۲۵۰۔ ۲؎ مرقات ج ۲ ص ۱۹۹۔

۳؎ مظاہر حق ایضاً، مرقات ج ۲ ص ۲۰۰۔

وعظ و تلقین اور ذکر وغیرہ کی مجلسوں کی حاضری کا بھی یہی حکم ہے۔ اور اس حدیث پاک میں نہی کی علت ان پودوں کی بدبو ہے۔ پس اگر کسی طرح سے ان کی بدبو کو زائل کر دیا جائے تو داخلِ نہی نہ رہیں گے جیسا کہ بعض احادیث میں فامیتموھا بالطبخ کر پکا کر ان کی بدبو کو ختم کر ڈالو کے الفاظ موجود ہیں۔

حدیث ۱۹: وعن انسؓ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم البزاق فی المسجد خطیئة و کفارتہا دفنہا۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مسجد میں تھوکنا گناہ ہے اور اس کا کفارہ یہ ہے کہ اسے دفن کر دے۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم دونوں نے روایت کیا۔

شرح: اس حدیث سے مسجد کا اکرام و احترام ثابت ہوتا ہے۔ مؤطا[۱] امام مالک میں حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ کی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے مُصنّف نے مسجد میں تھوکنے کو مطلقاً ناجائز ثابت کیا ہے۔ پھر بھی عیرت ہے کہ بعض مالکیہ مثلاً قاضی عیاضؒ نے بعض دوسری احادیث سے استدلال کرتے ہوئے اسے جائز ثابت کیا ہے۔ حافظ[۲] ابن حجرؒ نے امام نوویؒ کے حوالہ سے اس حدیث کی رُو سے مسجد میں تھوکنے کو جمہور علماء کے نزدیک ناجائز ٹھہرایا ہے۔ اسی طرح علامہ قسطلانی[۳]ؒ نے بھی مختصراً حافظ ابن حجرؒ کے قریب قریب اس حدیث پر بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ جن احادیث میں حالتِ نماز میں یا نماز سے باہر تھوکنے کا ذکر آیا ہے وہاں مسجد کا ذکر نہیں ہے اس لیے ان سے یہی مراد لی جائے گی کہ اس سے مراد مسجد کی باہر کی حالت ہے یا اگر مجبوراً ایسا کرنا پڑے مثلاً بوجہ بیماری وغیرہ۔ صاحبِ[۴] مظاہر حق کے نزدیک اگر اتفاقاً ایسی حرکت ہو بھی جائے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ اسے دفن کر دیا جائے۔ اِس اتفاقاً کے لفظ سے حافظ ابن حجرؒ اور قسطلانیؒ کی تائید ہوتی ہے۔

علامہ[۵] علی القاریؒ وکفارتہا دفنہا کی شرح میں فرماتے ہیں کہ جب مسجد

۱؎ مُصفّٰی و مسوّٰی ج ۱ ص ۹۰۔ ۲؎ فتح الباری ج ۲ ص ۲۵۴۔

۳؎ ارشاد الباری ج ۱ ص ۴۸۶۔ ۴؎ مظاہر حق ج ۱ ص ۲۵۰۔

۵؎ مرقات ج ۲ ص ۲۔

میں ڈالے ہوئے تھوک کو وہاں سے زائل کر دیا جائے یا کسی پاک چیز سے ڈھانپ اور چھپا دیا جائے تو گناہ تو زائل ہو جائے گا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ سرے سے یہ فعل جائز ہی قرار پائے گا۔ ابن العماد فرماتے ہیں کہ جس شخص نے مسجد کی توہین کے لیے اس میں تھوکا تو اس نے کفر کا فعل کیا۔

علامہ شوکانی نے نیل الاوطار میں ابو داؤد، ترمذی، مسند احمد اور نسائی وغیرہ سے کئی احادیث روایت کر کے ثابت کیا ہے کہ مسجدوں کی صفائی، پاکیزگی انہیں، خوشبو دار رکھنا تقاضائے احکامِ شرع ہے اور مسجدوں سے تنکے، روڑے اور کوڑا کرکٹ صاف کرنے کو حضورؐ نے محبوب رکھا ہے۔ ان احکام کے ہوتے ہوئے قاضی عیاضؒ کی اس رائے کو کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ مسجد میں اپنے بائیں طرف یا بائیں کے نیچے تھوکنا جائز ہے۔

حدیث ۲۰: وعن ابی ذر رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عرضت علی اعمال امتی حسنہا و سیئہا فوجدت فی محاسنِ اعمالہا الاذی یماط عن الطریق و وجدت فی مساوی اعمالہا النخاعۃ تکون فی المسجد لا تدفن۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میری امت کے اچھے اور بُرے اعمال میرے سامنے پیش کیے گئے تو میں نے اس کی نیکیوں میں سے راستے سے تکلیف دہ چیز کا ہٹانا بھی پایا اور برائیوں میں وہ کھنگار (تھوک) بھی پایا جو مسجد میں پھینکا جائے اور اسے دفن بھی نہ کیا جائے۔ اسے مسلم نے روایت کیا۔

شرح: اس حدیث نے اوپر کی روایت کی مزید شرح و تائید کر دی ہے اور اس سے پتہ چل جاتا ہے کہ مسجد میں تھوکنا اس کے احترام و عظمت کے خلاف ہے اور دفن کا لفظ اس لیے فرمایا کہ اس وقت مسجدیں کچی تھیں اور علاقہ ریتیلا تھا۔

۱؎ نیل الاوطار ج ۲ ص ۳۹۔

ظاہر ہے کہ تھوک وغیرہ کو اگر ریت میں دفن کر کے چھپا دیا جائے تو وہ بہت ہی جلد گل سڑ کر بھسم ہو جاتا ہے بالخصوص عرب کی گرمی میں۔ پکی مسجدوں میں دفن کا معنی اس کا زائل کرنا اور مسجد سے باہر نکال کر چھپانا مراد لیا جائے گا جیسا کہ ہم نے اوپر کی حدیث کی شرح میں مرقات سے نقل کیا ہے۔

اسی مضمون کی جو حدیث ابو داؤد اور ترمذی سے علامہ شوکانیؒ نے نقل کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں: عرضت علی اجور امتی حتی القذاۃ یخرجہا الرجل من المسجد۔ (میرے سامنے میری امت کے، نیکیوں کے ثواب پیش ہوئے حتی کہ کوئی تنکا، روڑا، مٹی اور کوڑا کرکٹ وغیرہ جسے کوئی شخص مسجد سے نکال دے اس کا ثواب بھی مجھے دکھایا گیا) احادیث میں الفاظ کا اختلاف ہے لیکن معانی کے لحاظ سے متحد ہیں۔

حدیث ۱۲۱ : وعن ابی ھریرۃؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا قام احدکم الی الصلاۃ فلا یبصق امامہ فانما یناجی اللہ مادام فی مصلاہ ولا عن یمینہ فان عن یمینہ ملکاً ولیبصق عن یسارہ او تحت قدمہ فیدفنہا وفی روایۃ ابی سعید تحت قدمہ الیسریٰ۔ متفق علیہ۔

ترجمہ : حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جب تم میں سے کوئی نماز کے لیے کھڑا ہو تو اپنے سامنے نہ تھوکے کیوں کہ جب تک وہ اپنی جائے نماز میں ہے تو وہ اپنے پروردگار کو پکارتا ہے۔ اور اپنے دائیں بھی نہ تھوکے کیوں کہ اس کے دائیں طرف ایک فرشتہ ہے بلکہ اسے بائیں طرف یا اپنے پاؤں کے نیچے تھوکنا چاہیئے اور وہ اسے دفن کر دے۔ اور ابو سعیدؓ کی روایت میں بائیں پاؤں کے نیچے کے الفاظ ہیں۔ متفق علیہ۔

شرح : یہی وہ حدیث ہے جس کی بنا پر قاضی عیاضؒ نے مسجد میں تھوکنے کو جائز قرار دیا ہے لیکن امام نوویؒ نے ان کے استدلال کو رد کیا ہے اور کہا ہے کہ اس حدیث میں مسجد کا لفظ موجود نہیں ہے۔ لہذا اسے مسجد سے باہر کی حالت پر محمول کیا جائے

لہ نیل الاوطار ج ۲ ص ۳۹۔

گا۔ لیکن امام بخاریؒ نے یہ حدیث باب دفن النخاعۃ فی المسجد میں بیان کر کے گویا یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ یہ حکم مسجد کے اندر کا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ[1] نے فرمایا ہے کہ مسجد کا لفظ یہاں موجود نہیں ہے لہٰذا اسے مسجد سے مقید کرنا درست نہیں معلوم ہوتا۔ اور اسی کی تائید علامہ قسطلانیؒ نے بھی کی ہے[2]۔

اگر اسے مسجد ہی کے متعلق قرار دیا جائے تو حالتِ اضطرار پر محمول ہوگا کیونکہ مسجد میں تھوکنا تو پیچھے گزری ہوئی حدیث کے مطابق ناجائز ہے۔ امام[3] نووی نے لکھا ہے کہ اگر کسی وجہ سے مسجد میں تھوک دے تو کچے یا ریت والے فرش کی صورت میں اسے دفن کر دے اور مسجد کا فرش پکا ہو تو اسے صاف کر کے زائل کر دے۔

سامنے[4] کی طرف نہ تھوکنے کی علت یہ فرمائی کہ وہ اپنے پروردگار کو پکار رہا ہے لہٰذا سامنے تھوکنا انتہائی خلافِ ادب ہے۔ دائیں طرف نیکیاں لکھنے والا فرشتہ ہے (اور حالتِ نماز میں بائیں والا غالباً ساتھ نہ ہوتا ہو کیونکہ اس کا کام تو کوئی ہوتا نہیں)

حدیث ۲۲ : وعن عائشۃ ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال فی مرضہ الذی لم یقم منہ لعن اللّٰہ الیہود و النصارٰی اتخذوا قبور انبیاءھم مساجد۔ متفق علیہ۔

ترجمہ : اُم المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی آخری بیماری میں ـــــ جس بیماری سے آپ اُٹھے نہیں ـــــ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے ـــــ یا اس نے ان پر لعنت کی ـــــ جنہوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا۔ بخاری و مسلم دونوں نے یہ حدیث بیان کی۔

شرح : شارح طیبیؒ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہو گیا تھا کہ آپؐ اب اس دنیا سے تشریف لے جا رہے ہیں۔ اور آپؐ کو لوگوں کے بارے میں یہ خوف

---

[1] فتح الباری ج ۲ صـ ۲۵۵ [2] ارشاد الباری ج ۱ صـ ۴۸۷ [3] مرقات ج ۲ صـ ۲۰۱، فتح الباری ج ۲ صـ ۲۵۵، قسطلانی ج ۱ صـ ۴۸۷ [4] مظاہر حق ج ۱ صـ ۲۵۱، مرقات ج ۲ صـ ۲۰۱ [5] مرقات ج ۲ صـ ۲۰۲، مظاہر حق ج ۱ صـ ۲۵۱، فتح الباری ج ۲ صـ ۲۶۹، قسطلانی ج ۱ صـ ۵۰۱۔

ہوا کہیں آپؐ کی قبر کی اس طرح تعظیم نہ کرنے لگیں جس طرح یہود و نصاریٰ نے اپنے نبیوں کی قبروں کی کی تھی۔ اس لیے آپؐ نے ان پر لعنت کر کے اپنی امت کو سمجھا دیا کہ یہ ان جیسا معاملہ نہ کرنے لگیں۔ اور لعنت کا باعث یہ تھا کہ یہود و نصاریٰ یا تو اپنے نبیوں کی قبروں کو ان کی تعظیم کے لیے سجدہ کرتے تھے یہ تو شرک جلی (واضح اور صریح) ہے اور یا اپنے پیغمبروں کی قبروں کو قبلۂ توجہ سمجھ کر ان کی طرف سجدہ کرتے تھے اور دل میں نیت عبادت الٰہی کی کرتے تھے۔ یہ شرک خفی اور فعل حرام ہے۔ اس لیے غیر اللہ کو عبادت کی نیت سے سجدہ کرنا شرک ہوا، اور محض قبلۂ توجہ بنانا اور تعظیمی سجدہ کرنا حرام ٹھیرا۔ کسی قسم کا اور کسی بھی نیت سے خدا کے سوا کسی کو سجدہ روا نہیں رکھا گیا۔ حضورؐ نے تکمیلِ دین کی ہے اور اپنی شرع میں غیر اللہ کے سجدے کی گنجائش مطلقاً نہیں چھوڑی۔

اوپر[1] بیان کردہ صورتوں کو چھوڑ کر اگر کوئی شخص برکت حاصل کرنے کے لیے کسی پیغمبر یا بزرگ کی قبر کے قریب —— نہ کہ اس کی طرف —— بغرض تبرک بیٹھے دعا مانگے (یعنی خدا تعالیٰ سے) اور عبادتِ الٰہی بجا لائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ اس حدیث میں قبروں کو سجدہ گاہ بنانے کے دونوں مطلب لیے گئے ہیں جو اوپر بیان ہو چکے یعنی ان کو سجدہ کرنا یا انہیں درمیان میں رکھ کر اور قبلۂ توجہ بنا کر اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرنا۔

حدیث ۳۲: وعن جندبؓ قال سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول الا وان کان من قبلکم کانوا یتخذون قبور انبیاءھم وصالحیھم مساجد الا فلا تتخذوا القبور مساجد انی انھاکم عن ذلک۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ: حضرت جندبؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے یہ فرماتے سنا: خبردار! تم سے پہلے لوگ اپنے پیغمبروں اور نیک لوگوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیتے تھے۔ خبردار! قبروں کو سجدہ گاہ مت بنانا میں تمہیں اس سے منع کرتا ہوں۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا۔

---

[1] مرقات ج ۲ ص ۲۰۲۔

شرح : اسلامی عقائد کی عمارت توحید کی بنیادوں پر اٹھائی گئی ہے۔ توحید خالص اسلام کی خصوصیتوں میں سے ہے۔ چونکہ قبروں کو شرک کا ذریعہ بنانا اور غیر اللہ کو کسی نہ کسی حیلے بہانے سے سجدہ کرنا پچھلی قوموں میں رائج رہ چکا تھا اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف الفاظ و اسالیب بیان سے اس کی برائی کو واضح فرمایا اور بارہا اس سے شدید ترین الفاظ میں روکا۔ اس حدیث میں بار بار کلماتِ تنبیہ فرما کر نہی کا صیغہ فلا تتخذوا استعمال فرما کر اور پھر آخر میں بطور تاکید انی انہاکم عن ذلك فرما کر حضورؐ نے اس معاملے کی اہمیت اور شدت کو واضح فرمایا ہے۔

حافظ ابن حجرؒ[1] عسقلانی نے تصریح کی ہے کہ اس حدیث کی ایک روایت میں قبل ان یتوفی بخمس کے الفاظ موجود ہیں۔ اسی طرح متعدد روایات میں یہ ارشاد آپؐ کے مرض الوفات کی صراحت کرتا ہے۔ اس سے ایک تو معاملے کی نزاکت و شدت واضح ہوتی ہے۔ دوسرے اس ارشاد کا بطور وصیت ہونا معلوم ہوتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس نہی کے زمانے کی تصریح یہ ثابت کرتی ہے کہ یہ حکم محکم ہے منسوخ نہیں ہوا کیونکہ یہ حضورؐ کی زندگی کے آخر میں صادر ہوا تھا۔ حافظ صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس حدیث سے قبرستان میں نماز کی کراہت ثابت ہوتی ہے چاہے قبر کے پہلو میں ہو یا اس کے اوپر یا اس کی طرف منہ کر کے۔ امام احمدؒ[2] بن حنبل فرماتے ہیں کہ ایسی نماز سرے سے ہوتی ہی نہیں اور باطل ہے کیونکہ ان کے نزدیک جس طرح مکروہ اوقات میں نماز نہیں ہوتی اسی طرح جن جگہوں میں نماز سے منع کیا گیا ہے ان میں بھی نماز منعقد نہیں ہوتی۔

علامہ[3] قسطلانیؒ کا ارشاد ہے کہ ایک حدیث میں صرف یہود پر لعنت کا ذکر ہے اور عام احادیث میں یہود و نصاریٰ دونوں مذکور ہیں۔ بات در اصل یہ ہے کہ یہود نے اس ناپاک رسم کو شروع کیا اور نصاریٰ نے ان کا اتباع کیا اور ہم امتِ مسلمہ کو ان دونوں کے اعمال و افعال سے روک دیا گیا ہے۔

---

[1] فتح الباری ج ۲ ص ۱۲۶   [2] مرقات ج ۲ ص ۲۰۲۔

[3] ارشاد الباری ج ۱ ص ۵۰۲ ، فتح الباری ج ۲ ص ۲۶۵۔

حدیث ۲۴ : وعن ابن عمرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اجعلوا فی بیوتکم من صلاتکم ولا تتخذ وھا قبورًا ۔ متفق علیہ۔

ترجمہ : حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا : اپنی کچھ نماز اپنے گھروں میں بھی پڑھا کرو اور انہیں قبریں مت بناؤ ۔ متفق علیہ۔

شرح : امام بخاریؒ نے یہ حدیث باب کراھیۃ الصلوٰۃ فی المقابر میں درج کر کے اس سے یہ استنباط کیا ہے کہ قبریں نماز کا محل نہیں ہیں اس لیے وہاں نماز مکروہ ہے گویا یہ ان کا اشارہ ابو سعید خدریؓ کی اس حدیث کی طرف ہے جسے ابوداؤد اور ترمذیؒ نے روایت کیا ہے اور چونکہ وہ حدیث بخاریؒ کی شرط پر نہیں لہٰذا اُسے روایت نہیں کر سکے، اس میں یہ الفاظ ہیں : الارض کلھا مسجد الا المقبرۃ والحمام ۔ حاکمؒ اور ابن حبانؒ نے اسے صحیح کہا ہے اگرچہ اس کے موصول یا مرسل ہونے میں بھی اختلاف ہوا ہے ۔[1]

علامہ قسطلانیؒ[2] فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں گھروں کے اندر نماز پڑھنے کی ترغیب دی گئی ہے اور قبروں کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ مردے اپنی قبروں میں نماز نہیں پڑھتے۔ گویا دوسرے الفاظ میں حضورؐ نے یوں فرمایا کہ اس طرح مت ہو جاؤ جس طرح مُردے اپنی قبروں میں ہوتے ہیں کیوں کہ ان کے اعمال منقطع ہو چکے ہیں اور شرعی تکالیف ان سے اٹھ چکی ہیں۔

علامہ علی القاریؒ[3] نے فرمایا ہے کہ وہ جگہ جو عبادت سے خالی ہو اسے حضورؐ نے اس حدیث میں قبروں سے تشبیہ دی ہے کیوں کہ قبروں میں نماز نہیں ہوتی اور جو شخص عبادت سے غافل ہے اسے حضورؐ نے مُردے سے تشبیہ دی ہے اللہ کا ذکر کرنے والا زندہ اور اس سے غافل مُردہ ہے ۔ اس حدیث کا معنی یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اپنے گھروں میں کچھ عبادت بھی کیا کرو، صرف انہیں سونے اور آرام ہی کے لیے مت رکھو ،

---

[1] فتح الباری ج ۲ ص ۲۶۳ [2] ارشاد الباری ج ۱ ص ۵۰۰ ۔
[3] مرقات ج ۲ ص ۲۰۳ ۔

کیوں کہ نیند بھی موت کی مانند ہے ۔

من[1] صلوٰتکم سے مراد نفل نماز ہے جو گھروں میں ہی ادا ہونا بہتر ہے حضورؐ خود نفل گھروں میں ادا فرماتے تھے ہاں احیاناً بغرض تعلیم مسجد میں بھی پڑھتے تھے۔ مسلمؒ نے ایک حدیث کی ہے کہ افضل صلوٰۃ المرء فی بیتہٖ الا المکتوبہ اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ نوافل گھر میں پڑھنا افضل ہے۔ بعض حنابلہ نے ازراہِ شدت نوافل کو مسجد میں جائز ہی نہیں سمجھا لیکن جمہور امت کے مسلک کے یہ خلاف ہے۔ حضورؐ نے بعض دفعہ نوافل و سنن مسجد میں ادا فرمائے جیسا کہ ابن حبانؒ نے نماز جمعہ کی بعد کی دو رکعتوں اور ترمذیؒ نے مغرب کے بعد کی دو رکعتوں کا حضورؐ سے مسجد میں ادا کرنا روایت کیا ہے۔

باب الستر

ستر کا لفظی معنی ہے ڈھانکنا، چھپانا اور اوجھل کرنا۔ یہاں ستر سے مراد سترِ عورت ہے یعنی نماز میں اپنے پردے کو ڈھانکنا۔ اس باب[2] میں صاحب مشکوٰۃ نے سترِ عورت کے علاوہ بعض اور احادیث بھی درج کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے دوستوں نے فلاں فلاں کپڑے میں نماز ادا کی ہے۔ ستر ڈھانکنا نماز میں فرض ہے اور یہ شرائطِ نماز میں سے ہے اور[3] ضمناً اس لفظ سے کپڑے اور جسم کی طہارت بھی مراد ہے۔

آئندہ احادیث سے سترِ عورت کی اہمیت واضح ہو جائے گی۔ حنفیہ نے دلائل شرع کی بنا پر گھٹنوں سے ناف تک کا حصہ ستر قرار دیا ہے۔ یعنی ویسے تو اپنے اچھے کپڑوں میں نماز پڑھنی چاہیے کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: خذوا زینتکم عند کل مسجدٍ الآیہ۔ لیکن اس ستر کی کم از کم حد یہ ہے اگر یہ بھی ڈھکی ہوئی نہ ہو — الا اضطراراً کیونکہ اضطرار کے مسائل الگ ہیں — تو نماز میں داخل ہونا ہی

---

[1] مرقات ج ۲ ص ۲۰۳ [2] مظاہر حق ج ۱ ص ۲۶۵

[3] مرقات ایضاً۔

جائز نہ ہوگا کیوں کہ یہ نماز کی شرط ہے جب تک یہ پائی نہ جائے گی نماز شروع ہی نہیں نہیں ہو سکتی ۔ ستر عورت کی اہمیت و وجوب میں کسی کو اختلاف نہیں ۔ ہاں عورت کی حد میں بعض اختلافات ہیں جن کی تھوڑی سی تفصیل علامہ[1] شوکانی رحؒ نے مع دلائل بیان کی ہے ۔ جس میں انہوں نے حدیث کے دلائل سے رانوں کا ڈھانکنا فرض قرار دیا ہے ۔ گھٹنے اور ناف کو ستر سے مستثنیٰ ثابت کیا ہے ۔ لیکن گھٹنوں سے بالکل اوپر سے لے کر ناف سے بالکل نیچے تک کا ستر ثابت کیا ہے ۔ حنفیہ اپنے دلائل کی بنا پر گھٹنوں اور ناف کو بھی عورت ہی قرار دیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ احتیاط بھی اسی میں ہے کہ ان دونوں کو اعضاء کو ستر میں داخل سمجھا جائے ۔ حنفیہ کی اس احتیاط کے بارے میں امام بخاری رحؒ کی رائے یہی معلوم ہوتی ہے کہ اسی کو اختیار کیا جائے ۔ گو وہ خود امام مالک رحؒ کی رائے کی طرف مائل ہیں (فیض الباری ج ۲ ص ۱۵) چوں کہ اس باب کی فصل اول میں صاحب مشکوٰۃ ایسی احادیث لا رہے ہیں جن میں ان بیان کردہ اختلافات کا ذکر نہیں ہے لہٰذا مختصراً انہیں بیان کرنا مناسب معلوم ہوا اور تفصیل کا یہ مقام نہیں ہے ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

الفصل الاوّل

حدیث ۱ : عن عمرؓ بن ابی سلمۃ قال رایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصلی فی ثوب واحد مشتملا بہ فی بیت ام سلمۃ واضعا طرفیہ علی عاتقیہ ۔ متفق علیہ ۔

ترجمہ : حضرت عمر بن سلمہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر میں ایک ہی کپڑا اشتمال کر کے باندھے ہوئے اور اس کپڑے کی دونوں طرفوں کو دونوں کندھوں پہ رکھے ہوئے نماز پڑھتے دیکھا ۔ متفق علیہ ۔

شرح : اشتمال کا معنی[2] ہے کپڑے کا ایک کنارہ دائیں کندھے کے اوپر سے بائیں بغل کے نیچے کو اور دوسرا کنارہ بائیں کندھے کے اوپر سے دائیں بغل کے نیچے کو

---

[1] نیل الاوطار ج ۱ ص ۲۶۰، ۲۶۵ ۔ مظاہر حق ج ۱ ص ۲۶۵ ۔ مرقات ج ۲ ص ۲۳۱

اس کی دونوں طرفوں کو مخالف سمتوں میں اِدھر اُدھر نکال لے یا ڈال لے۔ اسے بخاری نے روایت کیا۔

شرح : اس حدیث میں کندھوں پر ڈالنے کا ذکر نہیں بلکہ کپڑے کی دونوں طرفوں کو مخالف سمتوں میں لے جانے اور اٹکانے کا ذکر موجود ہے معلوم ہوا کہ غرض ان ارشادات سے یہ ہے کہ ستر نہ کھل جائے۔ اگر بڑا کپڑا ہو تو اس کا اشتمال کرلے چھوٹا ہو تو اتزار (تہبند باندھنا) کا لفظ خود احادیث سے نقل ہو چکا ہے لیکن اشتمال سے مراد یہ نہیں کہ اپنے ہاتھ بھی اسی کپڑے کے اندر تنگ کرکے باندھ لے۔ اسے اشتمال صماء کہا گیا ہے اور اس سے حدیث میں منع کیا گیا ہے۔ امام بخاریؒ نے باب اذا کان الثوب ضیقاً میں ایک حدیث نقل کی ہے جس میں کھلے کپڑے کے التحاف اور تنگ کپڑے کے اتزار کا حکم دیا گیا ہے۔ اور کپڑے کو جسم پر لپیٹ کر گھٹنے کھڑے کرنے سے منع کیا گیا ہے جبکہ ننگا ہو جانے کا خدشہ ہو اسے احتباء کہتے ہیں۔

حدیث ۴ : وعن عائشۃؓ قالت صلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی خمیصۃ لہا اعلام فنظر الی اعلامہا نظرۃ فلما انصرف قال اذھبوا بخمیصتی ھذہ الی ابی جہم واتونی بانبجانیۃ ابی جہم فانہا الہتنی انفاً عن صلوتی۔ متفق علیہ۔ وفی روایۃ للبخاری قال کنت انظر الی علمہا و انا فی الصلوۃ فاخاف ان یفتننی۔

ترجمہ : ام المؤمنین عائشہ صدیقہ سلام اللہ علیہا سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حاشیے دار چادر میں نماز پڑھی اور نماز میں ایک نگاہ اس کے حاشیوں پر ڈالی۔ پس جب نماز ختم کرلی تو ارشاد فرمایا کہ میری یہ چادر ابو جہمؓ کے پاس لے جاؤ اور ابو جہمؓ کی بلا حاشیہ چادر مجھے لا دو کیونکہ اس نے تو ابھی مجھے نماز سے غافل کر ڈالا تھا۔ متفق علیہ۔ بخاری میں اس حدیث کے متصل دوسری روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ میں اس کے حاشیے کی طرف دیکھتا تھا اور میں نماز میں تھا تو مجھے خدشہ ہوا کہ کہیں یہ مجھے فتنے میں نہ ڈال

ل بخاری باب ما یستر من العورۃ۔

دے۔

شرح: خمیصہ[1] دھاری دار چادر کو بھی کہتے ہیں اور انبجانی ایک قسم کی چادر ہوتی تھی جس میں حاشیہ یا دھاریاں نہیں ہوتی تھیں۔ یہ چادر حضرت ابوجہم رضؓ نے بطور ہدیہ حضورؐ کو دی تھی۔ آپؐ نے ان کی دلداری کے لیے اسے پہنا اور پھر سادہ چادر ان سے یہ بدل کر منگوائی تاکہ ان کی دل شکنی نہ ہو۔ آپؐ کے پہن لینے سے اس کا جواز تو ثابت ہو گیا لیکن آپؐ کے مقامِ عصمت وطہارت کی بلندی نے بھی یہ بھی برداشت نہ کیا کہ نماز میں سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی اور طرف ایک نگاہ بھی چلی جائے اس لیے اسے اتار کر دوسری چادر منگوالی۔

علامہ قسطلانیؒ نے لکھا ہے کہ حضورؐ کی ایک تو بشری حالت تھی جس کے پیشِ نظر آپؐ نے فرمایا کہ اس چادر نے مجھے غافل کر ڈالا۔ اور ایک آپؐ کی مخصوص حالت تھی (عصمت) جس کے پیشِ نظر آپؐ نے جزم ویقین کے الفاظ سے نہیں فرمایا کہ اس نے واقعی مجھے نماز سے ہٹا دیا تھا بلکہ یہ فرمایا کہ قریب تھا یہ مجھے فتنے میں ڈال دے۔ (جیسا کہ دوسری روایات کے الفاظ ہیں)۔ حدیث سے معلوم ہوا کہ جو چیز نماز میں حضورِ قلب سے مانع ہو اس سے گریز کرنا چاہیئے۔

حدیث ۵: وعن انسؓ قال کان قرام لعائشۃ رضؓ ستوت بہ جانب بیتہا فقال لہا النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم اُمیطی عنا قرامك ھذا فانہ لا یزال تصاویرہ تعرض لی فی صلوٰتی۔ رواہ البخاری۔

ترجمہ: حضرت انسؓ نے فرمایا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہاں ایک پردہ تھا جس سے انہوں نے اپنے گھر کی ایک جانب کو ڈھانک دیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اپنے اس پردے کو ہم سے پرے ہٹاؤ کیونکہ اس کی تصویریں میری نماز میں میرے سامنے آتی رہی ہیں۔ متفق علیہ۔

شرح: اس حدیث کی شرح کے لیے بھی اوپر کی حدیث کی شرح پر ایک دفعہ پھر نظر ڈال لی جائے۔ صاحبِ[2] مظاہرِ حق فرماتے ہیں کہ حضرت ام المؤمنین عائشہ

---

[1] فتح الباری ج ۲ صت ۲۴۰، مظاہرِ حق ج ۱ صت ۲۶۶، مرقات ج ۲ صت ۲۳۲ قسطلانی ج ۱ صت ۴۶۳، [2] مظاہرِ حق ج ۱ صت ۲۶۶

سلام اللہ علیہا نے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پردہ بطور دیوار گیری اور بعض کے نزدیک بطور چھپر کھٹ ڈالا تھا۔ تصاویر کا لفظ ظاہر کرتا ہے کہ اس میں جانداروں کی تصویریں ہوں گی۔ اس صورت میں تو نہی تحریم کے لیے ہوگی اور جناب ام المؤمنین رضؓ کو اس سے قبل حرمت معلوم نہ ہو گی یا اس کی حرمت کا اعلان ہی حضورؐ نے اسی موقعہ پہ فرمایا ہوگا۔ لیکن علامہ[۱] علی القاریؒ نے شارح طیبیؒ سے قرام کا معنی نقل کیا ہے کہ وہ ایک پتلا منقش پردہ ہوتا ہے۔ اس صورت میں تصاویر سے مراد وہی نقش و نگار ہوں گے اور نہی تحریم کے لیے نہیں بلکہ تنزیہاً ہوگی اور اصل بات تو یہ ہے کہ حضورؐ کا مقام اتنا بلند تھا کہ آپؐ دنیوی ساز و سامان کو بالکل اپنی ذات یا اہل بیت کے لیے پسند نہ فرماتے تھے اور صرف بقدرِ ضرورت و کفالت ہی استعمال فرماتے تھے۔ لہٰذا اس معاملے میں اس ذمہ داری کا احساس بھی کارفرما تھا جو بحیثیت پیغمبرؐ و راہنما ہونے کے آپؐ پر ڈالی گئی تھی۔

علامہ[۲] قسطلانیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے شافعیہ نے تصویروں کی مطلقاً کراہت (حرمت) کا استدلال کیا ہے اور حنفیہ بھی اسی کے قائل ہیں لیکن وہ تصاویر جو نیچے بچھی ہوئی ہوں ان کے نزدیک مستثنیٰ ہیں اور مالکیہ کا بھی یہی مسلک ہے اور امام احمدؒ بھی ایک روایت کے مطابق اسی کے قائل ہیں۔

حدیث ۶ : وعن عقبة بن عامرؓ قال أهدى لرسول الله صلى الله عليه وسلم فروج حرير فلبسه ثم صلى فيه ثم انصرف فنزعه نزعاً شديداً كالكاره ثم قال لا ينبغي هذا للمتقين۔ متفق علیہ۔

ترجمہ : حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ کی خدمت میں ایک ریشمی قباء بھیجی گئی۔ سو آپؐ نے وہ پہنی پھر اس میں نماز پڑھی۔ پھر جب نماز سے واپس تشریف لائے تو ناپسند کرنے والے کی مانند اسے سختی سے اتار دیا۔ پھر فرمایا کہ خوف خدا رکھنے والوں کے لیے یہ مناسب نہیں ہے۔ متفق علیہ

---

[۱] مرقات ج ۲ ص ۲۲۳ ۔ [۲] قسطلانی ج ۱ ص ۴۶۴ ۔

شرح: مولانا قطب الدینؒ فرماتے ہیں کہ فروج اس قبا کو کہتے ہیں جس میں پیچھے کی طرف چاک ہوتا ہے اور وہ قبا حضورؐ کی خدمت میں اکیدر دومہ (بادشاہ) یا اسکندریہ کے بادشاہ نے بھیجی تھی اور حضورؐ نے یہ اس وقت پہنی تھی جبکہ ابھی ریشم کا استعمال حرام نہیں ہوا تھا اور اسے ناپسند اس لیے فرمایا کہ ابھی حرام نہیں تھا۔ لیکن اس میں رعونت پائی جاتی تھی۔ اسی لیے فرمایا کہ متقیوں کے لیے یہ مناسب یعنی گو مباح ہے لیکن تقوٰی کے خلاف اور خوفِ خدا کے بلند مقام سے فروتر ہے پھر جب ریشم کا پہننا حرام ہو گیا تو متقی غیر متقی کا بھی فرق جاتا رہا اب سب کے لیے ناجائز قرار پایا اور یہ بھی ممکن ہے کہ ریشمی کپڑے سے ہی اس وقت ہدی ہو لیکن اس صورت میں متقی کا معنیٰ مومن لیا جائے گا یعنی شرک سے مبرّا۔ اور اس صورت میں لا ینبغی کا معنی لا یجوز ہو گا۔

امام ابن حجر عسقلانی اور علامہ علی القاریؒ[۲] نے لکھا ہے کہ اسی موقع پہ ریشم کا استعمال حرام کیا گیا ہے کیونکہ دوسری روایت میں ہے کہ حضورؐ نے دیباج (ریشم) کی قبا میں نماز پڑھی، پھر اسے اتار ڈالا اور فرمایا مجھے جبریلؑ[۴] نے اس سے منع کر دیا ہے اور یہ نماز آپؐ نے لوٹائی نہیں کیونکہ تحریم سے قبل ہوئی تھی اب کسی صورت جائز نہیں ہے۔ واللّٰہ اعلم بالصواب۔

[۵] علامہ قسطلانیؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص ریشمی کپڑے میں نماز پڑھے تو نماز ہو گئی لیکن اس نے فعل حرام کا ارتکاب کیا۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ ریشمی کپڑے میں نماز مکروہ (تحریمی) ہے مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر اسے اور کپڑا مل جائے تو وقت کے اندر نماز لوٹا لے۔

بابُ السُترة

ستره[۶] کے لفظی معنی آڑ کے ہیں۔ لیکن اصطلاحِ شرح میں سترہ کا لفظ اس چیز

---

[۱] مظاہر حق ج ۱ صـ ۲۶۶ [۲] مرقات ج ۲ صـ ۲۲۳ [۳] فتح الباری ج ۲ صـ ۲۴۱ [۴] فیض الباری ج ۲ صـ ۱۹ [۵] ارشاد الساری ج ۱ صـ ۴۶۳ [۶] مرقات ج ۲ صـ ۲۴۰، مظاہر حق ج ۱ صـ ۲۷۰۔

پر بطور غالب استعمال کے بولا جاتا ہے جیسے نمازی اپنے آگے گاڑلے مثلاً کوئی ڈنڈا وغیرہ یا کوئی گوڑا یا لکڑی تاکہ اس کے ساتھ نمازی کے سجدہ کی جگہ معلوم ہو جائے اور کوئی گزرنے والا اس کے اور اس کی سجدہ گاہ کے درمیان سے نہ گزر جائے۔ علامہ علی القاریؒ فرماتے ہیں کہ کوئی سواری، دیوار، درخت یا آدمی وغیرہ بھی سترہ کا کام دے سکتا ہے اور اس کی لمبائی کی مقدار ایک ہاتھ اور موٹائی ایک انگلی بھر ہے۔ امام نوویؒ نے فرمایا ہے کہ علماء اسلام کے نزدیک سترہ کی حکمت یہ ہے کہ سترہ سے آگے نمازی کی نگاہ نہ جائے اور حضورِ قلب نہ جاتا رہے، اور قریب سے گزرنے والوں کو پتہ چل جائے کہ یہ شخص نماز پڑھ رہا ہے اور اس کے آگے سے کوئی نہ گزرے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ سترہ کے بارے میں اختلاف ہوا ہے۔ ہمارے اصحاب کا کہنا یہ ہے کہ نمازی کو سترہ کے قریب کھڑا ہونا چاہیئے اور سترہ سے تین ہاتھ سے زیادہ فاصلہ نہ رکھے اگر کوئی ڈنڈا نہ ملے تو پتھر، مٹی اور روڑے وغیرہ ہی جمع کر کے کھڑے کر دے ورنہ کوئی چیز مثلاً جائے نماز ہی بچھا دے اور اگر کچھ نہ ہو تو ایک خط ہی کھینچ لے اور امام کا سترہ مقتدی کے لیے کافی ہے پس اگر کوئی گزرنے والا پہلی صف کے آگے سے گزرے تو گنہ گار نہ ہوگا۔ ہاں امام کے آگے سے گزرنے والا گنہ گار ہوگا اور امام کے آگے سے گزرنے والا ہی مقتدیوں کے آگے سے گزرنے والا شمار کیا جائیگا۔

سید المحدثین علامہ انور شاہ محدث کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث جسے امام بخاریؒ نے ترجمۃ الباب بنایا ہے سترۃ الامام سترۃ من خلفہ ابن ماجہؒ نے روایت کی ہے لیکن اس کی سند میں سقوط ہے لہٰذا وہ بخاری کی شرط اور معیار کے مطابق نہیں۔ لیکن دلائل شرع سے اس کا مضمون ثابت تھا لہٰذا بغیر جتائے انہی الفاظ کو ترجمۃ الباب بنا دیا ہے۔ اس سے یہ استدلال کیا جا سکتا ہے کہ جماعت کی نماز واحد ہے اسی لیے امام کا سترہ مقتدیوں کے لیے بھی سترہ تسلیم کیا گیا ہے ورنہ ہر ہر شخص کے سامنے سترہ ہونا چاہیے تھا۔ یہی حال جماعت میں دوسری چیزوں کا بھی ہے مثلاً قراءتِ فاتحہ وغیرہ۔ اسی حدیث میں ہے لَا صَلٰوۃَ اِلَّا بِخُطْبَۃٍ اس سے یہ نہیں سمجھا گیا کہ ہر ہر شخص خطبہ پڑھے ورنہ اس کی نماز نہ ہوگی۔ یہی معنی ہے لَا صَلٰوۃَ

ہ فیض الباری ج ۲ ص ۲۰۔

اِلاّ بفاتحۃ الکتاب کا بھی کہ فاتحہ کا وجود نماز میں ہونا ضروری ہے اور وہ موجود ہے۔ لہٰذا ہر ہر شخص کو فاتحہ کی قرأت ضروری نہ ہوگی۔

[1] حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ سترہ کا حکم بہت سی احادیث سے ثابت ہے لیکن یہ امر استحباب کے لیے ہے۔ امام مالکؒ نے مؤطا میں عروہؓ بن الزبیر کا ایک اثر نقل کیا ہے کہ وہ سترہ کے بغیر بھی صحرا میں نماز ادا کر لیا کرتے تھے۔ اور خط کھینچنا یا کسی عصا یا تلوار وغیرہ کو زمین پر ڈال دینا کفایت نہیں کر سکتا کیوں کہ اس سے سترہ کا مقصود حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور صحابہؓ سے ثابت ہے کہ وہ خط وغیرہ کھینچنے کی آسانی کے باوجود ایک ہاتھ اونچی چیز کی تلاش میں رہتے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

الفصل الاوّل

حدیث ۱ : عن ابن عمرؓ قال کان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم یغدو الی المصلی و العنزہ بین یدیہ تحمل و تنصب بالمصلی بین یدیہ فیصلی الیہا۔ رواہ البخاری۔

ترجمہ : حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دن کے پہلے پہر میں عید گاہ کی طرف تشریف لے جاتے اور برچھا آپؐ کے سامنے اٹھا کر لے جایا جاتا تھا اور عید گاہ میں آپؐ کے سامنے گاڑ دیا جاتا تھا پھر آپؐ اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا۔

شرح : عنزہ عصا سے لمبا اور نیزے سے چھوٹا ہوتا ہے اور اس میں نیزے کی مانند پھل ہوتا ہے۔ امام حاکمؒ نے مسلم کی شرط پر ایک [2] صحیح حدیث روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سترہ کجاوے کے مثل جتنا کافی ہے اور فرمایا کہ نماز میں سترہ استعمال کیا کرو اگرچہ ایک تیر ہی گاڑ لیا کرو۔ چنانچہ یہاں سترہ کا کام برچھے سے لیا گیا ہے۔ اور یہ [3] برچھا عموماً حضورؐ کے خدام سترہ کے طور

---

[1] مصفی و مسوّی ج ۱ ص ۹۵ ۔ [2] مرقات ج ۲ ص ۲۴۰ [3] مظاہر حق ج ۱ ص ۲۷۰

پر استعمال کرنے، ڈھیلے توڑنے اور اسی طرح کے اور کام کرنے کے لیے آپؐ کے آگے لے کر چلتے تھے۔ امام بخاریؒ نے دو الگ بابوں میں حربہ اور عنزہ کا سترہ بنایا جانا ثابت کیا ہے۔[1] حافظ عسقلانیؒ نے فرمایا ہے کہ حربہ عنزہ سے ذرا بڑا برچھا ہوتا ہے۔

حدیث ۲: وعن ابی جحیفۃ قال رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بمکۃ وھو بالابطح فی قبۃ حمراء من ادم ورأیت بلالاً اخذ وضوء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ورأیت الناس یبتدرون ذلک الوضوء فمن اصاب منہ شیئا تمسح بہ ومن لم یصب منہ اخذ من بلل ید صاحبہ ثم رأیت بلالا اخذ عنزۃ فرکزھا وخرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی حلۃ حمراء مُشمرا صلی الی العنزۃ بالناس رکعتین ورأیت الناس والدواب یمرون بین یدی العنزۃ۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت ابو جحیفہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے مکہ میں بمقام ابطح (محصّب) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چمڑے کے ایک سرخ خیمے میں دیکھا اور میں نے بلالؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کا بقیہ پانی لیے ہوئے دیکھا اور لوگ جلدی جلدی اس پانی کو حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے سو جس کو اس میں سے کچھ مل جاتا وہ اپنے جسم کو مل کر برکت حاصل کرتا تھا اور جسے اس میں سے کچھ نہیں ملتا تھا وہ اپنے ساتھی کے ہاتھ کی تری کو لے لیتا تھا۔ پھر میں نے بلالؓ کو دیکھا کہ اس نے ایک برچھا پکڑا اور اسے گاڑ دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دامن سمیٹے ہوئے ایک سرخ جوڑے میں باہر تشریف لائے اور آپؐ نے اس برچھے کی طرف منہ کر کے لوگوں کو دو رکعت نماز پڑھائی اور میں نے لوگوں کو اور چار پایوں کو اس برچھے کے پرے سے گزرتے دیکھا۔ اس حدیث پر بخاری و مسلم کا اتفاق ہے۔

شرح: اس[2] حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سرخ لباس مردوں کے لیے پہننا جائز

---

[1] فتح الباری ج ۲ ص ۲۸۶۔ [2] مرقات ج ۲ ص ۲۴۱، مظاہر حق ج ا ص ۲۷۱۔

ہے چنانچہ علامہ ابن حجرؒ نے اس سے استدلال کیا ہے کہ رنگ چاہے کتنا گہرا ہو سرخ رنگ کے کپڑوں کا اس حدیث سے جواز نکلتا ہے لیکن ایسا کہ نا مکروہ ہے کیونکہ اس کی حرمت میں اختلاف ہے۔ علامہ علی القاریؒ نے فرمایا ہے کہ حضورؐ کا یہ جوڑا غالباً یمنی چادروں کا تھا اور اس میں سفید تانے میں سرخ لکیریں تھیں یعنی سرخ دھاری دار تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زعفرانی اور معصفر کپڑا پہننے اور سرخ کپڑے استعمال کرنے سے منع فرمایا ہے۔ ابن الملک فرماتے ہیں کہ مردوں کو عورتوں کے مشابہ لباس پہننے سے واضح طور پر حضورؐ نے منع فرمایا ہے اس لیے ماننا پڑے گا کہ اس جوڑے میں صرف سُرخ دھاریاں تھیں۔ سرخ کپڑا چاہے بننے سے پہلے دھاگہ سرخ ہو یا بعد میں سُرخ رنگ سے رنگا جائے، عورتوں کی مشابہت کی وجہ سے ناجائز ہے۔

علامہؒ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ حنفیہ کی دلیل ابوداؤد اور ترمذی کی روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ فرماتے ہیں، ایک شخص سرخ جوڑا پہنے حضورؐ کے پاس سے گزرا اور حضورؐ کو سلام کیا لیکن آپؐ نے اسے جواب نہ دیا۔ حافظ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اس کی سند کمزور ہے گو ترمذی نے اسے حَسن کہا ہے لیکن بخاری کی حدیث اس سے بہرحال قوی ہے لہٰذا اسے لیا جائے گا اور اسے چھوڑ دینا چاہیئے۔

علامہؒ سیدؒ انور شاہؒ فرماتے ہیں کہ امام ابن العربی مالکیؒ نے احکام القرآن میں اِسی حدیث کی روایت میں تصریح کی ہے کہ حضورؐ نے حجۃ الوداع سے واپسی پر جو جوڑا زیبِ تن فرمار کھا تھا وہ خالص سرخ نہ تھا بلکہ اس میں سفید زمین پر سرخ دھاری تھی۔ پھر حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ حنفیہ کے نزدیک اگر سُرخ رنگ زعفران کا ہو یا عصفر (ایک خوشبودار بوٹی) کا ہو تو مردوں کے لیے مکروہ تحریمی ہے لیکن ان دو کے سوا اگر سرخ رنگ ہو تو مکروہ تنزیہی ہے اور اگر سرخ دھاری دار ہو تو بلا کراہت ہے۔ اور عورتوں کے لیے یہ سب اقسام جائز ہیں۔

علامہؒ قسطلانیؒ نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ حمراء سے مراد دو

---

١ فتح الباری ج ٢ ص ٢٤١ ٢ فیض الباری ج ٢ ص ١٩

٣ ارشاد الساری ج ١ ص ٤٦٥

یمنی چادریں تھیں جن میں سرخ وسیاہ دھاریاں پڑی تھیں۔

علامہ شوکانی رح نے مسندِ احمد، مسلم اور نسائی کی ایک حدیث سے معصفر کی حرمت ثابت کی ہے اور اسے جمہور صحابہ رض و تابعین و تبع تابعین اور شافعی اور ابو حنیفہ رح کا مذہب قرار دیا ہے لیکن سرخ رنگ کے کپڑوں کے متعلق یہی بخاری کی حدیث بطور استدلال پیش کر کے اسے شافعیہ اور مالکیہ کا مسلک قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ عترت اور حنفیہ اس رنگ کی حرمت کے قائل ہیں اور عبد اللہ بن عمرو رض کی روایت سے دلیل پکڑتے ہیں۔

حدیث ۳ : وعن نافع عن ابن عمر رض ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یعرض راحلتہ فیصلی الیہا۔ متفق علیہ۔ وزاد البخاری قلت افرأیت اذا ھبت الرکاب قال کان یأخذ الرحل فیعدلہ فیصلی الیٰ اٰخرتہ۔

ترجمہ : نافع رح نے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سواری کو اپنے اور قبلے کے درمیان عرضاً بٹھا لیتے اور اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ لیتے تھے۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے لیکن بخاری رح نے ان الفاظ کا اور اضافہ کیا ہے کہ نافع رح کہتے ہیں میں نے ابن عمر رض سے کہا، بھلا یہ تو بتاؤ کہ جب سواری کے جانور چرنے یا پانی پینے گئے ہوتے تھے تو پھر آپ کس طرح نماز پڑھتے؟ انہوں نے فرمایا کہ آپ کجاوے لے کر اسے درست کر لیتے تھے اور اس کی پچھلی لکڑی کی طرف نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔

شرح : امام شافعی رح کا مسلک یہ ہے کہ کسی جانور کی طرف منہ کر کے نماز جائز نہیں۔ لیکن اس صحیح حدیث کو دیکھ کر امام نووی رح نے فرمایا کہ امام شافعی رح کو یہ حدیث نہیں پہنچی اور ان کا مسلک صحیح حدیث کا اتباع ہے۔ پس شافعیہ کا مسلک یہی ٹھیرا کہ جانور کو بٹھا کر اس کی طرف نماز پڑھ لینا اور سترہ بنا لینا جائز ہے۔

امام بخاری رح نے باب الصلوٰۃ الی الراحلۃ والبعیر والشجر والرحل میں یہی حدیث درج کی ہے اور اس سے ان تمام چیزوں کا سترہ بنانا جائز قرار دیا ہے۔

۱۔ نیل الاوطار ج ۱ ص ۳۸۹ ۔ ۲۔ مرقات ج ۲ ص ۲۴۲ ۔

لیکن حافظ[1] ابن حجرؒ نے شرح میں شافعی مسلک کی تائید میں کمال کر دکھایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ امام شافعیؒ کا مطلب یہ ہے کہ فی حالِ الاختیار، جانور کی طرف منہ کر کے اور اسے سترہ بنا کر نماز پڑھنا ناجائز ہے۔ غالباً ان کا مطلب اختیار سے یہ ہے کہ جانور پہ کجاوہ کسا ہو تو سترہ بنانا جائز ہے ورنہ ناجائز۔ لیکن یہ تاویل جیسی کچھ ہے نظر آ رہی ہے۔

سید المحدثین[2] سید انور شاہؒ نے فرمایا کہ اس حدیث میں آخِرَةُ الرَّحل کے لفظ سے حنفیہ نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ ہر وہ چیز جو ایک ہاتھ لمبی اور ایک انگلی موٹی ہو وہ سُترہ بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ حضرت[3] شاہ ولی اللہؒ نے اسی بنا پر شرح مؤطا میں اس مقدار کو معتبر قرار دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رحل کی پچھلی لکڑی کی مقدار تقریباً یہی ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔

حدیث ۴ : وعن طلحۃ بن عُبَیدِ اللہؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا وضع احدکم بین یدیہ مثل مؤخرۃ الرحل فلیصل ولا یبال من مر وراء ذٰلک رواہ مسلم۔

ترجمہ : حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی شخص کجاوے کی پچھلی لکڑی جیسی کوئی چیز اپنے سامنے رکھ لے تو نماز پڑھ لے اور جو اس سے پرے پرے گزرتا ہے اس کی پروا نہ کرے۔ اسے مسلم نے روایت کیا۔

شرح : یعنی[4] جب سترہ موجود ہے تو نمازی کا خشوع نہیں ٹوٹے گا اور گزرنے والا گنہ گار نہ ہوگا۔ اس حدیث سے سترہ کے یہی دو مقاصد بھی معلوم ہو گئے۔ مؤخرۃ الرحل اور آخرۃ الرحل ایک ہی چیز ہے یعنی کجاوے کی پچھلی اونچی لکڑی۔

حدیث ۵ : وعن ابی جہیمؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ

---

[1] فتح الباری ج ۲ ص ۴۸۸۔ [2] فیض الباری ج ۲ ص ۸۳۔
[3] مصفّٰی و مسوّٰی ج ۱ ص ۹۵ [4] مظاہر حق ج ۱ ص ۲۷۱، مرقات ج ۲ ص ۲۴۲

وسلم لو يعلم المار بين يدى المصلّى ماذا عليه لكان ان يقف اربعين خيراً له من ان يمر بين يديه قال ابو النضر لا ادرى قال اربعين يوماً او شهراً او سنة ۔ متفق عليه ۔

ترجمہ : حضرت ابو جہیمؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر نمازی کے سامنے سے گزرنے والا جانتا کہ اسے کتنا گناہ ہوتا تو نمازی کے سامنے سے گزرنے سے بہتر تھا کہ چالیس .... کھڑا رہتا۔ ابو النضر راوی حدیث کہتے ہیں کہ میں نہیں جانتا کہ چالیس دن کہا یا چالیس مہینے یا چالیس سال ۔ متفق علیہ ۔

شرح : یہ حدیث بعینہٖ مؤطا میں بھی ہے ۔ حافظ ابن حجرؒ[1] فرماتے ہیں کہ قَالَ اَبُو النضر امام مالکؒ کا قول ہے بخاریؒ کی تعلیق نہیں ہے ۔ مسندِ بزار میں ہے اَرْبَعِیْنَ خریفًا (یعنی سال) کا لفظ آگیا ہے لہٰذا اس شک کو چالیس سال کے لفظ سے رفع کرنا چاہیئے ۔ اور ایک اور روایت میں مِائَۃ (سو سال) کا لفظ بھی ہے (ابن ماجہ، ابن حبان) حافظ صاحب نے امام طحاویؒ سے نقل کیا ہے کہ یہ ارشاد زجر و توبیخ کے لیے ہے لہٰذا ماننا ہوگا کہ حضورؐ نے پہلے چالیس سال اور پھر کسی موقع پہ سو سال کا لفظ ارشاد فرمایا تھا ۔ خود حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں چونکہ مبالغہ مراد ہے لہٰذا کوئی خاص عدد مثلاً چالیس ہی مراد نہیں ہے اور لَوْ سے مراد بالفرض والتقدیر ہے ۔

علامہ[2] علی القاریؒ نے علامہ کرمانیؒ سے نقل کیا ہے کہ اس حدیث میں عدد اس معاملے کی تفخیم و تعظیم کے لیے مبہم رکھا گیا ہے ۔ حافظ توربشتیؒ نے طحاویؒ سے نقل کیا ہے کہ اَرْبَعِیْنَ سے مراد چالیس سال ہی ہیں ۔ اور چالیس کا عدد اس لیے ہے کہ انسان پہ خلقے طور اور دور گزرتے ہیں ان میں اس کو دخل ہے مثلاً چالیس دن نطفہ پھر چالیس دن مضغہ پھر چالیس دن علقہ رہتا ہے اور چالیس سال میں کمالِ شباب کو جا پہنچتا ہے ۔

---

[1] فتح الباری ج ۲ ص ۲۹۱ ۔

[2] مرقات ج ۲ ص ۲۴۳ ، مظاہر حق ج ۱ ص ۲۷۱ ۔

حافظ ابن حجرؒ[1] نے بَینَ یَدَیِ المُصَلِّی کی تحدید میں تین قول نقل کیے ہیں: پہلا یہ کہ جب وہ نمازی کی سجدہ گاہ اور نمازی کے درمیان سے گزرے، دوسرا یہ کہ تین ہاتھ کے فاصلے سے گزرے اور تیسرا یہ کہ نمازی سے لیکر اس کے پتھر پھینکنے کے مقام تک میں گزرے۔ لیکن سترہ کے احکام سے حنفیہ یہی سمجھتے ہیں کہ پہلا قول مراد ہے یعنی یہ گناہ اس وقت ہے جبکہ نمازی کے اور اس کی سجدہ گاہ کے درمیان سے گزرے۔ واللہ اعلم۔

حضرت[2] شاہ ولی اللہؒ محدث دہلوی نے بغویؒ سے سارے اہلِ علم کا اتفاق نقل کیا ہے کہ اگر نمازی کے سامنے سترہ نہ ہو تو گزرنے والے کا قصور نہیں۔ سترہ ہونے کی صورت میں نمازی اسے ہاتھ وغیرہ سے ہٹائے۔ اگر پھر بھی باز نہ آئے تو شدت سے مزاحمت کرے۔ حدیث میں مقاتلہ کا جو لفظ آیا ہے اس سے یہی مراد ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے اس قول سے بھی حافظ ابن حجرؒ کے بیان کہ وہ پہلے مطلب کی تائید نکلتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۶: وعن ابی سعید قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا صلی احدکم الی شیئ یسترہٗ من الناس فاراد احد ان یجتاز بین یدیہ فلیدفعہ فان ابیٰ فلیقاتلہ فانما ھو شیطان۔ ھذا لفظ البخاری ولمسلم معناہ۔

ترجمہ: حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی ایسی چیز کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ رہا ہو جو اسے لوگوں سے ڈھانکے (یعنی سترہ جو نمازی اور لوگوں میں حائل ہو)، پس کوئی شخص اس کے سامنے سے گزرنا چاہے تو وہ اسے باز رکھے اگر وہ پھر بھی باز نہ آئے تو اس سے لڑے (مزاحمت کرے)، کیونکہ وہ تو ایک شیطان ہے۔ یہ بخاری کا لفظ ہے اور مسلم نے اسی کے ہم معنی روایت کی ہے۔

شرح: حضرت[3] علامہ سید انور شاہؒ فرماتے ہیں کہ گزرنے والے کو ہٹانا ہماری فقہ کی کتابوں میں یوں آیا ہے کہ اگر جہری نماز ہے تو بلند آواز سے قراءت کرے

---

[1] فتح الباری ج ۲ ص ۲۹۰۔ [2] مسوّیٰ ج ۱ ص ۹۶۔ [3] فیض الباری ج ۲ ص ۸۴۔

(اگر پہلے ہی قرأت بالجہر کر رہا ہو تو اس سے بھی اونچی آواز سے کرے) اگر سری نماز ہے تو تکبیر، تسبیح یا ایک آیت بلند آواز سے پڑھ کر اسے ہٹائے اور فَلْيُقَاتِلْهُ کا لفظ ہمارے نزدیک دلی کراہت اور تقبیح کے لیے ہے نہ یہ کہ واقعی نمازی اس سے لڑنا شروع کر دے۔ یہ لفظ یہاں بطور مبالغہ آیا ہے تاکہ گزرنے والے کو معلوم ہو جائے کہ وہ کیسا فعل کر رہا ہے۔ حضراتِ شافعیہ نے حدیث کے ظاہر کو لیا ہے اور ان کے نزدیک ایسی صورت میں حسی قتال جائز ہے۔ حتیٰ کہ امام نووی رح یہاں تک کہہ گئے کہ اگر گزرنے والا قتل ہو جائے تو دیت آئے گی قصاص نہیں آئے گا اور گزرنے کو جو شیطان فرمایا ہے سو جو شخص عابد اور اس کے رب کے درمیان حائل ہو وہ شیطان نہیں تو اور کون ہوگا۔

حافظ[1] ابن حجر رح فرماتے ہیں کہ شافعیہ کی ایک جماعت نے حدیث کے ظاہر کے مطابق قتال کی اجازت دی ہے لیکن دفع سے مراد اس میں اشارہ اور آہستگی سے منع کرنا ہے اور مقاتلہ سے مراد ذرا شدت سے روکنا ہے اور بیہقی رح نے امام شافعی رح سے بھی یہی نقل کیا ہے۔

پھر حافظ صاحب رح نے امام نووی رح سے نقل کیا ہے کہ اس حدیث کا امر استحباب پر محمول ہے۔ ہمارے اصحاب میں کوئی بھی وجوب کا قائل نہیں ہوا اور اِنَّمَا هُوَ شَيْطَانٌ سے مراد یہ ہے کہ اس کا یہ فعل شیطانی فعل ہے۔

علامہ[2] علی القاری رح نے دفع کا معنی اشارہ، تسبیح، تکبیر بیان کیا ہے جبکہ نمازی کی کوتاہی نہ ہو ورنہ اگر ایک آدمی چور راہے میں کھڑا ہو کر نماز پڑھنے لگے تو اس کا یہ حکم قطعاً نہ ہوگا۔ اسی طرح اگر دوسری صف والوں نے پہلی صف پوری نہ کی ہو تو ان کے آگے سے گزر کر پہلی صف کی تکمیل جائز ہوگی۔ اور یہ حکم مسجدِ حرام اور داخلِ کعبہ سب جگہوں کے لیے ہے

ظاہر[3] یہ نے اس حدیث سے نمازی کے سامنے سے گزرنے والے کے ساتھ

---

[1] فتح الباری ج ۲ ص ۲۹۰۔ [2] مرقات ج ۲ ص ۲۴۴ ، مظاہر حق ج ۱ ص ۲۷۲
[3] قسطلانی ج ۱ ص ۵۴۲۔

دخیلگامشتی اور قتال کو واجب قرار دیا ہے۔ حالانکہ اس کے وجوب کا کوئی بھی ان کے سوا قائل نہیں ہوا۔

حدیث ۷: وعن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تقطع الصلوٰۃ المرأۃ والحمار والکلب ویقی ذلک مثل مؤخرۃ الرحل۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کا ارشاد ہے کہ عورت، گدھا اور کتا نماز کو توڑ دیتے ہیں۔ اور اس سے کجاوے کی پچھلی لکڑی کی مانند چیز بچاتی ہے اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔

شرح: علامہ علی القاری نے میرک شاہ کا بیان الازھار سے نقل کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ قطع سے مراد اس حدیث میں حضور قلب اور خضوع و خشوع کا قطع ہونا اور نمازی کا ان چیزوں میں الجھ کر رہ جانا ہے کیوں کہ اگر یہ معنی مراد نہ لیا جائے بلکہ حقیقی قطع اور بطلان مراد رکھا جائے جیسا کہ بعض کا خیال ہے تو اس حدیث کے بعد کی تینوں حدیثیں اس کے صریح خلاف پڑیں گی۔ پس ایسا معنی مراد لینا چاہیے جس سے حدیث کا تعارض جاتا رہے۔ جمہور علماء کے نزدیک دسوائے حسن بصری احمد بن حنبل اور اسحاق بن راہویہ کے، نمازی کی نماز کسی چیز سے نہیں ٹوٹتی چاہے اس کے سامنے سترہ ہو یا نہ ہو۔ اور گزرنے والا چاہے سترہ سے پرے ہو کر گزرے چاہے نمازی اور سترہ کے درمیان سے گزر جائے گزرنے والا چاہے مرد ہو یا گدھا اور کتا ہو، بلکہ سیاہ کتے کا بھی یہی حکم ہے کیوں کہ صحیح احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں پس قطع سے مراد حضورِ قلب اور خشوع و خضوع کا قطع ہونا ہے۔

اس سے قبل اسی باب کی احادیث کی شرح میں گزر چکا ہے کہ ظاہریہ کے سوائے ساری امت سترہ کے مستحب ہونے پر متفق ہے۔ پس اس فیصلے کی رو سے سترہ اگر نہ بھی ہو یا ہو لیکن گزرنے والا اس سے ورے کو گزرے تب بھی نماز باطل نہ ہوگی۔

مولانا قطب الدین فرماتے ہیں کہ جمہور علماء اور صحابہ وغیرہم کا یہ مذہب ہے

---

۱ مرقات ج ۲ ص ۲۴۵۔ ۲ مظاہر حق ج ص ۲۷۲۔ ۳ شاہ ولی اللہ نے اس مسئلہ پہ "گویا اجماعِ مجتہدین" کے الفاظ لکھے ہیں۔ مصفی ج ۱ ص ۹۷۔

کہ کوئی چیز یا کوئی شخص اگر نمازی کے آگے سے گزرے تو اس کی نماز ٹوٹتی نہیں خواہ یہ تین چیزیں ہوں جن کا ذکر اس حدیث میں ہے خواہ ان کے علاوہ کوئی اور چیز ہو۔ اور یہ احادیث جو اس بارے میں آئی ہیں شدت اور مبالغے پر محمول ہیں تاکہ حضورِ قلب کے لیے سترہ کھڑا کر لیا جائے۔ یا مراد یہ ہے کہ یہ چیزیں خشوع و خضوع کو توڑ دیتی ہیں جو نماز کی روح اور اس کی اصل اور سِر ہے۔ یا اس کا مطلب یہ ہے کہ قریب ہے کہ ان سے نماز باطل ہو جائے کیوں کہ ان چیزوں میں دل بہت مشغول ہو جاتا ہے عورت کا حال تو ظاہر ہے اور گدھا شیطان ہے یا اس کے ساتھ شیطان ہوتے ہیں اسی لیے جب وہ رینکتا ہے تو اعوذ باللہ پڑھنا مستحب ہے اور کتا نجس العین ہے اور بعض[1] روایات میں کتے کے ساتھ اَسْوَد کی قید موجود ہے غالباً یہ اس لیے کہ وہ بڑا خطرناک اور ڈراؤنا ہوتا ہے اور بعض احادیث میں اس کے لیے شیطان کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

امام بخاریؒ نے باب استقبال الرجل الرجل میں حضرت امّ المؤمنین عائشہ سلام اللہ علیہا سے نقل کیا ہے کہ ان کے سامنے یہ حدیث بیان ہوئی کہ نماز کو عورت گدھا اور کتا توڑ دیتے ہیں تو انہوں نے فرمایا تم نے ہمیں کتوں کے حکم میں داخل کر دیا ہے۔ (یعنی حدیث کا معنی غلط سمجھے ہو) میں کئی دفعہ حضورؐ کے سامنے سوئی ہوتی اور آپؐ نماز پڑھ لیتے تھے۔ حافظ ابن حجرؒ[3] اس کی شرح میں فرماتے ہیں کہ جب کوئی چیز نمازی کے دل کو مشغول نہ کرے تو اس کا کوئی نقصان نہیں اور بخاری نے ترجمۃ الباب میں بھی یہی چیز کہی ہے اور جب عورت سے نماز نہیں ٹوٹتی تو مرد سے بدرجۂ اولیٰ نہ ٹوٹے گی۔ بخاریؒ اس سے یہی ثابت کر رہے ہیں۔

حدیث ۸ : وعن عائشۃ رضی اللہ عنہا قالت کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یصلی من اللیل وانا معترضۃ بینہ وبین القبلۃ کاعتراض الجنازۃ۔ متفق علیہ۔

امّ المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ

---

[1] مرقات ج ۱ ص ۲۴۵۔ [2] قسطلانی ج ۱ ص ۵۴۳۔
[3] فتح الباری ج ۲ ص ۲۹۲۔

علیہ وسلم رات کو (تہجد کی) نماز پڑھا کرتے اور میں آپؐ کے اور قبلہ کے درمیان عرض کے بل سوئی ہوتی جیسے کہ جنازہ سامنے عرض کے بل رکھا ہوتا ہے۔ متفق علیہ۔

شرح: پہلی حدیث میں جس میں تین چیزوں کے نماز کو قطع کر دینے کا ذکر تھا اُس کے بعد اس حدیث کو لانے سے صاحبِ مشکوٰۃ کی غرض یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اس حدیث سے قطع سے مراد حضورِ قلب کا قطع کر دینا ہے اصل نماز ہی کا باطل کر دینا مراد نہیں ہے۔ ورنہ اس حدیث میں تو جنابِ ام المؤمنینؓ سامنے سے، گزرتی نہیں بلکہ سوئی ہوتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام بخاریؒ نے باب من قال لا یقطع الصّلوٰۃ شیئٌ میں دو احادیث بالکل اسی مضمون کی حضرت عائشہؓ سے درج کی ہیں۔

حافظؒ ابن حجرؒ عسقلانی نے فرمایا ہے کہ علماء کا ان احادیث پر عمل کے بارے میں اختلاف ہوا ہے۔ امام طحاویؒ وغیرہ تو حضرت ابو ذرؓ وغیرہ کی احادیث کے منسوخ ہونے کے قائل ہوئے ہیں لیکن نسخ کے لیے ضروری ہے کہ دونوں احادیث میں سے ایک کا پہلے اور دوسری کا بعد میں ہونا ثابت ہو جائے اور وہ یہاں ثابت نہیں اور پھر نسخ اس وقت مانا جاتا ہے کہ دونوں قسم کی حدیثوں کو جمع کرنا ناممکن ہو اور یہاں جمع کرنا ممکن ہے۔ امام شافعیؒ اور دوسرے لوگوں نے فرمایا ہے کہ ابو ذرؓ والی حدیث میں قطع سے مراد خشوع و خضوع کا قطع کرنا مراد ہے نہ کہ سرے سے نماز ہی کو باطل کر دینا اور اس کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ حدیث روایت کرنے والے صحابیؓ سے پوچھا گیا کہ کتے کے خاص کر کالا (الاسود) ہونے کا ذکر (اس حدیث میں) کیوں ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ وہ شیطان ہے۔ اور یہ امر معلوم ہے کہ شیطان اگر نمازی کے سامنے سے گزر جائے تو نماز باطل نہیں جیسا کہ صحیح حدیث میں شیطان کا نمازی کے پاس آکر وسوسے ڈالنا مذکور ہوا ہے۔

اس کے بعد حافظ ابن حجرؒ نے ان لوگوں کے دلائل اور جوابات بیان کیے ہیں جو واقعی ان تینوں چیزوں سے نماز کا باطل ہونا مراد لیتے ہیں اور امام احمدؒ کا مسلک یہ بیان کیا ہے کہ ان کے نزدیک کالے کتے سے تو نماز باطل ہو جاتی ہے لیکن عورت

ؒ فتح الباری ج ۲ ص ۲۹۳۔

اور گدھے کے متعلق وہ متردّد ہیں کیوں کہ کالے کتے والی حدیث کے معارض انہیں کوئی حدیث نہیں مل سکی اور عورت اور گدھے کے متعلق صحیح حدیثیں موجود ہیں کہ ان سے نماز باطل نہیں ہوتی پھر بعض حضرات نے عورت میں زوجہ اور غیر زوجہ کا بھی فرق کیا ہے نیز سامنے سے گذرنے اور لیٹے ہوئے میں بھی فرق مانا ہے۔ اور یہ بھی کہا ہے کہ حضورؐ کے زمانے میں گھروں میں چراغ نہیں ہوتے تھے لہٰذا اندھیرے میں اگر حضرت عائشہ صدیقہؓ سامنے سوئی ہوتیں تو اس میں کوئی حرج نہیں تھا۔ بعض علماء نے اس حدیث کو حضورؐ کے خصائص میں بھی شمار کیا ہے یعنی حضورؐ کی یہ خصوصیت تھی، امت میں سے کسی کا یہ حوصلہ نہیں کہ ایسے موقع پر اس کے دل میں کوئی تشویش پیدا نہ ہو۔

لیکن جمہور علماء کا مسلک اوپر بیان کیا جا چکا ہے اس لیے ان تمام بحثوں کے باوجود فیصلہ یہی ماننا چاہیئے کہ پہلی حدیث میں قطع سے مراد باطل کرنا نہیں بلکہ حضورِ قلب کا توڑنا ہے اور اگر حضورِ قلب نہ ٹوٹے تو پھر ان چیزوں کے گذر جانے سے بھی کچھ حرج نہیں لیکن چونکہ اس کا احتمال قوی تھا لہٰذا اس حدیث میں ایسا فرمایا گیا واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۹: وعن ابن عباسؓ قال اقبلت راکباً علی اتان وانا یومئذٍ قد ناھزت الاحتلام ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصلی بالناس بمنیً الی غیر جدار فمررت بین یدی بعض الصف فنزلت وارسلت الاتان ترتع ودخلت فی الصف فلم ینکر علی احد۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ میں ایک گدھی پر سوار ہو کر آیا اور میں ان دنوں بالغ ہونے کے قریب تھا اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ کے مقام پر لوگوں کو نماز پڑھا رہے تھے اور آپؐ کے سامنے کوئی دیوار وغیرہ نہ تھی پس میں صف کے کچھ حصے کے آگے سے گذر گیا اور سواری سے اترا اور گدھی کو چرنے کے لیے چھوڑ دیا پس میں صف میں شامل ہو گیا اور کسی نے میرے فعل پر انکار نہ کیا۔ متفق علیہ۔

شرح [1]: امام بخاریؒ نے اس حدیث کو اپنی صحیح میں باب سترۃ الامام سترۃ من خلفہ میں درج کر کے گویا یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت بھی یہی تھی اور اسی کا دوسروں کو حکم دیتے تھے کہ صحرا وغیرہ میں سترہ کے بغیر نماز نہ پڑھی جائے لہٰذا اس موقع پر بھی لازماً سترہ موجود ہو گا۔ کیوں کہ ابن عمرؓ اور ابو جحیفہؓ کی صحیح حدیثوں میں سُترہ کا استعمال صراحتہً مذکور ہے۔ اسی[2] طرح ابن عباسؓ کا صف کے بعض حصے کے آگے سے گزرنا، گدھی کو چھوڑنا اور پھر نماز میں شامل ہونا یہ سب چیزیں بتا رہی ہیں کہ سترہ حسب معمول موجود ہو گا۔ لیکن امام بیہقیؒ نے اپنی کتاب میں اس حدیث پر باب باندھا ہے باب من صلی الی غیر سُترۃ۔ اور امام شافعیؒ سے نقل کیا ہے کہ ابن عباسؓ کا یہ قول اِلٰی غَیرِ جدَارٍ یہ ثابت کرتا ہے کہ وہاں کوئی سترہ وغیرہ موجود نہ تھا۔ اور بالکل یہی چیز مُسند بزار میں اس روایت میں موجود ہے وہاں لَیْسَ شَیْئٌ یَسْتُرُہ کے لفظ آئے ہیں۔ اس صورت میں اس حدیث کا مطلب یہ ہو گا کہ سترہ کا حکم استحبابی ہے اور حضورؐ نے کبھی کبھی بلا سترہ بھی نماز پڑھی ہے۔ پس اگر سُترہ موجود نہ تھا تو حضرت ابن عباسؓ جو قریب البلوغ تھے ان کا اور ان کی گدھی کا صف کے کچھ حصے کے آگے سے گزر جانا اور کسی کا انہیں کچھ نہ کہنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ نہ صرف سترہ کے بغیر نماز جائز ہے بلکہ گدھے کا سامنے سے گزر جانا بھی نماز کو باطل نہیں کرتا اور جس حدیث میں اس کے خلاف آیا ہے اس سے مراد قطعِ حضورِ قلب لیا جائے گا ورنہ ابن عباسؓ کی اس حدیث کی تاویل بہت مشکل ہو جائے گی۔

جن حضرات نے فرمایا ہے کہ سترہ تو موجود تھا لیکن دیوار وغیرہ کی آڑ نہ تھی، ان کے نزدیک ابنِ عباسؓ اور ان کی گدھی کا سامنے سے گزرنا مضر نہ تھا کیونکہ دوسری احادیث میں آچکا ہے کہ سترہ کی موجودگی میں کسی چیز کا اس کے پرے سے گزر جانا مضر نہیں۔ لیکن یہ بات پھر بھی دل میں کھٹکتی ہے کہ آیا ابن عباسؓ اور ان کی سواری اس صورت میں لازماً لوگوں کے سجدہ گاہ سے پرے پرے گزرے تھے؟ اس کا کوئی ذکر اس حدیث میں موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شارحین حدیث میں یہ حدیث

---

[1] مرقات ج ۲ ص ۲۴۵، فتح الباری ج ۲ ص ۲۸۴ ایضاً فتح الباری کتاب العلم و کتاب الاستیذان۔ [2] ایضاً مرقات ج ۲ ص ۲۴۶۔

معرکۃ الآراء بن گئی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جمہور علماء سترہ کے استحباب کے قائل ہیں اور کسی چیز کے سامنے (یعنی سجدہ گاہ سے بھی ورے) سے گذر جانے سے نماز کے باطل ہونے کا حکم نہیں لگاتے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

صاحبِ[1] مظاہر حق نے فرمایا ہے کہ ابن عباسؓ چونکہ اسوقت نابالغ تھے لہٰذا کسی نے انہیں صف کے آگے سے گذر جانے پہ کچھ نہ کہا اور گدھی کے گذر جانے سے بھی کوئی حرج نہ تھا۔ لیکن انہوں نے دو چیزوں کو عجیب انداز میں جمع فرما دیا ہے اگر گدھی کے گذرنے سے نماز نہ ٹوٹی تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ اگر اس وقت جوان بھی ہوتے (اور جوانی کے قریب تو تھے ہی) تو کیا حرج تھا؟

علامہ[2] سید انور شاہ کشمیری نے فرمایا ہے کہ عورت، گدھے اور کتے کے گذرنے سے نماز قطع ہونے اور نہ ہونے والی دونوں قسم کی احادیث صحیح ہیں پس ہم کہتے ہیں کہ نماز ان سے قطع ہو جاتی ہے یعنی اس کی روح اور حضور قلب قطع ہو جاتے ہیں۔ (حضورؐ اس سے مستثنیٰ ہیں) اور نماز قطع نہیں ہوتی یعنی مِن کُلِّ الوُجُوہِ باطل نہیں ہو جاتی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

علامہ[3] شوکانیؒ نے دو قسم کی احادیث بیان کی ہیں اور فرمایا ہے کہ حضرت انسؓ ابو ہریرہؓ اور بعض روایات کے مطابق ابن عباسؓ اور ابو ذرؓ یہ حضرات صحابہؓ میں سے اور تابعین میں سے حسن بصریؒ، ابو الاحوصؒ اور ائمہ میں سے احمد بن حنبلؒ اور ابن حزمؒ ظاہری نماز کے بالکلیہ باطل ہو جانے کے قائل ہیں۔ پھر قطع نہ ہونے بلکہ صرف حضور قلب کے جاتے رہنے کو جمہور صحابہؓ و تابعینؒ اور ائمہؒ فقہ کا مسلک بیان کیا ہے۔

باب صفۃ الصلوٰۃ

صفت[4] سے مراد یہاں جنس صفت ہے جو ارکان، فرائض، واجبات، سنن اور مستحبات سب کو مشتمل ہے۔ امام ابن الہمامؒ فرماتے ہیں کہ وصف اور صفت کو بعض

---

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۲۷۲ [2] فیض الباری ج ۲ ص ۸۶۔
[3] نیل الاوطار ج ۲ ص ۲۵۴، ۲۵۵۔ [4] مرقات ج ۲ ص ۲۴۹۔

لوگ ایک ہی چیز قرار دیتے ہیں لیکن متکلمین کے نزدیک ان میں فرق ہے۔ وصف ان صفات کے ذکر کرنے کو کہتے ہیں جو موصوف میں پائے جائیں اور خود وہ چیز جو موصوف میں پائی جاتی ہے اسے صفت کہا جاتا ہے۔ مراد ان کی یہ ہے کہ وصف مصدر ہے اور صفت اسمِ مصدر ہے۔ اور صفۃ الصّلوٰۃ سے مراد اس کے نفسی، اوصاف ہیں جو صفاتِ خارجیہ مثلاً قیام، رکوع اور سجود وغیرہ پر صادق آتے ہیں۔

اس باب[1] میں نماز کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں کہ اسے کیوں کر ادا کیا جائے اور اس کے ارکان واجزاء کون کونسے ہیں؟

الفصل الاوّل

حدیث ۱: عن ابی ھریرۃ رضؓ ان رجلاً دخل المسجد ورسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم جالس فی ناحیۃ المسجد فصلّٰی ثم جاء فسلم علیہ فقال لہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم وعلیک السلام ارجع فصل فانک لم تصل فرجع فصلی ثم جاء فسلم فقال وعلیک السلام ارجع فصل فانک لم تصل فقال فی الثالثۃِ او فی التی بعدھا علمنی یا رسول اللّٰہ فقال اذا قمت الی الصلوٰۃ فاسبغ الوضوء ثم استقبل القبلۃ فکبر ثم اقرأ بما تیسر معک من القراٰنِ ثم ارکع حتی تطمئن راکعاً ثم ارفع حتی تستوی قائماً ثم اسجد حتی تطمئن ساجداً ثم ارفع حتی تطمئن، جالساً ثم اسجد حتی تطمئنَّ ساجداً ثم ارفع حتی تطمئن جالساً وفی روایۃ ثم ارفع حتی تستوی قائماً ثم افعل ذلک فی صلوٰتک کلھا۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللّٰہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی مسجدِ (نبویؐ) میں داخل ہوا اور رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم مسجد کے ایک کونے میں تشریف

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۲۷۴

فرماتے ۔ سو اس شخص نے نماز پڑھی پھر وہ حضورؐ کی خدمت میں آیا اور سلام کہا،
تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے سلام کا جواب دیا اور فرمایا واپس جاؤ
اور نماز پڑھو کیوں کہ تم نے نماز نہیں پڑھی ۔ پس وہ واپس گیا اور نماز پڑھی
پھر واپس آیا اور حضورؐ کو سلام کہا ۔ آپؐ نے پھر سلام کا جواب دے کر فرمایا،
واپس جاؤ اور نماز پڑھو کیوں کہ تم نے نماز نہیں پڑھی ۔ پس اس شخص نے
تیسری یا چوتھی مرتبہ عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ مجھے (نماز پڑھنا) سکھائیے تو حضورؐ
نے فرمایا جب تو نماز کا ارادہ کرے تو اچھی طرح وضو کر پھر قبلہ کی طرف منہ کر۔
پھر تکبیر کہہ پھر جتنا تو آسانی سے قرآن پڑھ سکے پڑھ پھر رکوع کر حتیٰ کہ رکوع کی
حالت میں اطمینان ہو جائے پھر اپنا سر اوپر اٹھا یہاں تک کہ تو سیدھا کھڑا ہو جائے
پھر سجدہ کر یہاں تک کہ تو سجدے کی حالت میں مطمئن ہو جائے پھر سر
اٹھا حتیٰ کہ تو بیٹھنے کی حالت میں اطمینان کر لے پھر سجدہ کر حتیٰ کہ حالتِ
سجدہ میں اطمینان ہو جائے پھر سر اٹھا یہاں تک کہ بیٹھنے کی حالت میں خوب
مطمئن ہو جائے ۔ اور ایک روایت میں یہ لفظ ہیں کہ پھر سر اٹھا حتیٰ کہ تو قیام
کی حالت میں خوب مطمئن ہو جائے ۔ پھر اپنی ساری نماز میں اسی طرح کر۔ اس
حدیث پر بخاری و مسلم کا اتفاق ہے ۔

شرح : اس[1] حدیث میں صراحۃً مذکور نہیں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس
شخص کو کس چیز کے چھوڑ دینے کی وجہ سے بار بار نماز پڑھوائی تھی ۔ اس لیے علمائے امت
میں اختلاف ہوا ہے ۔ لیکن اتنی بات تو واضح ہے کہ اگر وہ شخص کوئی فرض چھوڑ رہا تھا
تو چونکہ فرض کی ادائیگی کے بغیر نماز سرے سے ہوتی ہی نہیں اس لیے بار بار اعادہ کروانے
کی بجائے پہلی مرتبہ ہی ارشاد فرما دیتے کہ تم نے فلاں چیز ترک کی ہے اس لیے تمہاری
نماز سرے سے نہیں ہوئی ۔ پھر یہ جو بار بار ارشاد کہ "تم نے نماز نہیں پڑھی" اس کا
مطلب یہ تھا کہ کامل نماز نہیں پڑھی یعنی اس کے تمام فرائض و واجبات اور سنن و آداب
جب تک ادا نہ کیے جائیں نماز صحیح اور کامل طور پر ادا نہیں ہوتی ۔ پھر اس بات کی
نشاندہی نہیں کی جا سکتی کہ وہ کونسی چیز تھی جسے وہ شخص بار بار ترک کر جاتا تھا ۔

---

[1] مرقات ج ۲ ص ۲۴۹ تا ۲۵۲ ، مظاہر حق ج ۱ ص ۲۷۵ ۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ حضورؐ نے اس حدیث میں بھی صرف بعض شرائط و ارکان و سنن کا ذکر فرمایا سب کا نہیں۔ کیوں کہ حضورؐ کا ارشاد برمحل اور برموقع ہوتا تھا اس بیان میں جو چیز وہ ترک کر رہا تھا وہ چونکہ آگئی تھی لہٰذا صراحت کی ضرورت نہ سمجھی گئی۔

اس حدیث میں نہ رفع یدین کا ذکر ہے نہ فاتحہ خلف الامام۔ بلکہ قراءت کے لیے ما تیسر من القرآن کا لفظ ارشاد فرمایا ہے جو قرآن پاک کی آیت فاقرؤا ما تیسر من القرآن سے ماخوذ ہے اور اس امر کی واضح دلیل ہے کہ سورۃ فاتحہ کی قرأت رکنِ صلوٰۃ نہیں۔ اسی لیے حنفیہ کہتے ہیں کہ مطلق قرأت فرض ہے اور سورۂ فاتحہ کا تعین دوسری احادیث کی بناء پر واجب ہے۔ اور مقدارِ آیت کم از کم ایک آیت ہے کیوں کہ اس سے کم کسی کے نزدیک بھی قراءت نہیں کہلاتی۔ پس امام ابو حنیفہؒ نے یہیں سے استدلال کیا ہے کہ کم از کم ایک آیت پڑھنا فرض ہے۔

اسی حدیث سے امام شافعیؒ، احمدؒ اور ابو یوسفؒ نے رکوع، سجود اور قومہ و جلسہ میں طمانیت کی فرضیت[1] کی دلیل نکالی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے دراصل اسی شخص کو اسی طمانیت کے نہ ہونے کی وجہ سے ارجع فصل فانک لم تصل فرمایا تھا اور چونکہ طمانیت کے نہ ہونے سے نماز کی نفی فرمائی گئی لہٰذا یہ فرض ہوئی۔ طمانیت سے مراد یہ ہے کہ رکوع، قومہ، سجدہ اور جلسہ میں پورے اطمینان اور تسلی سے ادائیگی ہو اور جسم کا ہر جوڑ اپنی جگہ پہ قرار پکڑے۔ امام ابو حنیفہؒ اور محمدؒ کے نزدیک رکوع و سجود میں طمانیت واجب ہے اور قومہ و جلسہ میں سنت ہے۔ ان کا یہ مسلک دوسری صحیح احادیث کی بناء پر ہے اور وہ اس حدیث کا معنیٰ وہی لیتے ہیں جو پہلے مذکور ہوا کہ حضورؐ نے نفی جو فرمائی تھی تو کمال کی نفی تھی۔ کیونکہ اسی حدیث میں ابوداؤد، ترمذی اور نسائی کی روایت میں آخر میں یہ لفظ بھی آئے ہیں کہ اگر تو نے اس کو تمام کیا تو تیری نماز کامل ہوئی اور جتنا نقص ڈالا اتنی ہی تیری نماز ناقص ہوئی اگر طمانیت فرض ہوتی تو سرے سے نماز کی نفی کی جاتی اور یہ الفاظ وجوب و سنیت کی دلیل ہیں اور بار بار جو اس شخص سے اعادہ کروایا تو اس لیے کہ نماز

---

[1] مرقات ج ۲ ص ۲۵۰ [2] مظاہر حق ج ۲ ص ۲۷۵۔

کامل ہو جائے ورنہ اگر باطل ہوتی تو بار بار اعادہ نہ کرواتے بلکہ اوّل سے ہی اصلاح فرما دیتے اور اسے بار بار بلا فرض نماز نہ پڑھنے دیتے۔ ہاں اس حدیث سے اتنا ضرور پتہ چل گیا کہ جو شخص کامل طور پہ نماز نہ پڑھے اس کی نماز صحیح نہیں، گویا کہ اس نے پڑھی ہی نہیں۔

اس حدیث میں تعلیم و تلقین کے آداب بھی موجود ہیں کہ نہ جاننے والوں سے نہایت نرمی سے پیش آنا چاہیے۔ پھر اس میں بار بار سلام کہنے کا استحباب بھی ثابت ہوتا ہے کہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد وہ شخص آپؐ کو سلام کہتا تھا اور آپؐ نے اسے اس سے منع نہیں فرمایا، پس یہی سنت ہے۔ اس حدیث کی پہلی روایت میں جلسۂ استراحت کا بھی ذکر ہے یعنی پہلی اور دوسری رکعت سے اٹھتے وقت پہلے اطمینان سے بیٹھ جائیں اور پھر اٹھیں۔ لیکن دوسری روایت میں جلسۂ استراحت کا ذکر نہیں سیدھا کھڑا ہو جانے کا حکم آیا ہے۔ پہلی روایت سے امام شافعیؒ نے استدلال کیا اور دوسری سے امام ابو حنیفہؒ نے۔ اس کا مفصل بیان آگے آئے گا۔

[1] نسائی کی روایت میں فَصَلّٰی رَکعَتَینِ کا لفظ آیا ہے اور ظاہر یہی ہے کہ یہ نماز تحیۃ المسجد تھی۔ اور ایک اور حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے مسجد میں آتے ہی حضورؐ کو سلام کہا تو آپؐ نے فرمایا کہ جاؤ پہلے نماز پڑھو پھر آکر مجھے سلام کہو — علامہ علی القاریؒ فرماتے ہیں کہ حضورؐ کی زیارت کا یہی ادب ہے اور اللہ کا حق آپؐ کے حق پر مقدم ہے۔ ابن الملک فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے پہلی مرتبہ ہی اسے تعلیم و تلقین نہیں فرمائی بلکہ تیسری یا چوتھی مرتبہ اس شخص کے التماس پہ تعلیم فرمائی اس کی وجہ یہ ہے کہ اس شخص نے پہلے پوچھا ہی نہیں لہٰذا حضورؐ تعلیم سے خاموش رہے (خیال تھا کہ شاید اسے خود تنبّہ ہو جائے)، اور جب اس نے خود دریافت کیا تو حضورؐ نے اسے بتا دیا۔

اسباغ الوضوء[2] سے مراد اُسے اچھی طرح بکمال و تمام فرائض و سنن سمیت کرنا ہے اور پہلی تکبیر (تحریمہ) حنفیہ کے نزدیک و ذکر اسم ربہ فصلی۔ الآیہ کی وجہ سے شرط ہے اور امام شافعیؒ کے نزدیک رکن ہے۔ اور نیت کا ذکر یہاں نہیں آیا کیوں کہ وہ بالکل واضح ہے۔ فکَبِّرْ کے لفظ سے قرآن کی آیت وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ

۱۔ مرقات، ج ۲ ص ۲۴۹۔ ۲۔ ایضاً۔

کی طرف اشارہ ہے اور تکبیر کا معنی تعظیم ہے۔ پس ہر وہ لفظ جو اس پر دلالت کرے اس سے مقصود حاصل ہو جائے گا۔ ایک حدیث میں ہے تحریمھا التکبیر اور حضورؐ نے اللہ اکبر کا لفظ جو ہمیشہ استعمال فرمایا تو اس لفظ کا خاص کرنا حنفیہ کے ہاں واجب ہے لیکن امام شافعیؒ اس لفظ کا بولنا رکنِ صلوٰۃ قرار دیتے ہیں۔

اس[1] حدیث میں کپڑوں اور نماز کی جگہ کی طہارت کا ذکر بھی نہیں آیا اور نہ ستر عورت کا ذکر آیا ہے کیوں کہ یہ چیزیں بہت مشہور ہیں۔ حافظ توریشتیؒ حنفی فرماتے ہیں کہ جو لوگ طمانیت کو نماز میں فرض قرار دیتے ہیں انہوں نے اس حدیث کے ظاہر سے استدلال کیا اور جو لوگ اسے واجب و سنت کہتے ہیں انہوں نے نفیٔ کمال مراد لی ہے۔

امام بخاریؒ نے اس حدیث پر باب باندھا ہے باب امر النبی صلی اللہ علیہ وسلم الذی لا یتم رکوعہ بالاعادۃ۔ حافظ[2] ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ غالباً بخاریؒ کا اشارہ رفاعہؓ بن رافع کی روایت کی طرف ہے جس میں اس شخص کے متعلق جو مسجد میں داخل ہوا تھا کہ لم یتم رکوعھا و سجودھا (مصنف ابن ابی شیبہ)۔

حضرت[3] علامہ سید انور شاہؒ الکشمیری فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے الفاظ ثم افعل ذلک فی صلاتک کلھا سے امام ابن الہمامؒ حنفی نے تیسری اور چوتھی رکعت میں بھی وجوبِ فاتحہ کا استدلال کیا ہے اور علامہ عینیؒ نے بھی اسے اختیار کیا ہے۔ لیکن مشہور یہی ہے کہ وہ مستحب ہے اور اس کے دلائل حنفیہ کے پاس موجود ہیں۔ حضرت علیؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ سے ثابت ہے کہ وہ آخری دو رکعتوں میں صرف تسبیح پڑھتے تھے۔ اور ابن الہمامؒ کے استدلال کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ یہ ارشاد ثم افعل ذلک قرأت کے بارے میں نہیں ہے بلکہ اس سے یہ بتانا مدنظر ہے کہ تمہاری تقصیر جو تم نماز میں کر رہے تھے اس کی اصلاح کر دی گئی ہے اب ساری نماز اسی طرح تعدیل و اطمینان سے پڑھا کرو۔ اور امر میرے نزدیک مطلق وجوب کے لیے نہیں ہوا

---

[1] مرقات ج ۲ ص ۲۵۱ [2] فتح الباری ج ۳ ص ۲۲۲۔

[3] فیض الباری ج ۲ ص ۳۰۰۔

کرتا بلکہ کبھی وجوب کے لیے اور کبھی استحباب کے لیے آتا ہے، بلکہ ایک ہی وقت میں دونوں معنوں کے لیے بھی آتا ہے۔ پس ارشاد کا مطلب یہ ہوا کہ تمام نماز میں، قرآن پڑھا کرو جہاں واجب ہے وہاں وجوباً جہاں مستحب ہے وہاں استحباباً اور حضورؐ کی اس حدیث میں تعدیلِ ارکان کی فرضیت کی کوئی دلیل نہیں کیونکہ اس شخص کو اعادے کا جو حکم دیا گیا تھا وہ فرضیت پر نہیں بلکہ تعزیر پر دلالت کرتا ہے جیسے ایک دفعہ غلط کام کرنے والے کو دوبارہ بطور سزا وہی کام کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔[1]

حدیث ۲ : وعن عائشة قالت كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يستفتح الصلوٰة بالتكبير والقراءة بالحمد لله رب العٰلمين وكان اذا ركع لم يشخص رأسه ولم يصوبه ولكن بين ذٰلك وكان اذا رفع رأسه من الركوع لم يسجد حتى يستوي قائمًا وكان اذا رفع رأسه من السجدة لم يسجد حتى يستوي جالسًا وكان يقول في ركعتين التحية وكان يفرش رجله اليسرىٰ وينصب رجله اليمنى وكان ينهىٰ عن عقبة الشيطان وينهى ان يفترش الرجل ذراعيه افتراش السبع وكان يختم الصلوٰة بالتسليم۔ رواه مسلم۔

ترجمہ : حضرت عائشہ صدیقہ سلام اللہ علیہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کو تکبیر سے شروع فرماتے تھے اور قرأت کو الحمد للہ رب العلمین سے اور جب رکوع کرتے تو نہ تو اپنا سر بلند کرتے نہ پست کرتے بلکہ ان دونوں حالتوں کے درمیان رکھتے۔ اور جب رکوع سے اپنا سر اٹھاتے تھے تو جب تک اچھی طرح کھڑے نہ ہو جاتے سجدہ نہ کرتے تھے اور جب سجدے سے اپنا سر اٹھاتے تھے تو جب تک سیدھے ہو کر بیٹھ نہ جاتے دوسرا سجدہ نہ کرتے تھے۔ اور فرمایا کرتے تھے کہ ہر دو رکعتوں پر التحیات ہے اور بیٹھنے کی حالت میں اپنا بایاں پاؤں بچھا دیتے اور دایاں پاؤں کھڑا کر لیتے تھے اور عقبۃ الشیطان سے منع فرمایا کرتے تھے اور اس سے بھی روکتے تھے کہ آدمی اپنے بازو درندے

---

[1] فیض الباری ج ۲ ص ۲۹۹۔

کی مانند بچھالے۔ اور حضورؐ اپنی نماز سلام کے ساتھ ختم کرتے تھے۔ اسے مسلم نے روایت کیا۔

شرح : اس[1] حدیث میں قرأت کو الحمد للہ رب العلمین سے شروع کرنا ثابت ہوا۔ پس بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو چپکے سے پڑھنا مسنون ہوا، یہی حنفیہ کا مسلک ہے اور ہر دو رکعتوں پر التحیات ہو اتو وتر کی تینوں رکعات ایک ہی تشہد سے پڑھنا مسنون نہ ہوا۔ اور یہ جو فرمایا ہے کہ دایاں پاؤں کھڑا رکھتے اور بایاں بچھاتے، اسی پر حنفیہ کا عمل ہے۔ عقبۃ الشیطان سے مراد کتے کی مانند بیٹھنا ہے کہ دو کولے زمین پر رکھے پنڈلیاں کھڑی کرے اور دونوں ہاتھ زمین پر رکھ دے۔ اس طرح بیٹھنا (نماز میں)، باتفاق علماء مکروہ ہے اور طیبیؒ نے اس حدیث کی تفسیر یہ بیان کی ہے کہ دونوں کولے ایڑیوں پر رکھ لے۔ اور بعض احادیث میں جو تشہد میں یا دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھنے کا طریقہ اس کے خلاف آیا ہے وہ حالتِ عذر مثلاً بیماری یا بڑھاپا وغیرہ پر محمول ہے۔ درندے کی طرح بازو بچھانے کا مطلب یہ ہے کہ سجدے میں بازو زمین اور جسم سے الگ رکھنے چاہئیں۔ اور الرجل کے لفظ سے معلوم ہوا کہ عورتوں کے لیے یہ حکم نہیں ہے بلکہ انہیں زیادہ سے زیادہ جسم کو سمیٹنا اور پردے کی رعایت رکھنا ضروری ہے۔ نماز کو لفظِ سلام سے ختم کرنا اس حدیث کی بنا پر امام شافعیؒ کے نزدیک فرض ہے اور حنفیہ اسے واجب کہتے ہیں ان کے نزدیک خروج من الصلوٰۃ بصنع المصلی فرض ہے اور لفظِ سلام سے نماز ختم کرنا واجب ہے۔ دلائل صحیح احادیث میں موجود ہیں۔ ایک حدیث میں ہے اذا قلت ھذا او فعلت ھذا فقد تمت صلٰوتک اوکما قال۔ اَوْ کے لفظ نے لفظِ تسلیم کی فرضیت کو ساقط کر دیا ہاں بحیثیت مجموعی حدیث کا مفاد یہ رہا کہ اپنے فعل سے نماز سے نکلے، پس یہ فرض ہوا۔

علامہ[2] علی القاریؒ فرماتے ہیں کہ تشہد ہمارے نزدیک دونوں قعدوں میں واجب ہے اور ایک روایت کے مطابق پہلے قعدے میں سنت ہے اور قعدۂ اولیٰ واجب ہے لیکن قعدۂ اخیرہ فرض ہے۔ اور ان کے دلائل اس حدیث کی شرح

---

[1] مظاہر حق ج ۲ ص ۲۷۶، مرقات ج ۲ ص ۲۵۲، ۲۵۳۔ [2] ایضاً۔

سے تعلق نہیں رکھتے۔

حدیث ۳ : وعن ابی حمیدؓ الساعدی قال فی نفر من اصحاب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم انا احفظکم لصلوٰۃ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم رائیتہ اذا کبر جعل یدیہ حذاء منکبیہ واذا رکع امکن یدیہ من رکبتیہ ثم ھصر ظھرہ فاذا رفع راسہ استوی حتی یعود کل فقار مکانہ فاذا سجد وضع یدیہ غیر مفترش ولا قابضھما واستقبل باطراف رجلیہ القبلۃ فاذا جلس فی الرکعۃ الآخرۃ قدم رجلہ الیسریٰ ونصب الاخریٰ وقعد علی مقعدتہ ۔ رواہ البخاری۔

ترجمہ : حضرت ابوحمید الساعدی رضی اللّٰہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کی ایک جماعت میں فرمایا : میں حضور صلی اللّٰہ علیہ وسلم کی نماز کو تم سب سے زیادہ یاد رکھنے والا ہوں۔ میں نے آپؐ کو دیکھا کہ جب تکبیر کہتے تو دونوں ہاتھوں کو کندھوں کے مقابل لے جاتے اور جب رکوع کرتے تو دونوں ہاتھوں کو گھٹنوں پر اچھی طرح جما دیتے پھر اپنی پیٹھ کو جھکاتے۔ پھر اپنا سر اٹھاتے تو سیدھے ہو جاتے یہاں تک کہ سب پٹھے اپنی جگہ واپس آجاتے۔ پھر جب سجدہ کرتے تو اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیتے لیکن انہیں زمین پر نہ بچھاتے (یعنی بازوؤں کو کھڑا اور علیحدہ رکھتے) اور نہ ان کی انگلیوں کو بند کرتے (یا انہیں پہلوؤں سے نہ ملاتے) اور اپنے پاؤں کی انگلیاں سیدھی قبلہ رخ کرتے۔ پھر جب دو رکعتوں پر بیٹھتے تو بائیں پاؤں پر بیٹھتے اور دایاں کھڑا کر لیتے۔ پھر جب آخری رکعت میں بیٹھتے تو بایاں پاؤں دائیں طرف نکال لیتے اور دوسرا کھڑا کرتے اور اپنے کولہوں پر بیٹھ جاتے اسے بخاری نے روایت کیا۔

شرح: اس[1] حدیث میں تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھوں کو کندھوں کے برابر لے جانے کا ذکر ہے۔ اور آگے ایک متفق علیہ حدیث آرہی ہے جس میں یحاذی بہما اذنیہ کا لفظ آیا ہے۔ ان دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ جب کانوں تک ہاتھ لے جائے جائیں تو ان کا نچلا حصہ کندھوں سے کچھ ہی اونچا ہوتا ہے گویا کندھوں کے متوازی ہی ہوتا ہے۔ اور امام[2] شافعیؒ سے بھی روایت ہے کہ انہوں نے تمام حدیثوں پر عمل کرنے کے لیے وہی طریقہ اختیار کیا جو حنفیہ کا معمول ہے۔ اور احادیث کا اِس باب میں اختلاف بتاتا ہے کہ حضورؐ کبھی کسی طرح کبھی کسی طرح عمل فرمالیتے تھے اور رکوع کی حالت میں گھٹنے کو اچھی طرح پکڑے لیکن کشادہ رکھے مگر حالتِ سجدہ میں انگلیاں ملا کر قبلہ رُخ رکھے۔ اور اس حدیث میں یہ نہیں بتایا گیا کہ سجدہ میں جاتے وقت پہلے ہاتھ زمین پر رکھے جائیں یا زانو۔ علماء نے کہا ہے کہ زانو رکھنے چاہییں اور تکبیر تحریمہ کے وقت اور تشہد کی حالت میں ہاتھوں کی انگلیوں کو ان کی قدرتی حالت پر رکھ کر دینا ہی مسنون ہے۔

تکبیر تحریمہ[3] کے وقت ہاتھ اٹھانے پر اجماع ہو چکا ہے صرف بعض روایات میں حضرت ابن سیرینؒ اور امام اوزاعیؒ سے اس کے خلاف بھی آیا ہے۔ ہاتھ اٹھانا توحید کی طرف اشارہ ہے اور دنیوی امور سے قطع تعلق کر کے عبادتِ الٰہی میں محو ہو جانے کی علامت بھی ہے۔ اور انہیں تکبیر سے پہلے یا اس کے ساتھ یا اس کے بعد اٹھائے؟ سو روایات میں ہر طرح آتا ہے اختلاف فقط اکمل و مستحب میں ہے ورنہ سنت ہر طرح ہے اور حتی الامکان جہاں احادیث کو جمع کرنا ممکن ہو وہاں جمع کر لینا ہی بہتر ہے۔

اس حدیث کے آخر میں حضورؐ کا قعدۂ اخیرہ میں بیٹھنا پہلی سے ذرا مختلف آیا ہے۔ حنفیہ اسے عذر مثلاً بڑھاپا یا بیماری وغیرہ پر محمول کرتے ہیں۔ حضرت سید انور شاہ[4] کاشمیریؒ فرماتے ہیں کہ حنفیہ کے نزدیک دونوں قعدوں میں بائیں پاؤں کو بچھا کر اور دائیں کو کھڑا کر کے بیٹھنا مسنون ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک دونوں

---

[1] مرقات ج ۲ ص ۲۵۴، مظاہر حق ج ا ص ۲۷۶ [2] قسطلانی ج ۲ ص ۸۲ بحوالہ امام نوویؒ

[3] مرقات ج ۲ ص ۲۵۴ [4] فیض الباری ج ۲ ص ۳۱۰۔

میں تورک (دونوں پاؤں کو دائیں طرف نکال کر کولہے زمین پہ ٹکا دینا) ہے شافعیہ کے نزدیک پہلے قعدے میں افتراش (بائیں پاؤں کو بچھا کر اس پہ بیٹھنا) اور دوسرے میں تورک ہے۔ اور اگر نماز دو رکعت والی ہو تو بھی ان کے ہاں تورک مسنون ہے۔ امام احمدؒ کے نزدیک ہر وہ تشہد جس کے بعد سلام ہو اس میں تورک ورنہ افتراش مسنون ہے۔ اور صحیح بات تو یہ ہے کہ سب صورتیں سنت سے ثابت ہیں۔ ترجیح صرف اختیار کرنے میں ہے حنفیہ کے دلائل تفصیل سے طحاوی اور الجوہر النقی میں مذکور ہیں اور حنفیہ کے نزدیک عورت کے لیے ہر صورت میں تورک مستحب ہے۔ کیوں کہ اس کے بیٹھنے میں مرد کی نسبت خود حدیث میں فرق کیا گیا ہے واللہ اعلم بالصواب۔ اور یہ جو حنفیہ نے کہا ہے کہ دائیں پاؤں کو کھڑا کرنا اور بائیں پاؤں کو بچھانا ہی ہر حالت میں بہتر ہے اور اس کے خلاف عذر پہ محمول ہے اس کی دلیل بخاری کے باب سنۃ الجلوس میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث بھی ہے انہوں نے فرمایا انما سنۃ الصلوٰۃ ان تنصب رجلک الیمنیٰ و تثنی الیسریٰ فقلت انک تفعل ذٰلک فقال ان رجلی لا تحملانی۔

حدیث ۳ : وعن ابن عمرؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یرفع یدیہ حذو منکبیہ اذا افتتح الصلوٰۃ واذا کبر للرکوع واذا رفع راسہ من الرکوع رفعھما کذٰلک و قال سمع اللہ لمن حمدہ ربنا لک الحمد وکان لا یفعل ذلک فی السجود۔ متفق علیہ۔

ترجمہ : حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دونوں ہاتھ کندھوں تک اٹھاتے تھے جب نماز شروع کرتے اور جب رکوع کے لیے تکبیر کہتے اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تو بھی اسی طرح ہاتھ اٹھاتے اور یوں کہتے سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ اور سجدے میں یہ نہیں کیا کرتے تھے۔ اس حدیث پہ بخاری ومسلم کا اتفاق ہے۔

شرح : اس حدیث میں تکبیر افتتاح (تحریمہ) کے علاوہ دو اور مواقع پہ رفع یدین

کا ذکر ہے۔ شافعیہ کے نزدیک انہی تین جگہوں میں بشمول پہلی تکبیر کے رفع یدین صحت کو پہنچتا ہے۔ مولانا قطب[1] الدینؒ نے سفر السعادت کے حوالے سے شافعیہ کا یہی مسلک بیان کیا ہے۔ اس مسئلہ پر گفتگو عنقریب مالکؓ بن الحویرث کی حدیث کے بعد آ رہی ہے۔

سمع[2] اللہ لمن حمدہ الخ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک یہ تنہا پڑھنے والے کے لیے ہے کہ دونوں کو جمع کر لے اور جماعت کی نماز میں امام سمع اللہ الخ کہے اور مقتدی صرف ربنا لک الحمد کہیں۔ صاحبین (ابو یوسفؒ و محمدؒ) کے نزدیک امام دونوں کہے اور مقتدی صرف ربنا الخ کہیں۔ امام طحاویؒ نے اسی کو اختیار کیا ہے اور ایک روایت امام ابو حنیفہؒ سے بھی یہی ہے۔ امام صاحب کے مسلک کی دلیل وہ حدیث صحیح ہے جسے ابن ماجہ کے علاوہ تمام اربابِ صحاح نے روایت کیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا اذا قال الامام سمع اللہ لمن حمدہ فقولوا ربنا لک الحمد اس حدیث میں امام کا وظیفہ سمع اللّٰہ اور مقتدی کا ربنا لک الحمد قرار دیا گیا ہے۔ پس جماعت میں تو امام اور مقتدی کا الگ الگ وظیفہ ہوگا لیکن انفرادی حالت میں اسے جمع کر لیا جائے گا تاکہ سب حدیثوں پر عمل ہو جائے۔

پھر بعد کی حدیثوں میں ربنا و لک الحمد اور اللّٰھم ربنا و لک الحمد بھی آیا ہے۔ یہ سب احادیث صحیح ہیں لیکن علامہ[3] ابن حجرؒ ربنا و لک الحمد کو اور اللھم ربنا و لک الحمد کو زیادہ صحیح قرار دیتے ہیں۔ امام بخاریؒ کی رائے بھی یہی معلوم ہوتی ہے کہ وہ اللھم ربنا کی افضلیت کے قائل ہیں کیوں کہ انہوں نے باب باندھا ہے باب فضل اللھم ربنا و لک الحمد اور اس میں وہ ابو ہریرہؓ کی حدیث لائے ہیں کہ اذا قال الامام سمع اللہ لمن حمدہ فقولوا ربنا و لک الحمد۔ اوپر گزر چکا ہے کہ یہ حدیث امام ابو حنیفہؒ کی تائید میں ہے۔ اور حافظ ابن حجرؒ نے بعینہ یہی امام مالکؒ کا مسلک بھی بیان فرمایا ہے۔ اور امام شافعیؒ اور احمدؒ کا مسلک بعینہ وہ ہے جو اوپر صاحبینؒ کا مسلک بیان کیا گیا ہے۔ منفرد کے متعلق علامہ ابن حجرؒ نے امام طحاویؒ[4] سے اجماع نقل کیا ہے کہ وہ دونوں کو جمع کرے۔ حافظ ابن حجرؒ نے امام مالکؒ کا مسلک جو بیان فرمایا وہ اوپر گزرا لیکن خود[5] امام مالکؒ مؤطا میں باب باندھتے ہیں باب[6]

---

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۲۷۷۔ [2] ایضاً مرقات ج ۲ ص ۲۵۶۔ [3] امام مالکؒ کا مختار بھی یہی ہے مؤطا مع شرح ج ۱ ص ۱۱۱۔ [4] مرقات ج ۲ ص ۲۵۶۔ [5] فتح الباری ج ۲ ص ۲۳۵۔
[6] مؤطا امام مالک مع مصفّٰی و مسوّٰی ج ۱ ص ۱۱۱

یستحب للامام ان یقول اذا رفع رأسه من الرکوع سمع اللہ لمن حمدہ والماموم ربنا لک الحمد۔ اور اس میں حضرت ابوہریرہؓ کی مشہور حدیث لائے ہیں۔ اس سے ان کا مسلک امام کے لیے صرف سمع اللہ الخ معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۵ : وعن نافع ان ابن عمرؓ کان اذا دخل فی الصلوٰۃ کبر ورفع یدیہ واذا رکع رفع یدیہ واذا قال سمع اللہ لمن حمدہ رفع یدیہ واذا قام من الرکعتین رفع یدیہ ورفع ذلک ابن عمر الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ رواہ البخاری۔

ترجمہ : حضرت نافعؒ (شاگرد ابن عمرؓ) فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب نماز میں داخل ہوتے تھے تو تکبیر کہتے اور دونوں ہاتھ اٹھاتے اور جب رکوع کرتے تو اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتے تھے اور جب سمع اللہ لمن حمدہ کہتے تو بھی دونوں ہاتھ اٹھاتے تھے اور جب دو رکعتوں کو ختم کر کے تیسری کی طرف اٹھتے تو پھر بھی دونوں ہاتھ اٹھاتے تھے اور عبداللہ بن عمرؓ نے اس حدیث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع کیا۔ اسے بخاری نے روایت کیا۔

شرح : مسئلہ رفع یدین پر گفتگو آئندہ حدیث کے ضمن میں آئے گی۔ اس حدیث میں صرف سمع اللہ لمن حمدہ پر اکتفاء کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ربنا لک الحمد کا ذکر نہیں ہے۔ ائمہ مجتہدین میں مختلف احادیث کی بناء پر بھی مسائل اجتہادیہ میں اختلاف ہوا ہے۔ یہ اس کی ایک مثال ہے۔ لیکن یہ اختلاف صرف افضلیت کا ہے جواز و عدم جواز کا ہرگز نہیں۔ ہر طرف دلائل موجود ہیں۔ ورفع ذلک ابن عمرؓ الخ یا تو نافع کا قول ہے یا کسی اور راوی کا یا امام بخاریؒ کا قول ہے کہ اس حدیث میں تو نافع نے عبداللہ بن عمرؓ کا عمل بیان کیا ہے۔ لیکن بعینہٖ یہی مضمون ابن عمرؓ نے خود حضورؐ کے متعلق بھی بیان کیا ہے، جیساکہ گزشتہ حدیث میں حافظ ابن حجرؒ[1] نے بیان کیا ہے کہ اس حدیث کے بعض طرق میں روایت چونکہ ابن عمرؓ پر موقوف ہے لہٰذا بخاریؒ نے تنبیہ کی ہے کہ دوسرے طرق میں موصول بھی ہے۔ تاکہ اس روایت کو موقوف نہ کہہ دیا جائے۔

علامہ قسطلانیؒ[2] نے بخاریؒ کے جزء رفع الیدین کے حوالہ سے اس حدیث کا موصول ہونا بیان کیا ہے اور اس کے توابع و شواہد بھی بیان فرمائے ہیں۔ پس یہ رفع ذلک الخ

---

[1] فتح الباری ج ۲ ص ۵-۴ ۔ [2] قسطلانی ج ۲ ص ۸۴ ۔

بخاریؒ کا قول ٹھیرا۔

حدیث ۶ : وعن مالکؓ بن الحویرث قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا کبر رفع یدیہ حتی یحاذی بہما اذنیہ واذا رفع رأسہ من الرکوع قال سمع اللہ لمن حمدہ فعل مثل ذلک وفی روایۃ حتی یحاذی بہما فروع اذنیہ

متفق علیہ۔

ترجمہ : حضرت مالکؓ بن الحویرث سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تکبیر تحریمہ کہتے تو اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتے یہاں تک کہ کانوں کی سیدھ میں لے جاتے اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تو کہتے سمع اللہ لمن حمدہ اور اسی طرح کرتے۔ اور ایک روایت میں یہ لفظ ہیں کہ ہاتھوں کو کانوں کی فروع (چوٹیوں) کے مقابل تک لے جاتے۔ متفق علیہ۔

شرح : اوپر کی تین حدیثوں میں رفع یدین کا ذکر آیا ہے یہ فعلی حدیثیں ہیں یعنی ان میں حضورؐ کا فعل نقل کیا گیا ہے۔ ان تین کے علاوہ اور بہت سی فعلی حدیثوں میں رفع الیدین کا ذکر موجود ہے لیکن حضورؐ کی کسی قولی حدیث میں اس کا ذکر نہیں آیا (یعنی حضورؐ سے ایسا کرنے کا حکم منقول نہیں ہے) ہاں تکبیر تحریمہ میں رفع الیدین کا حکم قولی احادیث میں بھی موجود ہے اور فعلی میں بھی۔ اور بہت سے صحابہؓ جنہوں نے حضورؐ کی نماز کی صفت بیان فرمائی ہے ان کی روایات بھی اس کے ذکر سے خالی ہیں۔ مثلاً اوپر ابو حمیدؓ الساعدی کی حدیث گزری ہے۔ اور اس باب کی پہلی حدیث جسے ابوہریرہؓ نے روایت کیا ہے اس میں بھی حضورؐ نے نماز میں خرابی کرنے والوں کو جو طریقہ بتایا تو اس میں رفع الیدین کا ذکر تک نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ رفع یدین کے ثابت کرنے والوں اور نفی کرنے والوں دونوں نے افراط و تفریط سے کام لیا ہے۔ دلائل دونوں طرف موجود ہیں اور کوئی اہل علم یا منصف مزاج شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ امامؒ ابوبکرؒ الجصاص حنفی نے احکام القرآن میں تصریح کی ہے کہ کلام صرف افضلیت میں ہے ورنہ رفع یدین عمل اور سند کے لحاظ سے متواتر ہے اور منسوخ نہیں ہوا۔ حافظ ابن تیمیہؒ نے فتاوی اور منہاج السنہ میں ابن القیمؒ نے الہدیٰ میں اور مبانی الاخبار کے بیان کے مطابق ابو عمرؒ نے تمہید میں اسی قسم

ؔ فیض الباری ج ۲ ص ۲۵۵ (حاشیہ)

کا کلام تحریر کیا ہے۔

حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں تقریباً پچاس صحابہؓ شمار کیے ہیں جو رفع یدین کرتے تھے لیکن حضرت سید انور شاہؒ فرماتے ہیں کہ ان میں سے بعض صرف تکبیر تحریمہ کے وقت ہی ہاتھ اٹھاتے تھے۔ اسناد کا ریں اور علامہ شوکانیؒ نے تیئس کا عدد لکھا ہے اور تخریج میں امام بیہقیؒ کا کلام نقل کیا گیا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ لائقِ حُجت، سندوں سے صرف پندرہ صحابہؓ سے رفع یدین ثابت ہے۔ اور ان میں سے بھی بعض میں کلام ہے۔ سو تقریباً بارہ کے قریب کا عدد باقی رہ گیا۔ اور احادیث کا اگر خلاصہ نکالا جائے تو صرف پانچ یا چھ باقی رہ جاتی ہیں۔ حضرت[1] علیؓ کی حدیث جس کی مختلف روایات میں رفع کے ذکر اور عدمِ ذکر میں اختلاف ہے اور ذکر نہ کرنے والے زیادہ قابل اعتبار ہیں۔ عبد اللہ[2] بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث جو کئی طرح منقول ہے۔ مالکؓ بن الحویرث[3] کی حدیث کا بھی یہی حال ہے۔ حضرت[4] وائل بن حجرؓ کی حدیث جس کے الفاظ میں اختلاف موجود ہے اور ابو حمیدؓ الساعدی[5] کی حدیث جس کی بعض روایات میں رفع کا ذکر ہے بعض میں نہیں اور حضرت[6] جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث اور دوسری طرف ترکِ رفع میں بھی اسی قدر احادیث موجود ہیں چاہے ان میں سے بعض کو مجروح کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور ہی کیوں نہ لگایا جائے۔

اور[1] ہمارے نزدیک حضرت عمرؓ، علیؓ، ابن مسعودؓ، ابو ہریرہؓ، ابنِ عمرؓ، البراءؓ بن عازب اور کعب بن عجرہؓ سے عملاً یا تصدیقاً ترکِ رفع پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے اور تابعین میں سے حضرت علیؓ اور عبد اللہ بن مسعودؓ کے اصحاب کی اکثر تعداد، سارے اہل کوفہ اور امام مالکؒ کے عہد میں بہت سے اہل مدینہ۔ جس کا اعتراف حافظ ابن القیمؒ نے اعلام الموافقین میں کیا ہے۔ اور امام مالکؒ نے تو اپنے مسلک و مختار کی بنیاد ہی اہلِ مدینہ کے عمل پر رکھی ہے[2]۔

[3] حنفیہ اور شافعیہ میں اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ نماز میں رفع اور عدم رفع دونوں طرح جائز ہے۔ اگر کوئی شخص سوائے تکبیر تحریمہ کے بالکل ہاتھ نہ اٹھائے تو امام شافعیؒ اس کی نماز کے فساد کا حکم نہیں لگاتے اور اسی طرح حنفیہ رکوع میں جاتے اٹھتے بلکہ سجدہ میں بھی اگر کوئی ہاتھ اٹھائے تو اس کی نماز کے فساد کے قائل نہیں ہیں۔

۱؎ فیض الباری ج ۲ ص ۲۵۹ (حاشیہ) ۲؎ گو موطا میں رفع یدین کی روایتیں موجود ہیں ص ۱۰۲ ۳؎ الکوکب الدری شرح ترمذی ج ۱ ص ۱۲۹۔

اور حنفی[1] اور شافعی دونوں سجدتین کے درمیان رفع یدین کے نسخ کو مانتے ہیں اور جن لوگوں نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے وہ غلط کہتے ہیں۔ بعض اکابر، مثلاً حضرت طاؤسؒ اور ان کے بیٹے، امام حسن بصریؒ، حضرت ابنِ سیرینؒ، نافعؒ، مجاہدؒ، عطاءؒ، قیسؒ بن سعد، حسنؒ بن مسلم سجدوں میں رفع یدین کرتے تھے اور عبدالرحمنؒ بن مہدی نے کہا ہے کہ یہ سنت ہے۔

حنفیہ[2] کا استدلال جابرؓ بن سمرہ کی حدیث سے ہے جسے مسلمؒ نے روایت کیا ہے، قال خرج علینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال مالی اراکم رافعی ایدیکم کانھا اذناب خیل شمس، اسکنوا فی الصلوٰۃ۔ امام بخاریؒ نے اس پر اعتراض کر کے اسے رفع یدین بوقت تسلیم پر محمول کیا ہے۔ لیکن دراصل یہ دو حدیثیں ہیں، پہلی میں اسکنوا فی الصلوۃ کا لفظ ہے اور دوسری میں نہیں ہے۔ علامہ[3] علی القاریؒ، فرماتے ہیں کہ جو شخص سلام کے وقت ہاتھ اٹھائے اسے یہ نہیں کہہ سکتے اسکنوا فی الصّلوٰۃ پس یہ دو حدیثیں ہیں اور ہمارا استدلال صرف حدیث کے پہلے جملے سے ہی نہیں بلکہ دوسرے سے بھی ہے یعنی اسکنوا فی الصّلوٰۃِ سے۔

ترک[4] رفع کی حدیث عبداللہؓ بن مسعود سے بھی آئی ہے جسے ابوداؤد، ترمذی اور نسائی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اس کی تحسین کی ہے اور اس کے راوی عاصم بن کلیب کو نسائی اور ابنِ معین نے ثقہ کہا ہے اور مسلم اور بخاری[5] نے اس سے روایت کی ہے اور عبداللہ[6] بن مسعود سے دیگر طرق سے دارقطنی، بیہقی، طحاوی اور کامل ابن عدی میں بھی روایت کیا گیا ہے۔ ترمذی کی روایت کے الفاظ ہیں: الا اصلی بکم صلوٰۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فصلی فلم یرفع یدیہ الا فی اولِ مرۃٍ۔ قال الترمذی حدیث حسن وبہ یقول غیر واحد من اھل العلم من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والتابعین وھو قول سفیانؒ واھل الکوفۃِ۔ اور[7] نسائی کی روایت کی اسناد علی شرط الشیخین ہے۔

---

1. الکوکب الدری شرح ترمذی ج ۱ ص ۱۳۱۔ 2. نصب الرایہ ج ۱ ص ۳۹۳۔
3. مرقات ج ۲ ص ۲۵۵۔ 4. نصب الرایہ ج ۱ ص ۳۹۴۔ 5. جزء القراۃ میں اور صحیح میں بھی تعلیقاً حاشیہ کوکب دری ج ۱ ص ۱۳۱۔
6. نصب الرایہ ج ۱ ص ۳۹۴۔ 7. زجاجۃ المصابیح ج ۱ ص ۲۲۸۔

ترک رفع[1] کی روایت حضرت براء بن عازبؓ سے بھی آئی ہے جسے ابوداؤد نے دو طریقوں سے بیان کیا ہے: كان النبي صلى الله عليه وسلم اذا افتتح الصلوٰة رفع يديه الى قريب اذنيه ثم لا يعود اور دوسری کے الفاظ ہیں: رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم رفع يديه حين افتتح الصلوٰة ثم لم يرفعهما حتى انصرف۔

اسی[2] طرح عبداللہ بن عمرؓ اور عبادؓ بن الزبیر کی روایات بھی بیہقی کی "خلافیات" میں موجود ہیں۔

اور ترک[3] رفع کے آثار حضرت عمرؓ، ابراہیم نخعیؒ، امام شعبیؒ، جناب علیؓ، ابو سعید الخدریؓ، عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن مسعود سے ثابت ہیں۔ گو بعض پر کلام بھی کیا گیا ہے۔

عبداللہ[4] بن عمر رضی اللہ عنہما سے ترکِ رفع کا اثر مؤطا امام محمدؒ میں بھی موجود ہے۔
عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت مسندِ امامِ اعظم میں صحیح سند سے یوں موجود ہے: ابوحنيفه قال حدثنا حماد عن ابراهيم عن علقمة والاسود عن ابن مسعودؓ ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان لا يرفع يديه الا عند افتتاح الصلوٰة ولا يعود في شيئ من ذلك۔

مولانا[5] قطب الدین نے فرمایا ہے کہ رفع اور ترک رفع کی مختلف روایات کو یا تو مختلف احوال و اوقات پر محمول کیا جائے گا کہ کبھی حضورؐ نے یوں کیا اور کبھی یوں کیا۔ اور فقہ حنفی چوں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کے اصحاب پر منتہی ہوتا ہے لہذا حنفیہ نے ترکِ رفع کی روایات کو لے لیا مگر شوافع نے دوسری روایات کو لے لیا ہے۔ اور سفر السعادت میں شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے رفع الیدین کے منسوخ ہونے کا قول نقل کیا ہے یہی وجہ ہے کہ ابنِ عمرؓ باوجود رفع کی حدیث کے راوی ہونے کے خود رفع کو چھوڑ چکے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۷: وعنه انه رأى النبي صلى الله عليه وسلم يصلي فاذا كان في وتر من صلاته لم ينهض حتى يستوي قاعداً

---

[1] نصب الرایہ ج ا ص۴۰۲۔ [2] نصب الرایہ ج ا ص۴۰۴۔ ۲۵۵
[3] ایضاً ص۴۰۵، ۴۰۶۔ [4] زجاجۃ المصابیح ج ا ص۲۲۸، ۲۲۹، مرقات ج ۲
[5] مظاہر حق ج ا ص۲۷۹۔

رواہ البخاری۔

ترجمہ : اور مالک رضؓ بن الحویرث سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے دیکھا پس جب حضورؐ پہلی یا تیسری رکعت میں ہوتے تو جب تک اچھی طرح بیٹھ نہ جاتے اٹھتے نہ تھے۔ اسے بخاری نے روایت کیا۔

شرح : اس[1] باب کی پہلی روایت میں یہ الفاظ ثم ارفع حتی تستوی قائمًا گزر چکے ہیں جن سے جلسۂ استراحت کی نفی ہوتی ہے۔ اور ترمذی کی حدیث میں ہے کہ حضورؐ اپنے پاؤں پر بیٹھے بغیر دوسری اور چوتھی رکعت کے لیے اٹھتے تھے۔ اسی طرح ابنِ مسعودؓ، حضرت علیؓ، حضرت عمرؓ، ابنِ عمرؓ اور ابن الزبیرؓ کے آثار سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ جلسۂ استراحت نماز میں نہیں ہے۔ ہاں بوجہ عذر مثلاً بیماری یا بڑھاپا وغیرہ کے جلسۂ استراحت جائز ہے۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام احمدؒ دونوں اس جلسہ کے قائل نہیں ہیں۔

حدیث ۸ : وعن وائل بن حجر انہ رأی النبی صلی اللہ علیہ وسلم رفع یدیہ حین دخل فی الصلوٰۃ کبر ثم التحف بثوبہ ثم وضع یدہ الیمنیٰ علی الیسریٰ فلما اراد ان یرکع اخرج یدیہ من الثوب ثم رفعہما وکبر فرکع فلما قال سمع اللہ لمن حمدہ رفع یدیہ فلما سجد بین کفیہ۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ : حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضورؐ کو نماز شروع کرتے وقت ہاتھ اٹھاتے دیکھا۔ آپؐ نے تکبیر کہی پھر اپنے ہاتھ کپڑے سے ڈھانک لیے۔ پھر دایاں ہاتھ بائیں پر رکھا۔ پس جب رکوع کا ارادہ فرمایا تو کپڑے سے ہاتھ باہر نکالے پھر انہیں بلند کیا اور تکبیر کہی پھر رکوع۔ پس جب سَمِعَ اللہ لِمَنْ حَمِدَہٗ کہا تو دونوں ہاتھ اٹھائے پھر جب سجدہ کیا تو دونوں ہاتھوں کے درمیان کیا۔ اسے مسلم نے بیان کیا۔

شرح : اس حدیث میں رفع الیدین کے ساتھ ساتھ حضورؐ کا اپنے ہاتھوں کو کپڑے میں لپیٹنا بھی ثابت ہوا۔ لیکن تعجب ہے کہ کوئی بھی اس پر زور نہیں دیتا، نہ اس کی سنیت کا قائل ہے۔ علماء[2] کہتے ہیں کہ یہ غالباً جاڑے کے زمانے میں تھا۔ آستینیں

---

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۲۸۱، مرقات ج ۲ ص ۲۵۸۔ [2] مظاہر حق ج ۱ ص ۲۸۱، مرقات ج ۲ ص ۲۵۸۔

تھیں۔ یا چادر تھی جس میں حضورؐ ہاتھ لپیٹ لیتے تھے۔ علاوہ ازیں اس روایت میں صرف سمع اللہ الخ کا ذکر ہے ربنالک الحمد نہیں ہے۔ اور باتفاق علماء دایاں ہاتھ بائیں پر رکھنا چاہیے۔ امام مالکؒ[۱] ہاتھ باندھنا جائز اور ارسال (ہاتھ چھوڑ دینا) مستحب ہونے کے قائل ہیں۔ اس حدیث میں سینے یا ناف کا ذکر نہیں ہے۔ دوسری روایات میں تصریح ہے اور معاملہ وسیع ہے صرف استحباب کا اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے ہاں ادب کی معتاد صورت یعنی ناف سے نیچے ہاتھ رکھنا اختیار کی گئی ہے جو احادیث سے ثابت ہے۔

حدیث ۹ : وعن سہل بن سعدؓ قال کان الناس یؤمرون ان یضع الرجل الید الیمنیٰ علیٰ ذراعہ الیسریٰ فی الصلوٰۃ۔ رواہ البخاری۔

ترجمہ : حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ فرماتے کہ لوگوں کو حکم دیا جاتا تھا کہ آدمی اپنا دایاں ہاتھ نماز میں اپنی بائیں کلائی پر رکھے۔ اسے بخاری نے روایت کیا۔

شرح :[۲] "لوگوں کو حکم دیا جاتا تھا" یہ طرز بیان صحابی کا ظاہر کرتا ہے کہ حکم دینے والے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہوں گے اسی روایت میں امام مالکؒ کے استاذ ابو حازم راوی حدیث کا قول بخاری نے نقل کیا ہے کہ ان کے نزدیک اس سے مراد یہی تھا کہ حکم دینے والے حضورؐ تھے۔

حافظ ابن حجرؒ اور علامہ قسطلانیؒ نے فرمایا ہے کہ دایاں ہاتھ بائیں ہتھیلی کی پشت پر رکھے اور گٹ بھی بازو میں ہے (ابوداؤد، نسائی، ابن خزیمہ) اور سنت یہ ہے کہ ہاتھ سینے سے نیچے رکھے۔ اور حنفیہ اپنے دلائل کی بنا پر ناف سے نیچے رکھنے کے قائل ہیں۔ امام مالکؒ[۳] سے مؤطا میں جو روایت آئی ہے وہ تو وضع الیمنیٰ علی الیسریٰ کی ہے لیکن ان کے بعض اصحاب کا مسلک ارسال الیدین کا ہے۔ امام مالکؒ سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ نفل میں ہاتھ باندھے اور فرض میں ارسال کرے۔ علامہ علی القاریؒ[۴] نے فرمایا ہے کہ صحاح کی روایات جن میں وضع الیدین کا صراحۃً ذکر ہے امام مالکؒ کے خلاف حجت ہیں۔ امام مالکؒ[۵] سے وضع کی روایت ہے وہ تحت السرہ ہے جیسا کہ الوزیر بن ہبیرہ نے الاشراف میں ان کی مشہور روایت اسی کو قرار دیا ہے۔ امام شافعیؒ سے تحت الصدر

۱؎ لیکن مؤطا میں وضع الیمنیٰ علی الیسریٰ کے سنت ہونے کی روایات ہیں ص ۱۰۳۔

۲؎ فتح الباری ج ۲ ص ۲۰۶، قسطلانی ج ۲ ص ۸۵۔ ۳؎ فتح الباری ج ۲ ص ۲۰۶۔

۴؎ مرقات ج ۲ ص ۲۵۹۔ ۵؎ فیض الباری ج ۲ ص ۲۶۶۔

اور فوق الصدر کی دونوں روایتیں موجود ہیں لیکن علی الصدر والی وائل بن حجرؓ کی، روایت (ابن خزیمہ) معلول ہے اس پر سلف میں سے کسی نے عمل نہیں کیا اور نہ ائمہ میں سے کسی کا یہ مذہب ہے۔ امام شافعیؒ کا مسلک فوق السرہ و تحت الصدر ہے۔ مصنف ابن ابی شیبہ میں وائل کی روایت میں تحت السرہ کا لفظ ہے۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں: والعمل علیٰ ھذا عند اھل العلم من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم والتابعین ومن بعدھم یرون ان یضع الرجل علی شمالہ فی الصلوٰۃ ورأی بعضھم ان یضعھما فوق السرۃ ورأی بعضھم تحت السرۃ۔

حدیث ۹: وعن ابی ھریرۃؓ قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا قام الی الصلوٰۃِ یکبر حین یقوم ثم یکبر حین یرکع ثم یقول سمع اللہ لمن حمدہ حین یرفع صلبہ من الرکعۃِ ثم یقول وھو قائم ربنا لک الحمد ثم یکبر حین یھوی ثم یکبر حین یرفع رأسہ ثم یفعل ذالک فی الصلوٰۃِ کلھا حتی یقضیھا و یکبر حین یقوم من الثنتین بعد الجلوس۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز کا ارادہ فرماتے تھے تو جب کھڑے ہوتے تو اللہ اکبر کہتے پھر رکوع کرتے وقت تکبیر کہتے پھر سمع اللہ لمن حمدہ کہتے جبکہ رکوع سے اپنی پیٹھ اٹھاتے اور پھر کھڑا ہونے کی حالت میں ہی ربنا لک الحمد کہتے پھر سجدہ کے لیے جھکتے وقت تکبیر کہتے پھر جب سر اٹھاتے تو تکبیر کہتے پھر نماز ختم کرنے تک ساری نماز میں اسی طرح کرتے۔ اور دو رکعتوں میں بیٹھ کر جب اٹھتے تو بھی تکبیر کہتے۔ متفق علیہ۔

شرح: اس حدیث میں رفع یدین کا ذکر نہیں ہے بلکہ ہر انتقال پر خفض و رفع یعنی پست و بلند ہوتے وقت اللہ اکبر کا ذکر آیا ہے۔ اور سمع اللہ الخ کے ساتھ ربنا لک الحمد بھی جمع کر دیا گیا ہے۔ کلام اس پر پہلے گزر چکا۔ امام احمدؒ نے تکبیرات کو واجب کہا ہے اور بعض علماء کے نزدیک سنت بھی نہیں لیکن جمہور کا مذہب سنیت کا ہے۔

ے مظاہر حق ج ۱ ص ۲۸۱، مرقات ج ۲ ص ۲۶۔

حدیث ۱۰: وعن جابرؓ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم افضل الصلوٰۃ طول القنوت۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ افضل نماز وہ ہے جس میں قیام لمبا ہو۔ اسے مسلم نے روایت کیا۔

شرح: شارح طیبیؒ نے اس حدیث کے لفظ قنوت سے مراد قیام لیا ہے۔ قنوت کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے مثلاً اطاعت، خشوع، صلوٰۃ، دعاء، عبادت اور قیام وسکوت۔ جہاں یہ لفظ استعمال ہو موقع محل کے لحاظ سے معنی مراد لیا جائے گا۔ ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ اور شافعیؒ نے اس حدیث سے استدلال کرکے کہا ہے کہ رات یا دن کی نماز میں طولِ قیام کثرت سجود سے افضل ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

بابُ مایقرأ بعد التکبیر

بعد[۲] التکبیر ای بعد تکبیرۃ الاحرام یعنی تکبیر تحریمہ کے بعد کیا پڑھا جائے اور لفظ قرأت یہاں قرأتِ قرآن ہی کے لیے خاص نہیں بلکہ عام معنوں میں استعمال ہوا ہے تاکہ دعاء وغیرہ بھی اس میں داخل ہو جائے۔ امام[۳] ابو حنیفہؒ، مالکؒ، اور احمدؒ کے نزدیک نوافل کا معاملہ چونکہ وسیع ہے لہٰذا تکبیر تحریمہ کے بعد کئی دعائیں جو احادیث میں آئی ہیں نفلوں میں کل یا بعض پڑھی جا سکتی ہیں۔ یہ چیز پڑھنے والے کے نشاط اور وقت وغیرہ پر مبنی ہے۔ اور فرائض میں صرف سبحانک اللّٰھم الخ پڑھی جانی چاہیے۔ امام ابو یوسفؒ اس کے ساتھ انی وجّھتُ وجہی کا پڑھنا بھی تجویز کرتے ہیں اور حنفیہ میں سے امام طحاویؒ کا مختار یہی ہے اور مشہور یہی ہے کہ انی وجہت الخ کو سبحانک اللّٰھم کے بعد پڑھیں گو اس کے خلاف بھی جائز ہے۔ امام شافعیؒ کے ہاں یہ دعائیں فرائض و نوافل سب میں پڑھنی چاہییں لیکن ظاہر ہے کہ صحیح حدیث میں جو آیا ہے کہ امام کو تخفیف کرنی چاہیے۔ یہ چیز بظاہر اس کے خلاف ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

۱؎ مرقات ج ۲ ص ۲۶۱، مظاہر حق ج ۱ ص ۲۸۱۔ ۲؎ ایضاً مرقات ج ۲ ص ۲۷۱، مظاہر حق ج ۱ ص ۲۸۶۔ ۳؎ ایضاً۔

مسلمؒ[1] میں ایک روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک دفعہ تعلیم کے لیئے سبحانک اللّٰھم الخ کو بالجہر پڑھا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اسناد کی حد تک یہ بات اولیٰ ہے کہ امام شافعیؒ کا مسلک اس باب میں اختیار کیا جائے لیکن صرف اسناد ہی درکار نہیں بلکہ تعامل صحابہؓ و تابعین و من بعدہم بھی دیکھنا پڑتا ہے پس تعامل اس باب میں احناف، مالکیہ اور حنابلہ کے ساتھ ہے۔ حضرت سید انور شاہ کشمیریؒ نے فرمایا ہے کہ اس باب میں میرے نزدیک تعامل ہی دلیل قاطع اور فیصلہ کن ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مؤطا[2] میں امام مالکؒ سے دعائے استفتاح کے متعلق استحباب اور لَا بَأسَ بِہا کے الفاظ آئے ہیں۔ اس وجہ سے بعض مالکیہ نے دعائے استفتاح کو مکروہ سمجھا ہے لیکن یہ درست نہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث میں آنے والی دعا استفتاح سب مستحب ہیں لیکن ان میں تاکید نہیں کی گئی نہ صحابہؓ کا ان پر التزام تھا علیٰ ہذا القیاس قرأت سے پہلے اعوذ باللہ الخ پڑھنا اور تشہد کے بعد درود پڑھنا کیونکہ ہمارے نزدیک یہ کسی دلیل قطعی سے بطورِ التزام صحابہؓ ثابت نہیں پس فضائل میں سے ہے۔ اور امام شافعیؒ نے دعائے استفتاح میں حضرت علیؓ کی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے انی وَجَّھت وَجْھِیَ الخ کو دعائے استفتاح قرار دیا ہے اور ابو حنیفہؒ نے حضرت عائشہؓ اور ابو سعید خدریؓ کی حدیث سے استدلال کر کے سبحانک اللّٰھم وَبِحَمدِکَ کو بہتر سمجھا ہے اور حضرت عمرؓ کا عمل اسی پر تھا۔ اور بغویؒ نے کہا ہے کہ اذکار صلوٰۃ مثلاً دعائے استفتاح، ذکر، رکوع، و سجود اور مابعد التشہد وغیرہ اختلافِ مباح کے قبیل سے ہے۔ ہر ایک نے اپنا مختار بیان کیا اور دوسرے نے انکار نہیں کیا۔ واللہ اعلم۔

امام بخاریؒ[3] نے باب ما یقرء بعد التکبیر میں حضرت انسؓ کی حدیث درج کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضراتِ ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما قرأت کو الحمد لِلّٰہ رب العٰلمین سے شروع کیا کرتے ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ نے شرح میں لکھا ہے کہ حدیث کا ظاہر بسم اللہ کے بالجہر نہ ہونے پر دلالت کرتا ہے اور اس سے بسم اللہ الخ کے آہستہ پڑھنے کی نفی نہیں ہوتی۔ اور مسلمؒ نے فلم اسمع احد امنہم یقرأ بسم اللہ

---

[1] فیض الباری ج ۲ ص ۲۶۸۔ [2] مصفّٰی شرح مؤطا ج ا ص ۱۰۳، ۱۰۴۔ [3] فتح الباری ج ۲ ص ۲۰۷۔

الرحمن الرحیم بعض رواۃ سے نقل کرنے کے معاملہ ہی ختم کر دیا ہے اور نسائی اور ابن حبان کی روایت بھی بسم اللہ کے آہستہ پڑھنے کی تائید کرتی ہے گو شافعیہ کے پاس اور دلائل بسم اللہ بالجہر کے موجود ہیں۔

الفصلُ الاوّل

حدیث ۱: عن ابی هریرۃ قال کان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یسکت بین التکبیر و بین القراءۃ اسکاتۃ فقلت بابی انت وامی یارسول اللّٰه اسکاتك بین التکبیر و بین القرائۃ ماتقول قال اقول اللهم باعد بینی و بین خطایای کما باعدت بین المشرق و المغرب اللهم نقنی من الخطایا کما ینقی الثوب الابیض من الدنس اللهم اغسل خطایای بالماء و الثلج و البرد۔ متفق علیه۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تکبیر اور قرأت کے درمیان تھوڑی دیر خاموش رہا کرتے تھے پس میں نے عرض کیا اے اللہ کے پیغمبرؐ میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہو جائیں آپؐ تکبیر اور قرأت کے درمیان جو خاموش ہوتے ہیں اس میں کیا پڑھتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا کہ میں اس میں کہتا ہوں اللّٰهُمَّ بَاعِدْ بَینی و بین خَطَایای الخ اے اللہ میرے اور میرے گناہوں کے درمیان اتنی دوری ڈال دے جتنی تو نے مشرق و مغرب میں ڈالی ہے۔ اے اللہ مجھے خطاؤں سے پاک کر دے جس طرح سفید کپڑا میل کچیل سے پاک صاف کر دیا جاتا ہے۔ اے اللہ میرے گناہ پانی، برف اور اولوں سے دھو ڈال۔ متفق علیہ۔

شرح: حافظ ابن حجرؒ عسقلانی نے فرمایا ہے کہ بخاری کی انسؓ کی روایت سے (جن میں حضورؐ اور ابوبکرؓ و عمرؓ کا نماز کو الحمدُ للّٰہ ربّ العٰلمین سے شروع کرنا بیان ہوا ہے)، مالکیہ نے استدلال کیا ہے کہ دعائے استفتاح نہیں پڑھنی چاہئیے۔ لیکن ابوہریرہؓ کی روایت اس خیال کو رد کرتی ہے اس لیے بخاری نے انسؓ کی حدیث کے بعد متصلاً ابوہریرہؓ والی روایت درج کر دی تاکہ پتہ چل جائے کہ انسؓ والی روایت میں قرأت کی ابتداء مراد ہے

۱؎ قسطلانی ج ۲ ص ۷۰ ۲؎ فتح الباری ج ۲ ص ۲۰۸۔

مطلق استفصاح مراد نہیں ہے۔
اس[1] حدیث میں حضورؐ نے بطورِ مبالغہ آسمان کی طرف سے آنی والی کئی مُطہر چیزوں کا ذکر فرمایا ہے۔ ان میں سے ایک نہ ایک چیز کی طہارتِ کاملہ کے حصول میں ضرورت پڑتی ہے۔ اور یہ اس لیے کہ مغفرتِ کاملہ حاصل ہو جائے۔ اور مراد ان سے محو خطایا ہے مجازاً۔ شارح طیبیؒ نے کہا ہے کہ پانی کے ذکر کے بعد برف اور اولوں کا ذکر اس لیے فرمایا کہ عفو کے بعد مغفرت و رحمت حاصل ہو جائے۔ اور ظاہر یہی ہے کہ حضورؐ کا یہ عمل اِس حدیث کے ظاہری الفاظ کے مطابق فرائض میں تھا۔ یہیں سے شافعیہ نے استدلال کیا ہے۔ حنفیہ اور دوسرے حضرات اسے بیانِ جواز پہ محمول کرتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

حدیث ۲: وعن علیٍ رضی اللہ عنہ قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا قام الی الصلوٰۃ و فی روایۃ کان اذا افتتح الصلوٰۃ کبر ثم قال وجہت وجھی للذی فطر السموات والارض حنیفًا وما انا من المشرکین ان صلوٰتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العٰلمین لا شریک لہ وبذالک امرت وانا من المسلمین اللھم انت الملک لا الٰہ الا انت، انت ربی وانا عبدک ظلمت نفسی واعترفت بذنبی فاغفرلی ذنوبی جمیعًا انہ لا یغفر الذنوب الا انت واھدنی لِاَحسن الاخلاق لا یھدی لاحسنھا الا انت واصرف عنی سیئھا لا یصرف عنی سیئھا الا انت لبیک وسعدیک والخیر کلہ بیدیک والشر لیس الیک انا بک والیک تبارکت وتعالیت استغفرک واتوب الیک واذا رکع قال اللھم لک رکعت وبک اٰمنت ولک اسلمت خشع لک سمعی وبصری ومخی وعظمی وعصبی فاذا رفع رأسہ قال اللھم ربنا لک الحمد ملأ السموات والارض وما بینھما وملأ ما شئت من شیٔ بعد۔ واذا سجد قال اللّٰھم لک سجدت وبک اٰمنت ولک اسلمت، سجد وجھی للذی خلقہ وصورہ وشق سمعہ وبصرہ

---

[1] مرقات ج ۲ ص ۲۷۱، مظاہر حق ج ۱ ص ۲۸۷۔

تبارك الله احسن الخالقين ثم يكون من اخر ما يقول بين التشهد و التسليم اللهم اغفرلى ما قدمت وما اخرت و ما اسررت و ما اعلنت و ما اسرفت و ما انت اعلم منى انت المقدم و انت المؤخر لا اله الا انت۔ رواه مسلم ۔ و فى رواية للشافعى و الشر ليس اليك والمهدى من هديت انابك و اليك لا منجأ منك و لا ملجأ الا اليك، تباركت۔

ترجمہ: حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے اور ایک روایت میں یہ لفظ ہیں کہ جب نماز شروع کرتے، تو تکبیر کہتے پھر کہتے وَجَّہتُ وَجْھِیَ الخ میں نے اپنا منہ اس ذات کی طرف کر لیا ہے جس نے ساری کائنات کو ایجاد کیا ہے میں مؤحد ہوں اور مشرکوں میں سے نہیں ہوں بلاشبہ میری نماز اور قربانی اور زندگی اور موت اللہ رب العٰلمین کے لیے ہے اس کا کوئی شریک نہیں مجھے اسی کا حکم ملا ہے اور میں مسلموں میں سے ہوں۔ اے اللہ تو ہی بادشاہ ہے تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو ہی میرا مالک ہے اور میں تیرا بندہ ہوں میں نے اپنے اوپر زیادتی کی اور اپنے گناہ کا اعتراف کرتا ہوں پس تو میرے گناہ بخش دے یقیناً تیرے سوا کوئی بھی گناہ نہیں بخش سکتا اور مجھے بہترین اخلاق کی ہدایت دے۔ بہترین اخلاق کی طرف تیرے سوا کوئی رہنمائی نہیں کرتا اور مجھ سے برے اخلاق کو دور فرما دے، مجھ سے برے اخلاق کو تیرے سوا کوئی ہٹا نہیں سکتا۔ میں حاضر ہوں اور تیرے احکام بجا لاتا ہوں اور سب بھلائی تیرے ہاتھ میں ہے اور شر کی نسبت تیری طرف نہیں کی جاتی۔ میں تیرے ساتھ قائم ہوں تیری طرف آتا ہوں۔ تو بابرکت ہے اور بلند ہے میں تجھ سے بخشش مانگتا ہوں اور تیری طرف رجوع کرتا ہوں۔ اور جب آپؐ رکوع کرتے تو کہتے اللّٰھُمَّ لَکَ رکعت۔ الخ اے اللہ میں تیرے لیے جھکا، تجھ پر ایمان لایا اور تیرا مطیع ہوا، میرے کان، آنکھیں، مغز، ہڈیاں اور پٹھے تیرے سامنے عاجز ہیں۔ اور جب اپنا سر اٹھاتے تو کہتے اللهم ربنا لك الحمد الخ" اے اللہ ہمارے مالک تعریف تیرے ہی لیے ہے ساری کائنات کی پُری کے برابر اور جو کچھ ان کے اندر ہے ان کے برابر اور اس کے بعد بھی تو جو چیز (پیدا کرنا) چاہے اس کے برابر" اور جب

سجدہ کرتے تو کہتے اللّٰھم لک سجدت الخ" اے اللہ میں نے تیرے لیے سجدہ کیا اور تجھ پر ایمان لایا اور تیرا مطیع ہوا۔ میرے چہرے نے اس ذات کو سجدہ کیا جس نے اسے پیدا کیا اور اس کی تصویر بنائی اور اس کے کان اور آنکھیں کھولیں۔ بابرکت ہے اللہ جو بہترین خالق ہے"۔ پھر حضور تشہد اور سلام کے درمیان آخری دعا یہ مانگتے اللّٰھم اغفر لی الخ" اے اللہ مجھے بخش دے جو کچھ میں پہلے کر چکا اور جو کچھ بعد میں کیا اور جو پوشیدہ کیا اور جو علی الاعلان کیا اور جو میں نے زیادتی کی اور جو کچھ تو مجھ سے بھی زیادہ جانتا ہے تو ہی آگے کرنے والا اور تو ہی پیچھے ہٹانے والا ہے۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں"۔ اسے مسلم نے روایت کیا۔ اور امام شافعیؒ کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں والشر لیس الیک الخ" اور شر تیری طرف منسوب نہیں ہے اور ہدایت یافتہ وہ ہے جسے تو نے ہدایت بخشی۔ میں تجھ سے ہی زندہ ہوں اور تیری طرف ہی آؤں۔ تجھ سے کوئی نجات اور پناہ کی جگہ نہیں مگر تو ہی جائے نجات اور جائے پناہ ہے۔ تو بابرکت ہے"۔

شرح: ہر چیز[1] کا خالق اللہ تعالیٰ ہے لیکن جو چیزیں شر ہیں وہ ہمارے لیے شر ہیں اور ہماری نسبت سے ان میں شر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی پیدائش ہونے کی حد تک ان میں شر نہیں بلکہ وہ چونکہ کائنات کا ایک ضروری حصہ ہیں اور ان سے آنہ مائش الٰہی کا مقصد پورا ہوتا ہے لہٰذا اس کی طرف نسبت کرنے سے وہ چیزیں بھی خیر ہی ہیں لیکن از راہ ادب شر کو خداوند تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں کیا جاتا کیونکہ اس کی پیدائش میں بہت سی حکمتیں ہیں۔ علاوہ ازیں شر مخلوق میں ہے نہ کہ خالق یا اس کی پیدائش میں۔ قرآن کہتا ہے۔ قل اعوذ برب الفلق من شر ما خلق۔ اور بعض نے والشر لیس الیک کا معنی یوں بیان کیا ہے کہ اے خدا شر تیرے نزدیک کرنے والی نہیں۔ یا شر تیری طرف بلند نہیں ہوتی یعنی تیرے ہاں مقبول نہیں جیسا کہ قرآن میں ہے الیہ یصعد الکلم الطیب۔ الآیہ۔ اور ارشادِ الٰہی ہے: وللہ الاسماء الحسنیٰ فادعوہ بھا الآیہ۔ پس باوجود اس کی مخلوق ہونے کے بری چیزیں اس کی طرف منسوب نہ کی جائیں گی۔ ہاں اچھی چیزوں کو اس کی طرف نسبت دیں گے۔

اس دعا میں خدا کی حمد و ثناء کو انتہاء وسعت مخلوقات تک پہنچا دیا پھر فرمایا ملء السموات والارض وما بینھما وملء ما شئت من شیئ بعد۔ حافظ ابن حجر[2] نے

---

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۲۸۸، مرقات ج ۲ ص ۲۷۵۔ [2] مرقات ایضاً۔

فرمایا ہے من شیئٍ بعد سے مراد عرش وکرسی اور اس کے اوپر کی چیزیں ہیں اور زمینوں کے اندر اور نیچے کی چیزیں جنہیں ان کے خالق کے سوا کوئی جانتا نہیں وہ بھی اس میں داخل ہیں۔ اور خوب ظاہر یہ ہے کہ ان دونوں سے مراد جسمانیات ہیں جو اعلیٰ واسفل ہیں۔ ابن الملک نے کہا کہ یہ غایت حمد ہے کیونکہ اس میں موجودہ و آئندہ ساری مخلوق کے برابر حمد کی گئی ہے اور پھر معدوم اشیاء جنہیں خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا وہ بھی داخل ہیں۔ میرک شاہؒ فرماتے ہیں کہ خدا کی مخلوق میں سے کوئی بھی اس کی حمد ایسی بیان کرنے کا مقام حاصل نہ کر سکا۔ اسی لیے آپؐ کا نام احمدؐ ہے۔

شق سمعہ وبصرہ یعنی جسم کو کھول کر کان اور آنکھیں بنائیں۔ اَحْسَنُ الخالقین یہ ترکیب مبالغہ اور تفضیل کل کے طور پر استعمال ہوئی ہے۔ مطلب یہ نہیں کہ کوئی اور خالق بھی ہیں اور اللہ ان سب سے اَحْسَنُ ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایک ہی خالق ہے اور وہ صفت خلق میں مرتبۂ کمال وانتہاء پر فائز ہے۔ یا یوں کہیے کہ برائے نام بھی جو خالق کہلاتے ہیں یعنی مصور اور صنعت کار اور فن کار وہ ان سب کا خالق ہے اور ایجاد وامداد اسی کا خاصۂ منفردہ ہے اس صفت میں اس کا کوئی بھی سہیم وشریک نہیں حتی کہ مشرک لوگ بھی خلق میں اس کا شریک کسی کو نہیں گردانتے الا مشرکی الهند وغیرہم۔ خدا کے علاوہ جو ظاہری صورتیں بھی بناتے ہیں وہ محض برائے نام ہی ان کی "تخلیق" کہلاتی ہیں ورنہ وہ خالق کل شیئ ہے اور اسؐ کی شان ہے واللہ خَلَقَکُم وَمَا تَعمَلُونَ (القرآن)

یہ دعا بظاہر نفلوں میں مانگی جاتی تھی اور وہ بھی صلوٰۃ اللیل میں۔ اگر کبھی احیانا فرض میں بھی مانگی گئی ہو تو بیانِ جواز کے لیے ہوگی۔ یا تعلیم وتلقین کے پیش نظر۔ واللہ اعلم۔

حدیث ۳۴ : وعن انسؓ ان رجلا جاء ودخل الصف وقد حفزہ النفس فقال اللہ اکبر الحمد للہ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ فلما قضیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلاتہ قال أیکم المتکلم بالکلمات فارم القوم فقال أیکم المتکلم بالکلمات فارم القوم فقال

ا؎ علامہ علی القاریؒ کا قول ہے۔

ایکم المتکلم بھا فانہ لم یقل باساً فقال رجل جئت وقد حفزنی النفس فقلتھا فقال لقد رأیت اثنی عشر ملکاً یبتدرونھا ایھم یرفعھا۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ: اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی آیا اور صف میں داخل ہو گیا اور اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ پس اس نے کہا الحمد للہ حمداً کثیراً الخ۔ تعریف اللہ ہی کے لیے ہے بہت زیادہ پاکیزہ اور بابرکت تعریف۔ پس جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ختم کی تو فرمایا کہ ان کلمات کا کہنے والا تم میں سے کون تھا؟ پس لوگ خاموش رہے پھر آپؐ نے فرمایا کہ تم میں سے ان کلمات کا کہنے والا کون تھا؟ پس لوگ خاموش رہے پھر فرمایا کہ ان کلمات کا کہنے والا کون تھا کیونکہ اس نے کوئی بری اور حرج کی بات نہیں کی۔ پس ایک شخص بولا کہ میں آیا اور میرا دم چڑھا ہوا تھا تو میں نے یہ کلمات کہے ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ میں نے بارہ فرشتوں کو اسے ہاتھوں ہاتھ لے جاتے دیکھا، ان میں سے ہر ایک اسی کوشش میں تھا کہ اس فقرے کو اٹھا لے جائے۔ مسلم نے اسے بیان کیا۔

شرح: جب حضورؐ نے لوگوں سے پوچھا کہ تم میں سے کون تھا جس نے یہ کلمات کہے تو لوگوں نے سمجھا کہ یہ غلطی ہوئی ہے اور حضورؐ ازراہ ناراضگی ایسا فرما رہے ہیں اور جب آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ کہنے والے نے کوئی بری بات نہیں کہی اور اس میں کوئی حرج نہ تھا تو پھر اس شخص نے اپنا عذر بیان کیا کہ بآواز بلند اس لیے یہ کلمات ادا ہوئے کہ دم چڑھا ہوا تھا اور تجربہ شاہد ہے کہ ایسی حالت میں آہستہ آہستہ کچھ پڑھنا اکثر نہیں ہو سکتا۔[1]

حافظ تورپشتیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ شخص تیز تیز قدم چل کر آیا تھا لہٰذا دم چڑھ گیا تھا لیکن شارح طیبیؒ کا کہنا ہے کہ اس کا دم دوڑنے کی وجہ سے چڑھا تھا لیکن ظاہر ہے کہ یہ حدیث کے خلاف ہے جو پہلے گزر چکی ہے کہ اذا اتیتم الصلوٰۃ فلا تاتوھا وانتم تسعون۔ الحدیث۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے بعض ائمہ کہتے ہیں جب جماعت کے فوت ہو جانے کا اندیشہ قوی ہو تو دوڑ کر آنا جائز ہے ورنہ نہیں۔ اور محل کراہت اس حدیث کے بموجب یہی دوسرا دوڑنا ہے اسی لیے فرمایا ہے: فما ادرکتم فاتموا وما فاتکم فاقضوا۔ پھر حافظ صاحبؒ نے فرمایا

---

[1] مرقات ج ۲ ص ۲۷۲۔

کہ ہمارے نزدیک زیادہ راجح یہی ہے کہ دونوں صورتوں میں دوڑنا ناجائز ہے اور اس واقعہ میں حضورؐ کو اس کے دوڑنے کا علم نہ ہوا تھا اسی لیئے نکیر نہ فرمایا۔ نیز زیادہ سے زیادہ اس سے یہ ثابت ہوا کہ اگر آپؐ کو علم بھی تھا تو نکیر نہ فرمانے سے صرف جواز ثابت ہوا کراہت پھر بھی باقی رہی۔ اور یہ کلام جمعہ کے علاوہ ہے جمعہ کے لیئے سعی واجب ہے اور اگر فوت ہو جانے کا خدشہ ہو تو لفظ سعی سے تیاری نہیں بلکہ دوڑنا مراد لیا جائے گا۔

اس حدیث میں کوئی اختلافی مسئلہ نہیں ہے۔ نہ یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ کلمات اس نے نماز کی کونسی رکعت میں اور کس موقع ومحل میں کہے تھے۔ گو دوسرے دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے یہ کلمات ربنالک الحمد کے بعد کہے تھے اور ظاہر ہے کہ قومہ میں ان الفاظ کے کہنے میں کسی کو بھی کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

باب القرأۃ فی الصلوٰۃ

اس باب میں نماز کے اندر قرأت کا مسئلہ احادیث صحیحہ کی روشنی میں بیان ہوا ہے۔ بعض اہم مسائل پہ گفتگو احادیث کے ضمن میں آرہی ہے لیکن چند اصولی باتیں بیان کر دینا مناسب ہے۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ "مطلق قرأت" سب علمائے امت کے نزدیک فرض ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک تمام رکعات میں، امام مالکؒ کے ہاں تین رکعت میں باعتبار لِلاکثرِ حکمُ الکُل کے اور حنفیہ کے نزدیک پہلی دو رکعتوں میں فرض ہے۔ امام احمدؒ قولِ مشہور کے مطابق امام شافعیؒ کے ہم نوا ہیں اور ایک روایت کے مطابق حنفیہ کے ساتھ ہیں۔ اور امام حسنؒ بصری اور زفرؒ بن الہذیل کے نزدیک ایک رکعت میں فرض ہے۔

اس سلسلے میں اصل اختلافی مسئلہ صرف قرأت نہیں بلکہ "قرأت فاتحہ خلف الامام" ہے۔ علمائے اہل سنت میں اس مسئلے پر اختلاف ہوا ہے۔ دلائل سب کے پاس موجود ہیں۔ اگر فرقہ داری کی روح سرایت نہ کر جاتی تو اختلاف کو اتنی اہمیت نہ ہوتی لیکن افسوس کہ اختلاف اپنی حدود سے نکل کر مخالفت اور تحزب وتفرق کا باعث بننے لگا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ گویا سارے دین کو اسی ایک ضمنی مسئلے کے گرد گھما دیا گیا۔ انا للہ وانا

---

[1] مظاہر حق ج ا ص ۲۹۱۔

الیہ راجعون ــــ سینکڑوں برس سے یہ مسئلہ معرکۃ الآراء چلا آرہا ہے۔ انصاف پسند ائمہ دین نے اس کی اصل حیثیت کو جانچ کر اور اس کی حدود کو پیش نظر رکھ کر اس مسئلے کو تفرق کا سبب بننے سے روکا لیکن بعد کے آنے والوں نے ان حدود کی پروا نہ کی اور اس افراط و تفریط نے اہل اسلام کو مختلف اوقات میں نقصان بھی پہنچایا۔ اگر کوئی منصف مزاج شخص غور کرے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی کہ دوسرے فرعی، فقہی اور حدیثی اختلافات اور اجتہادی مسائل کی مانند یہ بھی بس ایک فقہی اجتہادی مسئلہ ہی ہے اسے فرقہ سازی اور کفر بازی کے شغلِ مذموم کا ذریعہ بنانا ظلم عظیم ہے۔ اس مسئلہ میں صحابہؓ تابعینؒ، اور ائمہ فقہ و حدیث میں بھی اختلاف ہوا ہے۔ آج کوئی شخص اس اختلاف کو نہ مٹا سکتا ہے اور نہ کسی کی جرأت ہے کہ ایک ہی دوٹوک اور حتمی فیصلہ کر ڈالے۔ اگر اس اختلاف کی وجہ سے فرقہ سازی اور گمراہ سازی کو ہوا دی جائے گی تو چودہ صدیوں کے عظیم ائمہ اسلام کے مقدس دامنوں میں سے کسی کا دامن بھی بچ نہ سکے گا لہٰذا دیانتداری اور اسلامی خیر سگالی کا تقاضا یہی ہے کہ اس اختلاف کو محض "اختلاف" کی حدود میں رکھا جائے۔

دورِ جدید کے "مجتہدین کرام" کو بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اسلام کی خدمت کے اور بے شمار میدان موجود ہیں، خدارا اس مسئلے پر جتنا کام ہو چکا ہے اسی کو کافی سمجھیے اور اب کوئی اور مفید کام اختیار فرمائیے۔ الحاد و دہریت اور اشتراکیت کا سیلاب ہمیں بہا لے جانے کی دھمکیاں دے رہا ہے۔ نئی نسلیں سرے سے اسلام کی بنیادی تعلیمات سے منحرف ہو رہی ہیں اس لیے اب اس زیادہ اہم کام کی طرف توجہ فرمائیے اور جس مسئلے کا فیصلہ ڈیڑھ ہزار برس میں نہیں ہو سکا اسے اپنی ترکتازیوں کی آماجگاہ مت بنائیے۔

یہ مسئلہ ایک علمی مسئلہ ہے اسے اہل علم کی تحقیقات تک محدود رہنا چاہیے عامۃ المسلمین کو اس میں زیادہ غور و خوض کرنے کی نہ ضرورت ہے نہ حاجت۔ سارے اہلِ اسلام کے نزدیک ثابت شدہ صورتوں میں سے جس طرح بھی نماز پڑھ لی جائے ادا ہو جاتی ہے۔ فرائض کو ادا کرنے کی طرف توجہ ہونی چاہیے اور حتی الوسع سنن و آداب کی ادائیگی کی کوشش بھی بہت محمود ہے لیکن اختلافات کی طرف توجہ نہ کرنی چاہیے۔

اس مسئلہ کی وجہ سے بالعموم حنفی حضرات کو ہی اعتراضات و الزامات کا نشانہ بنانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے حالانکہ اگر انصاف سے دیکھا جاتا تو مالکی اور حنفی حضرات کا مسلک بھی شافعی مسلک سے مختلف رہے اور سب نے اپنے مسلک کی بنیاد

حدیث و سنت ہی پر رکھی ہے۔ خدا و رسول ؐ کے دین میں کسی کی اجارہ داری نہیں سب اہل علم کو دیانت و امانت کے تقاضے کے ساتھ اپنی تحقیق کا نتیجہ دوسروں کے سامنے رکھنے کا حق حاصل ہے۔ اگر بزرگانِ دین پر سے اعتماد اٹھ جائے تو خدانخواستہ خود دین کی حیثیت مشکوک ہو جائے گی۔ علمی بحث میں ذاتیات کو داخل کرنا یا الزام تراشی کوئی اچھا شغل نہیں۔ بعض لوگوں نے اس مسئلے یا اس قسم کے اور مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے امام ابو حنیفہؒ اور ان کے ساتھیوں پر اعتراضات اور الزامات کی بوچھاڑ کی ہے لیکن حنفیہ کا دامن ان مسائل میں دلائل سے خالی نہیں بلکہ ان کے پاس اپنے مسلک کے لیے حدیث و سنت کے قوی دلائل موجود ہیں۔ احادیث کو ٹکرانا اور جہاں تطبیق ممکن ہو وہاں بھی ترجیح اور رد و قبول کا استعمال کرنا حنفیہ کے مسلک کے خلاف ہے۔

صحاح ستہ کی کسی ایک کتاب پر کسی بھی مسئلے کے لیے انحصار نہیں کیا جا سکتا۔ صحیح احادیث صحاح میں بکھری پڑی ہیں۔ کسی بھی کتاب کی کسی صحیح حدیث یا احادیث کا ذخیرہ ان صحاح کے باہر بھی موجود ہے۔ خود ان کتابوں کی یہ مسلّم حیثیت صاحبِ شریعت علیہ السلام سے ثابت نہیں ہوئی۔ ان کتابوں کے مصنفین اور مؤلفین میں سے کوئی بھی معصوم نہ تھا۔ عصمت و نبوت کا دروازہ تاقیامت بند ہو چکا ہے لہٰذا کسی مسئلے کی تحقیق کے لیے اگر کوئی شخص بخاری یا مسلم یا کسی اور کتاب پر انحصار نہیں رکھتا بلکہ حدیث و سنت کے دوسرے ذخائر کو بھی ٹٹولتا ہے تو اس کا یہ فعل عین تقاضائے اسلام ہے۔ اس نے کسی رکنِ اسلام کو نہیں گرا دیا کہ لوگ فوجیں لے کر اس پر چڑھ دوڑیں۔

حنفیہ کے ہاں دلائل شرع سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ جماعت کی نماز واحد ہے اور امام ضامن (ذمہ دار) ہے پس وہ کہتے ہیں کہ نماز میں قرأتِ فاتحہ کا پایا جانا واجب ہے، جماعت کی نماز میں امام کی معرفت اور انفرادی نماز میں خود منفرد نمازی کے ذریعے سے۔ یہ ایک اہم اصول ہے جسے کسی صورت میں نظر انداز کرنا درست نہ ہوگا۔ اور دلائل کتاب و سنت کی رو سے مطلق قرأت فرض ہے فاقرءوا ما تیسر من القرآن۔ اور حدیث ابوہریرہؓ میں گزر چکا ہے کہ حضورؐ نے نماز میں خرابی کرنے والے سے فرمایا اقرأ بما تیسر معك من القرآن۔ اور دیگر دلائل سنت کی وجہ سے قرأتِ فاتحہ واجب ہے لیکن جماعت کی نماز اور انفرادی نماز میں اس باب میں حسبِ

دلائل حدیث فرق ہے جیساکہ ابھی آگے آرہا ہے اور اس فرق کو دیگر ائمہ حدیث و فقہ نے بھی محسوس کیا ہے جیساکہ مالکی اور حنبلی مسلک سے واضح ہوتا ہے ۔ واللہ ولی التوفیق ۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

حدیث ۱ : عن عبادۃؓ بن الصامت قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب ۔ متفق علیہ ۔ وفی روایۃ لمسلم لمن یقرأ بام القراٰن فصاعدًا ۔

ترجمہ : حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا : جس شخص نے فاتحۃ الکتاب نہ پڑھی اس کی نماز نہیں ہوئی ۔ بخاری و مسلم نے اسے روایت کیا ۔ اور اس حدیث کی مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں : جس نے ام القرآن اور اس سے زائد نہ پڑھا ۔

شرح : [1] فاتحۃ الکتاب سورہ الحمد کا نام ہے کیونکہ اس سے کتاب شروع ہوتی ہے اور وہ قرآن پاک کے مضامین کو کھولتی (شروع کرتی) ہے اور پڑھنے والوں پر نیکی اور جنت کے دروازے کھولتی ہے ۔ اسی طرح اُمّ القرآن بھی اسی سورت کا نام ہے کیونکہ وہ مضامینِ قرآن کا مغز اور مرکز ہے ۔

لاصلوٰۃ [2] میں نفی شافعیہ کے نزدیک صحت کی ہے یعنی الحمد کے بغیر نماز ہوتی ہی نہیں ۔ اور حنفیہ اور دوسرے لوگوں کے نزدیک نفی کمال کی ہے یعنی کامل نماز نہیں ہوتی جیسے لَا صلوٰۃ لِجار المسجد الّا فی المسجد ۔ الحدیث ۔ میں ہے اور دلیل اس کی خود مسلم کی روایت کے الفاظ فَصَاعِدًا میں موجود ہے پس جب ام القرآن اور فَصَاعِدًا (یعنی الحمد پر زائد چیز ۔ سورۃ وغیرہ) کی ہے وہی فاتحۃ الکتاب کی بھی ہے ۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ الفاتحہ اور کوئی اور سورت (کم از کم تین آیات یا ایک بڑی آیت) دونوں کا ایک حکم ہے اور وہ دونوں واجب ہیں ۔ البتہ مطلق قراءتِ قرآن فرض ہے بدلیل حدیث ابو ہریرہؓ گزشتہ جس میں مَا تَیَسَّرَ مَعَکَ مِنَ الْقُرْاٰنِ کے الفاظ ہیں ۔

اس [3] حدیث میں مقتدی کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ خاص اس کی نماز بھی بغیر اس کے

---

[1] مرقات ج ۲ ص ۲۸۲ [2] مظاہر حق ج ا ص ۲۹۱ ، مرقات ج ۲ ص ۲۸۲ [3] فیض الباری ج ۲ ص ۱۹۸

خود پڑھنے کے نہیں ہوتی حالانکہ محل نزاع وہی ہے۔ امام اور منفرد کے متعلق کوئی جھگڑا ہی نہیں۔ اور مقتدی کا معاملہ اتنا نازک ہے کہ امام مالکؒ اپنی روایت کردہ احادیث و آثار کی بناء پر جہری نماز میں مقتدی کے لیے قرأتِ فاتحہ کے قائل نہیں اور سری نماز میں مقتدی کے لیے قرأتِ فاتحہ کے استحباب کے قائل ہیں اور امام احمدؒ بن حنبل کا بھی یہی مسلک ہے ہاں وہ جہری نماز میں مقتدی کے لیے قرأتِ فاتحہ تجویز کرتے ہیں جبکہ اسے امام کی آواز نہ پہنچے۔ ان کا قول ہے ماسمعنا احدًا من اھل الاسلام یقول: انّ الامام اذا جہر بالقرأۃِ لَا تجزیٔ صلوٰۃ من لم یقرأ۔

امام شافعیؒ کا قولِ قدیم جس پر وہ عمر بھر قائم رہے یہی ہے لیکن آخری دو سال میں جبکہ وہ مصر میں وارد ہوئے تو پہلے قول کو چھوڑ کر وہ سری و جہری دونوں قسم کی نمازوں میں مقتدی کے لیے بھی قرأتِ فاتحہ کے وجوب کے قائل ہو گئے۔ حنفیہ نے آیتِ قرآنی واذا قرئ القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا لعلکم ترحمون سے بھی استدلال کیا ہے کہ فَاسْتَمِعُوا کا حکم جہری نماز اور اَنصِتُوا کا حکم سری نماز کے لیے ہے۔ لیکن امام محمدؒ بن الحسن الشیبانی کا مسلک بھی تقریبًا مالکی اور حنبلی فقہاء جیسا ہے یعنی وہ سری نمازوں میں مقتدی کے لیے قرأتِ فاتحہ کے جواز بلکہ استحباب کے قائل ہیں۔ گو امام ابن الہمامؒ نے امام محمدؒ کی طرف اس مسئلے کی نسبت سے انکار کیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مسلمؒ کی گزشتہ روایت کے مطابق بعینہٖ انہی لفظوں وسورۃ معھا، وما تیسّر، وآیتین من القرآن، ثم اقرء بماشئت، وشیٔ معھا، ولو بفاتحۃ الکتاب کے الفاظ کے ساتھ صحیح احادیث ترمذی، ابوداؤد، طبرانی، مسندِ احمد، ابونعیم اصفہانی، مسندِ حارثی، کامل ابن عدی وغیرہ میں موجود ہیں۔ تفصیل کے لیے تخریج زیلعی دیکھیے۔ ان احادیث سے فصاعدًا کے لفظ کی شرح واضح ہو جاتی ہے۔

حدیث ۲: وعن ابی ھریرۃؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من صلی صلاۃ لم یقرء فیھا بام القران فھی خداج ثلاثا غیر تمام فقیل لابی ھریرۃ انا نکون

۱؎ مؤطا امام مالکؒ مع شرح ج ۱ ص ۱۰۴ تا ۱۰۶

۲؎ مؤطا امام مالکؒ مع شرح جلد ۱ ص ۱۰۴ تا ۱۰۶۔ ۳؎ ایضاً۔ فیض الباری ج ۲ ص ۲۷۲
۴؎ ایضاً۔ ۵؎ نصب الرایہ للزیلعی ج ۱ ص ۳۶۳ تا ۳۶۷۔

وراء الامام قال اقرء بہا فی نفسک فانی سمعت رسول اللّٰہ علیہ وسلم یقول قال اللّٰہ تعالیٰ قسمت الصلوٰۃ بینی وبین عبدی نصفین ولعبدی ما سأل فاذا قال العبد الحمد للّٰہ رب العلمین قال تعالیٰ حمدنی عبدی واذا قال الرحمن الرحیم قال اللّٰہ تعالیٰ اثنیٰ علی عبدی واذا قال مالک یوم الدین قال مجدنی عبدی واذا قال ایاک نعبد وایاک نستعین قال ھذا بینی وبین عبدی ولعبدی ما سأل فاذا قال اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیہم غیر المغضوب علیہم ولا الضالین قال ھذا لعبدی ولعبدی ما سأل۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے کوئی نماز پڑھی جس میں ام القرآن نہ پڑھی تو وہ ناقص ہے۔ تین بار یہ فرمایا۔ وہ پوری نہیں ہے۔ پس حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے کہا گیا کہ ہم امام کے پیچھے ہوتے ہیں تو انہوں نے کہا اسے اپنے دل میں پڑھو کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندوں کے درمیان دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اور میرے بندے کے لیے ہے جو وہ مانگے۔ پس جب بندہ کہتا ہے الحمد لِلّٰہ ربِّ العٰلمین تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری ثناء بیان کی۔ اور جب وہ کہتا ہے مالکِ یوم الدِّین تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری بڑائی بیان کی اور جب وہ ایاکَ نعبُد وایاکَ نستعین کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ آیت میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے اور میرے بندے کے لیے ہے جو کچھ اس نے مانگا۔ پھر جب وہ اھدنا الصّراط المستقیم صراط الّذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالّین کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ میرے بندے کے لیے ہے اور میرے بندے کو مل جائے گا جو اس نے مانگا۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا۔

شرح: اس[1] حدیث میں پہلی بات تو یہ ہے کہ ام القرآن کے بغیر نماز ناقص و ناتمام

---

[1] مرقات ج ۲ ص ۲۸۳۔

ہے اور اس سے حنفیہ وغیرہم کی تائید ہوتی ہے۔ اگر الفاتحہ کی قرأت فرض ہوتی تو یوں فرماتے کہ اس کے بغیر نماز باطل ہے سرے سے ہوتی ہی نہیں۔ ناقص و ناتمام کا مطلب یہی ہے کہ قرأتِ فاتحہ واجب ہے فرض نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ ابوہریرہؓ کے شاگرد سمجھتے تھے کہ قرأتِ فاتحہ کا حکم مقتدی کے لیے نہیں ہے اسی لیے انہوں نے کہا اِنَّا نَکُوْنُ وَرَاءَ الْاِمَامِ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ امام کے پیچھے قرأت نہ کرنے کا معاملہ شائع وذائع اور مشہور معروف تھا۔ اور حضرت ابوہریرہؓ نے اس کا جو جواب دیا اس سے بھی واضح طور پر مقتدی کے لیے قرأتِ فاتحہ کا حکم نہیں نکلتا کیوں کہ انہوں نے فرمایا اِقْرَأْ بِھَا فِیْ نَفْسِکَ۔ اسے اپنے دل میں پڑھو یعنی اس کے الفاظ و معانی پر غور کرتے رہو۔ پھر قرأتِ فاتحہ کی تاکید کے لیے انہوں نے حضورؐ کا جو ارشاد نقل کیا اس سے فاتحہ کی اہمیت تو واضح ہوئی لیکن مقتدی کے لیے اس کی قرأت کا حکم اس میں نہیں ہے۔

علاوہ ازیں اس حدیثِ قدسی یعنی قسمت الصَّلٰوۃَ سے واضح ہوگیا کہ بِسْمِ اللّٰہ سورۃ فاتحہ کا جز نہیں ہے اور اس کے بغیر اس کی سات آیتیں ہیں: تین خالص خدا کے لیے، تین خالص بندے کے لیے اور ایک دونوں میں نصفا نصف ہے۔ اس حساب کے بغیر تنصیف ہو ہی نہیں سکتی۔ پس یہ حدیث اس لحاظ سے بھی حنفیہ کے مسلک کی تائید میں ہے۔

اور یہ جو فرمایا کہ ایاک نعبد وایاک نستعین خدا اور بندے کے درمیان نصفا نصف ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں عبادت تو خدا کے لیے ہے اور استعانت (دعا وغیرہ) کا فائدہ بندے کو پہنچتا ہے اور اھدنا الصراط المستقیم سے لے کر آخر تک تین آیتیں ہیں ورنہ نصفین نہیں ہو سکتے۔[1]

اقرأبھا فی نفسک کا معنی اگر یہ لیا جائے کہ الفاتحہ کو آہستہ آہستہ پڑھ لیا کرو تو حدیث کا یہ حصہ شافعیہ کے مسلک کی تائید میں ہوگا۔ لیکن یہ اس صورت میں صرف ایک صحابی کا قول ہے نہ کہ حدیثِ مرفوع۔ اور اس میں جہری یا سری کا ذکر بھی نہیں۔ عین ممکن ہے کہ پوچھنے والے کی غرض یہ ہو کہ ہم سری نماز میں امام کے پیچھے پڑھیں یا نہ پڑھیں۔ اس صورت میں یہ حدیث امام مالکؒ، امام احمدؒ اور حنفیہ میں سے امام محمدؒ کے مسلک کی تائید کرتی ہے۔ نہ کہ شافعی مسلک کی۔ چنانچہ[3] امام مالکؒ نے مؤطا میں اسے سری نماز پر ہی محمول

---

[1] مظاہر حق ج ا صـ ۲۹۲، مرقات ج ۲ صـ ۲۸۴ ۔ [2] ایضاً، مرقات صـ ۲۸۵۔

[3] مؤطا مع شرح مصفّٰی ج ا صـ ۱۰۶۔

فرمایا ہے۔

حدیث ۳ : وعن انس رضی اللہ عنہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم وابابکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ کانوا یفتتحون الصلوٰۃ بالحمد للہ رب العٰلمین رواہ مسلم۔

ترجمہ : حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نماز کو الحمد للہ رب العٰلمین کے ساتھ شروع کیا کرتے تھے۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا۔

شرح : اس[1] حدیث کے ظاہری الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور اور شیخین رضی اللہ عنہما نماز میں جہر سے بسم اللہ پڑھتے ہی نہ تھے لیکن بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا پڑھنا متفق علیہ ہے۔ اور کسی کو اس میں اختلاف نہیں ہے۔ اختلاف صرف بسم اللہ کے جہراً یا سراً پڑھنے میں ہے۔ پس یہ حدیث حنفیہ کے مسلک کی دلیل ہے کہ نماز میں قرأت الحمد للہ رب العٰلمین سے شروع کی جائے جیسا کہ دوسری روایاتِ صحیحہ میں بھی آیا ہے۔

موطا[2] میں امام مالک رحمہ اللہ باب لایقرأ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اذا افتتح الصلوٰۃ کے تحت میں یہی حضرتِ انس رضی اللہ عنہ کی روایت لائے ہیں۔ ان کے اس باب سے معلوم ہوتا ہے کہ بسم اللہ بالکل نہ پڑھنی چاہیئے اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے امامِ مالک رحمہ اللہ کا یہی مسلک بیان کیا ہے کہ بسم اللہ نہ جہراً پڑھی جائے نہ سراً۔ اور کچھ لوگوں نے حدیث کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ حضور اور شیخین رضی اللہ عنہما بسم اللہ ایسے طریقے سے نہ پڑھتے تھے کہ سنی جائے، پس یہ اخفاء پر دلالت کرتی ہے مطلقاً نفی قرأت پر نہیں۔ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مجھے کوئی ایسی دلیل نہیں مل سکی جس سے بسم اللہ کے خفیہ پڑھنے کا ثبوت ملتا۔ اور امامِ شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک بسم اللہ سورۃ فاتحہ کا جزء ہے اور اس کی قرأت فرض ہے، پس جہری نماز میں اسے بالجہر اور سری میں سراً پڑھنا مسنون ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک جہری اور سری دونوں قسم کی نمازوں میں بسم اللہ کو خفیہ پڑھنا چاہیئے۔ اور یہ حدیث اس باب کی دلیل ہے کہ بسم اللہ[3] آیتِ قرآنی ہونے کے باوجود سورۃ فاتحہ یا کسی اور سورۃ کا جزء نہیں بلکہ یہ ایک مستقل آیت ہے جو ہر جگہ آیتِ قرآنی ہے اور سورتوں میں فصل کے لیے اترتی رہی ہے۔

امام[4] شافعی رحمہ اللہ نے اس حدیث کی تاویل یہ بیان کی ہے اَلحَمدُ للہِ رَبِّ

---

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۲۹۲ [2] مصفّٰی ومسوّٰی ج ۱ ص ۱۰۵ [3] فتح الباری ج ۳ ص ۸۰

[4] مرقات ج ۲ ص ۳۸۵ ، مظاہر حق ج ۱ ص ۲۹۲

العٰلمین سے مراد آیت سورۃ نہیں بلکہ یہ سورۃ کا عنوان ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ حضورؐ اور شیخینؓ ثناء و دعاء کے بعد سورۃ الحمد شروع فرماتے تھے اور چونکہ بسم اللہ بھی اس سورت کا جز ہے لہذا اسے بھی بالجہر ہی پڑھتے ہوں گے۔

علامہؒ شوکانیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی صحیحین کی روایت میں یہی الفاظ ہیں کہ: کانوا یستفتحون بالحمد للہ رب العلمین اور مسلم کے الفاظ ہیں لا یجھرون یا لا یذکرون بسم اللہ الخ اور ابن خزیمہ کے الفاظ ہیں یُسِرُّون اور مسند احمد کی روایت میں ہے لم یکونوا یستفتحون القراءۃ ببسم اللہ الرحمن الرحیم۔ اور علماء کوفہ اور جناب عمرؓ و علیؓ اور عمارؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ اور امام باقرؒ اور حسن بصریؒ اور ابن سیرینؒ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور عبداللہ بن زبیر اور سفیان ثوریؒ، حمادؒ، امام اوزاعیؒ، ابو حنیفہؒ، احمد بن حنبلؒ، ابو عبیدؒ، اور امام ابراہیم نخعیؒ کا مسلک بھی یہی ہے اور احادیث دونوں طرف موجود ہیں۔ اس کے بعد علامہ موصوفؒ نے دونوں طرف کی کچھ احادیث بیان کی ہیں اور ان پر محدثانہ کلام فرمایا ہے اور لکھا ہے کہ اس باب میں اختلاف صرف مستحب یا مسنون کا ہے، کسی کے ہاں بھی بالجہر یا خُفیہ پڑھنے سے نماز کے بطلان یا فساد کا حکم نہیں ہے۔ اور خود علامہ موصوفؒ کا یہ مسلک معلوم ہوتا ہے کہ کبھی سرًا اور کبھی جہرًا پڑھی جائے، اور اسی پر انہیں اصرار بھی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

علامہؒ ابن حجرؒ نے اس حدیث پر طویل کلام کیا ہے لیکن اس کی صحت سے انکار نہیں کر سکے اور یہ کہہ کر رہ گئے کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ حضرات بسم اللہ پڑھتے ہی نہ تھے جیسا کہ مالکیہ کا مسلک ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ خُفیہ پڑھتے تھے اور یہی بعض حنفیہ کا مسلک ہے۔

حدیث ۴: وعن ابی ھریرۃؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا أمن الامام فامنوا فانہ من وافق تامینہ تامین الملائکۃ غفرلہ ماتقدم من ذنبہ۔ متفق علیہ۔ وفی روایۃ قال اذا قال الامام غیر المغضوب علیہم ولا الضّالّین فقولوا آمین فانہ من وافق قولہ قول الملائکۃ غفرلہ ما تقدم من ذنبہ۔ ھذا لفظ البخاری ولمسلم نحوہ وفی اخری للبخاری قال اذا امن القاری فامنوا فان الملائکۃ تؤمّن

فمن وافق تامینہ تامین الملائکۃ غفر لہ ماتقدم من ذنبہ۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو کیوں کہ جس کا آمین کہنا فرشتوں کے آمین کہنے کے موافق ہو جائے اس کے پہلے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔ اس حدیث پر بخاری و مسلم کا اتفاق ہے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ امام جب غیر المغضوب علیھم ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو کیوں کہ جس کا قول ملائکہ کے قول کے موافق پڑ جائے اس کے سب پہلے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔ یہ بخاری کے الفاظ ہیں اور مسلم کے الفاظ بھی اسی کے مانند ہیں۔ اور بخاری کی ایک اور روایت میں ہے حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ جب قاری آمین کہے تم بھی آمین کہو کیوں کہ فرشتے بھی آمین کہتے ہیں۔ پس جس کا آمین کہنا فرشتوں کے آمین کہنے کے موافق پڑ جائے اس کے پہلے گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔

شرح: ان احادیث میں ایک اور معرکۃ الآراء مسئلہ بیان ہوا ہے لیکن اس کا اختلاف قراءتِ فاتحہ اور رفع یدین والے اختلاف سے کچھ ہلکا ہے کیوں کہ اس مسئلہ میں صرف جواز و استحباب میں کلام ہوا ہے اور بالجہر یا بالسر آمین کہنے سے کسی کے نزدیک بھی نماز پر کسی طرح کا کوئی اثر بھی نہیں پڑتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آمین کہنے میں اختلاف نہیں۔ اختلاف صرف جہر اور اخفاء کا ہے۔ اس مسئلہ میں ائمہ فقہ و حدیث کے مسالک یہ ہیں: امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک امام اور مقتدی دونوں آہستہ آہستہ آمین کہیں۔ امام مالکؒ سے بھی ایک روایت یہی ہے اور ان کا مشہور مسلک یہی ہے کہ امام آمین نہ کہے اور مقتدی آہستہ کہیں اور امام اعظمؒ سے بھی ایک روایت یہی ہے۔ گویا اس مسئلہ میں حنفیہ اور مالکیہ متفق ہیں۔ امامِ شافعیؒ کا مسلک قولِ قدیم کے مطابق یہ ہے کہ امام اور مقتدی دونوں بالجہر آمین کہیں اور قولِ جدید یہ ہے کہ امام تو بالجہر کہے لیکن مقتدی آہستہ کہیں۔ امام احمدؒ کے نزدیک آمین بالجہر ہے لیکن تفصیل کا ہمیں علم نہیں۔[۱]

حضرت سید انور شاہؒ الکشمیری فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آمین کا بآواز بلند ہونا بطریقِ تعلیم و ارشاد ثابت ہے نہ کہ بطریقِ سنیت۔ اور بطریقِ تعلیم آمین بالجہر ہی نہیں بلکہ احیاناً بسم اللہ بھی بلند آواز سے حنفیہ کے نزدیک جائز ہے اور امام ابو[۲] یوسف فرماتے ہیں کہ قنوتِ نازلہ میں آمین بالجہر جائز ہے اور اکثر سلف اسے آہستہ کہتے

---

۱ فیض الباری ج ۲ ص ۲۹۰، ۲۹۱۔ ۲ ایضاً۔

تھے جیسا کہ امام ابن جریر طبریؒ سے الجوہر النقی میں بیان کیا گیا ہے: "جہر و سر کی دونوں، احادیث صحیح ہیں اور ہر ایک پر علماء کی ایک جماعت کا عمل ہے لیکن سر مختار ہے کیوں کہ اکثر صحابہؓ وتابعینؒ کا اس پر عمل تھا۔" تمام دلائل کو جمع کیا جائے تو خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ آمین بالجہر جائز ہے اور اس کا اخفاء سنت ہے اور یہی میرے نزدیک مختار ہے۔

صاحب مشکوٰۃ نے تین احادیث کو جمع کیا ہے:

ا۔ اذا امّن الامام فامّنوا۔

ب۔ اذا قال الامام غیر المغضوب علیہم ولا الضّالین فقولوا آمین۔

ج۔ اذا امّن القاری فامّنوا۔

شافعیہ[1] نے پہلی حدیث سے استدلال کیا ہے کیوں کہ وہ ان کے نزدیک امام اور مقتدی دونوں کے آمین بالجہر میں صریح ہے لیکن ان کا یہ قول اذا کبّر فکبّروا میں نہیں چل سکے گا۔ کیوں کہ اس کا مطلب یقیناً یہ نہیں کہ جب امام بلند آواز سے اللہ اکبر کہے تو تم بھی بآواز بلند ہی اللہ اکبر کہو۔ ظاہر ہے کہ اس کا کوئی بھی قائل نہیں پھر اس لفظ سے بالجہر کیسے نکل آیا؟ کیوں نہ یہ کہا جائے کہ جب قرأت ختم ہوتی ہے تو حسب قاعدۂ نماز امام آمین کہتا ہے اے مقتدیو تم بھی آمین کہا کرو۔ پس اس میں بالجہر کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

دوسری حدیث سے امام مالکؒ نے (مطابق مذہب مشہور) استناد کیا ہے کہ حضورؐ نے امام اور مقتدی کے درمیان ان کے وظائف کی تقسیم کردی ہے کہ امام تو غیر المغضوب علیہم الخ کہے اور مقتدی آمین کہیں، جیسے کہ حدیث میں اذا قال الامام سمع اللہ لمن حمدہ فقولوا ربنا ولک الحمد آیا ہے اور اس پر پہلے بحث ہو چکی ہے پھر چونکہ مقتدیوں کو صرف آمین کا حکم ہے بالجہر کا نہیں لہذا انہیں آہستہ آمین کہنا چاہیئے۔ نیز اسی حدیث کی روایت میں نسائی نے یہ الفاظ بھی بیان کیے ہیں کہ فان الامام یقولہا یعنی امام تو قرأت کے بعد آمین کہتا ہے اے مقتدیو تم بھی کہو۔ اور ظاہر ہے کہ امام کو اگر بالجہر کا حکم ہوتا تو یہ خبر کہ فان الامام یقولہا بیکار تھی۔ پس معلوم ہوا کہ امام بالسر کہتا ہے اور یہی حکم مقتدیوں کو بھی ہے۔

رہی[2] تیسری حدیث اس کے الفاظ میں القاری کا لفظ ہے امام کا نہیں، لہذا یہ اپنے مطلب میں واضح نہیں۔ نیز اس میں بھی بالجہر کا کوئی ذکر نہیں۔ اور ذخیرۂ حدیث میں کہیں کوئی ایسا حکم نہیں آیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتدیوں کو آمین بالجہر کا حکم فرمایا تھا۔

---

[1] فیض الباری ج ۲ ص ۲۹۱، ۲۹۴۔ [2] فیض الباری ج ۲ ص ۲۹۴۔

جس نے بھی بالجہر کہا ہے اپنی رائے سے کہا ہے اور حدیث پر اضافہ کیا ہے اور سُنّت ہونا شارع کی طرف سے حکم کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اور چوں کہ اس باب میں کوئی مرفوع حدیث واضح نہیں ہے لہٰذا ہم دعا کی اصل سنت کو دیکھتے ہیں تو وہ از روئے قرآن خفیہ ہوتی ہے؛ ادعوا ربکم تضرعًا وخفیۃ۔ الآیۃ) واذکر ربك فی نفسك تضرعًا وخیفۃ۔ الآیۃ۔ پس ہم نے اس ہدایت پر عمل کر لیا اور آمین کو آہستہ کہنے کے قائل ہوئے ہیں۔ واللہ اعلم۔

امام بخاریؒ[1] بھی شاید اس حقیقت سے آگاہ تھے لہٰذا انہوں نے باب جہر الامام بالتامین کے ترجمۃ الباب میں حضرت عبداللہ بن الزبیرؓ کا عمل درج کیا ہے لیکن شارحین حدیث کہتے ہیں کہ یہ قنوتِ نازلہ کا معاملہ تھا جس میں ہمارا بھی اختلاف نہیں اور پھر یہ ایک صحابیؓ کا فعل ضرور ہے لیکن حضورؐ کی سنت اسے کہنا اور اس پر اس حیثیت سے اصرار کرنا شاید انصاف کا تقاضا نہ ہی سمجھا جائے گا۔ علاوہ ازیں ان احادیث گزشتہ میں فرمایا گیا ہے کہ جس کا قول ملائکہ کے قول کے موافق ہو گا اس کے گناہ معاف ہوں گے اور ظاہر تو یہی ہے کہ یہ الفاظ بھی آمین بالسر پر ہی دلالت کرتے ہوں کیوں کہ ملائکہ آمین کہتے تو یقینًا ہیں کیوں کہ حضورؐ نے خبر دے دی ہے لیکن ہم ملائکہ کی تامین کو سنتے نہیں۔ پس موافقت اس طرح ہو سکتی ہے کہ ہم بھی آمین خفیہ کہیں۔

آمین[2] بالخفاء کی واضح احادیث مسندِ احمدؒ، مسندِ ابی داؤد طیالسی اور مستدرک حاکم میں موجود ہیں گو ان میں سے بعض میں کلام بھی کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۵: وعن ابی موسی الاشعری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا صلیتم فاقیموا صفوفکم ثم لیؤمکم احدکم فاذا کبر فکبروا واذا قال غیر المغضوب علیھم ولا الضالین فقولوا آمین یحببکم اللہ فاذا کبر ورکع فکبروا وارکعوا فان الامام یرکع قبلکم ویرفع قبلکم فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتلك بتلك قال واذا قال سمع اللہ لمن حمدہ فقولوا اللھم ربنا لك الحمد یسمع اللہ لکم۔ رواہ مسلم۔ وفی روایۃ لہ عن ابی ھریرۃؓ وقتادۃؓ واذا قرأ فانصتوا۔

---

[1] بخاری مع فتح الباری ج ۳ ص ۴۲۵۔ [2] نصب الرایہ للزیلعیؒ ج ۱ ص ۳۶۹۔

ترجمہ: حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب تم نماز پڑھو تو اپنی صفیں درست کرو پھر تم میں سے ایک تمہارا امام بنے پس جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب وہ غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو اللہ تعالیٰ تمہاری دعا قبول فرمائے گا۔ پس جب امام تکبیر کہے اور رکوع کرے تو تم بھی تکبیر کہو اور رکوع کرو کیونکہ امام تم سے پہلے رکوع کرتا ہے اور تم سے پہلے سر اٹھاتا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ پہلے اٹھنا اس پہلے رکوع میں جانے کے بدلے میں ہے۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا اور جب امام سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو تم اللّٰھم ربنا لک الحمد کہو اللہ تعالیٰ سُن لے گا۔ اسے مُسلم نے روایت کیا اور اس کی ایک روایت میں ہے جو حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے اور قتادہؓ سے کہ جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔

شرح: اس حدیث میں صفیں سیدھی کرنے کا حکم ہے۔ صفوں میں کوئی کجی اور دراڑ نہ رہنے دینا مسنون ہے۔ اور مقتدی کے آداب و فرائض بیان فرمائے گئے ہیں اس حدیث سے ثابت ہوا کہ امامؑ کی مطابقت واجب ہے۔ اور یہاں فرمایا ہے کہ تم میں سے ایک شخص تمہارا امام بنے اور دوسری روایت میں پہلے گزر چکا ہے کہ تم میں جو بڑا یعنی افضل ہو وہ امام بنے۔ دونوں حدیثوں میں اختلاف نہیں کیوں کہ اس جگہ بیانِ جواز ہے کہ کوئی بھی امام بن جائے نماز جائز ہو گی۔ یا جیسا کہ شارحینِ حدیث کہتے ہیں کہ وہ لوگ عموماً فضیلت[۲] وغیرہ میں برابر تھے اس لیے آپؐ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی بھی امام بن سکتا ہے۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ امام تو غیر المغضوب علیہم الخ کہے اور مقتدی آمین کہیں اور بالجہر کا ذکر نہیں ہے۔ لہٰذا حدیث کا یہ حصہ امام مالکؒ کے مشہور مسلک اور امام ابو حنیفہؒ کی اس روایت کے عین مطابق ہے کہ امام آمین نہ کہے۔ اور یہ[۳] جو فرمایا کہ فتلک بتلک اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح امام پہلے جھکتا ہے اسی طرح پہلے سر بھی اٹھاتا ہے اور مقتدی جس طرح دیر سے جھکتے ہیں اسی طرح دیر سے اٹھتے بھی ہیں۔ پس امام اور مقتدی کا رکوع برابر ہو گیا اور کسر نکل گئی۔ علاوہ ازیں امام کا وظیفہ سمع اللہ لمن حمدہ فرمایا اور مقتدی کا وظیفہ اللّٰھم ربنا لک الحمد کہنا قرار دیا ہے۔ اس پر اس سے پہلے بھی گفتگو ہو چکی ہے۔

[۴] عن ابی ھریرۃ وقتادۃ۔ ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ مُسلم نے واذا قرأ

---

[۱] مرقات ج ۲ ص ۲۸۔ [۲] ایضاً۔ [۳] مظاہر حق ج ۱ ص ۲۹۳، ایضاً مرقات
[۴] ایضاً مرقات، مظاہر حق ج ۱ ص ۲۹۴

فانصتوا کی زیادتی ابو ہریرہؓ کی روایت سے بیان کی ہے حالاں کہ ایسا نہیں ہے بلکہ امام مسلم سے پوچھا گیا تھا کہ ابو موسیٰؓ کی روایت میں تو یہ زیادتی واذا قرأ فانصتوا نہیں ہے اور حدیث ابو ہریرہؓ میں موجود ہے تو کیا یہ زیادتی صحیح ہے؟ تو امام مسلم نے اس زیادتی کی صحت کا اقرار کیا تھا۔ حدیث کا یہ حصہ حنفیہ کے مسلک کی تائید کرتا ہے اس لیے اس پر بہت قیل وقال کیا گیا ہے۔ پیچھے فاتحہ خلف الامام کی بحث میں گزر چکا ہے کہ حنفیہ کے پاس اپنے مسلک کے لیے کافی ووافی دلائل موجود ہیں اور جہری نماز میں مالکیہ اور حنبلیہ بھی ان کے ہم نوا ہیں اور امام شافعیؒ بھی آخری دو سالوں کے سوا عمر بھر جہری نمازوں میں اسی مسلک پر کاربند رہے تھے۔ لیکن مقامِ افسوس ہے کہ شارحین حدیث اگر حنفیہ کے مسلک کا رد کرنے پر آئیں تو مسلم کی مسلمہ صحیح روایت کو بھی اڑا دینے سے دریغ نہیں فرماتے۔ کچھ بھی ہو یہ روایت قرآن کی اس آیت کے عین مطابق ہے کہ اذا قرئ القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا۔ لہٰذا اول تو اس کی صحت میں شک نہیں، بالفرض اگر امام نوویؒ وغیرہ کی جرح کو مان بھی لیا جائے تو بھی آیتِ قرآنی کا اٹل استدلال تو اپنی جگہ پر قائم ہے۔ اور دوسرے حدیثی دلائل اس کی تائید ونصرت کے لیے موجود ہیں۔

بعض مرحوم بزرگ قرآنِ پاک کی اس آیت کی تفسیر میں یہ دور کی کوڑی لاتے تھے کہ اس کا خطاب کفار ومشرکین سے ہے مسلمان اس کے مخاطب ہی نہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مقامِ حیرت وافسوس ہے کہ جن کا قرآن کی حرمت وتقدیس پر ایمان ہی نہیں وہ تو اس کے مخاطب ٹھہریں اور جن کی ہدایت ورہنمائی کے لیے قرآن اترا تھا وہی اس کے خطاب سے باہر ہو جائیں ـــــ چہ خوش!

ع جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے۔

حدیث ۶ : وعن ابی قتادۃؓ قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقرأ فی الظھر فی الاولیین بام الکتاب وسورتین وفی الرکعتین الاخریین بام الکتاب ویُسمعنا الآیۃ احیاناً۔ ویطول فی الرکعۃ الاولیٰ مالا یطیل فی الرکعۃ الثانیۃ وھٰکذا فی فی العصر وھٰکذا فی الصبح۔ متفق علیہ۔

ترجمہ : حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کی نماز میں پہلی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ اور اور دو سورتیں پڑھتے تھے (یعنی ہر رکعت میں ایک ایک سورت) اور پچھلی دو رکعتوں میں صرف سورۂ فاتحہ پڑھتے۔ اور

کبھی کبھی ہمیں آیت سنا دیتے تھے اور پہلی رکعت کو دوسری کی نسبت زیادہ طویل کرتے تھے اور اسی طرح عصر میں اور اسی طرح صبح کی نماز میں۔ متفق علیہ۔

شرح : الآیۃ احیاناً سری نماز میں محض تعلیماً یا اعلاناً تاکہ مقتدی جان جائیں کہ امام قرأت کر رہا ہے اور اکتا ئیں نہیں، کبھی کبھی بالجہر کوئی آیت سنا دینا حنفیہ کے ہاں بھی اس حدیث کی رو سے جائز ہے ورنہ سری نمازوں میں قرأت آہستہ کرنا ہی واجب ہے۔ جس طرح کہ جہری نمازوں میں بالجہر پڑھنا واجب ہے۔ حافظ ابنِ حجرؒ نے اس مقام پر طنزیہ لہجے میں حنفیہ پر چوٹ کی ہے کہ "جو لوگ کہتے ہیں اس سے سہو واجب ہو جاتا ہے چاہے سہواً پڑھ جائے یا مطلقاً یعنی سہو کی قید کے بغیر"۔ حالاں کہ حضورؐ کا یہ فعل حافظ صاحب خود بھی مانتے ہیں کہ بغرضِ تعلیم و اعلام تھا۔ معلوم نہیں پھر اس میں، اختلافی مسئلہ کونسا تھا جس کے لیے حضرت حافظ صاحبؒ نے یہ الفاظ تحریر فرمائے ہیں۔

اور اس حدیث میں پہلی رکعت کو دوسرے سے زیادہ لمبا کرنے کا واضح ثبوت ہے حنفیہ کا عمل اسی پر ہے۔ شافعی حضرات خود اس بارے میں مختلف ہیں۔ حنفیہ بالخصوص نمازِ فجر میں پہلی رکعت کو زیادہ طویل کرنے کے قائل ہیں کیوں کہ وہ غفلت اور نیند کا وقت ہے پس تکثیر جماعت کے لیے ایسا کرنا مسنون و مستحب ہے۔ امام محمدؒ تمام نمازوں میں اسی پر عمل کے قائل ہیں اور یہی مسلک زیادہ ظاہر اور واضح ہے[۵]۔

حدیث ۷ : وعن ابی سعیدؓ الخدری قال کنا نحزر قیام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الظھر والعصر فحزرنا قیامہ فی الرکعتین الاولیین من الظھر قدر قراءۃ الٓمٓ تنزیل السجدۃ وفی روایۃ فی کل رکعۃ قدر ثلاثین آیۃ وحزرنا قیامہ فی الاخریین قدر النصف من ذلک وحزرنا فی الرکعتین الاولیین من العصر علی قدر قیامہ فی الاخریین من الظھر وفی الاخریین من العصر علی النصف من ذلک۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ : حضرت ابو سعیدؓ خدری فرماتے ہیں کہ ظہر اور عصر کی نمازوں میں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام کا اندازہ لگاتے تھے۔ سو ہم نے ظہر کی پہلی دو رکعتوں کے آپؐ کے قیام کا اندازہ کیا کہ وہ سورۂ الٓمٓ تنزیل السجدۃ کے پڑھنے کے برابر تھا۔

---

[۱] مرقات ج ۲ ص ۲۸۹، مظاہر حق ج ۱ ص ۲۹۴، فیض الباری ج ۲ ص ۲۸۴۔

[۲] فتح الباری ج ۳ ص ۲۲۴۔ [۳] فتح الباری ج ۳ ص ۲۱۶، [۴] مظاہر حق ج ۱ ص ۲۹۴، مرقات ج ۲ ص ۲۸۹۔ [۵] فیض الباری ج ۲ ص ۲۸۴۔

اور ایک روایت میں ہے کہ ہر رکعت میں تیس آیتوں کے برابر تھا۔ اور ہم نے پچھلی دو رکعتوں میں آپؐ کے قیام کا اندازہ لگایا کہ وہ پہلی رکعتوں کے نصف کے برابر تھا۔ اور عصر میں ہم نے آپؐ کا پہلی دو رکعتوں کا قیام ظہر کی پچھلی دو رکعتوں کے برابر جانچا اور عصر کی پچھلی دو رکعتوں کا قیام اس سے بھی نصف کے اندازے پر تھا۔ اس حدیث کو امامِ مسلم نے روایت کیا۔

شرح: سورۂ السجدہ کی آیات بھی ۲۹ ہیں۔ پس دوسری روایت کا لفظ فی کل رکعۃٍ قدر ثلاثین اٰیۃ بھی بالکل پہلی کے مطابق ہے۔ اس حدیث میں ظہر کی دونوں پہلی رکعتوں کی قرأت ایک جیسی بتائی گئی ہے اور گزشتہ روایت میں گزرا ہے کہ پہلی رکعت دوسری کی نسبت سے زیادہ طویل ہوتی تھی۔ سو معلوم ہوتا ہے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے اور کبھی ویسا۔ اور جس طرح بھی کیا جائے سنت ہوگا۔ ہاں افضل و مستحب میں کلام ہو سکتا ہے۔ تو اس سلسلے میں ائمہ اسلام نے اپنے دلائل کی بناء پر ایسا کیا ہے۔

اس حدیث میں یہ جو فرمایا گیا ہے کہ ظہر کی پچھلی دو رکعتیں پہلی سے تقریباً نصف ہوتی تھیں تو اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کبھی کبھی ظہر و عصر کی (یا شاید اور نمازوں میں بھی) پچھلی رکعتوں میں بھی الفاتحہ کے ساتھ سورت ملایا کرتے تھے لیکن اوپر کی روایت میں صراحۃً صرف سورۂ فاتحہ ہی پڑھنے کا ذکر آیا ہے۔ امام شافعیؒ کا قولِ جدید اسی کے موافق ہے لیکن شافعیہ کا فتویٰ قولِ قدیم پر ہے کہ پچھلی دو رکعتوں میں صرف سورۂ فاتحہ پڑھنی چاہیے اور یہی مسلک حنفیہ کا بھی ہے۔ پس اس حدیث سے جو سورت کا ملانا معلوم ہوتا ہے شاید کبھی کبھی بیانِ جواز کے لیے ایسا کرتے تھے۔ سب ائمہ مجتہدین کے نزدیک آخری دو رکعتوں میں صرف سورۂ فاتحہ پر اکتفاء کرنا سنت ہے، اگو حنفیہ سکوت یا تسبیح کے جواز کے بھی قائل ہیں لیکن قرأت افضل ہے۔ چونکہ اس حدیث میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ اور سورت ملانے کا بھی ثبوت ہے لہٰذا آخری رکعات میں سورت پڑھنے سے سجدۂ سہو نہیں آئے گا۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ ان رکعات میں فاتحہ کے ساتھ سورۃ ملانا مکروہ نہیں گو ترک اس کا افضل ہے۔ اور شاید اس حدیث یا اسی قسم کی اور روایات کی وجہ سے حسن بن زیادؒ کی روایت عَنْ اَبِیْ حَنِیْفَۃَ میں پچھلی رکعتوں میں سورت ملانا واجب آیا ہے گو فتویٰ حنفیہ کا بھی اس میں شافعی مسلک کے مطابق ہے۔

حدیث ۸: وعن جابرؓ بن سمرۃ قال کان النبی صلی اللہ علیہ و

۱؎ مظاہر حق ج ۱ ص ۲۹۵، مرقات ج ۲ ص ۲۸۹ ۲؎ ایضاً، ایضاً۔ ۳؎ فیض الباری ج ۲ ص ۲۹۰، ایضاً مظاہر حق۔

سلم یقرأ فی الظھر باللیل اذا یغشیٰ وفی روایۃ سبح اسم ربک الاعلیٰ وفی العصر نحو ذلک وفی الصبح اطول من ذلک ۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ : حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ظہر میں واللیل اذا یغشیٰ اور ایک روایت میں ہے کہ سبح اسم ربک الاعلیٰ پڑھتے تھے اور عصر میں بھی اسی کی مانند اور صبح میں اس سے لمبی قرأت کرتے تھے۔ اسے مسلم نے روایت کیا۔

شرح : سورت[1] تو ایک بیان ہوئی ہے لیکن قرأت دو رکعتوں میں ہوتی ہے۔ پس یا تو ایک سورت کو دونوں رکعتوں میں دہراتے تھے یا کچھ آیتیں پہلی رکعت میں اور بقیہ دوسری میں پڑھتے تھے۔ یہ دونوں صورتیں جائز ہیں لیکن بعید ہیں۔ بظاہر صحابی نے صرف ایک ہی رکعت کی قرأت بتانے پر اکتفاء کیا ہے۔ اور یہ حدیث چھوٹی سورتیں بتا رہی ہے پس ضرورت کے موقع پر محمول ہوگی۔ علماء[2] نے کہا ہے کہ احادیث میں مقدار قراءت کا اختلاف حالات کے اختلاف کی وجہ سے ہوا ہے۔ یا صحابہ[3] کی حالت دیکھ کر ایسا کرتے تھے جب ان میں نشاط محسوس فرماتے تو طویل قرأت فرماتے ورنہ مختصر کر دیتے۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ امام کو ہلکی نماز پڑھانے کا حکم ہے کیوں کہ مقتدیوں میں بیمار، کمزور، بوڑھے مسافر اور حاجت مند سبھی قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ پس معاملہ دراصل حالات و ظروف پر مبنی ہوا۔ آپؐ کی مختلف اوقات کی قرأت احادیث میں مختلف آئی ہے۔ احادیث میں ہے کہ صبح کی نماز میں آپؐ نے سورۂ المؤمنون اور الروم، یٰسٓ، الواقعہ، قٓ، اذا زلزلت اور معوذتین پڑھی ہیں۔ ظہر میں لقمان، تنزیل السجدہ، الذاریات، البروج، الطارق، الاعلیٰ، الغاشیہ، الشمس، اللیل کا ذکر آیا ہے اور بعض آیات کو تعلیماً بالجہر پڑھا ہے۔ عصر کی نماز میں البروج، الطارق، الاعلیٰ اور الغاشیہ ثابت ہوئی ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۹ : وعن جبیر ابن مطعمؓ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقرأ فی المغرب بالطور۔ متفق علیہ۔

ترجمہ : حضرت جبیرؓ بن مطعم فرماتے ہیں کہ میں نے حضورؐ کو مغرب کی نماز میں سورۂ والطور پڑھتے ہوئے سنا۔ حدیث متفق علیہ ہے۔

شرح : نمازِ مغرب میں بوجہ قلت وقت کے اختصارِ قرأت مستحب ہے پس یا تو حضورؐ نے سورۂ والطور کا کچھ حصہ پڑھا ہوگا (گو ایک رکعت میں پوری سورت پڑھنا افضل

---

[1] مظاہر حق ج ا ص ۲۹۵۔ [2] مرقات ج ۲ ص ۲۹۰۔ [3] فیض الباری ج ۲ ص ۲۹۵، مرقات ج ۲ ص ۲۹۰۔

ہے لیکن کچھ حصے کے جواز میں کوئی شبہ نہیں)۔ لیکن اگر ساری سورت ایک یا دو رکعتوں میں پڑھی تھی تو جواز میں کوئی کلام نہیں ہے بشرطیکہ لوگوں پر گراں نہ گذرے اور ستارے اچھی طرح آسمان پر ظاہر نہ ہو جائیں لیکن حیرت ہے کہ امام ابوداؤدؒ نماز مغرب میں قرأت طویل کرنے کے منسوخ ہو جانے کے قائل ہیں۔

حدیث ۱۰: وعن ام الفضلؓ بنت الحارث قالت سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقرأ فی المغرب بالمرسلاتِ عُرفاً۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت ام الفضلؓ بنت حارث فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نمازِ مغرب میں سورۂ والمرسلات پڑھتے سُنا۔ متفق علیہ۔

شرح: یعنی کبھی کبھی ایسا ہوا ورنہ مغرب میں چھوٹی سورتوں کا پڑھنا مستحب ہے جیسا کہ ابھی گذرا۔ یہ اُم الفضلؓ حضرت ابن عباسؓ کی والدہ تھیں اور انہوں نے حضورؐ کی مرض الوفات میں آپؐ کو والمرسلات مغرب میں پڑھتے سنا تھا۔ حافظ ابن حجرؒ نے حضورؐ کا مغرب میں یہ سورتیں پڑھنا لکھا ہے: الانفال، الدخان، القتال، الاعلیٰ، الکافرون، التین، القارعہ اور مشکوٰۃ کے اس باب میں دوسری فصل میں الاعراف بھی آئی ہے۔ ان میں بڑی چھوٹی دونوں قسم کی سورتیں ہیں۔ پس یہ چیز احوال وظروف پر مبنی رہی ہے۔[1]

حدیث ۱۱: وعن جابرؓ قال کان معاذ بنؓ جبل یصلی مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم ثم یاتی فیؤم قومہ فصلی لیلۃ مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم العشاء ثم اتی قومہ فامھم فافتتح بسورۃ البقرۃ فانحرف رجل منھم فسلم ثم صلی وحدہٗ وانصرف فقالوا لہ انافقت یافلان قال لا واللہِ ولآتین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلاخبرنہ فأتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال یارسول اللہ انا اصحاب نواضح نعمل بالنھار وان معاذاً اصلی معک العشاء ثم اتی قومہ فافتتح بسورۃ البقرۃ فاقبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی معاذٍ فقال یامعاذ افتان انت اقرأ والشمس وضحاھا والضحیٰ، واللیل اذا یغشی وسبح اسم ربک الاعلیٰ۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ معاذؓ بن جبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

---

[1] فتح الباری ج ۲ ص ۲۱۷، فیض الباری ج ۲ ص ۲۸۴۔

ساتھ نماز پڑھتے تھے پھر آتے اور اپنی قوم کی امامت کرتے۔ پس ایک رات انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھی پھر اپنی قوم کے پاس آئے اور ان کی امامت کی تو سورۃ البقرۃ شروع کر دی۔ پس ان میں سے ایک آدمی جماعت سے ایک طرف ہٹ گیا اور سلام پھیر دیا پھر اکیلے نماز پڑھی اور واپس چلا گیا۔ پس لوگوں نے اسے کہا اے فلاں کیا تو منافق ہو گیا ہے؟ اس نے کہا واللہ نہیں اور میں بالضرور حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوں گا اور آپؐ کو بتاؤں گا۔ پس وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا یا رسولؐ اللہ ہم اونٹوں سے پانی کھینچ کر کھیتی باڑی کرنے والے لوگ ہیں اور دن کو کام کرتے ہیں اور معاذؓ نے آپؐ کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھی پھر اپنی قوم میں آیا اور سورۃ البقرہ شروع کر دی۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذؓ کی طرف رُخِ انور کیا اور فرمایا اے معاذؓ! کیا تم فتنہ اندازی کرنے والے ہو؟ یہ سورتیں پڑھا کرو: والشمس والضحیٰ، واللیل اور اعلیٰ۔ بخاری و مسلم کا اس حدیث پر اتفاق ہے۔

شرح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ امام کو مقتدیوں کی رعایت کرنی لازم ہے ورنہ فتنہ پڑے گا اور لوگ اس سے منحرف ہو جائیں گے۔ اور یہ حدیث پہلی احادیث کے خلاف نہیں کیوں کہ ان میں حضورؐ کے واقعات بیان ہوئے ہیں اور مسجد نبویؐ میں صحابہؓ ذوق و شوق سے حاضر ہوتے تھے اس لیے حضورؐ احیاناً لمبی لمبی سورتیں بھی پڑھتے تھے تو فتنہ کا خطرہ نہیں تھا۔

اس[1] حدیث سے شافعیہ نے استدلال کیا ہے کہ فرض پڑھنے والا نفل والے کے پیچھے نماز پڑھ سکتا ہے اور وجہ استدلال یہ ہے کہ حضرت معاذؓ حضورؐ کے ساتھ عشاء کے فرض پڑھ کر جاتے اور اپنے محلے کی مسجد میں امامت کراتے تھے۔ لیکن علامہ علی القاریؒ نے لکھا ہے کہ نیت کا معاملہ ایسا ہے جس پر اللہ کے سوا کسی کو اطلاع نہیں ہو سکتی پس آپ لوگوں نے یہ کہاں سے سمجھ لیا کہ معاذؓ حضورؐ کے ساتھ فرض پڑھ کر جاتے تھے؟ ایسا کیوں نہ ہوتا ہو گا کہ حضورؐ کے ساتھ نفل پڑھ کر جاتے ہوں اور فرض اپنے محلہ کی مسجد میں پڑھاتے ہوں تاکہ دونوں فضیلتیں حاصل ہو جائیں۔ کیونکہ حضورؐ کی مجلس میں حاضری کے باعث وہاں نماز کا وقت ہو جاتا تھا اب اگر وہ نماز میں شامل نہ ہوتے تو ان کو شکوک و شبہات کی نگاہ سے دیکھا جاتا بلکہ نفاق کی تہمت لگائی جاتی۔ پس حدیث کا یہ معنی اولیٰ ہے تاکہ سب کا اتفاق حاصل ہو جائے۔

حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز کو درمیان سے توڑنے کی صورت میں بھی جو سلام کا رواج ہے یہ بے اصل نہیں بلکہ حضورؐ کے زمانے میں ایسا ہو چکا ہے اور آپؐ نے اس سے منع نہیں فرمایا تھا۔

---

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۲۹۶، مرقات ج ۲ ص ۲۹۰۔

حدیث ۱۲ : وعن البراءؓ قال سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقرأ فی العشاء والتین والزیتون وما سمعت احداً احسن صوتا منہ ۔ متفق علیہ۔

ترجمہ : حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عشاء کی نماز میں والتین والزیتون پڑھتے سنا اور میں نے آپؐ سے بڑھکر کسی کو خوش الحان نہیں سنا ۔ متفق علیہ۔

شرح : اور ظاہر ہے کہ سورۃ تین چھوٹی سورتوں میں سے ہے ۔ پس عشاء میں چھوٹی سورت کا پڑھنا بھی ثابت ہو گیا ۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں ابن عساکر کی حدیث اس حدیث کے موافق ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب نبیوں کو خوبصورت اور خوش الحان بھیجا تھا اور تمہارے پیغمبر کو بھی خوبصورت اور خوش آواز بنا کر بھیجا ہے اور آپؐ بلند آواز بھی تھے ، دوسروں کی آواز وہاں تک نہ پہنچ سکتی تھی جہاں تک آپؐ کی آواز پہنچتی تھی ، دور دور والے لوگ بھی آپؐ کا وعظ اور خطبہ و تلاوت سن لیتے تھے ۔ اور سورۃ تین صحابی نے ایک رکعت کی قرأت میں سنی ہو گی دوسری میں کوئی اور پڑھی ہو گی۔

حدیث ۱۳ : وعن جابر بن سمرۃ قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقرأ فی الفجر بقٓ والقرآن المجید ونحوہا وکانت صلوتہ بعد تخفیفاً ۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ : حضرت جابر بن سمرۃؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز میں سورۃ قٓ پڑھا کرتے تھے اور اس کی مانند اور سورتیں ۔ اور اس کے بعد آپؐ کی نماز ہلکی ہوتی تھی ۔ اسے مسلم نے روایت کیا

شرح : اس کے بعد یعنی نماز فجر کے بعد دوسری نمازیں اتنی لمبی ہوتی تھیں ۔ یا یوں کہیے کہ پہلے پہل حضورؐ لمبی قرأت کرتے تھے پھر جب لوگ کثرت سے مسلمان ہو گئے اور کام کاج کی وجہ سے ان پہ قرأت کی تطویل گراں ہوئی تو آپؐ نے تخفیف فرما دی ۔ شارح طیبیؒ نے لکھا ہے کہ ان احادیث میں کان سے استمرار مراد نہیں ہے بلکہ حالتِ متجددہ مراد ہے جیسے کیف نکلم من کان فی المہد صبیاً (القرآن) ۔

حدیث : وعن عمرو بن حریث انہ سمع النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقرأ فی الفجر واللیل اذا عسعس ۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ : عمرو بن الحریثؓ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فجر کی نماز میں سورۃ تکویر پڑھتے سنا جس میں یہ آیت آتی ہے واللیل اذا عسعس ۔ مسلم۔

شرح : شرح السنہ میں ہے کہ امام شافعیؒ نے فرمایا کہ واللیل اذا عسعس سے مراد صرف ایک آیت نہیں بلکہ وہ سورت مراد ہے جس میں یہ آیت وارد ہوئی ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس آیت سے لیکر آخر تک سورت پڑھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت غالباً پوری پوری سورت ہر ہر رکعت میں ہوتی تھی اور آپؐ سے سورۃ کو توڑ کر پڑھنا یا تو مغرب میں (الاعراف کا) ثابت ہے جیسے دو رکعتوں میں پڑھا تھا اور یا فجر کی نماز میں البقرہ کی دو آیتیں اور آل عمران پہ پڑھی ہے لمبی قرأت طول کے لحاظ سے افضل ہے اور پوری سورت کو اور وجہ فوقیت

۱ مرقات ج ۲ ص ۲۹۲ ۔ ۲ مظاہر حق ج ا ص ۲۹۷ ۔ ۳ مرقات ایضاً ، مظاہر حق ج ا ص ۲۹۷ ۔ ۴ مرقات ج ۲ ص ۲۹۲

حاصل ہے لیکن تراویح میں قرآن کا تجزیہ اس سے مستثنیٰ ہے کیونکہ وہاں ختم قرآن مقصود ہوتا ہے۔

حدیث ۱۵: وعن عبد اللّٰہ بن السائبؓ قال صلی لنا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم الصبح بمکۃ فاستفتح سورۃ المؤمنین حتی جاء ذکر موسی وھارون او ذکر عیسیٰ اخذت النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم سعلۃ فرکع۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن السائبؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں صبح کی نماز پڑھائی پس آپؐ نے سورۂ المؤمنون شروع کی یہاں تک موسیٰؑ و ہارونؑ یا عیسیٰؑ کا ذکر آیا تو حضورؐ کو کھانسی آگئی اور آپؐ رکوع میں چلے گئے۔ مسلم۔

شرح: حسبِ روایتِ نسائیؒ یہ فتح مکہ کے زمانے کا واقعہ ہے۔ اور حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کا ذکر اس آیت میں ہے: ثم ارسلنا موسیٰ واخاہ ھارون اور عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر اس آیت میں ہے وجعلنا ابن مریم وامہٗ آیۃً۔ شارح طیبیؒ نے لکھا ہے کہ یہ کھانسی آپؐ کو شدتِ تاثر سے رونے کی وجہ سے آگئی تھی۔

حدیث ۱۶: وعن ابی ھریرۃؓ قال کان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقرأ فی الفجر یوم الجمعۃ بالٓمٓ تنزیل فی الرکعۃ الاولیٰ وفی الثانیۃ ھل اتیٰ علی الانسان۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن فجر کی نماز میں پہلی رکعت میں الٓمٓ تنزیل السجدہ اور دوسری رکعت میں سورۂ دہر پڑھتے تھے۔ متفق علیہ۔

شرح: اس حدیث میں بھی کان یقرأ کا مطلب یہ نہیں کہ بطورِ استمرار ایسا کرتے تھے۔ بلکہ خود بعض احادیث میں اس کے خلاف گزر چکا ہے پس اس کا مطلب یہی ہے کہ اکثر ایسا کرتے تھے۔ بعض شافعیہ نے جو اس پر ہمیشگی اختیار کر لی وہ مطلوبِ شرع نہیں۔ ابن دقیق العیدؒ فرماتے ہیں کہ حدیث میں کوئی دلیل اس بات کی نہیں کہ حضورؐ اس پر مداومت فرماتے تھے خود شافعی حضرات کا ایک طبقہ اس کا قائل ہے کہ امام کو کبھی کبھی یہ سورتیں نہ پڑھنی چاہییں تاکہ عوام ان کے وجوب کے قائل نہ ہو جائیں۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ بعض عوام سمجھنے لگے ہیں کہ شافعی مسلک میں صبح کی نماز کی تین رکعات ہیں (یعنی پہلی رکعت میں آیتِ سجدہ پر سجدہ کی وجہ سے) اس لیے جب امام سجدۂ تلاوت کرتا ہے تو وہ لوگ سمجھتے ہیں کہ امام نے غلطی کی پس جلدی سے رکوع کر کے پھر سجدہ میں جاتے ہیں اور دو سجدے کر کے پھر امام کے ساتھ ملتے ہیں۔ اور بعض شافعیہ نے لکھا ہے کہ امام کو کبھی کبھی یہ سجدۂ تلاوت نہ کرنا چاہیے تاکہ عوام غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔

لیکن اصل علاج وہی ہے کہ بعض دفعہ ان سورتوں کو ہی دوسری سورتوں سے بدل لیا جائے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ حضورؐ کا جمعہ کے دن کی فجر میں ان سورتوں کے سوا

۱؎ مظاہر حق ج ۱ ص ۲۹۷ ، مرقات ج ۲ ص ۲۹۴ ۔ ۲؎ ، ، ، ،

اور سورتیں پڑھنا بھی ثابت ہے۔

حدیث ۱۷: وعن عبید اللہ بن ابی رافع قال استخلف مروان اباھریرۃ علی المدینۃ وخرج الی مکۃ فصلّی لنا ابوھریرۃ الجمعۃ فقرأ سورۃ الجمعۃ فی السجدۃ الاولیٰ وفی الاخرۃ اذاجاءک المنافقون فقال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقرأبھما یوم الجمعۃ (مسلم)

ترجمہ: عبید اللہ (تابعی) جو ابورافع (صحابی) کے بیٹے ہیں فرماتے ہیں کہ مروان نے مدینہ پر ابوہریرہؓ کو اپنا نائب بنایا اور خود مکہ کو چلا گیا۔ پس ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے ہمیں جمعہ پڑھایا تو پہلی رکعت میں سورۂ جمعہ اور دوسری میں سورۂ منافقون پڑھی۔ پھر فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جمعہ کے دن یہ دونوں سورتیں پڑھتے سُنا ہے۔ اسے مسلم نے روایت کیا۔

شرح: اموی خلافت میں مروان مدینہ کے حاکم تھے یہ اسی زمانے کا ذکر ہے۔ اور جمعہ کے دن کے لفظ سے نمازِ جمعہ مراد ہے۔

حدیث ۱۸ وعن النعمانؓ بن بشیرٍ قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقرأ فی العیدین وفی الجمعۃ بسبّح اسم ربک الاعلیٰ وھل أتاک حدیث الغاشیۃ قال واذا اجتمع العید الجمعۃ فی یومٍ واحدٍ قرأھما فی الصّلاتین (رواہ مسلم)

ترجمہ: حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم دونوں عیدوں میں اور جمعہ میں سورۃ الاعلیٰ اور الغاشیہ پڑھا کرتے تھے۔ فرمایا اور جب عید اور جمعہ ایک دن میں جمع ہوجاتے تو حضورؐ یہ دونوں سورتیں دونوں نمازوں میں پڑھتے اسے مسلم نے روایت کیا۔

شرح: [1] یہ حدیث پچھلی حدیث کے خلاف نہیں کیونکہ مطلب اس کا یہ ہے کہ زیادہ تر یہ سورتیں جمعہ میں پڑھتے تھے اور اس حدیث سے بعض دفعہ سورۂ جمعہ اور منافقون کا پڑھنا ثابت ہوا۔ اِس حدیث سے یہ بھی پتہ چلا کہ سورۂ الاعلیٰ اور الغاشیہ کا جمعہ اور عیدین میں پڑھنا مستحب مؤکّد ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

حدیث ۱۹: وعن عبید اللہ انّ عمرؓ بن الخطاب سأل ابا واقد اللیثیؓ

---

[1] مظاہر حق ج: ص۴۹۸

ما کان یقرأ بہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الاضحٰی و الفطر فقال کان یقرأ فیھما بق و القرآن المجید و اقتربت الساعۃ رواہ مسلم۔

ترجمہ: حضرت عبیداللہ تابعی (جو مدینہ کے فقہائے سبعہ میں سے تھے) سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت ابو واقد اللیثی رض سے دریافت فرمایا کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم عید الاضحیٰ اور عید الفطر میں کیا پڑھا کرتے تھے، تو انہوں نے جواب دیا کہ سورۃ ق اور سورہ اقتربت الساعۃ پڑھا کرتے تھے۔ مسلم۔

شرح: یہ روایت مُرسَل ہے کیونکہ عبیداللہ نے جناب عمر فاروق رض کا زمانہ نہیں پایا۔ لیکن مسلم کی دوسری روایت میں اسے یوں متصل کیا گیا ہے: عن عبید اللہ عن ابی واقد رض قال سألنی عمر رض بن الخطاب الخ۔ اور جناب عمر فاروق رض کی ایک خاص علمی مجلس ہوا کرتی تھی جس میں مسائل کی چھان بین یوں ہوتی تھی کہ حضرت فاروقِ اعظم رض صحابہ سے سوالات دریافت فرماتے تھے تاکہ سننے والوں کے ذہن میں وہ مسائل جم جائیں اور خوب یاد ہو جائیں۔

حدیث ۲۰: وعن ابی ھریرۃ قال ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرأ فی رکعتی الفجر قل یا ایھا الکافرون وقل ھو اللہ احد۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر کی دو رکعتوں میں سورۃ کافرون اور اخلاص پڑھی تھیں۔ اسے مسلم نے روایت کیا۔

شرح: بیانِ جواز کے لئے پڑھیں یا کوئی ضروری کام مثلاً سفر جہاد وغیرہ درپیش ہوگا، ورنہ پہلے گزر چکا ہے کہ نمازِ فجر میں حضور عموماً لمبی قرأت کرتے تھے۔ علامہ علی القاری نے رکعتی الفجر سے مراد سنت کی دو رکعتیں لی ہیں۔ یہ ایک اچھا مطلب ہے کیونکہ احادیث میں رکعتی الفجر کا لفظ اس معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۲۱: وعن ابن عباس قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقرأ فی رکعتی الفجر قولوا آمنا باللہ وما انزل الینا والتی فی آلِ عمران قل یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃٍ سواءٍ بیننا وبینکم۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

لہ مرقات ج ۲ ص ۲۹۵ ۔ ۳ہ مظاہر حق ج ۱ ص ۲۹۸ ، مرقات ج ۲ ص ۲۹۵

۲ہ مرقات ج ۲ ص ۲۹۵ ، مظاہر حق ج ۱ ص ۲۹۸

فجر کی دو رکعتوں میں قولوا آمنا باللہ وما انزل الینا اور سورۂ آلِ عمران کی آیت قل یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم پڑھا کرتے تھے۔ اسے مسلم نے روایت کیا

شرح: اس حدیث میں بھی رکعتی الفجر کا لفظ ہے۔ اس کی پہلی رکعت میں سورۃ البقرہ کی آیت قولوا آمنا باللہ الخ اور دوسری رکعت میں سورۂ آلِ عمران کی آیت قل یا اھل الکتاب الخ پڑھا کرتے تھے۔ علامہؒ علی القاری فرماتے ہیں کہ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ سورۂ فاتحہ کے ساتھ کوئی سورت یا اس کا قائم مقام یعنی ایک لمبی آیت یا تین چھوٹی آیتیں (کیونکہ چھوٹی سے چھوٹی سورت کی مقدار یہی ہے) ملانا واجب ہے۔ پھر سنتوں میں قرأت بالجہر نہیں ہوتی تو یا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے صحابہؓ کو یہ معلوم ہوا کہ سنت میں یہ سورتیں پڑھتے ہیں یا کبھی تعلیماً باواز بلند پڑھی ہوں گی۔ یہ بھی پتہ چل گیا کہ سورۃ کا بعض حصہ خصوصاً اس کے درمیان سے پڑھنا مکروہ نہیں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

لہ ایضاً مرقات و مظاہر حق۔

باب الرکوع

کتاب و سنّت اور اجماعِ امّت سے رکوع نماز کا رکن ہے۔ اور اس کا معنی لُغت میں جُھکنا اور عاجزی کرنا ہے اور اصطلاحِ شرع میں نماز کے اندر ایک خاص قسم کا جُھکنا رکوع کہلاتا ہے۔ رکوع اُمّتِ محمّدیہ کی خصوصیتوں میں سے ہے کیونکہ بعض مفسّرین نے آیت وَارْکَعُوا مَعَ الرَّاکِعِیْن کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ اے بنی اسرائیل مُسلم ہوکر اہلِ اسلام جیسی نماز ادا کرو اور یہ اس لئے فرمایا کہ ان کی نماز میں رکوع نہیں تھا۔ راکعین سے مراد اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اور آپؐ کی امّت ہے۔ اور حضرت مریم علیہا السلام کو جو حکم ہُوا تھا کہ وَارْکَعِی مع الراکعین، اس سے مراد یہ ہے کہ نمازیوں کے ساتھ نماز پڑھو یعنی یہاں رکوع کا معنی عبادت اور نماز تھا۔ اور سجدہ کو مکرّر کیا گیا ہے لیکن رکوع ایک رکعت میں ایک ہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رکوع دراصل سجود کا مقدّمہ اور وسیلہ ہے۔ اور سجدہ کو نماز میں عظیم حیثیت حاصل ہے کیونکہ یہ انتہائی عاجزی کا اظہار ہے کہ انسان کے جسم کے اشرف ترین عضو یعنی پیشانی کو اس جگہ خدا کے سامنے گرا دینا جہاں قدم آتے اور جُوتے رکھے جاتے ہیں۔ حدیث میں ہے اَقْرَبُ مایکون العبدُ من ربہٖ وھو ساجدٌ اور سجدہ کو مکرّر کیا گیا ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان اسی خاک سے پیدا ہُوا ہے اور اسی میں سما جائے گا۔ گویا نمازی پہلے سجدہ میں یہ اعلان کرتا ہے کہ اے مالک! تو نے مجھے اسی خاک سے پیدا کیا تھا پھر دوسرے سجدے میں اعلان کرتا ہے کہ میں اسی خاک کی طرف واپس جاؤں گا اور اوپر اٹھ کر گویا یہ اعلان کرتا ہے کہ دوبارہ اسی خاک سے نکالا جاؤں گا۔ مِنْھَا خَلَقْنٰکُمْ وَفِیْھَا نُعِیْدُکُمْ وَمِنْھَا نُخْرِجُکُمْ تَارَۃً اُخْرٰی (القرآن)۔

الفصل الاول

حدیث ۱: عن أنسؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلمؐ أقیموا الرکوع وَ السجود فواللہ إنّی لأراکم من بعدی۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: رکوع اور سجود کو درست طور پر ادا کیا کرو۔ پس واللہ میں تمہیں پیٹھ کے پیچھے سے ضرور دیکھتا ہوں۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔

۱؎ مرقات ج ۲ ص ۳۰۶، مظاہر حق ج ۱ ص ۳۰۵

شرح[1]: اقامت سے مراد سیدھا کرنا اور درست طور پر ادا کرنا ہے۔ اسی حکم کی بنا پر تعدیلِ ارکان کو واجب کہا جاتا ہے اور بعض ائمہ اسلام کے نزدیک یہ فرض ہے۔ بحث اس پر پیچھے گزر چکی ہے۔ حضورؐ کا صحابہؓ کو پیچھے سے دیکھنا معجزہ اور خارقِ عادت ہے اور بظاہر یہ اس کشف پر مبنی ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو عطا فرمایا تھا۔ اور یہ فرما کر حضورؐ نے تعدیلِ ارکان کی اہمیت میں مبالغہ مراد لیا ہے کہ جب تمہاری حالت مجھ پر مخفی نہیں رہتی تو اللہ تعالیٰ عالم الغیب پر کیسے مخفی رہ سکے گی! کیونکہ حضور کو جو علم حاصل تھا وہ اللہ تعالیٰ کے اعلام سے تھا۔ علامہ قسطلانیؒ فرماتے ہیں کہ یہ الفاظ حقیقت پر محمول ہیں۔ اور بطور معجزہ حضورؐ کو پچھلی طرف سے بغیر اس کے کہ چیزیں آنکھ کے سامنے آئیں اور قریب ہوں واقعی آنکھوں سے ہی دکھائی دیتی تھیں۔

حدیث ۲: وعن البراءؓ قال کان رکوع النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم و سجودہٗ وبین السجدتین واذا رفع من الرکوع ما خلا القیام والقعود قریبًا من السواء۔ متفق علیہ

ترجمہ: حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رکوع اور آپؐ کا سجدہ اور دو سجدوں کے درمیان جلسہ اور رکوع کے بعد کا قومہ، قیام اور جلوس کے سوا تقریبًا برابر ہوتے ہیں۔ متفق علیہ۔

شرح[2]: یعنی قیام میں تو قرأت ہوتی ہے اس لئے وہ طویل ہوا۔ اور جلوس کی حالت میں تشہد اور دعا وغیرہ ہوتے ہیں سو وہ بھی طویل ہوتا تھا باقی چار حالتیں یعنی رکوع، قومہ، سجدہ اور جلسہ تقریبًا برابر ہوتے تھے۔ لیکن ان کی مقدار متعین نہیں کی جا سکتی۔ قیام اور جلوس کے استثناء کی ایک وجہ اور بھی ہے کہ یہ حاجت اور حالات کے مطابق طویل و قصیر ہوتے تھے جیسا کہ پچھلی احادیث میں گزر چکا ہے۔ لیکن یہ چار مواضع تقریبًا ایک جیسے ہوتے تھے۔ حافظ[3] ابن حجرؒ نے قیل کے لفظ سے قیام سے مراد اعتدال اور قعود سے مراد جلسہ بین السجدتین لیا ہے اور پھر حافظ ابن القیمؒ سے اس معنی کا رد نقل کیا ہے اور اپنے بعض اساتذہ کے شیوخ سے نقل کیا ہے کہ قریبًا من السواء کا مطلب یہ ہے کہ پہلی رکعت کا قیام دوسری کے برابر اور پہلی رکعت کا رکوع دوسری رکعت کے رکوع کے قریب ہوتا تھا اور

---

[1] مظاہر حق ج ۱ صفحہ ۳۰۵، مرقات ج ۲ صفحہ ۳۰۸۔ [2] فتح الباری ج ۳ صفحہ ۳۳۲، فیض الباری ج ۲ صفحہ ۲۹۸، مظاہر حق ج ۱ صفحہ ۳۰۵، مرقات ج ۲ صفحہ ۳۰۹، قسطلانی ج ۲ صفحہ ۱۳۰ [3] فتح الباری ج ۳ صفحہ ۳۳۲، قسطلانی ج ۲ صفحہ ۱۳۰

قیام سے مراد اعتدال اور قعود سے جلسہ ہے لیکن پھر خود ہی اسے تکلف قرار دیا ہے۔
میرک شاہؒ[1] فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو متفق علیہ قرار دینے میں مشکل پیش آتی ہے کیونکہ اس کے آخری الفاظ ما خلا القیام و القعود صرف بخاری میں آئے ہیں باقی حدیث متفق علیہ ہے

حدیث ۳ : وعن انسؓ قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا قال سمع اللہ لمن حمدہ قام حتیٰ نقول قد اوھم ثم یسجد ویقعد بین السجدتین حتی نقول قد اوھم۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ : حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سمع اللہ لمن حمدہ کہتے تو کھڑے ہو جاتے حتی کہ ہم کہتے (یعنی دل میں) کہ آپؐ نے رکوع چھوڑ کر پھر قیام اختیار کر لیا ہے۔ پھر آپ سجدہ کرتے اور دو سجدوں کے درمیان بیٹھ جاتے یہاں تک کہ ہم دل میں کہتے کہ آپؐ نے دوسرا سجدہ چھوڑ ہی دیا ہے۔
اسے مسلم نے روایت کیا۔

شرح : اس حدیث میں بھی قومہ میں لفظ سمع اللہ لمن حمدہ کہنا ہی مذکور ہوا ہے اور اس پر مکمل بحث پہلے ہو چکی ہے۔ قومہ اور جلسہ کی یہ درازی پچھلی حدیث کے بظاہر خلاف ہے لیکن کبھی کبھی بیانِ جواز کے لئے فرضوں[2] میں ایسا ہوتا ہوگا۔ یا اس حدیث میں نوافل کا ذکر ہے۔ واللہ اعلم۔
اور[3] لفظ اَوْھَمَ بمعنی ترک ہے جیسا کہ علامہ علی القاریؒ نے الفائق سے نقل کیا ہے۔ اور یہی معنی مراد لینا مناسب ہے۔ اگر اسے اُوْھِمَ مجہول پڑھا جائے تو معنی یہ ہوگا کہ آپؐ کو غلطی لگ گئی ہے اور سہو ہو گیا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے بھی پہلے معنی کو ترجیح دی ہے اور کہا ہے کہ اَوْھَمَ کا معنی ہے اَوْقع الناس فی الغلط انّہ ترکھا۔ واللہ اعلم بالصواب

حدیث ۴ : وعن عائشۃ رضی اللہ عنھا قالت کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یکثر ان یقول فی رکوعہٖ وسجودہٖ سبحانک اللّٰھم ربنا وبحمدک اللّٰھم اغفرلی یتاوّل القرآن۔ متفق علیہ۔

ترجمہ : حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ سلام اللہ علیہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رکوع اور سجدے میں اکثر یوں کہا کرتے تھے۔ سبحانک اللّٰھم ربنا الخ "اے اللہ اے ہمارے مالک تو پاک ہے اور اپنی تعریف کے ساتھ ہے

[1] مرقات ج ۲ ص ۳۰۹ [2] مظاہر حق ج ۱ ص ۳۰۶ [3] مرقات ج ۲ ص ۳۰۹

اے اللہ میری مغفرت فرما" یہ آپؐ قرآن پر عمل کرتے ہوئے فرماتے تھے۔ متفق علیہ۔
شرح: اس حدیث میں صراحت نہیں آئی کہ حضورؐ رکوع اور سجدے میں یہ دعا فرائض میں مانگا کرتے تھے یا نوافل میں۔ معلوم بظاہر یوں ہوتا ہے کہ ام المومنین رضؓ صلوٰۃ اللیل کا ذکر فرما رہی ہیں مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا۔ رکوع میں اللہ تعالیٰ کی تعظیم اور سجدے میں دُعا ہونی چاہیئے۔ لیکن اس حدیث سے پتہ چلا کہ رکوع اور سجدہ دونوں میں دعا جائز ہے۔ اور اگر مقتدیوں پر بوجھل نہ گزرے تو جماعت کی نماز میں بھی ایسا کرنا جائز ہے[۱]
یتاوّل القرآن کا معنیٰ ہے قرآن کے حکم کے مطابق آپؐ ایسا کرتے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ۔ اور یہ استغفار آپؐ کی طرف سے دراصل اپنی امت کے لئے تھا۔ اور خود اپنے لئے مانا جائے تو کما یلیق بشانہٖ ماننا پڑے گا کیونکہ آپؐ تو معصوم محض تھے۔ آخری عمر میں نمازوں کے علاوہ بھی اکثر حمد و تسبیح اور استغفار کی کثرت فرمایا کرتے تھے۔

حدیث ۵: وعنها اَنَّ النبی صلی الله علیه وسلم کان یقول فی رکوعه وسجوده سُبُّوحٌ قُدُّوسٌ رَبُّ الْمَلَائِكَةِ وَالرُّوحِ۔ رواہ مسلم

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رکوع اور سجدے میں یوں کہا کرتے تھے: سُبُّوحٌ قُدُّوسٌ الخ " اللہ نہایت پاک اور نہایت مقدس ہے جو فرشتوں اور روح القدس کا پروردگار ہے۔" مسلم
شرح: "سُبُّوحٌ" اور "قُدُّوسٌ" دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں اور ان سے مراد اللہ تعالیٰ کی تنزیہہ و تقدیس ہے۔ یعنی وہ ہر قسم کے ذاتی و صفاتی عیب سے پاک اور بزرگ و برتر ہے اور وہ رب تو ساری کائنات کا ہے لیکن عبادت کے وقت رکوع و سجود میں ملائکہ اور روح القدس کا رب اس لئے کہا گیا ہے کہ یہ مخلوق صرف عبادت الٰہی اور تسبیح و تقدیس ہی کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ قرآن پاک میں یَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلَائِكَةُ صَفًّا، نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ، أَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ وغیرہ آیات میں روح سے مراد جبریلؑ ہی ہیں۔ اسی طرح تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا۔ الآیۃ۔ میں بھی وہی مراد ہیں۔ علی الخصوص جب روح کا ذکر ملائکہ کے ساتھ آئے تو اس سے مراد ملائکہ کا سردار اور افضل فرشتہ یعنی جبریلؑ ہی ہوتا ہے۔

---

[۱] فیض الباری ج ۲ ص ۳۰۱ [۲] فتح الباری ج ۴ ص ۴۲۵، مظاہر حق ج ۱ ص ۳۰۶، مرقات ج ۲ ص ۳۱۰ [۳] مرقات ج ۲ ص ۳۱۱، مظاہر حق ج ۱ ص ۳۰۶۔

حدیث ۶ : وعن ابن عباسؓ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم
اَلَا اِنِّیْ نُہِیْتُ اَنْ اَقْرَأَ الْقُرْآنَ رَاکِعًا اَوْسَاجِدًا فَاَمَّا الرُّکُوْعُ
فَعَظِّمُوْا فِیْہِ الرَّبَّ وَاَمَّا السُّجُوْدُ فَاجْتَھِدُوْا فِی الدُّعَا فَقَمِنٌ
اَنْ یُّسْتَجَابَ لَکُمْ ۔ رواہ مسلم ۔

ترجمہ : حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ۔ خبردار یقیناً مجھے رکوع اور سجدہ کی حالت میں قرآن پڑھنے سے منع کر دیا گیا ہے ۔ پس رکوع میں تو تم پروردگار کی عظمت بیان کیا کرو اور سجدے میں دعا ، مانگنے کی کوشش کیا کرو کیونکہ وہ مقبول کئے جانے کے لائق ہوتی ہے ۔ مسلم ۔

شرح : علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث دوسری احادیث کے خلاف نہیں جن میں رکوع میں بھی دعاؤں کا ذکر آیا ہے ۔ کیونکہ تعظیم پروردگار دعا کے منافی نہیں ہے گو اولیٰ یہی ہے کہ رکوع میں صرف تعظیم کی جائے ۔ اور اس حدیث میں سجدہ میں دعا کی کثرت کا ارشاد ہے جو رکوع میں نہیں ہے یعنی رکوع میں کثرت سے تعظیم رب کی جائے گو کچھ دعا بھی مانگ لی جائے ۔ سجدہ میں دعا کی تکثیر کا سبب یہ ہے کہ وہ حالت بندے کے خدا سے قرب کی حالت ہے ۔ اسی لئے دعا کی قبولیت کی بشارت بھی دے دی گئی ہے ۔[۱]

رکوع میں تعظیم کا جو حکم ہے اسی کے لئے سبحان ربی العظیم کہا جاتا ہے اور سجدہ میں چونکہ انتہائی تذلل کی حالت ہوتی ہے لہٰذا سبحان ربی الاعلیٰ کہا جاتا ہے ۔ اس کے علاوہ دوسری مسنون و ثابت شدہ دعائیں بھی مستحب ہیں ۔ نوافل میں حنفیہ کہتے ہیں کہ صریح دعائیں مانگنی چاہئیں اور فرائض بھی تسبیحات پر اکتفا کرنا ہی اولیٰ ہے گو حدیث میں وارد شدہ دعاؤں کے مانگنے میں کوئی اختلاف نہیں ہے ۔[۲]

رکوع و سجود میں جو قرآن کی تلاوت سے روکا گیا ہے تو اس کا باعث یہی ہے کہ یہ خشوع و خضوع اور تذلل کی حالتیں ہیں ۔ اس سے استدلال بھی کیا گیا ہے کہ مقتدی چونکہ امام کا تابع ہوتا ہے اس لئے قرأتِ قرآن کا ظرف امام ہی ہے جو متبوع اور افضل ہے نہ کہ مبتدی جو متبع اور ماتحت ہے ۔ واللہ اعلم بالصواب

حدیث ۷ : وعن ابی ھریرۃؓ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم
اذا قال الامام سمع اللّٰہ لمن حمدہ فقولوا اللّٰھم ربنا لک

---
[۱] فتح الباری ج ۲ ص ۲۴۵ ۔ [۲] مرقات ج ۲ ص ۳۱۲ ، مظاہر حق ج ۱ ص ۳۰۶

الحمد فانہ من وافق قولہ قول الملائکۃ غفرلہ ماتقدم من ذنبہ۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب امام سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو کہو اللّٰھم ربنا لک الحمد۔ کیونکہ جس کا قول ملائکہ کے موافق ہو جائے گا اس کے پچھلے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ متفق علیہ۔

شرح: اس مسئلے پر باب صفۃ الصلوٰۃ اور باب القرأۃ میں مفصل بحث گزر چکی ہے وہاں دوبارہ دیکھ لی جائے۔ بظاہر یہ حدیث ہے جس سے امام ابو حنیفہؒ اور مالکؒ نے یہ سمجھا کہ امام کا وظیفہ سمع اللہ الخ کہنا ہے اور مقتدی کا وظیفہ ربنا لک الحمد کہنا ہے۔ یہ لفظ حدیث میں کئی طرح ثابت ہے اور ہر طرح کہنا جائز ہے مثلاً ایک وہ جو یہاں ہے اور اللّٰھم ربنا ولک الحمد اور ربنا ولک الحمد اور ربنا لک الحمد

حدیث ۸: وعن عبد اللہؓ بن ابی اوفیٰ قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رفع ظھرہ من الرکوع قال سمع اللہ لمن حمدہ اللّٰھم ربنا لک الحمد ملء السمٰوٰت وملء الارض وملء ماشئت من شیء بعد۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب رکوع سے پیٹھ اُٹھاتے تھے تو کہا کرتے تھے سمع اللہ لمن حمدہ الخ اللہ نے سن لی اس کی بات جس نے اس کی تعریف کی۔ اے اللہ ہمارے رب تیرے ہی لئے تعریف ہے آسمانوں کی پُری کے برابر اور زمین کو پُری کے برابر اور اس کے بعد تو جس چیز کی پُری چاہے۔ مسلم

شرح: ملء کا لفظ یہاں بطورِ مجاز کثرت کے لئے استعمال ہوا ہے اور یہ تمثیل و تقریب ہے کیونکہ کلام کو پیمانوں سے نہیں ناپا جا سکتا اور نہ برتن وغیرہ اس کی گنجائش رکھتے ہیں اور اس سے مراد تکثیر عدد ہے۔ اور بالفرض اگر ان کلمات کو اجسام مان لیا جائے تو یہ کائنات کو بھر دیں گے۔ اور ملء ماشئت الخ کا لفظ عابد کے عجز پر دلالت کرتا ہے۔ گویا وہ کہتا ہے کہ میں تو یہیں تک کہہ سکتا ہوں آگے اے خدا تیری مشیئت۔ اور حمد و ثنا کے اس مقام پر سوائے اس ذات کے کوئی نہ پہنچ سکا جس کا نام احمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔[1]

[1] مرقات ج ۲ ص ۳۱۲

[1] حنفیہ کے نزدیک یہ لمبی دعا نوافل میں ہوتی تھی۔ گو فرائض میں بھی جائز ضرور ہے۔ اور اس حدیث میں فرائض کی تصریح نہیں ہے۔ پس اگر مقتدی بوجھ نہ محسوس کریں تو یہ دعا بھی جائز ہوگی۔ ورنہ امامت کا معاملہ نازک ہے اور وہاں تخفیف کا حکم دیا گیا ہے۔

حدیث ۹: وعن ابی سعیدؓ الخدری قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا رفع رأسہٗ من الرکوع قال اللّٰھُمَّ ربنا لک الحمد ملأ السمٰوٰتِ وملأ الارض وملأ ما شئت من شیءٍ بعد اھل الثناء والمجد احق ما قال العبد وکلنا لک عبدٌ اللّٰھم لا مانع لما اعطیت ولا معطی لما منعت ولا ینفع ذا الجدِ منک الجدُّ۔ رواہ مسلم

ترجمہ: حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جنابِ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنا سر رکوع سے اٹھاتے تو کہتے اللّٰھُمَّ ربنا لک الحمد الخ" اے اللہ ہمارے رب تیرے ہی لئے تعریف ہے آسمانوں اور زمین کی پری کے برابر تو ثناء اور بزرگی کا اہل ہے اور بندہ جو کچھ کہے اس کا تو ہی حقدار ہے اور ہم سب تیرے بندے ہیں۔ اے اللہ جو تو نے عطا فرمایا اسے روکنے والا کوئی نہیں اور جو تو نے روک دیا اس کا عطا کرنے والا کوئی نہیں اور کسی عظمت و دولت اور کوشش والے کی عظمت و دولت وسعی تیرے مقابلے میں اسے کچھ فائدہ نہیں دے سکتی۔ مسلم۔

شرح: احق ما قال العبد الخ کو مبتدا اور اللّٰھُمَّ لا مانع الخ کو خبر بھی قرار دیا گیا ہے۔ اس صورت میں ترجمہ یوں ہوگا کہ بندہ زیادہ سے زیادہ جو کہہ سکتا ہے وہ یہ ہے الخ۔ اس دعا میں خداوند تعالیٰ کی توحید و تحمید اور ثناء و تمجید بیان فرمائی گئی ہے تذلل و خشوع کی انتہا ہے جو ان کلمات میں عابد کے لئے اور مجد و ثناء کی انتہا ہے جو معبود کے لئے ثابت کی گئی ہے۔

حدیث ۱۰: وعن رفاعۃؓ ابن رافع قال کنا نصلی وراء النبی صلی اللہ علیہ وسلم فلما رفع رأسہٗ من الرکعۃ قال سمع اللہ لمن حمدہٗ فقال رجل وراءہ ربنا ولک الحمد حمدًا کثیرًا طیبًا مبارکًا فیہ فلما انصرف قال من المتکلم آنفًا قال رأیت بضعۃ و ثلاثین ملکًا یبتدرونھا ایھم یکتبھا اوّل۔ رواہ البخاری۔

---

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۳۰۷، مرقات ج ۲ ص ۳۱۲

ترجمہ: حضرت رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے پس جب آپؐ نے رکوع سے سر اُٹھایا اور سمع اللہ لمن حمدہ کہا تو ایک آدمی نے آپؐ کے پیچھے کہا ربّنا ولک الحمد الخ اے ہمارے ربّ بہت سی، پاکیزہ، بابرکت حمد وثنا تیرے ہی لئے ہے۔ پس جب آپؐ نے نماز ختم کر لی تو فرمایا کہ ابھی کون شخص تھا جس نے یہ کہا؟ اس نے عرض کیا کہ میں ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ میں نے کچھ اوپر تیس فرشتوں کو دیکھا کہ اسے ہاتھوں ہاتھ لے رہے تھے کہ ان میں سے کون انہیں پہلے لکھے۔ بخاری۔

شرح: یہ حدیث پہلے بھی گزری ہے اس میں حضورؐ کا تین دفعہ دریافت فرمانا اور لوگوں کا ڈر کے مارے نہ بولنا اور تیسری بار اس شخص کا جواب گزر چکا ہے۔ فرشتوں کی تعداد اور ان کا ایک دوسرے پر ان کلمات کے لکھنے میں سبقت لے جانا وغیرہ سب عالمِ غیب کے معاملات ہیں جو باذن اللہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کھول دیئے جاتے تھے۔ ہمارا بعینہٖ ان پر ایمان لانا فرض ہے کیفیت خدا اور رسولؐ کے سپرد ہے کیونکہ یہ چیزیں مادّی جہان اور اس کے احکام سے بالا ہیں۔

بابُ السجودِ وفضلِہٖ

لُغت میں سجود کا معنی ہے عاجزی کرنا، خوب جُھکنا، سر کو زمین پر رکھنا۔ لیکن اصطلاحِ شرح میں ایک خاص طریقے سے سر کو زمین پر رکھنا سجدہ کہلاتا ہے۔ سجدۂ عبادت ہمیشہ سے اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص رہا ہے۔ شرعِ اسلامی میں غیر اللہ کو بہ نیتِ عبادت سجدہ کرنے والا مشرک ہے اور اسلام نے محض بہ نیت تعظیم وتحیّۃ بھی سجدہ حرام قرار دیا ہے۔ پس شرعِ محمدیؐ میں سجدہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ والاصفات کے لئے خاص ہو چکا ہے۔

حضرت[1] حکیم الاسلام شاہ ولیؒ اللہ الدہلوی نے فرمایا ہے کہ سجدہ کی حد سات اعضاء کا زمین پر رکھ دینا ہے: پیشانی، دونوں ہاتھ، دونوں گھٹنے اور دونوں پاؤں کے اگلے حصّے اور سجدہ میں اطمینان اور جائے سجود پر اعضاء کا بوجھ ڈال دینا ضروری

[1] مصفّٰی شرح موطا ج ۱ ص ۱۱۳۔

ہے تاکہ سجدہ کا معنی بخوبی حاصل ہو جائے اور اعضاء کے بلند مقامات پر نچلے مقامات کا بلند ہونا بھی ضروری ہے اور یہ قید لفظ سجود سے سمجھی جاتی ہے ورنہ زمین پر دراز ہونا اور پھیلنا تو ہو گا سجدہ نہیں ہو گا اور سجدہ کا اکمال یہ ہے کہ رفع یدین کے بغیر تکبیر کہیں اور پہلے گھٹنوں کو زمین پر رکھیں پھر ہاتھوں کو اور اس کے بعد پیشانی اور ناک کو۔ اور سجدہ میں اذکارِ مسنونہ میں سے کوئی ذکر کریں۔ دونوں ہاتھوں کو کندھوں کے قریب رکھیں اور انگلیوں کو قبلہ رُخ پھیلا دیں اور دونوں گھٹنوں کو جُدا جدا رکھیں اور پیٹ کو رانوں اور کہنیوں کو پہلوؤں سے الگ رکھیں۔ علماءِ امت اس پر متفق ہیں کہ پیشانی کو سجدہ میں جائے سجود پر رکھ دینا واجب ہے اور دونوں ہاتھوں کو ننگا کرنا اور چادر یا آستین سے نکالنا ضروری نہیں۔

اس باب میں سجدے کی کیفیت اور فضیلت کی احادیث بیان ہونگی۔

الفصل الاوّل

حدیث ۱: عن ابنؓ عبّاس قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلمؐ اُمرت اَن اَسجد علی سبعۃ اعظمٍ علی الجبھۃ والیدین والرکبتین واطراف القدمین ولا تکفت الثیاب ولا الشعر۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ سات ہڈیوں پر سجدہ کروں یعنی پیشانی پر، دونوں ہاتھوں پر، دونوں گھٹنوں پر اور دونوں پاؤں کے اگلے حصّوں پر۔ اور یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ ہم نماز میں کپڑوں اور بالوں کو نہ سمیٹیں۔ بخاری و مسلم۔

شرح:[۱] ایک حدیث صحیح میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دوزخ کی آگ پر حرام کر دیا ہے کہ وہ سجدہ کے اعضاء کو کھائے (یعنی لگے) اور ایک حدیث میں اعضاء سجدہ میں سے چہرے کا ذکر آیا ہے شاید چہرے کی عظمت وخصوصیت کی وجہ سے اس کا ذکر فرمایا گیا ہے یا اُس پہلی حدیث میں بھی اعضاء سجدہ سے مراد چہرہ ہی ہے۔ حنفیہ کے نزدیک پیشانی میں ناک بھی شامل اور امام بخاریؒ نے باب السجود علی الانف میں اپنا

۱؎ فتح الباری ج ۳ ص۴۴۲، قسطلانی ج ۲ ص۱۳۱، فیض الباری ج ۲ ص۳۰۳

رجحان اسی طرف ثابت کیا ہے اور امام شافعیؒ کے نزدیک بھی پیشانی کے حکم میں ناک شامل ہے (یعنی امام شافعیؒ کے ایک قول کے مطابق جیسا کہ حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری ج ۳ ص۴۴۲ میں فرمایا ہے)۔ اِسؒ حدیث کی وجہ سے ائمہ اسلام کا مسلک یہی ہے کہ سجدہ ان سات اعضاء کو زمین پر رکھ کر کیا جائے۔ اکثر ائمہ ناک اور پیشانی کو ایک ہی حکم میں داخل کرتے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ اگر فقط پیشانی پر سجدہ کرے اور ناک کو نیچے نہ لگائے تو جائز تو ہے لیکن مکروہ ہے کیونکہ احادیث میں ناک کا ذکر بھی آچکا ہے۔ اگر فقط ناک پر سجدہ کرے تو صاحبینؒ اور شافعیؒ کے نزدیک سجدہ ادا نہ ہوگا ہاں عذر کی حالت اس سے مستثنیٰ ہے۔ امام ابوحنیفہ سے اس بارے میں دو روایتیں ہیں۔ ایک میں جائز نہیں دوسری میں جائز لیکن مکروہ ہے۔ سجدے میں اگر دونوں پاؤں زمین سے اُٹھ جائیں تو نماز فاسد ہے۔ اور ایک کا اٹھانا بھی مکروہ ہے اور پاؤں کی انگلیوں کو قبلہ رُخ رکھنا واجب ہے۔ حنفیہ نے کچھ دوسرے دلائل کی بنا پر ہاتھوں اور گھٹنوں کا زمین پر رکھنا سنّت قرار دیا ہے اور شوافع کا مسلک بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ اور بعض دوسری صحیح احادیث میں واضح طور پر ناک کا لفظ چونکہ موجود ہے لہذا اُسے بھی پیشانی ہی کے حکم میں داخل سمجھا گیا ہے گو شافعیہ نے ناک کا ذکر استحباباً مانا ہے لیکن اس کی اہمیت سے انھیں بھی انکار نہیں اور استحباب کی کوئی دلیل نہیں لہذا اُسے بھی وجوب ہی کے حکم میں داخل سمجھا جائیگا۔ امام مالکؒ، ثوریؒ اور اوزاعیؒ کا مذہب بھی یہی ہے۔

اس حدیث میں جو کپڑوں اور بالوں کو سمیٹنے اور اکٹھا کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کپڑوں اور بالوں کو خاک آلود ہونے سے بچانے کے لئے سنبھالنا اور باندھ لینا جائز نہیں ہے۔ علّامہ ابن حجرؒ[۲] نے ان الفاظ کی نہی کو باتفاق علماء تنزیہی قرار دیا ہے گو ان کا کلام اس مقام پر کچھ اُلجھا ہوا سا نظر آتا ہے۔ علّامہ[۳] علی القاریؒ نے قاضی عیاضؒ سے نقل کیا ہے کہ اس حدیث میں اُمِرتُ کا لفظ امر استحباب کے لئے ہے اور جن چیزوں کا وجوب ثابت ہوا ہے اس کے دلائل اور ہیں۔ اِسی طرح اس حدیث کی نہی کا بھی حال ہے کہ بالاتفاق تنزیہی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

۱؎ مظاہر حق ج ۱ ص۳۱، مرقات ج ۲ ص۳۱۸۔ ۲؎ فتح الباری ج ۳، ۲ ص۴۴۱، ۴۴۵
۳؎ مرقات ج ۲ ص۳۱۹۔

حدیث ۲: وعن انس قال قال رسول اللّٰہ علیہ وسلم اعتدلوا فی السجود ولا یبسط احدکم ذراعیہ انبساط الکلب۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سجدہ کی حالت میں درست اور سیدھے رہو اور تم میں سے کوئی اپنے بازو کتے کی مانند نہ پھیلا دے۔ بخاری و مسلم۔

شرح: باب کے شروع میں ہم نے امام ولی اللہ الدہلوی سے سجدے کی جو تعریف اور حد وغیرہ بیان کی ہے وہ اس حدیث سے ماخوذ معلوم ہوتی ہے۔ علامہ علی القاری نے طیبی کے حوالہ سے اعتدال کی تعریف یہ بیان کی ہے کہ سجدہ میں پیٹھ سیدھی رکھے، کتے کی طرح بازو زمین پر بچھا دینا سجدہ کے اعتدال کے خلاف ہے۔ علامہ ابن دقیق العید فرماتے ہیں کہ خسیس چیزوں سے تشبیہ کا مقصد نفرت دلانا ہوتا ہے تاکہ ایسے افعال کو ترک کر دیا جائے۔ ہاں اگر سجدہ بہت طویل ہو اور نمازی تھک جائے تو بوجہ عذر ایسا کرنا جائز ہوگا

حدیث ۳: وعن البراء بن عازب قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اذا سجدت فضع کفیك وارفع مرفقیك۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ: حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تو سجدہ کرے تو اپنی دونوں ہتھیلیاں نیچے رکھ دے اور اپنی دونوں کہنیاں اوپر کو اٹھا لے۔ اسے مسلم نے روایت کیا۔

شرح: سجدہ کی تعریف اور اعتدال کے ذکر میں ان دونوں چیزوں کا ذکر گزر چکا ہے۔ اس حدیث میں بالخصوص ان کا ذکر کسی مصلحت سے فرمایا گیا ہوگا۔ سجدہ میں ہتھیلیوں کو سیدھا قبلہ رخ انگلیاں کھول کر لیکن باہم ملا کر دونوں کانوں کے سامنے یا کندھوں کے سامنے علی اختلاف الروایتین رکھنا چاہیئے اور ان پر بوجھ ڈالنا اور زور دینا ضروری ہے اور حسب ضرورت انہیں چادر یا آستین وغیرہ میں ڈالنا جائز ہے۔ حضورؐ سے بعض دفعہ کنکریوں اور گرمی سے بچنے کے لئے ہاتھوں کا چادر میں رکھنا بھی ثابت ہوا ہے۔ کما فی ابن ماجہ۔ لیکن بلا ضرورت چھپانا مکروہ ہے۔ عورتوں کو چونکہ حالتِ نمازیں بھی ستر کا حکم ہے لہٰذا وہ زمین پر بچھ جائیں اور اعضاء

۱؎ ایضاً ۲؎ مظاہر حق ج ۱ ص ۳۱۱ ، مرقات ج ۲ ص ۳۲۰

کو باہم ملالیں۔

حدیث ۴: وعن میمونۃ قالت کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذ سجد جافیٰ بین یدیہ حتیّٰ لو انّ بھمۃ ارادت ان تمر تحت یدیہ مرّت۔ ھذا لفظ ابی داؤد کما صرّح فی شرح السنۃ باسنادہ۔ ولمسلم بمعناہ قالت کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا سجد لو شاءت بھمۃ ان تمر بین یدیہ لمرّت۔

ترجمہ: حضرت ام المؤمنین میمونہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب سجدہ کرتے تھے تو اپنے دونوں ہاتھ جدا رکھتے تھے حتیٰ کہ اگر بکری کا بچہ چاہتا تو آپؐ کے ہاتھوں کے نیچے سے گزر جاتا۔ یہ ابوداؤد کے الفاظ ہیں جیساکہ علامہ بغوی نے شرح السنۃ میں اپنی سند کے ساتھ تصریح کی ہے اور امام مسلمؒ نے اسی معنی میں ایک حدیث روایت کی ہے کہ اُم المؤمنین میمونہؓ نے ارشاد فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب سجدہ کرتے تو اگر بکری کا بچہ آپؐ کے ہاتھوں کے آگے سے گزرنا چاہتا تو گزر جاتا۔

شرح: مسلم کی حدیث چونکہ واضح نہ تھی اس میں بین یدیہ کے لفظ تھے جن سے وہ بات ثابت نہ ہوئی تھی جسے صاحبِ مصابیح ثابت کرنا چاہتے تھے لہذا انہوں نے پہلے ابوداؤد کی روایت بیان کی جو اپنے معنی میں بالکل واضح ہے پھر اس کی تائید میں مسلم کی حدیث بیان کی۔ اب گویا یہ حدیث مسلم کی ہے اس لیے اسے پہلی فصل میں رکھنا مصنف کے قاعدے کے خلاف نہ ہوا کہ وہ پہلی فصل میں صرف بخاری و مسلم کی حدیث لاتے ہیں۔ اور دراصل[1] صاحبِ مشکوٰۃ نے گویا مؤلفِ مصابیح پر اعتراض کیا ہے کہ ابوداؤد کی روایت پہلی فصل میں کیوں لے آئے لیکن خود ان کے الفاظ سے صاحبِ مصابیح کا عذر اور جواب واضح ہو جاتا ہے واللہ اعلم بالصواب۔

بھمہ کا معنی ہے بکری کا چھوٹا سا بچہ جو چلنے پھرنے لگ گیا ہو۔ اور جافیٰ یدیہ کا مطلب یہ ہے کہ اپنے ہاتھوں کو رانوں، زمین اور پہلوؤں سے جُدا رکھ کر خوب کھول کر سجدہ فرماتے تھے۔

---

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۳۱۱

حدیث ۵: وعن عبد اللہؓ بن مالك بن بحینۃ قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا سجد فرّج بین یدیہ حتّٰی یبدو بیاض ابطیہِ۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مالک (ابن بحینہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب سجدہ فرماتے تو اپنے ہاتھوں کو کھول کر رکھتے یہاں تک کہ آپؐ کی بغلوں کی سفیدی نظر آجاتی۔ بخاری ومسلم۔

شرح: عبداللہ کے باپ کا نام مالک اور ماں کا نام بحینہ ہے۔ پس ابن مالک اور ابن بحینہ دونوں عبداللہؓ کی صفات ہیں۔ اور بغلوں کی سفیدی کو بھی حضور کے خصائص میں شمار کیا گیا ہے اور یہ امر ثابت شدہ حقیقت ہے کہ حضورؐ کی بغل مبارک سے بدبو نہیں آتی تھی۔ ہاں اس امر میں کلام ہوا ہے کہ بغلوں میں بال بھی تھے یا نہیں۔ اغلباً بال تو تھے لیکن حضورؐ فطرتاً صفائی پسند تھے۔ اس لئے وہ نظر نہ آتے تھے اور بغلوں کی سفیدی کے ظاہر ہونے کا باعث یا تو آستین کا کھلا ہونا تھا یا ان صحابی نے شاید کسی وقت حضورؐ کو قمیض کے بغیر نماز پڑھتے دیکھا ہوگا۔ واللہ اعلم

حدیث ۶: وعن ابی ھریرۃؓ قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول فی سجودہٖ اللّٰھم اغفرلی ذنبی کلّہٗ دقّہٗ وجلّہٗ واوّلہٗ وآخرہٗ وعلانیتہٗ وسرّہٗ۔ رواہ مسلم

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سجدے میں یوں کہا کرتے تھے: اَللّٰھُمَّ اغفرلی ذنبی کلّہٗ الخ "اے اللہ میرے سب چھوٹے بڑے، پہلے پچھلے اور ظاہر و پوشیدہ گناہ بخش دے" مسلم

شرح: ظاہرؔ یہ ہے کہ یہ دعا کبھی کبھی پڑھا کرتے تھے اور ممکن ہے کہ تسبیح کے بغیر یا اس کے سمیت پڑھتے ہوں۔ بالخصوص نوافل میں لمبی دعائیں ثابت ہیں۔ ظاہر اور چھپے گناہ سے مراد یہ ہے کہ لوگوں کے نزدیک وہ ایسے ہیں ورنہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ سب ظاہر ہیں۔ اور مقصود ان الفاظ سے احاطہ اور مبالغہ ہے اور حضورؐ کی نسبت سے گناہ کا لفظ عام گناہ کی مانند نہیں لیا جائے گا کیونکہ آپؐ معصوم ہیں اس لئے اس سے مراد کما یلیق بشانہٖ لیا جائے گا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

---

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۳۱۱، مرقات ج ۲ ص ۳۲۱، فتح الباری ج ۳ ص ۲۴۴۔
[2] مظاہر حق ج ۱ ص ۳۱۱، مرقات ج ۲ ص ۳۲۱۔

حدیث ۷: وعن عائشۃ رضی اللہ عنہا قالت فقدت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیلۃً من الفراش فالتمستہٗ فوقعت یدی علی بطن قدمیہٖ وھو فی المسجد وھما منصوبتان وھو یقول اللّٰھم انی اعوذ برضاک من سخطک وبمعافاتک من عقوبتک واعوذبک منک لا اُحصی ثناءً علیک اَنت کما اثنیت علی نفسک۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ: ام المؤمنین عائشہ سلام اللہ علیہا فرماتی ہیں کہ ایک رات میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بستر پر نہ پایا تو ان کی تلاش کی پس میرا ہاتھ آپؐ کے قدموں کے نیچے جا پڑا اور آپؐ اس وقت مسجد میں تھے اور آپؐ کے قدم (حالتِ سجود میں) کھڑے تھے اور آپؐ کہہ رہے تھے اللّٰھم انی اعوذ برضاک الخ "اے اللہ میں تیری رضا کے ساتھ تیری ناراضگی سے پناہ مانگتا ہوں اور تیری معافی کے ساتھ پناہ لیتا ہوں۔ میں تیری تعریف کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ تو اسی طرح ہے جس طرح ہے جس طرح تو نے خود اپنی صفت و ثنا ر بیان فرمائی ہے۔ مسلم۔

شرح: یہ واقعہ تو یقیناً نوافلِ تہجد کا ہے۔ اعوذ بک منک پہلے جملوں کا خلاصہ اور حاصل ہے اور ان الفاظ سے حضورؐ کا مقامِ عبدیت و عبودیت ظاہر و باہر ہے مخلوق چاہے کتنے بلند سے بلند تر مقام پر فائز ہو خالق بہر حال خالق ہے اور اس کے حضور میں اپنے عجز و قصور کا اعتراف ہی اصلِ عبدیت ہے اسی وجہ سے حضورؐ کو عبدِ کامل کہا جاتا ہے۔ اس حدیث سے یہ مسئلہ بھی ثابت ہو گیا کہ عورت کے چھونے سے مرد کا وضو نہیں ٹوٹتا ورنہ حضورؐ نماز توڑ دیتے اور از سر نو وضو فرماتے جو ثابت نہیں ہوا۔ واللہ اعلم۔[1]

• انت کما اثنیت علی نفسک کا اشارہ اس آیت کی طرف ہے: فَلِلّٰہِ الْحَمْدُ ربِّ السّمٰوٰتِ وربِّ الارضِ رَبِّ العالمین ٥ وَلَہُ الکبریاءُ فِی السّمٰوٰتِ والارضِ وھو العزیز الحکیم۔

حدیث ۸: وعن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اقرب مایکون العبد من ربّہٖ وھُوَ ساجِدٌ فاکثروا الدعاء۔ رواہ مسلم۔

---

[1] مرقات ج ۲ ص ۳۲۲، مظاہر حق ج ۱ ص ۳۱۲۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جنابِ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بندہ اپنے پروردگار سے سجدے کی حالت میں قریب ترین ہوتا ہے۔ پس اس حالت میں تم بہت دعا کیا کرو۔ مسلم۔

شرح: ویسے تو اللہ تعالیٰ ہر وقت بندے کی شاہ رگ سے بھی قریب تر ہے۔ نحن اقرب الیہ من حبل الورید۔ الآیۃ۔ مگر اس حدیث میں جو قرب بیان کیا گیا ہے اس سے مُراد اللہ کی رضا وعطا کا قرب ہے اس لیے اس حالت میں کثرتِ دعا کا حکم فرمایا گیا ہے۔ اور باعث اس کا یہ ہے کہ سجدے میں بندہ اپنے اصل مقام یعنی بندگی، انتہائی تذلّل اور خدا تعالیٰ کے اعتراف ربوبیت والوہیت کے مقام پر فائز ہوتا ہے۔ اور بندے کا اس مقام پر فائز ہونا ہی انتہائی قربِ الٰہی کا باعث ہے اسی لئے کہا گیا ہے۔ مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ۔ اس حدیث سے استدلال کیا گیا ہے کہ کثرتِ سجود طولِ قیام سے افضل ہے۔

حدیث ۹: وعنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا قرأ ابن آدم السجدۃ فسجد اعتزل الشیطان یبکی یقول یا ویلتیٰ اُمِر ابن آدمؑ بالسجود فسجد فلہٗ الجنّۃ واُمِرتُ بالسّجود فابیتُ فلی النّار۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب آدمی سجدے کی آیت پڑھتا اور سجدہ کرتا تو شیطان روتا ہوا ایک طرف کو چلا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے ہائے افسوس آدمی کو سجدہ کا حکم دیا گیا تو اُس نے سجدہ کیا پس اُس کے لئے جنّت ہے اور مجھے سجدے کا حکم ملا تو میں نے انکار کر دیا پس میرے لئے جہنم کی آگ ہے۔ مسلم۔

شرح: [1] شیطان کا یہ فعل حسرت وندامت کے اظہار کے لئے ہے اور اس حدیث سے ثابت ہوا کہ دراصل ابلیس ملعون کو جس سجدے کا حکم دیا گیا تھا وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے تھا اور آدمؑ محض قبلہ کی حیثیت رکھتے تھے جیسا کہ حافظ ابن حجر نے فرمایا ہے۔ اس حدیث سے سجدۂ تلاوت کے واجب ہونے کا ثبوت ملتا ہے اور یہی حنیفہ کا مسلک ہے۔

حدیث ۱۰: وعن ربیعۃؓ بن کعب قال کنتُ اَبِیْتُ مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاَتَیتُہٗ بوضوئہٖ وحاجتہٖ فقال لی سَلْ فقلتُ اَسالُكَ مرافقتكَ فی الجنّۃ قال اَوَ غیرَ ذٰلكَ قلتُ ھو

---

[1] مرقات ج ۲ ص ۳۲۳۔

ذاك قال فأعنّي علیٰ نفسك بكثرة السجود ۔ رواہ مسلم ۔

ترجمہ: حضرت ربیعہ بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں رات گزارتا تھا۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ میں آپؐ کے پاس پانی اور دیگر ضروریات یعنی مسواک اور مصلیٰ وغیرہ لایا تو حضورؐ نے فرمایا مانگ (کیا مانگتا ہے) تو میں نے عرض کیا کہ میں جنت میں آپ کی رفاقت کا طلبگار ہوں۔ حضورؐ نے

ارشاد فرمایا کیا اس کے سوا کچھ اور بھی؟ میں نے کہا نہیں میری تو یہی خواہش ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ پس (اگر یہی خواہش ہے تو) زیادہ سجدوں سے میری اعانت کر۔ مسلم۔

شرح: حضورؐ کو بذریعہ وحی اور اعلامِ خداوندی معلوم ہوگیا تھا کہ اس صحابیؓ کے حق میں جو کچھ مانگیں گے بعینہٖ مل جائے گا اسی لئے خود اس کی طرف پہل فرمائی اور اس کی خواہش طلب کا سوال فرمایا۔ کریم انسانوں کا قاعدہ ہے کہ جب کسی سے خوش ہوں تو اس کی خدمت و وفاداری کا بدلہ ضرور چکاتے ہیں اور حضورؐ سے بڑھ کر کوئی کریم پیدا نہیں ہوا۔ اور اس صحابیؓ کی طلب پر قربان جائیے کہ ایسے قبولیت کے وقت میں مانگا تو وہ کچھ مانگا جو اس کی انتہائی ایمانداری اور عقلمندی پر دلالت کرتا ہے اور حضورؐ نے دوبارہ جو فرمایا کہ بس یہی کچھ مانگتے ہو یا کچھ اور بھی؟ یہ اسے اپنی طلب پر پختہ کرنے اور اس کا امتحان لینے کی غرض سے تھا۔ کہ یہ شخص کوئی عارضی متاعِ دنیوی کا طالب تو نہیں۔ اور اس کے جواب سے اس کی بلند ہمتی اور اُولو العزمی کا اظہار ہوتا ہے۔ حضورؐ نے واضح طور پر تو جنت کی رفاقت کا وعدہ نہیں فرمایا لیکن آپؐ کا ارشاد کہ کثرتِ سجود سے میری اعانت کرو دلالت کر رہا ہے کہ آپؐ نے اس صحابیؓ کے سوال کو قبول فرمالیا تھا۔ ہاں! یہ مسئلہ بھی واضح فرما دیا کہ جنت میں میری رفاقت میری شفاعت پر منحصر ہے اور شفاعت کا باعث کثرتِ سجود ہے۔ یاد رہے کہ یہاں محض نجاتِ اُخروی کا ذکر نہیں نہ عام شفاعت زیرِ بحث ہے بلکہ جنت کے بلند ترین مراتب زیرِ بحث ہیں۔ یہ اس لئے کہ شفاعت تو اہلِ کبائر کے لئے بھی ثابت ہے لیکن جنت میں رفاقت یقیناً اس سے بلند تر مقام ہے جس کی یہاں طلب و گفتگو تھی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۱۱: وعن معدان بن طلحة قال لقيتُ ثوبانؓ مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقلتُ أخبرني بعملٍ أعملهُ يدخلني اللہ به الجنة فسكت ثم سألتهُ فسكت ثم سألتهُ الثالثة

سلہ مظاہرِ حق ج ۱ صہ ۱۳ ، مرقات ج ۲ صہ ۲۳

فقال سألت عن ذلك رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال علیك بكثرۃ السجود للہ فانك لا تسجد للہ سجدۃً الا رفعك اللہ بھا درجۃً وحطّ عنك بھا خطیئۃً قال معدان ثم لقیت ابا الدرداء فسألتہ فقال لی مثل ما قال لی ثوبان. رواہ مسلم۔

ترجمہ: معدانؒ ابن طلحہ فرماتے ہیں کہ میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام ثوبانؓ سے ملا اور ان سے کہا کہ مجھے کوئی ایسا کام بتایئے جسے میں بجا لاؤں تو اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے مجھے جنّت میں داخل کردے۔ پس حضرت ثوبانؓ خاموش ہو رہے۔ پھر میں نے یہی سوال کیا تو وہ پھر بھی خاموش رہے پھر میں نے تیسری بار ان سے یہی سوال کیا تو ثوبانؓ نے فرمایا کہ میں نے اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا تو آپؐ نے فرمایا تھا کہ تم پر لازم ہے کہ اللہ کو کثرت سے سجدے کیا کرو کیونکہ تم جب بھی اللہ کو سجدہ کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے تمہارا مرتبہ اونچا کر دیتا ہے اور اس کے باعث تمہارا کوئی گناہ بخش دیتا ہے۔ معدانؒ کہتے ہیں کہ پھر میں حضرت ابوالدرداءؓ سے ملا اور اُن سے بھی یہی سوال کیا تو انہوں نے بھی مجھے حضرت ثوبانؓ والا ہی جواب ملا۔ مسلم۔

شرح: حضرت ثوبانؓ کے جواب سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی سوال کیا ہوگا تو اس میں بھی تین ہی مرتبہ پوچھنے کی نوبت آئی ہوگی۔ یا حضرت ثوبانؓ نے سائل کا شوق و رغبت پرکھنے کے لئے امتحاناً دو مرتبہ خاموشی اختیار کر لی تھی۔ اور بظاہر تو کثرتِ سجود سے مراد زیادہ نماز پڑھنا ہے لیکن اس سے سجدہ تلاوت اور سجدہ شکر بھی مراد لیا جا سکتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

باب التشہد

تشہّد کا لفظی معنی ایسی گواہی دینا ہے جس میں زبان و دل ایک دوسرے کے بالکل موافق ہوں اور اصطلاحِ شرع میں نماز کا تشہّد ایک خاص قسم کا ذکر ہے جو دوسری اور آخری رکعات میں پڑھا جاتا ہے۔ اس میں چونکہ کلمہ شہادت بھی ہوتا ہے اس لئے اس کا نام تشہّد رکھا گیا ہے۔ اس باب میں صرف تشہّد کا ہی ذکر نہیں بلکہ قعدہ اور انگشت

لے مرقات ج ۲ صـ ۳۲۴ مظاہر حق ج ۱ صـ ۳۱۳

شہادت کا اشارہ وغیرہ اور ان کی کیفیات بھی زیر بحث آئیں گی۔

حنفیہ نماز میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے تشہد پر عامل ہیں جو بخاری و مسلم وغیرہ کی احادیث سے ثابت ہے۔ اس[1] کے علاوہ حضرت عمرؓ، حضرت عائشہؓ، ابن عمرؓ اور ابن عباسؓ سے بھی کچھ مختلف الفاظ میں مؤطا اور دوسری کتب حدیث میں تشہد ثابت ہیں جو بھی پڑھ لیں کافی ہے۔ علامہ شوکانیؒ نے نیل الاوطار ج ۲ ص ۱۷۲ میں تشہد کے راوی صحابہؓ میں جابرؓ، علیؓ، ابوبکرؓ، ابوموسیٰؓ، ابن الزبیرؓ، سلمانؓ، ابوحمیدؓ، حسینؓ بن علیؓ، طلحہؓ بن عبیداللہ، انسؓ، ابوہریرہؓ، ابوسعیدؓ، الفضلؓ بن عباس، ام سلمہؓ، مطلبؓ بن ربیعہ اور ابنؓ ابی اوفیٰ کا نام بھی لیا ہے۔ لیکن ان میں سے بہت سی روایات میں کلام ہے۔ اور اس کے ساتھ اور دعائیں بھی حدیث سے ثابت ہیں۔ واللہ ولی التوفیق۔

الفصل الاوّل

حدیث ۱: عن ابنؓ عمر قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا قعد فی التشہد وضع یدہ الیسریٰ علیٰ رکبتہٖ الیسریٰ ووضع یدہ الیمنیٰ علیٰ رکبتہٖ الیمنیٰ وعقد ثلاثۃً وخمسین واشار بالسبابۃ وفی روایۃٍ کان اذا جلس فی الصلاۃ وضع یدیہ علیٰ رکبتیہ ورفع اصبعہ الیمنیٰ التی تلی الابہام یدعو بہا ویدہ الیسریٰ علیٰ رکبتہٖ باسطہا علیہا۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تشہد میں بیٹھتے تو اپنا بایاں ہاتھ اپنے بائیں گھٹنے پر رکھتے اور دایاں ہاتھ دائیں گھٹنے پر رکھتے تھے اور ترپن[2] کے عدد کے مطابق ہاتھ بند کرتے اور انگشت شہادت سے اشارہ کرتے اور ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ جب نماز میں بیٹھتے تھے تو اپنے ہاتھ اپنے گھٹنوں پر رکھ لیتے تھے اور اپنی دائیں انگلی جو انگوٹھے کے ساتھ ہے اُسے اُٹھا کر دعا کرتے یعنی توحید کا اشارہ فرماتے۔ اور اپنا بایاں ہاتھ بائیں گھٹنے پر پھیلا کر رکھتے تھے۔ مسلم۔

شرح: اہل عرب کے ہاں اکائیوں، دہائیوں، سینکڑوں اور ہزاروں کے لئے انگلیوں کے بند کرنے اور کھولنے کے اشارے مقرر تھے۔ ترپن کا اشارہ اس طرح ہے کہ

---

[1] مصفّیٰ شرح مؤطا ج ۱ ص ۱۱۶ [2] مظاہر حق ج ۱ ص ۳۱۶، مرقات ج ۲ ص ۳۲۸

چھنگلیا اور اس کے ساتھ کی انگلی اور درمیانی انگلی کو بند کرلے اور انگوٹھے کو انگشتِ شہادت کی جڑ میں رکھے۔ اور عبداللہ بن زبیرؓ کی حدیث میں جو مسلم نے روایت کی ہے۔ عقد تسعین کا ذکر آیا ہے اور تسعین (نوّے) کے عقد کی صورت یہ ہے کہ چھنگلیا اور ساتھ والی انگلی کو بند کرے اور انگوٹھے اور درمیانی انگلی کے سر ملا کر حلقہ بنائے اور انگشتِ شہادت کو کھلا رکھے۔ امام شافعیؒ اور ایک روایت کے مطابق امام احمدؒ کا عمل عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما والی روایت کے مطابق ہے اور حنفیہ کا مسلک اور امام احمدؒ کا مختار مذہب بھی عقد تسعین ہے اور امام شافعیؒ کا قولِ قدیم بھی اسی کے مطابق ہے اور حضرت وائل بن حجر کی حدیث جو مسند احمد اور ابوداؤد میں ہے وہ بھی اسی کے مطابق ہے اور امام مالکؒ کے نزدیک دائیں ہاتھ کی تمام انگلیاں بند کرلے اور صرف انگشتِ شہادت کو کھلا رکھے اور بعض احادیث میں بغیر عقد کے بھی اشارہ ثابت ہوا ہے اور بعض حنفیہ کا اسی پر عمل ہے۔ غالباً مختلف اوقات میں حضورؐ کا عمل اس باب میں مختلف رہا ہے۔ بعض حنفیہ نے جو اشارے کو ترک کیا ہے یہ قولِ مرجوح ہے فقہ حنفیہ کی تمام کتب میں اس کا سنت ہونا مذکور ہوا ہے۔ تمام فقہاءؒ اور محدثین رفع سبابہ کی سنیت کے قائل ہیں اور صحابہؓ و تابعینؒ سے اس کا متفق علیہ ثبوت موجود ہے۔ شافعیہ کے نزدیک لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہتے وقت انگلی اٹھانی چاہیئے اور حنفیہ کے ہاں لا الٰہ پر اُٹھائے اور اِلَّا اللّٰہ پر نیچے رکھ دے اور انگلی بالکل سیدھی آسمان کی طرف نہ اٹھانی چاہیئے تاکہ جہت اور طرف کا گمان نہ ہو، بلکہ اسے قبلہ رُخ اٹھانا اَولیٰ ہے اور اس حدیث میں اشارہ کے تشہد کو دُعا کہا گیا ہے کیونکہ وہ اس پر مشتمل ہے یعنی ذکر کو دُعا بھی کہا گیا ہے اور بعض ائمہ شافعیہ و حنفیہ نے کہا ہے کہ جب انگلی اٹھائے تو پھر اُسے اٹھائے ہی رکھے کیونکہ اس کا اعادہ کسی روایت میں مذکور نہیں ہے۔ علامہ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ انگلی اٹھاتے وقت نیّت توحید و اخلاص کی ہونی چاہیئے۔ انگشتِ شہادت کا نام اسی شہادت کی بناء پر رکھا گیا ہے۔ اور عربی میں اسے مُسَبِّحَہ یا سَبَّاحَۃ بھی کہا جاتا ہے اور سبّابہ کہنے کا باعث یہ ہے کہ جھگڑے کے وقت اس کے اشارے سے گالی وغیرہ دی جاتی تھی۔

حدیث: وعن عبد اللہؓ بن الزبیر قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا قعد یدعو وضع یدہ الیمنیٰ علی فخذہ الیمنیٰ ویدہ الیسریٰ علی فخذہ الیسرٰی و اَشار باصبعہ ووضع ابہامہ علی اصبعہ الوُسطیٰ ویلقم کفہ الیسرٰی

رُکبتہٗ ۔ رواہ مسلم ۔

ترجمہ : حضرت عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم جب تشہّد کی دُعا (ذکر) کرنے بیٹھتے تھے تو اپنا دایاں ہاتھ دائیں ران پر رکھتے اور بایاں ہاتھ بائیں ران پر رکھتے اور انگشتِ شہادت سے اشارہ فرماتے اور اپنا انگوٹھا درمیانی انگلی پر رکھتے اور بائیں ہتھیلی سے اپنا گھٹنا پکڑتے ۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے ۔

شرح : اس روایت کا ذکر اوپر بھی ہو چکا ہے ۔ اس میں جو عقد مذکور ہے اسے نوّے یا تیئس کا عدد کہا جاتا ہے ۔[1] اس حدیث میں یہ اشارہ بھی ہے کہ یہ حلقہ اشارہ کرنے کے وقت بنایا جاتے ۔ حنفیہ کا مختار یہی ہے ۔ اور شافعیہ فرماتے ہیں کہ تشہّد میں بیٹھتے وقت ہی یہ عقد بنا لینا چاہیئے ۔ بعض حنفیہ نے بھی یہی کہا ہے ۔

اس حدیث میں قَعَدَ یدعو سے مراد تشہد پڑھنے بیٹھنا ہے ۔ اوپر کی روایت میں اشارۂ سبّابہ کے لئے بھی دُعا کا لفظ بولا گیا تھا اور یہاں تشہّد کے لئے دُعا کا لفظ آیا ہے ۔ وجہ بالکل ظاہر ہے ۔ پچھلی روایت میں بائیں ہاتھ کو گھٹنے پر بچھا دینے کا ذکر تھا ۔ اس میں ہتھیلی سے گھٹنے کو تھامنے کا ذکر ہے ۔ دونوں طرح جائز ہے ۔ کبھی یوں اور کبھی یوں کرتے تھے ۔ پچھلی روایت میں گھٹنے کا لفظ تھا اور اس میں ران کا لفظ ہے ۔ ان میں کوئی اختلاف نہیں ، کیونکہ ہاتھ کا کچھ حصّہ ران پر ہوتا ہے اور اگلا حصّہ گھٹنے پر ہوتا ہے اور دونوں روایات میں محض تعبیر کا اختلاف ہے ۔

حدیث ۳ : وعن عبدُاللّٰہ بن مسعود قال کنّا اذا صلّینا مع النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قلنا السلام علی اللّٰہ قبل عبادہ السلام علی جبرئیل السلام علی میکائیل السلام علی فلانٍ فلمّا انصرف النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم اَقبل علینا بوجھہٖ قال لا تقولوا السلام علی اللّٰہ فانّ اللّٰہ ھو السلام فاذا اجلس اَحدکم فی الصّلاۃ فلیقل التّحیّات للّٰہ والصّلوات والطّیّبات السّلام علیك ایھا النّبیّ و رحمۃ اللّٰہ وبرکاتہٗ السلام علینا وعلی عباد اللّٰہ الصالحین ۔ فانّہٗ اذا قال ذالك اصاب کلّ عبدٍ صالحٍ فی السّمآء والارض اَشھد ان لآ اِلٰہَ اِلّا اللّٰہ وَاَشھد اَنّ محمّدًا عبدہٗ ورسولہٗ ، ثمّ

---

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۳۱۶ ، مرقات ج ۲ ص ۳۲۹

لیتخیّر من الدّعاء اعجبہٗ الیہ فیدعوہ۔ متّفق علیہ۔

ترجمہ : حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ ہم لوگ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھتے تو تشہد کے مقرر کیے جانے سے قبل یوں کہا کرتے : السلام علی اللہ الخ سلام ہو اللہ پر اور یہ واقعہ موجودہ تشہد سے پہلے کا ہے جس میں السلام علینا وعلیٰ عباد اللہ الصالحین آیا ہے (یا ہم کہا کرتے کہ بندوں کی طرف سے اللہ پر سلام ہو) جبرئیل پر سلام ہو۔ میکائیل پر سلام ہو، فلاں پر سلام ہو۔ پس جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم معراج سے واپس تشریف لائے (یا ایک دن نماز سے فارغ ہوئے) تو ہماری طرف منہ کر کے فرمایا یوں مت کہو السلام علی اللہ کیونکہ اللہ تو خود مصدرِ سلام ہے پس جب تم میں سے کوئی شخص نماز میں بیٹھے تو یوں کہے التحیات للہ الخ سب زبانی عبادتیں اور بدنی عبادتیں اور مالی عبادتیں اللہ ہی کے لئے ہیں۔ اے پیغمبرؐ! آپؐ پر سلام اور اللہ کی رحمت اور اُس کی برکتیں ہوں۔ ہم پر سلام ہو اور خدا کے سب نیک بندوں پر بھی سلام ہو۔" کیونکہ جب وہ یوں کہے گا تو زمین و آسمان کے ہر نیک بندے کو اس کی دعا شامل ہو جائے گی اور سلامتی پہنچ جائے گی۔" میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ بلاشبہ محمدؐ خدا کے بندے اور اس کے پیغمبرؐ ہیں۔" پھر اُسے اپنی سب سے پسندیدہ دُعا منتخب کرنی اور اس کے ذریعے دعا کرنی چاہیئے۔ بخاریؒ و مسلمؒ۔

شرح : السّلام[1] اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے اور اس کا معنی ہے وہ ذات جو خود عیوب سے پاک ہے اور دوسروں کو سلامتی بخشنے والا ہے۔ تشہد کے مشروع ہونے سے قبل صحابہؓ کا السّلام علی اللہ کہنا بطور دعا و ذکر تھا اور حضورؐ نے ابھی انہیں لفظ سلام اور اللہ تعالیٰ کی صفت السّلام کے معنے تلقین نہیں فرمائے تھے۔ پس جب یہ وقت آیا تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تو خود مصدرِ سلام ہے اور بندوں کی دُعاؤں سے بے نیاز ہے لہذا السلام علی اللہ نہ کہا جائے اور فرشتوں یا دیگر اشخاص و افراد کا نام لینے کی بجائے ایک جامع عبارت تلقین فرما دی کہ اس کے ذریعے سے ساری کائنات کے نیک بندوں کو سلامتی میں شامل کر لیا جائے۔

---

[1] فیض الباری ج ۲ ص ۳۱۲

علامہ علیؒ القاری[1] فرماتے ہیں کہ حدیث میں فلیقل کا امر وجوب کے لئے ہے۔ اس لئے حنفیہ کے نزدیک تشہدؔ پڑھنا واجب ہے اور اسی طرح پہلا قعدہ بھی واجب ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے چھوڑنے پر سجدۂ سہوا ادا فرمایا تھا۔[2] اور آخری قعدہ دلائلِ شرع سے فرض ہے کیونکہ حضورؐ کی حدیث ہے کہ جب امام آخری قعدے میں بیٹھ جائے اور تشہدؔ سے قبل اس کا وضو جاتا رہے تو اس کی نماز مکمل ہوگئی۔ اور حضرت علیؓ سے موقوفاً روایت ہے کہ اذا جلس قدر التشھد ثم احدث فقد تمت صلاتہ۔ اور یہ حدیث مرفوع کے حکم میں ہے لیکن حافظ ابنِ حجر کا یہ دونوں روایات باتفاقِ حفّاظ ضعیف ہیں۔ بوجہ اختلافِ حفّاظِ حدیث خود ضعیف قول ہے۔

تشہدؔ کے باب میں امام شافعیؒ نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت اختیار کی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے ابن مسعودؓ کی روایت اور امام مالکؒ نے جناب عمرؓ کی روایت اختیار کی ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ جو نسا پڑھ لیں نماز جائز ہے اختلاف صرف افضلیت میں ہے۔[3]

سلام سے مراد آفات سے محفوظ رہنا ہے، رحمت سے مراد انتہائی فضل و احسان اور انعام الٰہی ہے اور برکات سے مراد ہر قسم کی دائمی بھلائی اور خیر میں زیادتی ہے۔ اور یہ جو فرمایا کہ ہر نیک بندے کو سلام و دعا شامل ہو جاتی ہے تو نیک بندے سے مراد وہ ہے جو اللہ اور بندوں کے حقوق ادا کرتا ہو اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد ہر مسلم ہے۔ علامہ علیؒ القاری نے ابن الملکؒ سے نقل کیا ہے کہ شب معراج میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے التحیات للہ الخ سے جو حمد و ثنا بیان فرمائی۔ اللہ تعالیٰ نے السلام علیك ایھا النبی الخ سے اس سلام کا جواب دیا۔ پھر حضورؐ نے السلام علینا و علی عباد اللہ الصالحین سے اس سلام کو قبول فرمایا اور جبرئیل علیہ السلام نے کہا اشھد ان لا الٰہ الا اللہ الخ اور ان تمام مقدس و متبرک کلمات کو نماز میں رکھ دیا گیا جو معراج المؤمنین ہے تاکہ معراجِ رسولؐ کی یاد تازہ رہے اور[4]

---

[1] مرقات ج ۲ صـ۳۳ [2] بخاری باب التشہد فی الاولیٰ صـ۱۵۱
[3] مرقات ج ۲ صـ۳۳
[4] مظاہر حق ج ۱ صـ۳۱۷، ایضاً مرقات، فیض الباری ج ۲ صـ۳۱۳

السلام علیکؑ الخ کا خطاب حکایتِ حالِ ماضیہ کے طور پر ہے۔

تشہدؔ ابن مسعودؓ کو حنفیہ نے اصحّ مافی الباب کے طور پر اختیار کیا ہے اور بعض شافعی حضرات مثلاً شیخ علاء الدولہؒ سمنانی ابن المنذر اور جمہور علماء کا یہی مختار ہے۔ شاہ ولی اللہ الدھلوی نے فرمایا ہے کہ امام شافعیؒ نے اختصارِ الفاظ کی بناء پر تشہدِ ابن عباسؓ کو اختیار فرمایا ہے۔ واللہ اعلم۔

امام[1] مالکؒ نے مؤطّا صلا میں اور امام بیہقیؒ نے حضرت عبداللہؓ بن عمر سے نقل کیا ہے کہ وہ السلام علیک ایہا النبی الخ کو نماز سے تحلیل (یعنی آخری سلام) کے طور پر تشہد کے آخر میں لاتے تھے اور اس کے ساتھ نماز سے باہر نکلتے تھے لیکن جمہور کے ہاں نماز کا محلّل السلام علیکم ورحمۃ اللہ کا لفظ ہے نہ کہ وہ سلام جو تشہد میں ہے۔

حدیث ۴ : وعن عبدؓ اللہ بن عباس قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یُعلّمنا التشہد کما یعلّمنا السورۃ من القرآن فکان یقول التّحیات المبارکات الصّلوات الطیّبات للہ السّلام علیکَ ایها النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ السّلام علینا وعلٰی عباد اللہ الصّالحین اَشهد ان لآ اِلٰہ الاّ اللہ وَ اَشہد اَنّ محمّدًا رّسول اللہ ۔ رواہ مسلم ۔ ولم اجد فی الصحیحین ولا فی الجمع بین الصحیحین سلامٌ علیک وسلامٌ علینا بغیر الف ولام ولکن رواہ صاحب الجامع عن الترمذی۔

ترجمہ : حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالٰی عنہما فرماتے ہیں کہ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں تشہد سکھاتے تھے جس طرح کہ قرآن کی سورت کی تعلیم دیتے تھے، پس فرمایا کرتے تھے: التحیات المبارکات الخ " بابرکت زبانی عبادات (اور) پاکیزہ بدنی عبادات اللہ ہی کے لئے ہیں ۔ اے پیغمبرؑ آپؐ پر سلام اور اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں نازل ہوں۔ ہم پر اور خدا کے سب صالح بندوں پر سلام ہو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمدؐ اللہ کے رسولؐ ہیں۔" اسے مسلم نے روایت کیا اور میں نے صحیحین اور الجمع بین الصحیحین میں سلامٌ علیک اور سلامٌ علینا، الف لام کے

---

[1] مصنّف ج ۱ صلا۔ [2] فیض الباری ج ۲ ص ۳۱۳

بغیر نہیں پایا لیکن جامع الاصول کے مؤلف نے اسے ترمذی سے روایت کیا ہے۔

شرح: حافظ الدنیا علامہ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ تشہد ابن مسعودؓ صحیح ترین ہے اور حنفیہ کے علاوہ امام احمدؒ بن حنبل نے بھی اسی کو اختیار فرمایا ہے اور بقول ترمذیؒ اکثر اہل علم صحابہؓ وتابعینؒ اسی کو اختیار کرتے ہیں اور حضورؐ نے اس کے سیکھنے اور سکھانے کا حکم دیا ہے اور اس کے سوا کسی اور تشہد کی یہ شان نہیں آئی۔ حضورؐ نے عبداللہؓ بن مسعود کو اسے لوگوں کو سکھانے کا امر فرمایا تھا اور حضورؐ نے عبداللہ بن مسعود کا ہاتھ اپنے دستِ مبارک میں لے کر اس کی تلقین فرمائی تھی جیسے کہ قرآن وسنت کی تلقین فرماتے تھے اور ابنِ مسعودؓ کی حدیث بخاری ومسلم دونوں کی ہے اور ابنِ عباس کا تشہد مسلم کے افراد میں سے ہے۔[1]

صحیحین کی روایت میں السلام علینا اور السلام علیك الف لام کے ساتھ ہے لیکن صاحب مصابیح نے سلام علیك اور سلام علینا روایت کیا تھا جو غیر صحیحین کی روایت میں تھا۔ اس بنار پر صاحبِ مشکوٰۃ نے ان پر اعتراض کیا ہے کہ بغیر الف و لام کے بخاری ومسلم کی روایت میں نہیں، پس اسے پہلی فصل میں لانا خلافِ قاعدہ ہوا۔ الجمع بین الصحیحین امام حمیدی کی ایک کتاب کا نام ہے۔ اور صاحب الجامع سے مراد جامع الاصول الستۃ علامہ ابنؒ الاثیر ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔[2]

علامہ قسطلانیؒ[3] نے باب التشہد فی الآخرۃ کی شرح میں لکھا ہے أی وجوب التشہد۔ اس سے معلوم ہوا کہ شافعیہ کے ہاں بھی تشہد واجب ہے لیکن دراصل حنفی اور شافعی اصطلاح میں فرق ہے۔ شافعی فرض کے لئے واجب کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور حنفیہ کے نزدیک واجب کا درجہ فرض وسنت کے بین بین ہے۔ یہ نکتہ یاد رکھ لیا جائے تو ائمہ فقہ وحدیث کے بہت سے اختلافات ختم یا حل ہو جاتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

---

[1] فتح الباری ج ۲ ص ۲۵۴، قسطلانی ج ۲ ص ۱۳۵، نیل الاوطار ج ۲ ص ۱۷۲۔

[2] مظاہر حق ج ۱ ص ۳۱۸، مرقات ج ۲ ص ۳۳۲

[3] ارشاد الساری ج ۲ ص ۱۴۷

باب الصّلاۃ علی النّبیّ صلّی اللہ علیہ وسلّم وفضلہا

یعنی اس باب میں حضورؐ پر صلاۃ کا حکم اور اس کا ثواب بیان کیا جائے گا۔

علمائے امّت[1] نے اس باب میں اختلاف کیا ہے کہ ارشادِ الٰہی یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا۔ میں امر وجوب کے لئے ہے یا استحباب کے لئے۔ پھر اگر وجوب کے لئے ہے تو کیا صلاۃ وسلام فرضِ عین ہے یا فرض کفایہ۔ اور یہ وجوب ہر مرتبہ حضورؐ کا ذکر سُننے پر متکرّر ہوتا ہے یا نہیں۔ اور متکرّر ہونے کی صورت میں ایک ہی مجلس میں بار بار اگر ذکرِ مبارک آئے تو ہر مرتبہ وجوب کا حکم ہوگا یا صرف پہلی مرتبہ فرض اور پھر مسنون و مستحب؟ امام شافعیؒ کے نزدیک قعدۂ اخیرہ میں صلاۃ وسلام فرض ہے اور دیگر سب علمائے امّت کے نزدیک مسنون ہے۔ اور حنفیہ کے نزدیک حضورؐ کا نام آنے پر صلاۃ وسلام کہنا واجب ہے، لیکن ایک ہی مجلس میں بار بار نامِ مبارک سننے پر پہلی مرتبہ واجب ہے اور پھر مسنون و مستحب۔

صلاۃ کا معنیٰ رحمت، دُعا اور استغفار ہے اور اس کی غرض یہ ہے کہ ہادیٔ برحق اور رہبر مطلق ہونے کی بنا پر ہمارے ذمہ جو حضورؐ کا حق ہے ہم اسے صلاۃ وسلام سے ادا کرنے کی کوشش کریں اور اپنی عقیدت و محبّت کا ثبوت دیں۔ صلاۃ وسلام اسلام کے شعائر میں سے ہے اور اہل ایمان کو اس کی طرف سے غفلت نہ ہونی چاہیئے۔ قاضی ابوبکرؒ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صلاۃ وسلام کی حدّ، وقت اور تعداد معیّن نہیں فرمائی، پس ہمیں اس کی ادائیگی سے کبھی غفلت نہ کرنی چاہیئے۔ اور مستقل طور پر صلاۃ وسلام حضورؐ کا خاصہ ہے یعنی صلی اللہ علیہ وسلم کہنا صرف آپؐ ہی لئے چاہیئے دیگر انبیاء کے لئے علیہم السلام کا لفظ اور صحابہ کے لئے رضی اللہ عنہ اور دیگر بزرگانِ دین کے لئے غفر اللہ لہٗ اور رحمہ اللہ کہنا مسنون ہے۔ غیر انبیاء کے لئے علیہ السلام کا لفظ بالاستقلال بولنا بدعت ہے۔ ہاں بالتبع جائز ہے مثلاً صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وازواجہٖ وسلّم۔ ملائکہؑ کے لئے بھی سلام کا لفظ مخصوص ہے مثلاً جبریل علیہ السلام۔

امام بخاریؒ[2] نے صلاۃ وسلام کی حدیث کو باب الادعیہ میں تو بیان کیا ہے لیکن صفۃ الصلوٰۃ میں اسے نہیں رکھا اور تشہد کے بعد فوراً دوسرا باب الدعا قبل السلام

---

[1] مرقات ج ۲ صـ ۳۳۶، مظاہر حق ج ۱ صـ ۳۲ [2] فیض الباری ج ۲ صـ ۳۱۳

رکھ دیا ہے۔ حضرت سید المحدثین علامہ انور شاہؒ فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ اب تک مجھے سمجھ میں نہیں آئی۔ اگر امام بخاریؒ اس سے امام شافعیؒ کے فرضیتِ صلاۃ کے دعوے کا رد کرنا چاہتے تھے تو بھی یہ سب کے نزدیک سُنّت تو ہے ہی۔

حدیث ۱: عن عبد الرحمٰنؒ ابی لیلیٰ قال لَقِیَنِیْ کعبؓ بن عجرۃ فقال اَلَا اُھْدِیْ لَکَ ھَدِیَّۃً سَمِعْتُھَا من النّبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقلت بلیٰ فَاَھْدِ ھَالِیْ فقال سَاَلْنَا رَسُوْل اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم فَقُلْنَا یارَسُوْلَ اللّٰہِ کیفَ الصَّلوٰۃُ عَلَیْکُمْ اَھْلَ الْبَیْتِ فَاِنَّ اللّٰہ قد عَلَّمَنَا کیفَ نُسَلِّمُ علیکَ قَالَ قُوْلُوْا اَللّٰھُمَّ صلّ علیٰ محمّد وَّعلیٰ آلِ محمّدٍ کَمَا صَلَّیتَ علیٰ ابراھیم وعلیٰ آلِ ابراھیم اِنَّکَ حمیدٌ مجید اَللّٰھُمَّ بارِکْ عَلیٰ مُحَمَّدٍ وَّعلیٰ آلِ مُحَمَّدٍ کما بارکت علیٰ ابراھیم وَعلیٰ آلِ اِبْرَاھِیمَ اِنَّکَ حمیدٌ مجید۔ متفق علیہ۔ اِلَّا اَنَّ مُسْلِمًا لم یذکر علیٰ ابراھیم فی الموضعین۔

ترجمہ: حضرت عبد الرحمٰنؒ بن ابی لیلیٰ صحابی فرماتے ہیں کہ مجھ سے کعبؓ بن عجرہ ملے تو فرمایا کیا میں تمہیں وہ تحفہ نہ دوں جو میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے؟ میں نے کہا کیوں نہیں؟ ضرور وہ تحفہ مجھے دیجیے۔ تو انہوں نے فرمایا کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا اور کہا کہ یارسول اللہ! ہم اہلِ بیتِ نبوت پر کیونکر صلاۃ بھیجیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ تو سکھا دیا ہے کہ آپؐ پر سلام کیسے بھیجیں۔ حضورؐ نے فرمایا یوں کہو اللّٰھم صلّی محمّد وّعلیٰ آلِ محمّدٍ الخ اے اللہ محمدؐ اور آلِ محمدؐ پر رحمت بھیج جس طرح تو نے ابراہیمؑ اور آلِ ابراہیمؑ پر رحمت بھیجی یقیناً تو ہی قابلِ تعریف بزرگ ہے۔ اے اللہ محمدؐ اور آلِ محمدؐ پر برکت بھیج جس طرح تو نے ابراہیمؑ اور آلِ ابراہیمؑ پر برکت بھیجی۔ یقیناً تو ہی تعریف کے لائق بزرگ ہے۔ بخاری و مسلم۔ لیکن مسلم نے دونوں جگہ علیٰ ابراھیم کا لفظ ذکر نہیں کیا۔

شرح: امام مالکؒ نے مؤطا میں کچھ اختلافِ الفاظ کے ساتھ یہ حدیث ابو مسعودؓ انصاری سے روایت کی ہے اور اس سے قبل ابو حمید الساعدیؓ کی وہ حدیث جو آگے آرہی ہے روایت فرمائی ہے حضرت شاہ ولی اللہؒ اس کی شرح میں فرماتے ہیں کہ جمہور اہلِ علم

۱؎ مصفّیٰ ج ۱ ص ۱۱۷

کا مسلک یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ کہنا مستحب ہے اور آخری تشہد میں غیر واجب اور حضرت ابن عمرؓ اور حضرت عائشہؓ کے الفاظ باب تشہد اسی پر دلالت کرتے ہیں۔ لیکن پہلا تشہد محلِ صلوٰۃ نہیں ہے اور تنہا امام شافعیؒ تشہد اخیر میں وجوبِ صلوٰۃ کے قائل ہیں (یعنی فرضیت کے۔ کیونکہ وجوب کا معنی ان کے ہاں فرضیت ہے) پس اگر کوئی شخص درود نہ پڑھے تو اس کی نماز صحیح نہیں۔ اور پہلے تشہد میں امام شافعیؒ کے نزدیک درود مستحب ہے۔ میں کہتا ہوں کہ صلوٰۃ کا کم از کم صیغہ اللھم صلی علی محمد و آلہ ہے اور اکمل یہ صیغہ ہے جو اس حدیث میں آیا ہے اور صلوٰۃ (یعنی تشہد کے علاوہ) جمہور کے نزدیک سنت اور شافعیؒ کے نزدیک فرض ہے اور جمہور کا قول زیادہ قوی دکھائی دیتا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور ام المومنین عائشہؓ کا جو حوالہ دیا ہے ان کی احادیث مؤطا[1] باب صیغ التشہد میں موجود ہیں۔ نافعؒ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے تشہد کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں ویدعو اذا قضی تشھدہ بما بدا لہ "تشہد ختم کرکے جو چاہتے دعا مانگتے تھے" اور آگے فرماتے ہیں فاذا قضی تشھدہ واراد ان یسلم "جب وہ تشہد ختم کرتے اور سلام کا ارادہ فرماتے" اور حضرت ام المومنین عائشہ سلام اللہ علیہا کی حدیث میں ہے کہ وہ تشہد علی عباد اللہ الصالحین تک پڑھ کر السلام علیکم کہا کرتیں۔

کعبؓ بن عجرہ کی حدیث میں یہ جو لفظ ہیں کہ "اللہ تعالیٰ نے ہمیں آپ پر سلام بھیجنا سکھایا ہے" اس سے مراد یا تو تشہد کا سلام ہے السلام علیک ایھا النبی الخ جیسا کہ اوپر گزرا یہ سلام اللہ تعالیٰ نے شب معراج میں حضورؐ کے سلام کے جواب میں ارشاد فرمایا تھا اور پھر اسے بہ تعلیم الٰہی نماز میں رکھا گیا۔ اور یا اس سے مراد ہے کہ صحابہؓ نے آپؐ سے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ پر تو یاایھا الذین آمنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما ○ فرما کر سلام وصلوٰۃ کا حکم دیا ہے لیکن آپؐ کے اہل بیت پر ہم کیونکر سلام بھیجیں؟ علامہ قاری[2] فرماتے ہیں کہ اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے۔ کہ صلاۃ وسلام کی کیفیت تو آیت سے نہیں معلوم ہوتی صرف حکم معلوم ہوتا ہے۔ پس صحابہؓ نے یہ کیسے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں سلام کی کیفیت سکھا دی ہے؟ خلاصہ کلام یہ ہوا کہ اس سے مراد وہی[3] نماز والا سلام ہے السلام علیک ایھا النبی الخ

---

۱ مؤطا مع شرح ج ۱ ص ۱۱۵ ۲ مرقات ج ۲ ص ۳۳۴ ۳ مظاہر حق ج ۱ ص ۳۲۱

یا اس سے مراد یہ سلام ہے جو بوقتِ ملاقات کہا جاتا ہے۔ السلام علیکم۔ اور حافظ ابن حجرؒ نے کئی روایات سے اسی کو ترجیح دی ہے۔

آلِ محمدؐ سے کیا مراد ہے؟ اس میں کئی قول ہیں: پہلا یہ کہ جن پر زکوٰۃ حرام ہے یعنی بنی ہاشم اور بنی عبد المطلب۔ دوسرا یہ کہ ہر متقی آپؐ کی آل ہے علامہ طیبیؒ نے اسے ذکر کیا ہے۔ تیسرا یہ کہ ساری اُمتِ اجابت آل میں داخل ہے۔ چوتھا یہ کہ ازواجِ مطہرات اور جن لوگوں پر صدقہ حرام ہے اور آپؐ کی ذرّیت بھی اس میں داخل ہے اور آئندہ حدیث صحیحین میں بھی اس کی تائید موجود ہے اور اس طرح احادیث جمع ہو جاتی ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ آلِ رسولؐ سے مراد بنو ہاشم اور بنو عبد المطلب ہیں امام شافعیؒ اور جمہور علماء کے نزدیک۔ اور یہی پہلا قول یہ کہ آل سے مراد ازواجؓ و ذرّیت دونوں ہیں جیساکہ آئندہ حدیث میں ان پر صلاۃ کا حکم آ رہا ہے اور یہ قول بالکل چوتھے کی مانند ہے۔ ساتواں قول یہ کہ آل سے مراد ہر مسلم ہے اور یہی بعینہٖ تیسرا قول ہے اور امام مالکؒ امام زہریؒ، سفیان ثوریؒ اور امام نوویؒ کا یہی قول ہے اور قاضی حسینؒ نے اسے متقی کی قید سے مشروط کیا ہے اور اس کی تائید میں وہ روایت ہے۔ جو تمام نے فوائد میں اور دیلمی نے مسند میں حضرت انسؓ سے بیان کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کلّ تقیّ من آلِ محمّدؐ۔ (اور جامع عرض کرتا ہے کہ یہی مسلک حضرت سیّدنا عبد القادرؒ جیلانی کا ہے) اور صاحبِ مظاہرِ حق نے اسی کو ترجیح دی ہے۔

علامہ شوکانیؒ نے کتاب اللہ کے محاورات آلِ فرعون، آلِ موسیٰ، آلِ ہارون وغیرہ کے علاوہ بعض روایات سے استدلال کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ تمام اتباع آلِ رسولؐ ہیں اور ازواج و ذرّیت کا ذکر جو احادیث میں آیا ہے وہ ان کے خصائص کی بناء پر ہے۔

میں عرض کرتا ہوں کہ آل کا معنی اتباع ہو یا اہل و عیال، ازواجِ مطہرات اس میں لازماً شامل ہیں جیساکہ آئندہ حدیث میں آ رہا ہے اور اس حدیث میں جو ابراہیمؑ و آلِ ابراہیمؑ پر درود ہے اس سے مراد وہ واقعہ ہے جس میں فرشتوں نے حضرت سارہؑ کو اسحاقؑ کی خوشخبری دی اور ان کے تعجب و حیرت کو یوں دفع کیا۔ قالوا اتعجبین من امر اللہ السلام علیکم اھل البیت ورحمۃ اللہ وبرکاتہ انہ حمید مجید (القرآن حکیم)

۱؎ مرقات ج ۲ ص ۳۳۷ ۲؎ ایضاً مرقات، ایضاً مظاہر حق۔
۳؎ نیل الاوطار ج ۲ ص ۱۸۱

اس آیت میں اہل بیت سے مراد خالصتہً حضرت سارہؓ ہیں پس حدیث میں بھی اہل بیت کی اوّلین حقدار اور آل کی اوّلین مصداق وہی ہیں اور دوسرے بزرگ بدُعا نبی کریمؐ تبعًا اور ثانیاً اس میں داخل ہیں جیسا کہ امام فخرالدین رازیؒ نے جناب علیؓ کے متعلق یہی کہا ہے اور حدیث کے الفاظ "حمید، مجید" کا ماخوذ بھی دراصل یہی قرآنی آیت ہے اس لئے ان دونوں کو ایک ہی سطح پر رکھ کر آل واہل بیت کا معنیٰ متعین کرنا لازم ہے نیز آیتِ تطہیر کا اوّلین مصداق بھی بروئے قرآنِ پاک ازواجِ مطہراتؓ ہی ہیں۔ دوسرے حضرات کو بعد میں حضورؐ کی دعا سے شامل فرمایا گیا۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

علاّمہ علیؒ القاری نے تمام انبیارؑ میں سے ابراہیم علیہ السلام اور ان کی آل کی تخصیص کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ اصول دین، توحیدِ مطلق اور انقیاد و اطاعت (اسلام) میں ہمیں ان کی متابعت کا حکم دیا گیا ہے۔ اور ان کے بعد تمام انبیارؑ انہی کی ذرّیت سے پیدا ہوئے بشمول سیّد الوجود خاتم النبیین جناب محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اور اسمٰعیل و اسحاق علیہما السلام خونی رشتے کے علاوہ اتباع کی بنار پر بھی آلِ ابراہیمؑ میں شامل ہیں۔ واللہ اعلم۔

---

[1] اس حدیث میں جو لفظ کیف الصلوٰۃ علیکم اہل البیت آیا ہے یہ نہ بخاری میں ہے نہ مسلم میں بلکہ مستدرک حاکم سے لیا گیا ہے۔ علاّمہ قاریؒ نے فرمایا ہے کہ اس کے باوجود صاحب مشکوٰۃ نے اسے متفق علیہ کہا ہے۔ یہ واقعی بڑی عجیب بات ہے۔

حدیث ۲ : وعن ابی حمیدؓ الساعدی قال قالوا یارسول اللہ کیف نصلّی علیك فقال رسول اللہ علیہ وسلّم قولوا اللھمّ صلِّ علی محمّد وّ ازواجہٖ و ذرّیتہٖ کما بارکت علی آل ابراھیم انّك حمیدٌ مجید۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت ابوحمید الساعدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ صحابہؓ نے عرض کیا۔ یارسولؐ اللہ! ہم آپ پر کیسے صلاۃ بھیجیں۔ تو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یوں کہو: اللھم صلی علی محمّد و ازواجہ الخ "اے اللہ محمدؐ اور ان کی بیویوں اور اولاد پر رحمت بھیج جس طرح تو نے آلِ ابراہیمؑ پر رحمت بھیجی اور محمدؐ اور ان کی ازواج و اولاد پر برکت بھیج جس طرح کہ تو نے آلِ ابراہیمؑ پر برکت بھیجی بلاشبہ تو ہی قابلِ تعریف صاحبِ عظمت ہے۔" بخاری ومسلم

---

[1] مرقات ج ۲ ص ۳۳۸ [2] ایضاً

شرح: اس حدیث میں (جو بالکل پچھلی حدیث کے بارے کی ہے) آل کی بجائے ازواج وذریت کا لفظ آیا ہے مفصّل تقریر پچھلی حدیث کی شرح میں گزر چکی ہے۔ دونوں احادیث کو ملا کر ہی یہ کہا گیا ہے کہ آل سے مراد ازواج و ذرّیت ہے اور پھر دیگر دلائل کی بنا پر آل کے معنی میں وسعت پیدا ہوئی جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے۔ پھر ملاحظہ کر لیا جائے۔ علامہ[1] ابن حجر نے ذرّیت کا معنی نسل لکھا ہے چاہے بیٹے کی طرف سے ہو چاہے بیٹی کی طرف سے۔ لیکن امام ابو حنیفہؒ اور دوسرے علمائے امّت فرماتے ہیں کہ لغت و عرف میں بیٹیوں کی اولاد ذرّیت نہیں کہلاتی ہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے کہ آپ کی نرینہ اولاد زندہ نہ رہی (کہ آپؐ خاتم النبیین تھے) لہٰذا آپؐ کے کفو ہونے کے لحاظ سے اور دوسرے امور میں آپؐ کی دختر یہ اولاد ذرّیت، کہلاتی ہے اور یہاں اس سے مراد حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد ہے۔ دوسری صاحبزادیوں کی اولاد بھی ذرّیت میں داخل تھی لیکن ان میں بعض کی اولاد ہوئی ہی نہیں اور بعض کی ہوئی لیکن منقطع ہو گئی۔ پس صرف اولاد فاطمہؓ کی باقی رہی اور وہی ذرّیتِ رسولؐ کہلاتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

بعض[2] روایات میں جو وارحم علی محمدؐ الخ اور ترحّم علی محمدؐ الخ کے الفاظ آئے ہیں محدثین کے نزدیک صحت کو نہیں پہنچے بلکہ امام نوویؒ نے تو ایسا کہنے کو بدعت فرمایا ہے ہاں ایک اسی قسم کی روایت حسن کے درجہ تک بعض محدثین کے نزدیک ضرور پہنچی ہے پھر بھی ان الفاظ سے پرہیز لازم ہے۔

حدیث ۳: وعن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من صلّی علیّ واحدۃً صلی اللہ علیہ عشرًا۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرمایا کہ حضور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ جس شخص نے مجھ پر ایک بار رحمت بھیجی اللہ اس پر دس مرتبہ رحمت بھیجے گا۔ مسلم۔

شرح: کیونکہ قرآن کہتا ہے من جاء بالحسنۃ فلہ عشر امثالھا۔ پس اس قاعدہ کی رُو سے حضورؐ پر ایک مرتبہ صلاۃ پڑھنا خداوند تعالیٰ کی دس رحمتوں کے نزول کا باعث ہوتا ہے۔ اور اس حدیث میں بندے کی صلاۃ بھیجنے اور اللہ کی رحمت دونوں کے لئے صلّیٰ کا لفظ آیا ہے یہ محض مشابہتِ لفظی ہے ورنہ ظاہر ہے کہ بندے کی صلاۃ تو طلبِ رحمت ہے اور اللہ کی صلاۃ کا معنی رحمت نازل کرنا ہے اور قرآن کہتا ہے:

[1] مرقات ج ۲ ص ۳۳۹۔ [2] مظاہر حق ج ۱ ص ۳۲۱، مرقات ج ۲ ص ۳۲۹

هُوَ الَّذِی یُصَلِّیْ علیکم و ملائکتہٗ - الآیۃ - واللہ اعلم بالصواب ۔

باب الدُّعا فی التشہّد

اس[1] سے مراد تشہّد کے بعد اور سلام سے پہلے کی دُعا ہے ۔ دعاؤں کی کئی قسمیں ہیں ، کچھ تو وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں ان سب کا یا ان میں سے بعض کا اختیار کرنا جائز و مستحب ہے ۔ اس کے علاوہ اور دعائیں بھی جائز ہیں لیکن وہ انسانی کلام کے مشابہ نہ ہوں ۔ تشہّد کی احادیث میں حضرت عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم سے گزر چکا ہے کہ تشہّد کے بعد پسندیدہ اور مختار دُعا مانگنی چاہیئے ۔ ہر شخص اپنی حاجت کے مطابق دعا پسند کر سکتا ہے لیکن زیادہ بہتر یہی ہے کہ حدیث کی جامع دعائیں مانگی جائیں ۔ حضرت[2] شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ سلام سے پہلے دُعا مستحب ہے اور سب علماء کا یہی مختار ہے ۔ اس باب میں کئی احادیث آرہی ہیں ان کی دعاؤں میں سے جو چاہے منتخب کرلے ۔ حضرت عبداللہؓ بن عباس والی آئندہ حدیث کو امام مالکؒ نے مؤطا میں روایت کیا ہے اور مسلم کی ابوھریرہؓ والی روایت ابو داؤد میں بھی آئی ہے ۔ علامہ[3] شوکانیؒ فرماتے ہیں کہ جن دعاؤں کو نمازی کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہے ۔ وہ ان مسنون و منصوص دعاؤں کے بعد مانگنی چاہیئں تاکہ سب احادیث پر عمل ہو جائے ۔ اور بعض ظاہریہ نے ان دعاؤں کے وجوب پر زور دیا ہے ۔ گو اجماع اس کے خلاف ہے ۔ علامہ شوکانیؒ کا رجحان بھی اس باب میں ظاہریہ کے مسلک کی طرف ہے ۔

الفصل الاوّل

حدیث ۱ : عن عائشۃؓ قالت کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یدعو فی الصلوٰۃ یقولُ اللّٰھُمَّ انی اعوذبك من عذاب القبر و اعوذبك من فتنۃ المسیح الدجال و اعوذبك من فتنۃ المحیا و فِتْنۃِ المماتِ اللّٰھم انی اعوذبك من المأثم و من المغرم فقال لہٗ قائلٌ ما اکثر ما تستعیذ مِنَ المغرم

---

[1] مرقات ج ۲ ص ۳۴۸ ، مظاہر حق ج ۱ ص ۳۲۷ ، فیض الباری ج ۲ ص ۳۱۳

[2] مصفّٰی ج ۱ ص ۱۱۷ ۔ [3] نیل الاوطار ج ۲ ص ۱۸۷ ۔

فقال اِنّ الرّجُلَ اِذا غرِم حدّثَ فکذِبَ وَ وَعدَ فاَخلفَ۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: اُم المومنین عائشہ سلام اللہ علیہا فرماتی ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں دُعاء مانگا کرتے تھے اور یوں کہا کرتے تھے۔ اَللّٰھُمّ اِنّی اعوذبک الخ "اے اللہ میں تجھ سے عذاب قبر سے پناہ مانگتا ہوں اور تجھ سے مسیح دجال کے فتنے سے پناہ مانگتا ہوں اور تجھ سے گناہ سے اور قرض سے پناہ مانگتا ہوں۔" ایک شخص نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! حیرانی کی بات ہے کہ آپ قرض سے اس قدر پناہ مانگتے ہیں! تو ارشاد فرمایا کہ آدمی جب مقروض ہو جائے تو بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے اور وعدہ کرتا ہے تو وعدہ خلافی کرتا ہے۔ بخاری و مسلم۔

شرح: یدعو فی الصلوٰۃ[1] کا مطلب ہے کہ نماز کے آخر میں سلام سے پہلے یہ دعا مانگتے تھے جیسا کہ آئندہ حدیث میں آرہا ہے۔ زندگی کے فتنے سے مراد زندگی کا خلافِ اسلام کاموں میں گزرنا ہے یا اُن مصائب و مشکلات میں مبتلا ہونا جن سے بے صبری اور خدا کی شکایت پیدا ہو۔ اور آدمی راہِ راست سے بھٹک جائے اور موت کے فتنہ سے مراد آخری وقت میں شیطان کی وسوسہ اندازی، عذابِ قبر، منکر و نکیر کا سوال اور اُس پر حیرت و خوف ہے۔ ان دونوں فتنوں سے مراد دنیا و عقبیٰ کے تمام مصائب بھی ہو سکتے ہیں۔ علامہ[2] قسطلانیؒ نے فتنۂ موت سے سوئے خاتمہ مراد لیا ہے۔

المسیح[3] الدجال کے فتنہ سے مراد یہودیت کا اسلام کے خلاف وہ عظیم ترین فتنہ ہے جو آخری زمانے میں پیش آنے والا ہے۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بڑے بڑے ثابت قدموں کے قدم بھی ڈگمگا جائیں گے۔ العیاذ باللہ۔ مسیح دجال وہ کانا یہودی ہے جو اسلام اور اہل اسلام کے لئے بڑے بڑے مصائب کا باعث بنے گا۔ دجّال کا معنی ہے نہایت جھوٹا، دغاباز اور مکار۔ مسیح کا لفظ جب عیسیٰ علیہ السلام کے لئے بولا جائے تو اس سے مراد بابرکت ہوتا ہے اور جب دجّال کے لیے بولا جائے تو اس سے مراد

——— کانا، فریبی اور مصنوعی مسیح ہوتا ہے جو ہر خیر سے دور اور ہر شر کا منبع ہوگا۔ اسے مسیح اس لئے بھی کہا گیا ہے کہ زمین میں سیاحت کرے گا حتیٰ کہ

[1] مرقات ج ۲ ص ۳۴۹، مظاہر حق ج ۱ ص ۳۲۸۔ [2] ارشاد الساری ج ۲ ص ۱۴۸
[3] فتح الباری ج ۴ ص ۴۵۵، ایضاً قسطلانی ج ۲ ص ۱۴۸، مرقات ج ۲ ص ۳۴۹، مظاہر حق ج ۱ ص ۳۲۸

مقاماتِ مقدسہ مکہ اور مدینہ میں بھی داخل ہونے کی کوشش کرے گا اور اللہ تعالیٰ ان دو مقامات کو اس کے ناپاک قدموں سے محفوظ رکھے گا۔ بخاریؒ نے مسیح بھی کہا ہے۔ ابو داؤدؒ نے مسیح سے مراد عیسیٰ علیہ السلام اور مِسیح سے دجال اکبر لیا ہے۔

حضرت سید المحدثین علامہ انور شاہؒ فرماتے ہیں کہ مسیح دجال کا فتنہ فتنۃ المحیا میں داخل ہے اس لئے مجھے یہ بات سمجھ میں نہ آئی تھی کہ خاص طور پہ اس سے پناہ مانگنے کی وجہ کیا ہے؟ حتیٰ کہ میں نے البدور السافرہ میں ایک روایت دیکھی کہ جس شخص کے دل میں سیدنا عثمان رضی اللہ کا بغض ہوگا وہ قبر میں مسیح دجال کے فتنہ سے محفوظ نہ رہے گا۔ اُس وقت میری سمجھ میں آیا کہ فتنۂ قبر اور فتنۃ المسیح الدجال کو اس حدیث میں کیوں ملا کر بیان فرمایا گیا ہے اور یہ بھی پتہ چلا کہ اس فتنے کا اثر قبر تک پہنچ جانے والا ہے۔ اور فتنۃ المحیا سے مراد گناہ اور فتنۃ الممات سے مراد قبر کا سوال ہے۔[1]

مأثم یا تو مصدر ہے تو اس کا معنی ہوگا گناہ میں مبتلا ہونا۔ یا اسم مصدر ہے جس کا معنی خود گناہ ہے۔ اسی طرح مغرم مصدر ہو تو معنی ہے مقروض ہونا اور اسم مصدر ہو تو اس سے مراد خود قرض ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے دوسرے معنی کو ترجیح دی ہے۔[2] قرض سے مراد وہ قرض ہے جس کی ادائیگی کی قوت نہ ہو، اگر ادا کرنے کی استطاعت ہے تو وہ اس استعاذہ سے خارج ہے۔

اور حضورؐ نے قرض سے پناہ مانگنے کی جو وجہ بیان فرمائی ہے اس سے فراستِ نبوت اور معاملات کا تجربہ ظاہر ہوتا ہے۔ واقعی مقروض انسان جھوٹ اور وعدہ خلافی کا مرتکب بلکہ عادی ہو جاتا ہے۔ حضورؐ معصوم تھے تو اس دعا کے مانگنے کی وجہ کیا تھی؟[3] حافظ ابن حجرؒ نے اس کا جواب کئی طرح دیا ہے مثلاً امت کو تعلیم مقصود تھی یا دراصل یہ دعا اُمت کے حق میں تھی یا اس سے کمالِ عبودیت واخلاص وافتقار الی اللہ کا ثبوت مدنظر تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۲: وعن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا فرغ احدکم من التشھد الآخر فلیتعوذ باللہ من اربع من عذاب جھنم وعذاب القبر ومن فتنۃ المحیا والممات ومن شر المسیح الدجال۔ رواہ مسلم۔

---

[1] فیض الباری ج ۲ ص ۳۱۳ ۔ [2] مرقات ج ۲ ص ۳۴۹ ، مظاہر حق ج ۱ ص ۳۲۸ ، فتح الباری ج ۲ ص ۴۵۵ ، قسطلانی ج ۲ ص ۱۴۶ [3] فتح الباری ج ۲ ص ۴۵۵ ۔

ترجمہ: حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کوئی شخص آخری تشہدؔ سے فارغ ہو جائے تو چار چیزوں سے اللہ کی پناہ مانگے: ۱۔ جہنمؔ کے عذاب سے۔ ۲۔ قبر کے عذاب سے۔ ۳۔ زندگی اور موت کی آزمائش سے۔ ۴۔ اور مسیحِ دجّال کے شرؔ سے۔ مسلم۔

شرح: اس حدیث میں فی الصّلوٰۃ کی بجائے اذا فرغ احدکم من التشہّد الآخر کا لفظ آیا ہے جس نے اس دعا کے مقام اور موقع کو متعیّن کر دیا ہے۔ اور اس حدیث میں ماثم و مغرم کی بجائے عذابِ جہنمؔ سے پناہ مانگنے کا حکم آیا ہے۔ اور یہ جو فرمایا کہ فلیتعوّذ اس کا مطلب یہ ہے کہ یوں دعا کرے اللّٰھمّ انی اعوذبک من عذاب جھنّم الخ۔ اس[1] امر کو جمہور نے استحباب پر محمول کیا ہے اور ظاہریہ کے نزدیک یہ امر بھی وجوب کے لئے ہے پس ان کے نزدیک یہ دُعا بھی واجب ہے۔ امام[2] بخاریؒ نے باب رکھا ہے باب ما یتخیر من الدّعاء بعد التشہّد ولیس بواجبٍ اور اس میں عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث لائے ہیں جس کے آخر میں ہے ثمّ لیتخیّر من الدّعاء اعجبہ الیہ فیدعو اور اس سے نتیجہ نکالا ہے کہ یہ دُعا مستحب تو ہے واجب و فرض نہیں ہے

حدیث ۳: وعن ابن عباس رضی اللہ عنھما انّ النّبیّ صلّی اللہ علیہ وسلّم کان یعلّمھم ھذا الدّعاء کما یعلّمھم السّورۃ من القرآن یقول قولوا اللّٰھمّ انّی اعوذبک من عذاب جھنّم واعوذبک من عذاب القبر واعوذبک من فتنۃ المسیح الدّجال واعوذبک من فتنۃ المحیا والممات۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں یہ دُعا اس طرح سکھاتے تھے جس طرح قرآن کی سورت کی تعلیم دیتے تھے۔ آپؐ فرماتے کہو اللّٰھمّ انّی اعوذبک الخ "اے اللہ میں تجھ سے دوزخ کے عذاب سے پناہ مانگتا ہوں اور تجھ سے عذابِ قبر سے پناہ مانگتا ہوں اور تجھ سے مسیح دجّال کے فتنے سے پناہ مانگتا ہوں اور تجھ سے زندگی اور موت کے فتنے سے پناہ مانگتا ہوں"۔ مسلم۔

---

[1] مرقات ج ۲ ص ۳۵۰ ۔ [2] بخاری مع شرح فتح الباری ج ۳ ص ۴۵۶

شرح: اس حدیث میں حضورؐ کا ارشاد قولوا دیکھ کر بعض علماء نے اس دُعا کے وجوب کا حکم لگایا ہے۔ امام[1] نووی فرماتے ہیں کہ مشہور محدّث طاؤس اس کے وجوب کے قائل تھے اور ایک دفعہ ان کے بیٹے نے یہ دُعا نہ مانگی تو طاؤس نے اسے نماز کے لوٹانے کا حکم دیا۔ لیکن جمہور علماء اس کے استحباب کے قائل ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ گو ظاہر یہی ہے کہ امر وجوب کے لئے ہوتا ہے لیکن دیگر دلائل کی موجودگی میں اسے بعض دفعہ استحباب کے لئے لیتے ہیں۔

پچھلی حدیث میں جو فلیتعوّذ کا لفظ تھا اُس کی وضاحت اس حدیث کے الفاظ نے کر دی ہے۔ الفاظ اور مضمون کے لحاظ سے یہ حدیث بھی سابق حدیث کی مانند ہے۔

حدیث ۴: وعن ابی بکر الصدّیق رضی اللہ عنہ قال قلت یارسول اللہ علّمنی دعاءً ادعوا بہٖ فی صلاتی قال قُل اللّٰھمّ اِنّی ظلمتُ نفسی ظلمًا کثیرًا وّلا یغفر الذّنوب اِلّا انت فاغفرلی مغفرۃ من عندک وارحمنی انّک انت الغفور الرحیم۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: سیدنا ابوبکر الصدّیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا یارسول اللہ! مجھے کوئی دعا سکھایئے جو میں اپنی نماز میں مانگا کروں۔ تو حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ یوں کہو: اللّٰھُمَّ اِنّی ظلمتُ نفسی الخ "اے اللہ! میں نے اپنے اوپر بہت سا ظلم کیا ہے اور تیرے سوا کوئی گناہوں کو بخش نہیں سکتا پس تو مجھے اپنی خاص مغفرت سے بخش دے اور مجھ پر رحم فرما یقیناً تو ہی بخشنے والا مہربان ہے۔ بخاری و مسلم۔

شرح: بعض روایات میں ظلمًا کثیرًا کا لفظ ہے اور بعض میں ظلمًا کبیرًا کا۔ پس کبھی یوں پڑھ لیا جائے اور کبھی دوسری طرح۔ اور[2] ادعوا بہٖ فی صلوٰتی سے مراد سلام سے قبل ہے۔ اور مغفرۃ کے ساتھ من عندک کا لفظ توحید خالص اور اخلاص عبودیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ورنہ مغفرت تو خدا تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔ پس معنیٰ یوں ہوا کہ اگرچہ میں مغفرت کا اہل نہیں تو اپنے فضل و کرم سے عطا فرما دے۔ حافظ ابن حجر[3] فرماتے ہیں کہ گو حدیث میں دعا کا محل متعین نہیں پھر بھی اس دعا کے سوال و تعلیم اور اس کی اہمیت کے پیش نظر یہی سمجھا جائیگا کہ اسے قبل

---

[1] مرقات ج ۲ ص۳۵۰۔ [2] مرقات ج ۲ ص۳۵۱

[3] فتح الباری ج ۴ ص۴۵۶، قسطلانی ج ۲ ص۱۴۹

السلام رکھا جائے۔ چنانچہ بخاریؒ نے اسے اسی باب میں رکھ کر اس طرف اشارہ کر دیا ہے۔ یہ دعا[1] نبوتؐ کے جوامع الکلم میں سے ہے کیونکہ اس میں ایک طرف تو تذللؔ اور اعترافِ معاصی کا انتہائی اعتراف ہے اور دوسری طرف مغفرت کی طلب ہے جو انتہائی انعام الٰہی اور رحمت خداوندی ہے۔ مغفرت کا تقاضا آگ سے بچانا اور رحمت کا تقاضا جنتؔ میں داخل کرنا ہے۔ اللّٰھُمَّ اجعلنا من الفائزین ۔

حدیث ۵ : وعن عامر بن سعدؓ عن ابیہ قال کنت اریٰ رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم یُسلِّمُ عن یمینہٖ وعن یسارہٖ حتی اریٰ بیاض خدِّہٖ ۔ رواہ مسلم ۔

ترجمہ : حضرت عامر بن سعد رحمہ اللہ اپنے والد سعد رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دائیں اور بائیں سلام کرتے ہوئے دیکھتا تھا یہاں تک کہ میں آپؐ کے رخسار مبارک کی سفیدی کو دیکھتا تھا۔ مسلم۔

شرح : یعنی جس وقت حضورؐ دائیں طرف سلام پھیرتے تو دایاں رخسار مبارک نظر آتا اور جب بائیں طرف سلام پھیرتے تو بایاں رخسار مبارک نظر آتا تھا۔ ابو داود، نسائی اور ترمذی کی روایت جو عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے اس میں بعینہٖ دونوں طرف باری باری سلام پھیرنے اور دائیں بائیں رخسار مبارک کے نظر آنے کی صراحت موجود ہے۔ امام مالکؒ نے مؤطا میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا ایک اثر باب صفۃ السلام میں بیان کیا ہے جس سے ان کا عمل تین مرتبہ سلام کہنے کا معلوم ہوتا ہے دائیں بائیں اور سامنے یعنی امام کو۔ حضرت[2] شاہ ولی اللہ الدہلوی شرح مؤطا میں فرماتے ہیں کہ امام مالکؒ کے نزدیک امام اور منفرد صرف سامنے کی طرف ایک سلام کہیں اور پھر اپنا سر دائیں جانب پھیر لیں اور مقتدی ایک سلام اسی طرح اپنے دائیں طرف کہے پھر اپنے سامنے امام کو ایک سلام کہے اور اگر اس کے بائیں جانب بھی کوئی اور مقتدی موجود ہو تو اسے بائیں طرف منہ کر کے سلام کہے۔ گویا امام مالکؒ کا عمل عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے اثر کے عین مطابق ہے اور وہ مقتدی کے لئے تین سلام اور امام اور منفرد کے لئے فقط ایک سلام کے قائل ہیں۔ لیکن جمہور علماء کا مسلک عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث یہ ہے کہ امام، منفرد اور مقتدی سب دو سلام کہیں اور

[1] قسطلانی ج ۲ ص ۱۵۰ ، مرقات ج ۲ ص ۳۵ ۔ [2] مصفیٰ ج ۱ ص ۱۱۸ ۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ کا لفظ بھی بڑھانے کے قائل ہیں۔ پس کم از کم سلام ایک مرتبہ ہے اور اکمل سلام دو مرتبہ ہے۔ دایئں بایئں منہ پھیر کر السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہا جائے۔

علّامہ[۱] سید انور شاہ محدّث کشمیری فرماتے ہیں کہ جمہور کے نزدیک سلام دو مرتبہ ہے اور ہمارے نزدیک یہ دونوں واجب ہیں۔ اور فتح القدیر میں ہے کہ پہلا سلام واجب ہے اور ایک روایت کے مطابق دوسرا سنت ہے اور امام مالکؒ کے نزدیک صرف ایک سلام ہے جس کا ثبوت خارجی عمل کے علاوہ ابوداؤد و باب الوتر اور نسائی باب الجمع بین الصلاتین کی دو حدیثیں ہیں۔ پس یہ ایک ثابت شدہ دینی حکم ہے اس کا انکار صحیح نہیں ہے۔ پھر امام مالکؒ نے جو مقتدی کے لئے تین سلام اختیار کئے ہیں تو گویا ان کے نزدیک یہ سلام بھی سلامِ تحیۃ ولقاء کی مانند ہے اور اس کے مصالح و آداب یہاں بھی ملحوظ ہیں۔ امام[۲] بخاریؒ نے امام مالکؒ کے ردّ کے لئے ہی بخاری میں ایک باب باندھا ہے۔ باب من لم یردّ السلام علی الامام۔

حافظ[۳] ابن حجرؒ عسقلانی نے فتح الباری میں حدیث ام سلمہؓ سے سلام کی فرضیت و رکنیت کا استدلال بڑے عجیب انداز میں فرمایا ہے لیکن بات بنتی نظر نہیں آتی تو حنفیہ کے استدلال کا ردّ شروع فرمایا دیا ہے۔ حالانکہ ابوداؤد کی صحیح حدیث میں عبداللہ بن مسعودؓ کو حضورؐ نے تشہد سکھانے کے بعد فرمایا: "[۴]اذا قلت ھٰذا فقد قضیت صلوٰتك ان شئت ان تقوم فقم وان شئت ان تقعد فاقعد" اس سے معلوم ہوا کہ اگر اس حالت میں کوئی اور رکنِ صلوٰۃ باقی ہوتا تو حضورؐ یہ الفاظ نہ فرماتے۔ ہاں سلام دونوں طرف حنفیہ کے ہاں واجب ہے لیکن دلائل کی بنا پر فرض نہیں ہے اور تحلیلھا التسلیم کے ارشادِ نبویؐ سے فرضیت ثابت کرنا بھی بہت بعید ہے اور حدیث اذا رفع الامام رأسہ من آخر رکعۃ وقعد ثم احدث قبل ان یتکلم فقد تمت صلوٰتہ" صحیح ہے گو حضرت حافظ ابن حجرؒ نے اسے ضعیف فرما دیا ہے۔ اور اس کے علاوہ اور بھی احادیث موجود ہیں مثلاً اذا احدث وقد قعد فی آخر صلاتہ قبل ان یسلّم فقد جازت صلوٰتہ۔

۱؎ فیض الباری ج ۲ ص ۳۱۴ ۲؎ ایضاً، فتح الباری ج ۲ ص ۴۵۷

۳؎ فتح الباری ج ۴ ص ۴۵۷

۴؎ مرقات ج ۲ ص ۳۵۱، ۳۵۲، نصب الرایہ ج ۱ ص ۴۲۴ حاشیہ۔

اور اذا جلس قدر التشهد ثم احدث فقد تمت صلاته[1]۔ اور اس کے اور کئی طرق ہیں جنہیں امام طحاویؒ وغیرہ نے بیان فرمایا ہے اور کم از کم ان طرق کی وجہ سے اس کا درجہ حسن کا ضرور ہو جاتا ہے۔

صاحب مشکوٰۃ المصابیح نے دیگر محدثین کے قاعدہ کے خلاف باب التسلیم الگ سے نہیں باندھا اس لئے سلام کی احادیث بھی وہ باب الدعاء فی التشہد میں ہی لے آئے ہیں۔ یہاں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ بقول علامہ شوکانیؒ[2] ایک سلام کی مشروعیت کے قائل حضرت ابن عمرؓ، انسؓ، سلمۃ بنؓ الاکوع، عائشہ صدیقہؓ، حسنؒ، ابن سیرینؒ، عمر بن عبدؒ العزیز، مالکؒ، اوزاعیؒ اور شافعیؒ موافق ایک قول کے ہیں۔ اور اہل بیت میں سے عبداللہ بن موسیٰ بن جعفر تین سلام کے قائل ہیں گو امامیہ ایک ہی سلام مانتے ہیں۔

عدم فرضیت سلام میں مذکورہ بالا دلائل کے علاوہ حنفیہ کے پاس اور دلائل بھی ہیں۔ صحیحین[3] کی ایک حدیث عبداللہؓ بن بحینہ سے ہے جس میں سلام سے قبل ہی نماز کے لئے قضیٰ صلاتہ، اور اتمّ صلاتہ، کے لفظ آتے ہیں۔ اگر سلام فرض ہوتا تو یہ لفظ بولنا درست نہ ہوتا۔ اور امام طحاویؒ نے حضرت علیؓ کا اثر جو حکم مرفوع میں ہے۔ یوں بیان کیا ہے: اذا رفع رأسہ من آخر سجدۃ فقد تمّت صلاتہ۔ اسی طرح مسلم صـ۲۱۱ اور طحاوی صـ۲۵۱ میں ابو سعیدؓ خدری کی روایت ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا کہ جب تین اور چار رکعتوں میں شک ہو تو یقین پر بنا کرے اور شک کو چھوڑ دے کیونکہ اگر اس کی نماز ناقص تھی تو اب پوری ہو گئی اور اگر پوری ہو چکی تھی تو زائد نفل ہو گئے۔ پس حضورؐ نے آخری سلام کے بغیر ہی نماز کو "پوری" فرمایا تو معلوم ہوا کہ سلام فرض نہیں صرف واجب ہے۔

حدیث ۶: وعن سمرۃؓ بن جندب قال کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اذا صلّٰی صلاۃً اقبل علینا بوجہہ۔ رواہ البخاری۔

ترجمہ: حضرت سمرہ ابن جندب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی نماز پڑھتے تو ہماری طرف منہ پھیر لیتے۔ بخاری۔

شرح: یعنی نماز سے فارغ ہو کر مقتدیوں کی طرف منہ کر کے بیٹھتے تھے جیسا کہ بخاریؒ

---

[1] طحاوی صـ۱۶۱، دار قطنی صـ۱۴۵، مسند طیالسی صـ۲۹۸، بیہقی ج ۲ صـ۲۲۹

[2] نیل الاوطار ج ۲ صـ۱۶۱ [3] نصب الرایہ ج ۱ صـ۴۳۶۔

[3] مرقات ج ۲ صـ۳۵۲، مظاہر حق ج ۱ صـ۳۱۹

نے دس جگہ یہ حدیث اپنی صحیح میں بیان کی ہے کہ حضورؐ بعض دفعہ اپنی دائیں جانب صحابہؓ کی طرف اور بائیں جانب قبلہ کی طرف کر لیتے تھے۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے بظاہر اس عمل پر حضورؐ کا دوام ومواظبت ثابت ہوتی ہے اور اس کی حکمت وعظ و تلقین اور تعلیم و تبلیغ ہے یا یہ کہ آنے والے سمجھ لیں کہ نماز باجماعت ختم ہو چکی ہے۔ زین ابن المنیرؒ کہتے ہیں کہ امام کا مقتدیوں کی طرف پیٹھ کرنا صرف ضرورتِ امامت کی وجہ ہے جب امامت پوری ہو گئی تو اس وقت ان کی طرف منہ پھیرنا تکبر، ریاکاری اور ترفع کو دور کرتا ہے۔ واللہ اعلم۔

حدیث: وعن انس قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم ینصرف عن یمینہ۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دائیں جانب کے مقتدیوں کی طرف منہ پھیرتے تھے۔ مسلم۔

شرح: اس سے مراد یا تو یہ ہے کہ حضورؐ جب نماز سے واپس ہونا چاہتے تو کبھی دائیں طرف سے تشریف لے جاتے اور کبھی بائیں طرف سے جیسا کہ اگلی حدیث میں آرہا ہے۔ یا یہ کہ مقتدیوں کی طرف منہ کرنے کے لئے دائیں طرف سے اور کبھی بائیں طرف سے پھرتے تھے۔ حضرت انور شاہ محدثؒ نے پہلا معنی مراد لیا ہے اور فرمایا ہے کہ اگر امام کو بیٹھنا ہو تو مقتدیوں کی طرف منہ کر کے بیٹھے نہ کہ جس طرح ہمارے ہاں شمال یا جنوب کی طرف منہ پھیرے بیٹھے رہتے ہیں۔ ہاں لوگوں کی طرف پھرنے کے لئے اکثر حضورؐ دائیں جانب سے اور کبھی بائیں طرف سے بھی پھرتے تھے۔ اور انصراف سے مراد یہاں نماز سے فارغ ہو کر باہر چلے جانا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۸: وعن عبداللہ بن مسعودؓ قال لا یجعل احدکم للشیطان شیئاً من صلاتہ یری ان حقاً علیہ ان لا ینصرف الا عن یمینہ لقد رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کثیراً ینصرف عن یسارہ۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی آدمی اپنی نماز میں شیطان کا حصہ نہ لگائے۔ وہ اس طرح کہ صرف دائیں طرف سے ہی پھرنے کو

---

۱ فتح الباری ج ۲ ص ۲۶۳ ۲ مرقات ج ۲ ص ۳۵۲۔
۳ فیض الباری ج ۲ ص ۳۱۶

لازم و ضروری قرار دے لے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بارہا بائیں طرف سے پھرتے بھی دیکھا ہے۔ بخاری و مسلم۔

تشریح:۔ یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دائیں جانب محبوب تھی حتّٰی کہ جوتا پہنتے اور کپڑا پہنتے وقت بھی اسے ملحوظ رکھتے تھے لیکن یہ چیز صرف استحباب و اولویّت کے درجہ میں ہے اسے فرض بنا ڈالنا اور لازم سمجھ لینا کسی طرح درست نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خود حضورؐ بیانِ جواز کے لئے اور اس کام کی اصل حیثیت واضح کرنے کے لئے بار ہا اس کے خلاف بھی کرتے تھے مثلاً زیر بحث حدیث کو لیجئے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے ارشاد کا خلاصہ یہی ہے کہ میں نے حضورؐ کو کئی دفعہ بائیں طرف سے پھرتے بھی دیکھا ہے۔ اب اگر کوئی شخص صرف دائیں جانب والی حدیث کو ہی مدّنظر رکھ لے اور ان دوسری احادیث کو نظر انداز کر دے تو یقیناً یہ ظلم ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ ہر چیز کو اس کے اصل مقام پر رکھا جائے۔ سنت کو سنت، فرض کو فرض اور جائز کو جائز کا ہی مقام دیا جائے اس سے تجاوز کرنا زیادتی ہوگا اور یہی مطلب ہے حضرت عبداللہؓ کے ارشاد کا یہ شیطان کا اتباع ہے اور جو ایسا کرے گا گویا اس نے اپنی نماز میں شیطان کا حصّہ لگا دیا۔ شارح طیبیؒ نے کہا ہے کہ امرِ مستحب پر اصرار کرنا، رخصت پر عمل نہ کرنا اور مستحب کو فرض واجب بنا لینا شیطان کا اتباع ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس کی رخصتوں پر بھی عمل کیا جائے جیسا کہ وہ چاہتا ہے کہ اس کے فرائض و احکام پر عمل کیا جائے۔ سو جب مستحب کا یہ حال ہے کہ اسے حد سے بڑھانا جائز نہیں ہے تو بدعت اور منکر کی گنجائش کہاں سے نکل سکتی ہے؟ اس حدیث سے یہ بھی پتہ چلا کہ عبداللہ بن مسعودؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال و افعال پر پوری اور کامل اطلاع رکھتے تھے۔ جیسا کہ حافظ ابن حجرؒ نے انہیں أعلم، أسنّ، أجلّ و اکثر ملازمة للنبیّ صلّی اللہ علیہ وسلم و اقرب الی موقفه فی الصّلاة لکھا ہے۔ واللہ اعلم۔

امام بخاریؒ نے اس حدیث پر باب باندھا ہے۔ باب الانفتال والانصراف عن الیمین والشمال۔

حدیث ۹: وعن البراء قال کنّا اذا صلّینا خلف رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم أحببنا أن نکون عن یمینه یُقبل علینا بوجهه قال فسمعته یقول ربّ قنی عذابك یوم تبعث أو تجمع

ے مظاہر حق ج ۱ ص ۳۲۹، مرقات ج ۲ ص ۳۵۲، ۳۵۴۔ ے فتح الباری ج ۴ ص ۴۶۵

عبادک - رواہ مسلم -

ترجمہ: حضرت براء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھتے تو آپ کے دائیں ہاتھ ہونا پسند کرتے تھے کہ حضور اپنا چہرہ مبارک ہماری طرف کریں۔ اور میں نے آپ کو یہ دعا کرتے سنا ربّ قنی الخ "اے میرے مالک! مجھے اپنے عذاب سے بچانا جس دن کہ تو اپنے بندوں کو اٹھائے گا یا جمع کرے گا، مسلم۔

شرح: دائیں طرف کی صف کے محبوب ہونے کی اور بھی احادیث موجود ہیں۔ لہذا اصحابہؓ اس طرف کھڑا ہونا پسند کرتے تھے نیز بائیں طرف سلام کرنے سے پہلے حضورؐ دائیں طرف چہرہ مبارک پھیرتے تھے یہ بھی ایک باعث تھا۔ اور حدیث کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اکثر آپؐ دائیں طرف سے ہی منہ پھیرتے اور باہر تشریف لے جاتے تھے اس لئے صحابہؓ کو یہاں کھڑا ہونا محبوب تھا۔ گو اس صورت میں عبد اللہ بنؓ مسعود کی مسلم کی روایت کے یہ چیز خلاف پڑے گی کیونکہ اس میں یہ الفاظ ہیں کہ حضورؐ اکثر بائیں طرف سے پھرتے یا ادھر کو تشریف لے جاتے تھے اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ حجرۂ مقدسہ اسی طرف تھا۔ لیکن بخاریؒ کی روایت کے الفاظ کثیرا ہیں اکثر نہیں اور مسلم کی انسؓ والی روایت میں دائیں طرف کے انصراف کے لئے اکثر کا لفظ بولا ہے۔ حافظ ابنِ حجر نے فرمایا ہے کہ بظاہر یہ دونوں حدیثیں متعارض ہیں لیکن ہر بزرگ نے اپنے مشاہدے کے مطابق اکثر کا لفظ بول دیا ہے۔ پس بہتر یہی ہے کہ اس حدیث میں دائیں صف کا محبوب ہونا اس وجہ سے مانا جائے کہ یہ طرف افضل ہے اور حضورؐ سلام میں پہلے ادھر منہ پھیرتے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ یہ دعا تعلیم امت کے لئے ہے یا تواضع پر محمول ہے اور أو کا لفظ راوی کا شک ہے یعنی ان دونوں لفظوں میں سے ایک حضورؐ نے بولا تھا۔

حدیث ۱۰: وعن أمّ سلمةؓ قالت انّ النسآء فی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم کنّ اذا سلّمن من المکتوبة قمن و ثبت رسول الله صلّی الله علیه وسلّم ومن صلّی من الرّجال ما شاء الله فاذا قام رسول الله صلّی الله علیه وسلّم قام الرّجال۔ رواه البخاری۔ وسنذکر حدیث جابرؓ بن سمرة فی باب الضحك ان شاء الله تعالیٰ۔

لہ مرقات ج ۲ ص ۳۵۳، مظاہر حق ج ۱ ص ۳۲۹، فتح الباری ج ۲ ص ۲۶۵

ترجمہ: ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عورتیں جب فرض نماز کا سلام پھیر لیتیں تو اٹھ کھڑی ہوتی تھیں اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور جن مردوں نے نماز پڑھی ہوتی تھی وہ اپنی جگہ پر قائم رہتے تھے۔ پھر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُٹھتے تو مرد بھی اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ بخاری۔ اور خدا نے چاہا تو ہم عنقریب باب الضحک میں جابرؓ بن سمرۃ کی حدیث بیان کریں گے۔

شرح: حضورؐ کا بعد از نماز تشریف رکھنا مختلف اوقات میں مختلف طور پر ہوتا تھا۔ کبھی صرف اَللّٰھُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ الخ پڑھنے کی مقدار پر، کبھی دُعا کرنے اور قرآن پڑھنے اور احکام خداوندی بیان فرماتے تھے اور بعض دفعہ خوابوں اور ان کی تعبیرات کا ذکر ہوتا تھا اور بعض دفعہ آپؐ خاموش بیٹھتے اور صحابہؓ گفتگو کرتے اور حضورؐ بھی مسکرایا کرتے جیسا کہ جابرؓ بن سمرہ والی حدیث میں ہے جس کا حوالہ صاحب مشکوٰۃ نے دیا ہے۔ اور جو عورتیں نماز میں شامل ہوتیں وہ پہلے نکل جایا کرتی تھیں اور حضورؐ کو اگر اٹھنا بھی ہوتا تو انہیں نکلنے کا موقع دیتے تھے تاکہ عورتوں اور مردوں کا اختلاط نہ ہونے پائے۔

اس حدیث کے ایک راوی امام زہریؒ سے بخاری باب التسلیم میں یہی معنی اس حدیث کا بیان ہوا ہے۔

بابُ الذِّکرِ بعد الصَّلوٰۃ

علامہ سید انور شاہ الکشمیریؒ فرماتے ہیں کہ اذکار و ادعیہ کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو نمازوں کے بعد (سنّت سے قبل) ثابت ہوتی ہیں اور دوسری وہ جو دوسرے منتشر اوقات میں ثابت ہوتی ہیں۔ نمازوں کے بعد کی دعائیں بہت سی ہیں انہیں علی سبیل البدلیّت پڑھنا چاہیئے کبھی کوئی اور کبھی کوئی۔ اور جو شخص ان سب کو جمع کرے تو وہ مخالفِ سنّت ہے اس کے باوجود اگر کوئی ایسا کرے تو اسے منع نہ کیا جائے گا۔ پس کبھی تو اَللّٰھُمَّ انت السلام الخ پڑھنا چاہیئے (جیسا کہ ترمذی میں ہے) اور کبھی موافق روایت ابوداؤد اَللّٰھُمَّ اَعِنّی علیٰ ذکرک الخ پڑھنا چاہیئے، کبھی کلمہ توحید جیسا کہ بخاری

---

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۳۳۳، مرقات ج ۲ ص ۳۵۳

[2] فیض الباری ج ۲ ص ۳۱۵/۳۱۴ ۔

میں ہے۔ اور تمام اذکار وادعیہ میں اصل اخفا ہے۔ ہاں کبھی کبھی کسی مصلحت یا فائدہ و داعیہ کے لئے جہر بھی آیا ہے۔ اور تسبیحِ فاطمہؓ حضورؐ نے انہیں سونے سے پہلے پڑھنے کے لئے سکھائی تھی نہ کہ نمازوں کے بعد پڑھنے کے لئے۔ ہاں چونکہ اسی قسم کا ذکر حضورؐ نے صحابہؓ کو نمازوں کے بعد پڑھنے کے لئے بھی سکھایا تھا اس لئے اس ذکر کا نام بھی عوام میں تسبیحِ فاطمہؓ مشہور ہو گیا۔ بعض احادیث میں جن نمازوں کے بعد[1] سنتیں ہیں ذکر کی قلّت کا بیان آیا ہے اور بعض احادیث میں عام طور پر نمازوں کے بعد ذکر و دعا کی کثرت کا بیان ہوا ہے۔ علمائے حنفیہ نے سب احادیث کو یوں جمع کیا ہے کہ جن فرضوں کے بعد سنّت و نفل ہیں وہاں ذکر و دعا مختصر ہونی چاہیئے اور فجر وعصر میں ذکرِ طویل ہونا چاہیئے۔

علّامہ شوکانیؒ نے نمازوں کے بعد کی ادعیہ واذکار کو احادیثِ صحیحہ سے ایک خاص ترتیب سے جمع کر دیا ہے۔ جس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ حضورؐ سے اس باب میں بہت سے اذکار اور دعائیں ثابت ہیں۔ [2] امام نوویؒ نے عام اذکار وادعیہ کو کتاب الاذکار میں۔ ابن السنیؒ نے عمل الیوم واللیلہ میں اور حافظ ابن حجرؒ نے امالی میں اور اسی طرح امام سیوطیؒ نے بھی امالی میں اور امام جزریؒ نے الحصن الحصین میں جمع کر دیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

الفصل الاوّل

حدیث ۱: عن ابن عبّاس رضی اللہ عنہما قال کنت اعرف انقضاء صلوٰۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم بالتکبیر۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ میں جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کا ختم ہونا تکبیر سے پہچانتا تھا۔ بخاری و مسلم۔

شرح: امام بخاریؒ نے اس حدیث کو باب الذکر بعد الصلوٰۃ میں دو سندوں سے بیان کیا ہے ایک یہ ہے اور دوسری میں رفع الصوتِ بالذکر کا لفظ آیا ہے۔ [3] حافظ ابن حجرؒ امام نوویؒ کے حوالہ سے فرماتے ہیں کہ حضورؐ کے وقت میں صحابہؓ نے کچھ وقت کے لئے ذکر کے طریقے کی تعلیم کی غرض سے بالجہر ایسا کیا تھا نہ یہ کہ دائمی عمل اسی پر تھا۔ اور مختار یہی ہے کہ امام اور مقتدی آہستہ آہستہ ذکر کریں ہاں اگر تعلیم کی حاجت ہو تو

---

۱ نیل الاوطار ج ۴ ص ۳۰۲ تا ۳۰۶ ۲ فیض الباری ج ۲ ص ۳۱۴

۳ فتح الباری ج ۴ ص ۴۵۸ ، قسطلانی ۲ ص ۱۵۴ ، مظاہر حق ج ۱ ص ۳۳۳

وہ مستثنیٰ ہوتا ہے۔ اس حدیث میں تکبیر سے مراد اگر ذکر ہے تو خیر ورنہ اگر اللہ اکبر کا لفظ مراد ہے تو مطلب یہ ہوگا کہ صحابہؓ سبحان اللہ، الحمد للہ، اللہ اکبر پڑھتے اور اللہ اکبر کا ذکر پہلے کرتے تھے۔ اور ممکن ہے ایک مرتبہ سب لوگ بلند آواز سے تکبیر کہتے ہوں کیونکہ افضل گو ذکر خفی ہے لیکن جہر کے جواز میں تو شک نہیں۔ اور بعض شارحین نے دوسری روایت کے لفظ ذکر کی تشریح تکبیر سے کی ہے کیونکہ دراصل ابن عباسؓ کی حدیث ایک ہی ہے جو دو سندوں سے بخاری میں آئی ہے۔

[1] اس حدیث کے ظاہری الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن عباسؓ اس وقت بہت چھوٹے تھے اور نماز میں شامل نہ ہوتے تھے یا بالکل پچھلی صفوں میں ہوتے تھے اور سلام کی آواز کی بجائے تکبیر و ذکر سے انہیں نماز کے اختتام کا پتہ چلتا تھا۔

[2] امام بیہقیؒ وغیرہ نے فرمایا ہے کہ صحیحین کی حدیث میں آیا ہے حضورؐ نے صحابہؓ کو بلند آواز سے ذکر کرنے سے بعد میں منع فرما دیا تھا اور فرمایا تھا کہ جسے تم پکارتے ہو وہ کوئی بہرا یا غائب نہیں ہے انہٗ معکم انہٗ سمیعٌ قریبٌ۔ اور تمام اذکار میں اخفاء مستحب ہے، صرف تلبیہ، امام کی قنوت (نازلہ یا رمضان میں وتر کی قنوت) عیدین کی تکبیریں، عشرۂ ذی الحجہ میں قربانی کے جانور دیکھ کر تکبیر و ذکر پڑھنا، سورۃ الضحیٰ سے لے کر آخر قرآن تک ہر دو سورتوں کے درمیان کا ذکر، حدیث میں آیا ہوا بازار کا ذکر، ٹیلوں پہ چڑھنے اور بلندیوں سے اترنے کا ذکر اس سے مستثنیٰ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۲ : وعن عائشۃ رضی اللہ عنہا قالت کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذ سلم لم یقعد الا مقدار ما یقول اللھم انت السلام ومنک السلام تبارکت یا ذوالجلال والاکرام۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ : ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سلام کہتے تو صرف اتنی مقدار بیٹھتے جس میں یہ کہتے اَللّٰھُمَّ انت السلام الخ "اے اللہ تو ہی منبع خیر و سلامتی ہے اور سلامتی تیری ہی طرف سے ہے۔ تو بڑا ہی بابرکت ہے اے شان و شوکت اور عزت و اکرام والے!" مسلم۔

شرح : [3] یہ حدیث ان نمازوں کے متعلق ہے جن کے فرائض کے بعد سنن بھی ہوتی ہیں

---

[1] قسطلانی ج ۲ صفحہ ۱۵۴۔ [2] مرقات ج ۲ صفحہ ۳۵۷، مظاہر حق ج ۱ صفحہ ۳۳۳

[3] مرقات ج ۲ صفحہ ۳۵۷، مظاہر حق ج ۱ صفحہ ۳۳۴

کیونکہ صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ حضورؐ فجر کی نماز کے بعد طلوعِ شمس تک مصلّی پر تشریف فرما رہتے تھے۔ اور حضرت انسؓ کی حدیث میں ہے کہ فجر کے بعد طلوعِ آفتاب تک اور عصر کے بعد غروب تک ذکر و دعا مستحب ہے اگر اس حدیث کو ظہر، مغرب اور عشاء کے متعلق نہ مانا جائے تو بقول حافظ ابن حجرؒ کبھی کبھی بوقتِ ضرورت و مصلحت فجر و عصر میں بھی ایسا ہوتا ہوگا۔ علامہ قاریؒ امام جزریؒ کے حوالہ سے فرماتے ہیں کہ اس ذکر میں الیك یرجع السّلام اور اَدْخِلْنَا دَارَكَ دَارَ السَّلَام کا اضافہ بعض قصّہ گوؤں کا ایجاد کردہ ہے ہمیں اس کی کوئی اصل معلوم نہیں ہوئی۔

حدیث ۳ : وعن ثوبان رضی اللہ عنہ قال کان رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم اذا انصرف من صلاتہ استغفر ثلاثاً و قال اللّٰھمّ انت السّلام ومنك السلام تبارکت یا ذا الجلال و الاکرام۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ : حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم جب نماز سے فارغ ہوتے تھے تو تین مرتبہ استغفار کرتے اور کہتے اللّٰھُمَّ انت السّلام الخ ” اے اللہ تو ہی سراسر سلامتی ہے اور تیری ہی طرف سے سب کو سلامتی حاصل ہوتی ہے تو بڑا ہی بابرکت ہے اے عظمت و احسان والے! مُسلم۔

شرح : جلال کا معنی عظمت و رفعت اور شان و شوکت ہے اور اکرام کا معنی ہے۔ عزّت بخشنا اور اپنے اولیاء کو انعام و احسان سے نوازنا۔ اور تین مرتبہ استغفار کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اَسْتَغْفِرُ اللہ کا لفظ فرماتے تھے اور یہ کمالِ عبودیت و عجز اور تعلیم و تلقین کی غرض سے ہوتا تھا۔ حضرت رابعہؒ عدویّہ (بصریہ) کا ارشاد ہے: استغفار نا یحتاج الی استغفار کثیر۔ ” ہمارا استغفار بھی بہت سے استغفار کا محتاج ہے“ یعنی بندہ جب شانِ معبود کو ایک طرف رکھے اور اپنے مخلوق ہونے کا تصوّر دوسری طرف تو چاہے سیّد الکائنات ہی کیوں نہ ہو۔ بہر حال وہ اپنے عجز اور کوتاہی کا اعتراف کئے بغیر نہ رہے گا۔ حَسَنَاتُ الابرار سیّئاتُ المقرّبین ” نیکو کاروں کی نیکیاں مقرّبوں کے نزدیک گناہ شمار ہوتی ہیں“ فسبحانہٗ ما اعظم شانہٗ۔ بعض روایات میں ہے کہ حضورؐ تین بار کہتے: استغفر اللہ الّذی لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الحیّ القیّوم وَ اَتُوْبُ الیہ۔

لہ مرقات ج ۲ ص ۳۵۸۔ ۲ مظاہر حق ج ۱ ص ۳۳۴

حدیث ۴: وعن المغیرۃ بن شعبۃ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یقول فی دُبر کل صلوٰۃ مکتوبۃ لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ لہ الملکُ ولہ الحمد وَھُوَ علیٰ کل شیٔ قدیر اللّٰھم لامانع لما اعطیت ولا مُعطی لما منعت ولا ینفعُ ذا الجدّ منک الجدّ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یوں کہا کرتے تھے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ الخ "اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ بادشاہت اسی کی ہے اور تعریف اسی کے لئے ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اے اللہ! تیرے دیئے ہوئے کو کوئی روک نہیں سکتا اور جسے تو روک لے اُسے کوئی دے نہیں سکتا اور کسی دولت والے کی دولت اس کو تیری طرف سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔" بخاری و مسلم۔

شرح: اس[1] ذکر میں کمالِ توحید کا بیان ایک طرف اور بندے کی طرف سے کمالِ عجز و نیاز کا اعتراف دوسری طرف ہے۔ وحدہٗ لاشریک لہٗ کا مطلب یہ ہے کہ وہ ذاتِ رفیع و عظیم اپنی ذات و صفات میں منفرد و یگانہ۔ لامانع لما اعطیت الخ زندگی اور اس کی ہر متعلقہ چیز، توفیقِ اطاعت و ذکر ہر چیز خدا کی طرف سے ہے اور جس چیز کے دینے کا وہ ارادہ فرمائے یا جسے روک لے ساری کائنات وہ دے نہیں سکتی۔ یہی کمالِ توحید و توکل ہے جو اسلام سکھاتا ہے۔ ولا ینفع ذا الجد الخ علم و عمل، ریاضت و سعی اور مال و دولت کوئی چیز خدا کی ناراضگی اور عذاب سے بچا نہیں سکتی نہ کوئی چیز اس کے لطف و کرم کا بدل بن سکتی ہے۔ مسند بزاز طبرانی میں یُحیی و یُمیت کا لفظ بھی ہے یعنی کہ لہٗ الحمد کے بعد۔ اور عبد بن حُمید کی روایت میں لما اعطیت کے بعد یہ اضافہ ہے۔ وَلَا رادَّ لِمَا قضیتَ۔ اور مسند احمد، نسائی اور ابن خزیمہ کی روایت میں ہے کہ حضورؐ یہ ذکر تین دفعہ کیا کرتے تھے۔ واللہ اعلم۔

حدیث ۵: وعن عبداللہؓ بن الزبیرؓ قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا سلّم من صلاتہٖ یقول بصوتہ الاعلیٰ

---

[1] مرقات ج ۲ ص ۳۸۵ فتح الباری ج ۲ ص ۲۶۳

لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہ وحدہٗ لاشریک لَہٗ لَہ المُلکُ وله
وله الحمد وھو علی کلّ شئٍ قدیر لا حول ولا قوّۃ
الّا باللّٰہ لا الٰہ الا اللّٰہ ولا نعبد الّا ایّاہ له النعمۃ
الفضلُ وله الثناء الحسنُ لا الٰہ الّا اللّٰہ مخلصین له الدّین
ولوکرہ الکافرون ۔ رواہ مسلم ۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز سے سلام پھیرتے تو بلند آواز سے یوں کہا کرتے تھے: لَآ اِلٰہ اِلَّا الخ اللہ کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں ۔ وہ تنہا ہے اس کا کوئی شریک نہیں بادشاہت اسی کی ہے اور حمد و ثنا اسی کے لئے ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ گناہ سے بچنے کی قوّت اور نیکی کرنے کی طاقت صرف اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور ہم اس کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے۔ نعمت اسی کی ہے اور کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ ہم عبادت و اطاعت کو اُسی کے لئے خالص کرنے والے ہیں۔ اگرچہ کافر اس بات کو ناپسند کریں۔ مسلم۔

شرح: اس سے قبل امام نووی رح کے حوالہ سے گزر چکا ہے انہوں نے امام شافعی رح سے نقل کیا ہے کہ حضورؐ کا احیاناً بعض اذکار[1] و ادعیہ کا بلند آواز سے پڑھنا تعلیم و تلقین کے لئے تھا ورنہ دعاؤں میں مستحب اخفاء ہے۔ اس حدیث میں پہلی احادیث کی نسبت کئی الفاظ زائد ہیں، حضورؐ کبھی اس طرح پڑھتے کبھی پہلے بیان کردہ الفاظ کے مطابق پڑھتے۔ ہر طرح جائز و مستحب ہے۔ بلکہ کبھی کبھی اذکار کو جمع کر لینا بھی جائز ہے۔ واللہ اعلم۔

حدیث ۶: وعن سعدؓ انه کان یُعلّم بنیه ھٰؤلاء الکلمات و یقول اِنّ رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیه وسلّم کان یتعوّذ بھن دُبر الصّلوٰۃ اللّٰھُمّ انّی اعوذ بک من الجبن و اعوذ بک من البخل و اعوذ بک من ارذل العمر و اعوذ بک من فتنۃ الدّنیا وعذاب القبر۔ رواہ البخاری۔

ترجمہ: حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ وہ اپنے بیٹوں کو یہ کلمات سکھاتے اور فرماتے تھے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کلمات کے ساتھ نماز کے بعد خدا کی پناہ مانگا کرتے تھے: اَللّٰھُمَّ اِنّی اعوذ بک الخ "اے اللہ میں تجھ سے بزدلی سے پناہ مانگتا ہوں اور میں تجھ سے ناکارہ عمر

[1] فتح الباری ج ۲ صفحہ ۲۵۴، قسطلانی ج ۲ صفحہ ۱۵۲، مظاہر حق ج ۱ صفحہ ۳۳۵، مرقات ج ۲ صفحہ ۳۵۸

سے پناہ مانگتا ہوں اور میں تجھ سے دنیا کی آزمائش اور قبر کے عذاب سے پناہ مانگتا ہوں۔" بخاری

شرح: پہلی احادیث میں مطلوبہ چیزوں کی دعا سکھائی گئی ہے اور اس حدیث میں ناپسندیدہ چیزوں سے خدا تعالیٰ کی پناہ مانگی گئی ہے۔ ان میں سے بعض کلمات ورود کے بعد کی دعا... میں بھی گزرے ہیں۔ جُبن[1] سے مراد بزدلی اور اطاعت خداوندی پر جرأت نہ کرنا ہے۔ ہر قسم کی بزدلی بُری ہے لیکن احکامِ الٰہی پر جرأت نہ کرنے کی بزدلی بدترین ہے۔ بخل کا معنی ہے اپنے مال، علم اور خدا داد قابلیتوں اور قوتوں سے نفع نہ پہنچانا اور اس کی آخری حد یہ ہے کہ اور کچھ نہ کر سکے تو نصیحت اور خیر خواہی سے تو دریغ نہ رکھے۔ شارح طیبیؒ فرماتے ہیں کہ جُود یا تو نفس و جان سے ہوتا ہے اُسے شجاعت کہتے ہیں اور اس کے مقابلے میں جبن ہے اور یا مال سے ہوتا ہے اور اسے سخاوت کہا جاتا ہے اور اس کے مقابلے میں بُخل ہے۔ پس جُود شجاعت و سخاوت دونوں پر محیط ہے جس میں شجاعت و سخاوت دونوں ہوں وہ کامل نفس کا مالک ہے اور جس میں دونوں نہ ہوں وہ انتہائی ناقص انسان ہے۔ اور از روئے قرآنِ پاک ارذل العمر سے مراد عمر کا وہ ناقص اور ناکارہ مقام ہے جب انسان کی عقلی و عملی قوتیں زائل ہو جائیں اور وہ اپنی پیدائش کے مقصد کو پورا کرنے کے قابل نہ رہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۷: وعن ابی ھریرۃ قال اِنّ فقراء المھاجرین اَتوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقالوا قد ذھب اَھل الدُّثور بالدّرجات العُلیٰ والنّعیم المقیم فقال ما ذاک قالوا یُصلّون کما نُصلّی وَیَصُومُون کَمَا نَصُومُ ویتصدّقون ولا نتصدّق و یُعتقون ولا نُعتق فقالَ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم اَفلا اُعلّمکم شیئًا تدرکُون بہٖ من سبقکم وَتسبقُون بہٖ من بعدکم ولایکونُ احدٌ افضلَ منکم الّا من صنع مثل ما صَنعتُم قالُوا بلٰی یا رسول اللہ قالَ تسبّحون وتُکبّرون وتحمدون دُبُرکلّ صلوٰۃٍ ثلاثًا وّ ثلاثین مرّۃً قالَ ابوصالح فرجع فقراءُ المھاجرین الیٰ رَسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم فقالوا سَمِعَ اخوانُنا اھلُ الاموال بما فعلنَا ففعلوا مثلہٗ فقال رسول اللہ صلّی اللہ

---

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۳۳۵، مرقات ج ۲ ص ۳۵۶۔

ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء. متفق عليه. وليس قول ابى صالح الى آخره الا عند مسلم وفى رواية للبخاری تسبحون دبر كل صلوٰة عشراً وتحمدون عشراً وتكبرون عشراً بدل ثلاثاً وثلاثين.

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ فقراء مہاجرین جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور کہا کہ مال دار لوگ بلند درجے اور جنت کی نعمتیں لے گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا وہ کیسے؟ انہوں نے کہا کہ وہ ہماری طرح نماز پڑھتے ہیں اور ہماری طرح روزہ رکھتے ہیں۔ لیکن وہ صدقہ کرتے ہیں جو ہم نہیں کرتے اور غلام آزاد کرتے ہیں اور ہم نہیں کرتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کیا میں ایسی چیز نہ بتاؤں جس سے تم اپنے سے بڑھ جانے والوں کو پالو اور اپنے سے پیچھے والوں سے آگے نکل جاؤ؟ اور کوئی بھی تم جیسا نہ ہو ہاں مگر وہ جو تمہارے جیسا کام کرے؟ انہوں نے عرض کیا کیوں نہیں اے اللہ کے پیغمبرؐ! حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ تم ہر نماز کے بعد تینتیس مرتبہ سبحان اللہ اور اتنی ہی مرتبہ اللہ اکبر اور اتنی مرتبہ الحمد للہ کہو۔ ابو صالحؒ تابعی جو حضرت ابوہریرہؓ کے شاگرد ہیں فرماتے ہیں کہ پھر غریب مہاجر لوگ حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہمارے مال دار بھائیوں نے سن لیا جو ہم نے کیا تو انہوں نے بھی اسی طرح کیا ہے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہے عطا فرما دے۔ بخاری ومسلم۔ لیکن قال ابو صالح الخ صرف مسلم کی روایت میں ہے اور بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ ہر نماز کے بعد تم دس مرتبہ تسبیح کہو، دس مرتبہ الحمد للہ کہو اور دس مرتبہ اللہ اکبر کہو۔ اس روایت میں تینتیس کی بجائے دس کا لفظ ہے

شرح: ثلاثاً وثلاثین[1]۔ تسبیح وتحمید وتکبیر کی تقسیم تین طرح سے آئی ہے:

ا۔ ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ ۳۳ مرتبہ الحمد للہ ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر۔ یعنی اللہ اکبر کا عدد ایک دفعہ بڑھا کر سو کی گنتی پوری کی جائے۔ (ب) سبحان اللہ۔ الحمد للہ اور اللہ اکبر تینوں ۳۳، ۳۳ مرتبہ بڑھ کر سو کی گنتی کلمۂ توحید سبحان اللہ والحمد للہ ولا الٰہ

[1] فیض الباری ج ۲ ص ۳۱۵۔

الا اللہ واللہ اکبر ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم سے پوری کرنا۔ ج۔ سبحان اللہ، الحمد للہ، اللہ اکبر، لا الٰہ الا اللہ میں سے ہر ایک پچیس مرتبہ پڑھ کر سو کا عدد پورا کرنا اور یہ آخری تقسیم ایک شخص نے خواب میں دیکھی تھی۔ اور چوتھی تقسیم جس میں تینتیس ۳۳ کو تین پر تقسیم کیا گیا ہے یہ وہم ہے لہٰذا مستقل صفت نہیں ہے۔ اور گنتی بہر حال سو ہے جو میرے نزدیک بدل بدل کر کرنی چاہیئے یعنی کبھی یوں اور کبھی یوں۔ اور سبحان اللہ کو پہلے، الحمد للہ کو بعد میں اور اللہ اکبر کو آخر میں پڑھا جائے تو احسن ہے لیکن حدیث میں آچکا ہے کہ جہاں سے چاہو شروع کر لو پس اس طرح بھی درست ہے۔ اور اگر کوئی شخص ان سب طریقوں کو جمع کرے تو گو وہ سنت پر عامل نہ ہوگا لیکن گنہ گار بھی نہ ہوگا کیونکہ یہ خیر محض ہے

اور حضورؐ کا یہ ارشاد کہ ذٰلك فضل اللّٰه الخ اس سے مراد مال و دولت ہے۔ کیونکہ مال و دولت کو قرآن میں فضل اللہ فرمایا گیا ہے۔ فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللّٰه۔ الآیۃ۔ حضورؐ کا مطلب یہ تھا کہ اللہ نے انہیں مال دیا انہوں نے اسے نیک کاموں میں خرچ کیا اور تم نادار ہو ایسا نہیں کر سکتے سو تمہیں صبر کرنا چاہیئے۔ یہ الٰہی تقسیم ہے کہ اس نے بعض بندوں کو بعضوں پر فضیلت بخشی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ غنی شاکر فقیر صابر سے بہتر ہے لیکن غنی شاکر پر ذمہ داریاں بہت ہیں اور گناہ میں مبتلا ہونے کا خوف زیادہ تر ہے اور دونوں میں فضیلت موجود ہے کوشش ہر ایک کو نیکی کی کرنی لازم ہے جس حال میں بھی ہو۔

ملا علی القاریؒ فرماتے ہیں کہ دلائل شرع کی بنا پر علماء نے غنیٰ اور فقر میں کلام کیا ہے کبھی یہ افضل اور کسی کے لئے وہ افضل ہے لیکن کفاف (یعنی حسب ضرورت مال ہونا، نہ کم نہ زیادہ، اور سوال سے بچے رہنا) ان دونوں سے افضل ہے جیسا کہ حدیث میں ہے: وکان رزقہٗ کفافًا اور محتاج و نادار اگر صابر ہونے کے ساتھ ساتھ شاکر بھی ہے تو وہ غنی شاکر سے یقیناً افضل ہے اور حکم خداوندی پر تسلیم و رضا چاہے فقر ہو چاہے غنیٰ ہو ہر حال میں سب سے افضل ہے۔

حضرت سیدنا عمر فاروقؓ کا ارشاد ہے کہ غنیٰ اور فقر دو سواریاں ہیں میں جس پر بھی سوار ہو جاؤں کوئی پرواہ نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یبسط الرزق لمن یشاء ویقدر انّہٗ کان بعبادہٖ خبیرًا بصیرًا۔ ہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے اکثر

لہ مظاہر حق ج ا صہ ۳۳۶، مرقات ج ۲ صہ ۳۶۲ ؎۲ مرقات ج ۳ صہ ۳۲۶

نبیوں، دوستوں اور برگزیدوں کے لئے فقر پسند فرمایا ہے اور غنیٰ اپنے اکثر دشمنوں اور بھوڑے سے پیاروں کے لئے بھی پسند فرمائی ہے۔ پس تو پسندیدہ چیز کو چن لے یا اپنے اختیار سے بھی درگزر کر اور معاملہ خدا پر چھوڑ دے۔ فانّ ربّک یفعل ما یشاء و یختارُ۔

علامہ عسقلانیؒ نے ابن بطالؒ[1] سے اور علامہ قسطلانیؒ نے ابن المنیرؒ سے نقل کیا ہے کہ غنی اور فقیر کے اعمالِ مفروضہ جب برابر ہوں تو اس میں کوئی شک نہیں کہ غنی افضل ہے کیونکہ اس سے جو نیکیاں ہو سکتی ہیں فقر سے ممکن نہیں۔ لیکن غنی اور فقیر میں افضلیت کا جو اختلاف ہے اس کا محل دراصل یہ ہے کہ ایک طرف فقیر ہے جو صیح معنی میں صابر ہے اور رضاء الٰہی پر راضی ہے اور دوسری طرف وہ غنی ہے جس میں صدقات و خیرات کی زیادتی پائی جاتی ہے۔ پس اس جہت سے ان میں سے افضل کون ہے؟ ورنہ جو کچھ اس حدیث سے ثابت ہے اس میں کلام کا یارا نہیں ہے۔

بخاری باب الذکر بعد الصلوٰۃ کی روایت میں اس حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں۔
ولھم فضل من اموالٍ یحجّون بھا و یعتمرون و یجاھدون و یتصدّقون اور اس سے آگے ان الفاظ کا اضافہ ہے: ان اخذتم بہٖ ادرکتم من سبقکم و لم یدرککم احد بعدکم و کنتم خیر من انتم بین ظھرانیھم الاّ من عمل مثلہٗ اور اس میں حضرت ابوہریرہؓ کا یہ ارشاد بھی ہے کہ سُبحان اللہ و الحمد للہ و اللہ اکبر تینتیس مرتبہ پڑھا جائے یعنی تینوں کلمات کو بیک مرتبہ ادا کر لیا جائے اور کل عدد ۳۳ کر لیا جائے۔ واللہ اعلم۔

حافظ ابن حجرؒ[2] نے علامہ قرطبیؒ سے نقل کیا ہے کہ اس حدیث میں جو ارشاد ہے ذٰلک فضل اللہ الخ اس میں اشارہ مال و دولت اور صدقہ و خیرات کی طرف نہیں ہے بلکہ حضورؐ یہ فرما رہے ہیں کہ تم سمجھتے ہو مالداروں کا ثواب زیادہ ہو گیا ہے اور ہم پیچھے رہ گئے ہیں، حالانکہ کسی کی نیکی کا ثواب اور اس کی صیح مقدار محض فضلِ الٰہی سے ہے وہ جسے چاہے جتنا چاہے دے دے یہ خالصۃً اس کے اختیار میں ہے۔ گویا حضورؐ کا یہ ارشاد فقراء مہاجرین کی تسلی کے لئے تھا اور ان کی یہ غلط فہمی کہ ثواب کی زیادتی محض مال کی زیادتی اور صدقہ و خیرات پر مبنی ہے اسے حضورؐ نے رفع فرمایا ہے۔

---
[1] ارشاد الساری ج ۲ ص ۱۵۸، فتح الباری ج ۲ ص ۲۶۱ [2] فتح الباری ج ۲ ص ۲۶۱

گویا حضورؐ کے ارشاد کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ثواب جو میں نے تمہیں بتایا تھا اس کا حقدار کوئی شخص محض ذکر یا صدقے سے نہیں ہو سکتا بلکہ یہ تو فضلِ الٰہی ہے۔ علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ تاویل تو بعید ہے لیکن اس حدیث کے معارض اور دلائل موجود ہیں جن کی وجہ سے مجبوراً یہ تاویل اختیار کرنا پڑی۔

اس[1] حدیث میں سوال اور تعلیم کے آداب کے علاوہ رشک اور اعمالِ صالحہ کی طرف مسابقت کا محمود ہونا بیان فرمایا گیا ہے نیز صحابہؓ کی نیکیوں پر حرص اور ہر وقت اسی طرف لگا رہنا معلوم ہوتا ہے۔ نیز اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انفرادی عمل کبھی کبھی متعدی عمل پر سبقت لے جاتا ہے۔

حدیث ۸ : وعن کعبؓ بن عجرۃ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم معقبات لایخیب قائلھن اوفاعلھن دبر کل صلوٰۃ مکتوبۃ ثلاث وثلاثون تسبیحۃ وثلاث وثلاثون تحمیدۃ واربع وثلاثون تکبیرۃ۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ : حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا چند گناہوں کو مٹانے والے کلمات ہیں جنہیں ہر فرض نماز کے بعد کہنے والا یا کرنے والا (راوی کا شک ہے) ناکام و نامراد اور ناامید نہ ہوگا۔ تینتیس مرتبہ سبحان اللہ کہنا، تینتیس مرتبہ الحمدللہ کہنا اور چونتیس مرتبہ اللہ اکبر کہنا۔ مسلم۔

شرح : معقبات[2] کا معنی ہے پے درپے آنے والے کلمات یا گناہ کو مٹا دینے والے جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے لَا مُعَقِّبَ لِحُکْمِہٖ - الآیۃ۔ یعنی اس کے حکم کو (فیصلے کو) کوئی منسوخ کرنے والا اور مٹانے والا نہیں۔ اس ارشاد میں الحمدللہ کی تعداد ۳۳ کی بجائے ۳۴ آ گئی ہے دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے دونوں طرح کر لیا جائے کبھی ایسے کبھی ویسے۔

حدیث ۹ : وعن ابی ھریرۃؓ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من سبح اللّٰہ فی دبر کل صلاۃ ثلاثا وثلاثین وحمد اللّٰہ ثلاثا وثلاثین وکبر اللّٰہ ثلاثا وثلاثین فتلک تسعۃ وتسعون وقال تمام المائۃ لاالٰہ الا اللّٰہ وحدہٗ لا شریک

---

[1] فتح الباری ج ۲ ص ۲۶۴۔ [2] مرقات ج ۲ ص ۳۶۲۔

لہٗ لہ الملک ولہ الحمد وھو علی کلّ شیئٍ قدیر غفرت خطایاہ وان کانت مثل زبد البحر۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص ہر (فرض) نماز کے بعد تینتیس مرتبہ اللہ کی تسبیح پڑھے، تینتیس مرتبہ اللہ کی حمد بیان کرے اور تینتیس مرتبہ اللہ کی تکبیر کہے پس یہ کل ننانوے ہو گئے اور سو کی تعداد پوری کرنے کو یوں کہے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ الخ " اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں، بادشاہی اسی کی ہے اور تعریف اسی کے لئے ہے اور وہ ہر شے پر قادر ہے۔" تو اس کے گناہ بخش دیئے جائیں گے اگرچہ وہ سمندر کی جھاگ کی مانند ہوں۔ مسلم۔

شرح: گناہوں سے مراد اس حدیث میں صغیرہ گناہ ہیں جیسا کہ صحیح احادیث سے اوپر گزر چکا ہے اور اس پر اجماع اہلِ حق ہے کہ کبائر کے لئے توبہ کی ضرورت ہے۔ ان کا کفّارہ کوئی اور عمل نہیں ہو سکتا۔

[1] حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ان تین کلمات سبحان اللہ، الحمد للہ، اللہ اکبر میں کئی روایات آئی ہیں۔ پس تسبیح کے متعلق ۳۳، ۲۵، ۱۱، ۱۰ اور ۳، ۱ اور ۷۰ اور سو کا عدد آیا ہے۔ تحمید کے متعلق ۳۳، ۲۵، ۱۱، ۱۰، ۱۰۰ کا عدد آیا ہے اور تہلیل یعنی لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کے متعلق ۱۰، ۲۵ اور ۱۰۰ کا عدد آیا ہے۔ اسی طرح تکبیر کے متعلق ۳۳، ۳۴، ۲۵، ۱۰، ۱۱ کے عدد وارد ہوئے ہیں اور سب درست ہیں لیکن انہیں جمع نہیں کرنا چاہیئے بلکہ کبھی اس تعداد پر اور کبھی اس پر عمل کرنا چاہیئے کیونکہ ان اعداد میں خاص اثرات ہیں جس طرح کہ ادویہ کی مقدار میں خاص اثرات ہوتے ہیں۔ پس اپنی مرضی سے انہیں جمع نہ کیا جائے بلکہ علی سبیل التبادل پڑھا جائے۔

[2] علامہ بغویؒ فرماتے ہیں کہ متعدّد احوال و اوقات میں حضورؐ سے متعدّد اعداد ثابت ہیں ان میں تخییر ہے یعنی اختیار دیا گیا ہے کہ کبھی یوں کر لو کبھی یوں۔ اور صحیح حدیث میں آ چکا ہے کہ حضورؐ دائیں ہاتھ کی انگلیاں بند کر کے تسبیح گنا کرتے تھے۔ اور ایک حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے یہ اذکار پوروں پر گننے کا حکم دیا اور فرمایا کہ ان سے سوال ہوگا اور انہیں بولنے کی قوت دی جائے گی۔ اور سندِ ضعیف کے ساتھ حضرت علیؓ سے

---

[1] فتح الباری ج ۲ ص ۲۶۰

[2] مرقات ج ۲ ص ۳۶۳، مظاہر حق ج ۱ ص ۳۳۷

مرفوعاً آیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا نعم الذکر السبحۃ. تسبیح بہت اچھا ذکر (طریقہ ذکر) ہے۔ اور حضرت ابوہریرہؓ سے ثابت ہے کہ وہ ایک دھاگے میں سو گرہیں لگا کر سونے سے پہلے اسے پڑھا کرتے تھے اور ایک روایت میں ہے کہ کھجور کی گٹھلیوں پر پڑھتے تھے۔ حافظ ابنؒ حجر نے لکھا ہے کہ گٹھلیوں پر پڑھنے اور سنگریزوں پر تسبیح کرنے کی صحابہؓ اور بعض امہات المومنینؓ سے روایات موجود ہیں بلکہ حضورؐ نے ایسا کرتے دیکھا اور منع نہیں فرمایا۔ ہاں انگلیوں پر پڑھنا تسبیح سے افضل ہے اور جسے بھولنے کا خطرہ ہو اُس کے لئے تسبیح کا استعمال اولیٰ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

باب مالا یجوز من العمل فی الصلوٰۃ وما یباح منہ

یعنی اس باب میں نماز کے محرمات، مفسدات، مکروہات اور مباحات کا بیان ہوگا۔ اس سے پہلے کئی احادیث کے ضمن میں بتایا جا چکا ہے کہ امر ہمیشہ وجوب کے لئے ہی نہیں ہوتا بلکہ بارہا اس سے استحباب مراد ہوتا ہے۔ اسی طرح نہی کا بھی حال ہے کہ وہ ہمیشہ حرمت کے لئے ہی نہیں ہوتی بعض دفعہ محض کراہت (تنزیہی) کے لئے بھی آتی ہے۔ کتاب و سُنّت کے ماہرین نے جنہیں فقہاء کہا جاتا ہے دلائلِ شرع سے ہر چیز کا درجہ اور مرتبہ متعین کیا ہے اور اس میں ان کے درمیان اختلافات بھی ہوئے ہیں تفصیل کے لئے کتب اصول کی طرف رجوع کرنا چاہیئے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ فرض، واجب، سُنّت و مستحب اور جائز کی حدود کیا ہیں؟ اور ان کے مقابلے میں حرام مکروہ اور مباح کسے کہتے ہیں ان کے دلائل و حدود کیا ہیں؟ بعض مسائل کی مناسب تشریح احادیث کے ضمن میں آجائے گی۔ واللہ ولیّ التوفیق

الفصل الاوّل

حدیث ۱: عن معاویۃ ابن الحکمؓ قال بَیْنَا اَنَا اُصَلّیْ مَعَ رَسُوْلِ اللہِ صلّی اللہ علیہ وسلّم اِذْ عَطَسَ رَجُلٌ مِّنَ الْقَوْمِ فقلت یرحمک اللہ فَرَمَانِی الْقَوْمُ بِاَبْصَارِھِمْ فقُلْتُ واثکل اُمّیَاہْ ماشانکم تَنْظُرُوْنَ اِلَیَّ فَجَعَلُوْا یَضْرِبُوْنَ بِاَیْدِیْھِمْ عَلٰی اَفْخَاذِھِمْ فَلَمَّا رَاَیْتُھُمْ یُصَمِّتُوْنَنِیْ لٰکِنِّیْ سَکَتُّ فَلَمَّا صَلّٰی

رَسُولُ اللهِ صلّی اللہ علیہ وسلّم فَبِأَبِيْ هُوَ وَأُمِّيْ مَا رَأَيْتُ مُعَلِّمًا قَبْلَهٗ وَ بَعْدَهٗ اَحْسَنَ تَعْلِيْمًا مِّنْهُ فَوَاللهِ مَا كَهَرَنِيْ وَلَا ضَرَبَنِيْ وَلَا شَتَمَنِيْ قَالَ اِنَّ هٰذِهِ الصَّلَاةَ لَا يَصْلُحُ فِيْهَا شَيْءٌ مِّنْ كَلَامِ النَّاسِ اِنَّمَا هِيَ التَّسْبِيْحُ وَالتَّكْبِيْرُ وَقِرَاءَةُ الْقُرْاٰنِ اَوْ كَمَا قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللهِ اِنِّيْ حَدِيْثُ عَهْدٍ بِجَاهِلِيَّةٍ وَقَدْ جَاءَنَا اللهُ بِالْاِسْلَامِ وَاِنَّ مِنَّا رِجَالًا يَّاْتُوْنَ الْكُهَّانَ قَالَ فَلَا تَاْتِهِمْ قُلْتُ وَمِنَّا رِجَالٌ يَتَطَيَّرُوْنَ قَالَ ذَالِكَ شَيْءٌ يَجِدُوْنَهٗ فِيْ صُدُوْرِهِمْ فَلَا يَصُدَّنَّهُمْ قَالَ قُلْتُ وَمِنَّا رِجَالٌ يَخُطُّوْنَ قَالَ كَانَ نَبِيٌّ مِّنَ الْاَنْبِيَاءِ يَخُطُّ فَمَنْ وَافَقَ خَطَّهٗ فَذَاكَ۔ رواه مسلم۔

قَوْلُهٗ لٰكِنِّيْ سَكَتُّ هٰكَذَا وَجَدْتُّ فِيْ صَحِيْحِ مُسْلِمٍ وَكِتَابِ الْحُمَيْدِيْ وَصُحِّحَ فِيْ جَامِعِ الْاُصُوْلِ بِلَفْظَةِ كَذَا فَوْقَ لٰكِنِّيْ۔

ترجمہ: حضرت معاویہ بن الحکم رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اس دوران میں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھ رہا تھا کہ اچانک لوگوں میں سے ایک شخص نے چھینک ماری تو میں نے کہا یرحمك الله "اللہ تجھ پر رحم کرے" پس لوگوں نے مجھے گھورا تو میں نے کہا ہائے میری ماں مجھے گم کرے! کیا بات ہے کہ تم میری طرف یوں دیکھتے ہو؟ تو لوگوں نے اپنے ہاتھ اپنی رانوں پر مارنے شروع کر دیئے۔ پس جب میں نے دیکھا کہ یہ لوگ مجھے خاموش کر رہے ہیں تو مجھے غصہ تو آیا لیکن خاموش ہو گیا۔ پس جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھ لی تو میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہو جائیں میں نے آپؐ سے پہلے اور آپؐ کے بعد بھی آپؐ سے اچھا معلم کوئی نہیں دیکھا سو خدا کی قسم نہ تو آپؐ نے مجھے جھڑکا نہ پیٹا نہ برا بھلا کہا بلکہ فرمایا کہ بلاشبہ اس نماز ایں لوگوں کی گفتگو میں سے کچھ بھی روا نہیں یہ تو تسبیح، تکبیر اور قرآن کی قرات ہے۔ یا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا (یعنی یہ لفظ تھے یا ان کی مانند کچھ اور الفاظ تھے اصولی مطلب بہر صورت ایک ہی ہے) میں نے عرض کیا اے اللہ کے پیغمبرؐ! میں نیا نیا جاہلیت سے اسلام کی طرف آیا ہوں۔ (تو مسلم ہوں) اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں اسلام کی دولت بخشی ہے اور ہم

ہیں سے کچھ لوگ کاہنوں کے پاس جاتے ہیں (اس کا کیا حکم ہے؟) حضورؐ نے فرمایا کہ تم کاہنوں کے پاس مت جاؤ! میں نے عرض کیا کہ ہم میں سے کچھ لوگ بُرے شگون لیتے ہیں۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ یہ ایک چیز ہے جسے وہ اپنے دلوں میں پاتے ہیں (یعنی یہ ایک وہم سے زیادہ نہیں) پس یہ چیز انہیں کام سے ہرگز باز نہ رکھے (یعنی بدشگونی سے نفع ونقصان وابستہ نہیں وہ اپنا کام کریں اور وہم کو دل سے نکال ڈالیں!) حضرت معاویہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا ہم میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو خط کھینچتے ہیں (اس کا حکم فرمایئے) آپؐ نے فرمایا کہ پیغمبروں میں سے ایک پیغمبر خط کھینچا تھا پس جس کا خط اس پیغمبر کے موافق ہوجائے تو وہ اس علم سے بات کو پا لیتا ہے۔ اسے مسلم نے روایت کیا۔ مصنّف کہتے ہیں کہ صحابیؓ کا قول "لکنّی سکتّ" میں نے صحیح مسلم اور کتاب حمیدی میں ایسا ہی پایا ہے اور جامع الاصول میں "لکنّی" پر کذا کا لفظ لکھ کر اسے صحیح کیا گیا ہے۔

شرح: اسلام نے فرائض ومحرّمات کے احکام میں ایک فطری تدریج مدّنظر رکھی ہے۔ پہلے ہی دن تمام احکام نہیں دے دیئے بلکہ آہستہ آہستہ انھیں مکمل فرمایا گیا ہے۔ تمام فرائض ومحرّمات کا یہی حال ہے۔ نماز میں پہلے کچھ پابندیاں نرم تھیں۔ لوگ سلام کہتے جواب دیتے۔ صف میں شامل ہوکر ایک دوسرے سے بات چیت بھی کر لیا کرتے تھے جیسا کہ احادیث میں ثابت ہے لیکن آخر کار سلام وکلام اور ان کا جواب ناجائز قرار دے دیا گیا اور قرآن نے فرمایا وَقُومُوا لِلّٰہِ قَانِتِیْنَ۔ "عاجزی سے خدا کے سامنے کھڑے رہو!" اور حضورؐ نے بات چیت وغیرہ سے منع فرمادیا جیسے کہ اس حدیث میں بھی ہے کہ "نماز میں لوگوں کی باہمی گفتگو روا نہیں" اور آئندہ حدیث میں آرہا ہے اِنَّ فی الصّلوٰۃ لشغلاً۔ پس اگر کوئی چیز اس حکم کے خلاف ثابت ہو تو وہ پہلے زمانے کی قرار دی جائے گی۔

[1] واثکل امیّاہ تعجب واستبعاد کا محاورہ ہے۔ ان صحابیؓ کو مسئلہ معلوم نہ تھا۔ لہذا لوگوں کے غضبناک نگاہوں سے دیکھنے پر حیران ہوئے اور یہ کہا۔ اور یہ لفظ زور سے کہا یا آہستہ کہا اس حدیث میں صراحت نہیں، ہاں اتنی صراحت ضرور ہے کہ یرحمك اللہ کا لفظ باواز بلند کہا تھا علاوہ ازیں ظاہر یہ ہے کہ چھینک مارنے والے نے الحمد للہ کہا ہوگا جس کے جواب میں حضرت معاویہؓ نے یرحمك اللہ کہا تھا۔ اس سے یہ بھی

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۳۴۱، ۳۴۲، مرقات ج ۳ ص ۲ تا ۵

معلوم ہوا کہ چھینک مارنے والے کے جواب میں یہ لفظ نماز میں کہنا حرام اور مفسد صلاۃ ہے اور اس شخص کو نماز کے اعادہ کا حکم اس لئے نہ دیا گیا کہ وہ بقولِ خود بالکل نو مسلم تھا۔ اعادۂ صلوٰۃ اس پر گراں گزرتا۔ حدیث سے تو یہ بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ دوسرے الفاظ واثکل امیاہ الخ بھی اس نے بآوازِ بلند ہی کہے ہونگے۔ تبھی تو لوگوں نے اسے متنبہ کرنے کے لئے رانوں پر ہاتھ مارے تھے۔ پھر بھی اس کی رعایت کی گئی اور نماز کے اعادہ کا حکم نہ دیا گیا۔ یا اگر دیا گیا تھا تو اس کا ذکر یہاں نہیں آیا۔ حدیث کے آخر سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ کلام سے نماز ٹوٹ جاتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ یرحمك اللہ میں چونکہ خطاب ہے اس لئے نماز باطل ہو جاتی ہے اگر یرحمہ اللہ کہے تو بوجہ خطاب و کلام نہ ہونے کے باطل نہیں ہوتی۔
علامہ ابن الھمام فرماتے ہیں کہ اگر اپنے لئے یرحمك اللہ کہے تو نماز فاسد نہیں ہوتی جیسے کہ یرحمنی اللہ کہنے سے بھی نہیں ٹوٹتی۔ کیونکہ یہ محض دعا ہے کلام الناس ہے اور دوسرے سے خطاب نہیں۔ اور اس لفظ کلام النّاس سے ذکر اور تسبیح وغیرہ خارج ہو گئے لیکن اگر کسی سے خطاب کرتے ہوئے کوئی آیت بھی پڑھ دے مثلاً ایک شخص نمازی سے پوچھے تمہارا سامانِ تجارت کس جنس کا ہے۔ وہ قرآن کی آیت پڑھے المخیل والبغال والحمیر تو اس کی نماز فاسد ہو گئی۔ یا مثلاً کسی یحییٰ نامی شخص کو نمازی قرآن کی آیت یَا یحییٰ خُذِ الکِتابَ بِقُوَّۃ پڑھ کر کتاب لینے کا حکم دے تو نماز ٹوٹ گئی کیونکہ یہ خطاب کلام الناس ہو گیا لیکن اگر قرأت کے ارادے سے یہ آیات پڑھیں تو نماز فاسد نہیں ہے۔

کاہن عرب میں وہ لوگ تھے جن کا شیطانوں سے میل ملاپ تھا اور جھوٹی سچی خبریں شیطانوں سے حاصل کر کے اور کچھ ان میں جھوٹ سچ ملا کر لوگوں کو بتایا کرتے تھے۔ اور علم غیب کا دعوےٰ کر کے لوگوں سے مال بٹورتے تھے۔ حضورؐ نے ایک اور حدیث میں کاہنوں اور عرّافوں کے پاس جانے سے منع فرمایا ہے اور ان کی بات کا یقین کرنے کو کفر فرمایا ہے۔ عرّاف کا معنیٰ ہے "سیانا" جو گم شدہ چیزوں اور چوریوں وغیرہ کا حال بتاتا ہے اس کا تعلق بھی شیطان اور ارواحِ خبیثہ سے ہوتا ہے۔ اور خط کھینچنے والا نبی دانیالؑ یا ادریسؑ تھے۔ اس عبارت سے علم رمل وجفر کا جواز نہیں نکلتا بلکہ یہ بطورِ زجر فرمایا ہے یا تعلیق بالمحال ہے یعنی کسی کا حساب اس پیغمبر کے حساب کے موافق

لہ مصفیٰ ج ۱ ص ۱۲۵۔

ہونا چونکہ ناممکن ہے لہٰذا اس علم کی بھی کوئی حقیقت نہ رہی۔ امام خطابیؒ نے فرمایا کہ اس پیغمبر کے خطوط تو معجزہ یا از راہِ علم الٰہی تھے اور کسی اور کا یہ مقام نہیں لہٰذا کسی کے لئے یہ روا بھی نہیں۔ کیونکہ اُس پیغمبر کے ساتھ خط کی موافقت یا کتاب و سنّت سے ثابت ہو سکتی ہے یا تواتر سے۔ پہلی چیز تو ظاہر ہے کہ علم رمل و جفر سے خالی بلکہ اس کے خلاف اور تواتر سے بھی اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ آجکل کا رمل بعینہٖ اُسی پیغمبر کے خطوط جیسا ہے پس یہ ناجائز ٹھہرا۔

اس مسئلہ پر تقریباً اتفاق ہے۔ اکثر علماء تابعین اور امام شافعیؒ وغیرہم یرحمہ اللہ سے نماز کے باطل ہوجانے کے قائل ہیں۔ اور حنفیہ کے ہاں مطلق کلام ناجائز اور مفسدِ صلوٰۃ ہے اور یہ حدیث حنفیہ کی دلیل ہے اور اس میں عمد اور سہو کا بھی فرق نہیں۔ دونوں حالتوں میں نماز فاسد ہے جیسے کہ کھانا یا پینا چاہے عمداً چاہے سہواً ہو مفسدِ صلاۃ ہے اور حدیث رُفع عن اُمتی الخطأ و النسیان سے مراد بالاجماع گناہ کا اُٹھایا جانا ہے نہ کہ کسی اور چیز کا۔ مُسلم میں حدیث ہے کہ زیدؓ بن الارقم انصاری فرماتے ہیں کہ ہم نماز میں بات کرلیا کرتے تھے پس جب یہ آیت اتری وَقُومُوا لِلّٰہِ قانتین تو ہمیں سکوت کا حکم ملا اور کلام سے منع فرما دیا گیا اور یہ حکم مدینہ میں آیا تھا اور ہجرت کے کافی سال بعد آیا تھا کیونکہ ابتدار ہجرت میں زیدؓ بن الارقم ابھی بچے تھے۔

امام شافعیؒ نے اس حدیث کے لفظ انّما ھی التسبیح و التکبیر و قرأۃ القرآن سے یہ استدلال فرمایا ہے کہ تکبیر تحریمہ نماز کا جزو اور فرض ہے۔ حنفیہ اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ حضورؐ کا مطلب یہ ہے کہ نماز میں تسبیح و تکبیر و قرأۃ القرآن ہے۔ اب ظاہر ہے کہ تسبیح کو کوئی بھی فرض نہیں سمجھتا۔ امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا ہے کہ تکبیر تحریمہ شرطِ صلوٰۃ ہے ان کی دلیل قرآن کی یہ آیت ہے۔ وَذکر اسم ربّہٖ فصلّی۔ اس آیت میں ذکر اسم ربّہٖ سے مراد تکبیر تحریمہ ہے اور اس پر فَصَلّٰی کا عطف ہے جو مغائرت کو چاہتا ہے۔ پس تکبیر تحریمہ شرطِ صلوٰۃ تو ہے جزءِ صلوٰۃ نہیں۔

[1] اور صاحب مشکوٰۃ نے لکنّی کے بارے میں جو کچھ کہا ہے دراصل یہ المصابیح کے مصنف کے رد میں ہے۔ صاحب مصابیح نے لکنّی کا لفظ اس حدیث سے ساقط کر دیا تھا۔ صاحبِ مشکوٰۃ فرماتے ہیں کہ مُسلم میں اور کتاب الحمیدی میں لکنّی کا لفظ موجود ہے۔ اسی طرح جامع الاصول میں بھی اس حدیث میں لکنّی کا لفظ موجود ہے بلکہ اس پر کذا کا

[1] مرقات ج ۳ ص ۳ [2] مظاہر حق ج ۱ ص ۳۴۲

لفظ لکھ کر اس کی تصحیح بھی کی گئی ہے۔ متقدمین کے ہاں کذا کا لفظ تصحیح کے لئے آتا تھا جیسا کہ ہمارے ہاں صح یا صحیح کا لفظ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۲ : وعن عبد اللّٰہ بنؓ مسعود قال کُنّا نُسلّم علی النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلّم وھو فی الصّلاۃ فیردّ علینا فلمّا رجعنا من عند النجاشیؒ سلّمنا علیہ فلم یردّ علینا فقلنا یا رسُول اللّٰہ کنّا نسلّم علیك فی الصّلوٰۃ فتردّ علینا فقال اِنّ فی الصّلوٰۃ لشغلاً۔ متفق علیہ۔

ترجمہ : حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کہا کرتے تھے جبکہ آپؐ نماز میں ہوتے تھے تو آپؐ سلام کا ہمیں جواب بھی دیتے تھے۔ پس جب ہم نجاشیؒ شاہِ حبشہ کے پاس سے واپس آئے تو ہم نے آپؐ کو سلام کہا (اور آپؐ نماز میں تھے) پس آپؐ نے سلام کا جواب ہمیں نہ دیا۔ تو ہم نے (نماز کے بعد) عرض کیا یا رسول اللہ ہم نماز میں آپؐ کو سلام کہتے تھے اور آپؐ ہمیں جواب بھی دیا کرتے تھے (یعنی مکہ مکرمہ میں قبل از ہجرت) تو آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ نماز میں بہت بڑی مصروفیت ہے۔ بخاری و مسلم۔

شرح : اِنّ فی الصّلوٰۃ لشغلاً[1] یعنی نماز میں قرأتِ قرآن، تسبیح و تکبیر و دعاء و مناجات کا شغل ہے جو کلام سے مانع ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نماز میں سلام کا جواب دینا اور کلام کرنا حرام ہے۔ اگر ہاتھ یا انگلی کے اشارے سے جواب دے تو نماز فاسد نہ ہوگی۔ (گو یہ بھی مکروہ ہوگا)۔

اس حدیث میں اس امر کی صراحت موجود ہے کہ ہجرت سے قبل مکہ میں حضورؐ لوگوں کے سلام کا جواب نماز میں دے دیتے تھے لیکن ہجرت کے بعد یہ چیز ناجائز ٹھیرا دی گئی۔ شاہِ نجاشی[2] جس کا ذکر اس حدیث میں ہے۔ اس کا نام اَصحمہؒ تھا وہ ایمان لا چکا تھا اور فتح مکہ سے قبل وفات پا گیا تھا اور حضورؐ نے صحابہؓ سمیت مدینہ میں اس کی نماز پڑھی تھی اور اس کی نعش بطور معجزہ حضورؐ کے سامنے بلند کر دی گئی تھی علامہ ابن حجرؒ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ اور اس کا سنِ وفات ۹ ہجری بھی بتایا گیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۳ : وعن مُعیقیبؓ عن النبیّ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم

---

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۳۴۳، مرقات ج ۳ ص ۵، مصنف ج ۱ ص ۱۲۵۔

[2] مرقات ج ۳ ص ۵، مظاہر حق ج ۱ ص ۳۴۳۔

فی الرّجل یسوّی التّراب حیث یسجد قال اِن کنت فاعلاً فواحدۃً۔ متفق علیہ۔

ترجمہ : حضرت معیقیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا اس شخص کے متعلق جو سجدہ کرنے کی جگہ کو برابر اور درست کرتا ہے حضورؐ نے اس سے ارشاد فرمایا کہ اگر ایسا کرنا ہی پڑ جائے تو ایک مرتبہ کر لو۔ بخاری و مسلم۔

شرح : علامہ علی القاریؒ نے بیان کیا ہے کہ اس روایت میں ایک بار کی اجازت ہے۔ اور ایک روایت میں دو بار کا لفظ بھی موجود ہے۔ یہیں سے فقہاء کہتے ہیں کہ آخری حد دو مرتبہ ہے۔ اگر کسی فعلِ مباح یا ناگزیر کو دو مرتبہ سے زیادہ کرے تو فعلِ کثیر ہو جائے گا اور نماز فاسد ہو جائے گی۔ چنانچہ شرح مُنیہ میں لکھا ہے کہ بلا وجہ سنگریزوں وغیرہ کو الٹ پلٹ کرنا جائز نہیں لیکن اگر وہ اونچے نیچے ہوں اور سجدہ ان پر ممکن نہ ہو ایک مرتبہ اور زیادہ سے زیادہ دو مرتبہ انہیں درست کر کے نشیب و فراز برابر کرے اس سے زیادہ جائز نہیں۔

حضرت معیقیبؓ قدیم الاسلام صحابی تھے اور حضرت سعیدؓ بن العاص کے آزاد کردہ غلام تھے، انہوں نے پہلے حبشہ کو اور پھر وہاں سے مدینہ کو ہجرت فرمائی تھی۔

حدیث ۴ : وعن ابی ھریرۃؓ نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن الخصر فی الصّلاۃ۔ متفق علیہ۔

ترجمہ : حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں کولھوں (پہلوؤں) پر ہاتھ رکھنے سے منع فرما دیا۔ بخاری و مسلم۔

شرح [1] : خصر کی تفسیر میں کئی اقوال ہیں ان میں سے قوی ترین یہی ہے کہ اس سے مراد اختصار یعنی پہلوؤں پر ہاتھ رکھنا ہے کیونکہ بقول شارح طیبیؒ روایاتِ حدیث کا اس پر اتفاق ہے کہ اس سے مراد پہلوؤں پر ہاتھ رکھنا ہے روایات میں آتا ہے کہ یہ اہل دوزخ کی راحت ہے اور یہودیوں کا طریقہ ہے۔ ابن الملکؒ نے "بعض الاخبار" کے حوالہ سے فرمایا ہے کہ ابلیس ملعون ہونے کے بعد اسی پوزیشن میں زمین پر اترا تھا اور جمہور کے نزدیک نہی کراہت پر معمول ہے لیکن اہل ظواہر حرمت کے قائل ہیں۔

حدیث ۵ عن عائشۃ رضی اللہ عنھا قالت سألت رسول اللہ صلی اللہ

لہ مرقات ج ۲ ص ۶، منظاہر حق ج ۱ ص ۳۴۳۔ ۲ے قسطلانی ج ۲ ص ۴۱۱، ایضاً مرقات۔

علیہ وسلم عن الالتفات فی الصلوٰۃ فقال ھو اختلاس یختلسہ الشیطان من صلاۃ العبد۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضؓ صدیقہ اُمّ المومنین فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلیؐ اللہ علیہ وسلم سے نماز میں اِدھر اُدھر دیکھنے کے متعلق پوچھا تو حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ وہ اُچک لینا ہے جو شیطان بندے کی نماز سے اُچک لیتا ہے۔ بخاری و مسلم۔

شرح: [۱] التفات سے مراد منہ اِدھر اُدھر پھیرنا ہے یہ تو اس حدیث کی رُو سے مکروہ ہوا کیونکہ اس سے خضوع و خشوع جاتا رہتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ بندہ جب تک متوجہ رہے اللہ تعالیٰ اس کی طرف متوجہ رہتا ہے اور جب اِدھر اُدھر منہ پھیر لے تو اللہ تعالیٰ بھی اُس سے پھر جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر سینہ قبلہ کی طرف رہے اور صرف منہ اِدھر اُدھر پھیرا جائے تو نماز تو فاسد نہ ہوگی لیکن اس کا کمال جاتا رہے گا۔ اسی لئے اس سے منع فرمایا گیا ہے۔ حافظ صاحبؒ نے [۲] فتح الباری میں فرمایا ہے کہ یہ حدیث کراہتِ تنزیہی پر دلالت کرتی ہے اور سوائے اہلِ ظاہر کے سب کا اس پر اجماع ہے۔ ظاہر یہ کے نزدیک ایسا کرنا (بلاضرورت) حرام ہے اور اس حدیث میں التفاف سے مراد یہ ہے کہ قبلہ سے رُخ نہ پھرے (ورنہ نماز باطل ہوگی) اور اس کراہت کا باعث خشوع میں نقص آنا یا بدن کے کچھ حصے کا استقبالِ قبلہ سے ہٹ جانا ہے۔ اور بعض احادیث میں التفاف کو مطلقاً جائز فرمایا گیا ہے یہ احادیث مسند احمد، ابن خزیمہ، ابو داؤد اور نسائی میں آئی ہیں۔

[۳] اور قبلہ سے سینہ پھیر لینے سے نماز باطل ہو جائے گی لیکن کنکھیوں سے دیکھنے کی صریحاً صحیح احادیث میں اجازت دی گئی ہے۔ اس لئے وہ مکروہ بھی نہیں جیسا کہ امام کی طرف دیکھنا بھی جائز ہے حدیث کے الفاظ ہیں "حین رأیتمونی" جسے امام بخاری نے باب رفع البصر الی الامام فی الصلوٰۃ کے ترجمۃ الباب میں رکھا ہے۔

[۴] حضرت علامہ سید انور شاہؒ فرماتے ہیں کہ شیطان بالکل کتے کی مانند ہے اسی طرح بعض احادیث میں کتے کو شیطان کہا گیا ہے جس طرح کتا چیزیں لے بھاگتا ہے۔ غفلت میں انسان پر حملہ کر دیتا ہے اسی طرح شیطان بھی بندے کی نماز میں سے کچھ نہ کچھ لے بھاگنے

---

[۱] مظاہر حق ج ۱ ص ۳۴۳، مرقات ج ۳ ص ۷

[۲] فتح الباری ج ۳ ص ۲۱۱ [۳] مظاہر حق ج ۱ ص ۳۴۳، مرقات ج ۲ ص ۷۔

[۴] فیض الباری ج ۲ ص ۲۷۰

کی کوشش کرتا ہے اور غفلت میں اس پر حملہ کرتا ہے اور جب تک ڈنڈا نہ دکھایا جائے پیچھے نہیں ہٹتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۶: وعن ابی ھریرۃؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لَیَنْتَھِیَنَّ اقوامٌ عن رفعھم ابصارھم عند الدعاء فی الصلوٰۃ الی السماء او لَتُخْطَفَنَّ ابصارھم۔ رواہ مسلم[۱]۔

ترجمہ: حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یا تو لوگ نماز میں دعا کے وقت اپنی آنکھیں آسمان کی طرف اٹھانے سے باز رہیں گے ورنہ اُن کی آنکھیں اُچک لی جائیں گی۔ مسلم۔

شرح: بخاری[۱] نے حضرت انسؓ سے اسی قسم کی حدیث جاب رفع البصر الی السماء فی الصلوٰۃ میں روایت کی ہے کیونکہ اس میں عند الدعاء کا لفظ نہیں ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے شرح میں بخاری کی مطلق حدیث کو مسلم کی مقید حدیث پر محمول کرکے اس سے مراد عند الدعاء ہی لیا ہے اور اسے خشوع وخضوع کے خلاف قرار دیا ہے۔ علامہ قسطلانیؒ[۲] نے علامہ عینی حنفیؒ کے حوالہ سے حافظ ابن حجرؒ کا تعقب کیا ہے اور فرمایا ہے کہ مقید حدیث اپنی قید پر ہے اور مطلق (بخاری والی) کا بھی کراہت میں یہی حکم ہوگا۔ پس نماز میں دُعاء کے وقت یا بغیر دُعا کے آسمان کی طرف نگاہ اٹھانا مکروہ اور خلافِ خشوع ہے اور اسی سے منع فرمانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں یہ آیت نازل فرمائی، قد افلح المؤمنون الذین ھم فی صلاتھم خاشعون ۝

اور[۳] دعاء کے وقت یا بغیر دعاء کے آسمان کی طرف نگاہ اٹھانے سے اللہ تعالیٰ کے مقید بالمکان ہونے کا وہم پایا جاتا ہے حالانکہ وہ زمان ومکان کے تقید سے ماوراء ہے۔ یہ سب قیدیں مخلوق کے لئے ہیں خالق ان سے بلند ہے۔ ابن ابی شیبہ کی روایت میں ہے کہ لوگ آسمان کی طرف نگاہیں اٹھایا کرتے تھے پس جب آیت قد افلح الخ نازل ہوئی تو حضورؐ نے سر مبارک جھکالیا اور لوگ اس کے بعد صرف موضع سجود کو دیکھتے تھے آگے نگاہ نہ لے جاتے تھے۔ اور[۴] نماز سے باہر دعا میں آسمان کی طرف نگاہ کرنا مکروہ نہیں جیساکہ علامہ عابد سندھیؒ اور محقق دوانیؒ نے فرمایا ہے کیونکہ نماز سے باہر کوئی چیز نگاہ اٹھانے سے مانع نہیں۔ لیکن علامہ علی القاریؒ نے امام جزریؒ کے حوالے سے اسے

---

[۱] بخاری مع فتح الباری ج ۳ ص ۱۷۱ [۲] قسطلانی ج ۲ ص ۹۱
[۳] مظاہر حق ج ۱ ص ۳۴۳، مرقات ج ۳ ص ۷ [۴] فیض الباری ج ۲ ص ۲۷۰

بھی مکروہ لکھا ہے گو اکثر علماء نے اسے جائز قرار دیا ہے۔ صاحب مظاہر حق فرماتے ہیں کہ بہتر یہی ہے کہ اس سے پرہیز کیا جائے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۷: وعن ابی قتادۃؓ قال رأیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یؤم الناس وامامۃ بنت ابی العاصؓ علی عاتقہ فاذا رکع وضعھا و اذا رفع من السجود اعادھا۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کی امامت کرتے دیکھا اور حضرت اُمامہ بنت ابی العاص رضی اللہ عنہما آپؐ کے کندھے پر تھی پس آپؐ جب رکوع کرتے تو اسے نیچے رکھ دیتے اور جب سجدے سے سر اٹھاتے تو اُسے پھر اُٹھا لیتے تھے۔ بخاری و مسلم۔

شرح: بخاری[1] میں اس حدیث میں یؤم الناس کا لفظ نہیں ہے۔ اس صورت میں معاملہ ہلکا ہو جاتا ہے کیونکہ نفل نماز میں فرض جیسی پابندیاں نہیں ہیں کچھ معاملہ ڈھیلا ہے۔ لیکن مسلم کی روایت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اس لیے علماء نے فرمایا ہے کہ یہ واقعہ انّ فی الصلوٰۃ لشغلاً وغیرہ احکام کی احادیث سے پہلے کا ہے۔ اگر پہلے کا نہ مانا جائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مخصوص مانا جائے گا۔ ورنہ یہ حدیث صراحۃً دوسری صحیح احادیث سے ٹکراتی ہے۔ امام خطابیؒ فرماتے ہیں کہ اصل معاملہ یوں تھا کہ بچی حضورؐ سے بہت مانوس تھی اور خود آپؐ سے چمٹ جاتی تھی اور جب حضورؐ رکوع فرماتے تھے تو آہستگی سے نیچے گر جاتی تھی اور پھر جب آپؐ ایک رکعت کے بعد اُٹھنے کو ہوتے تو کندھے پر چڑھ بیٹھتی تھی۔ اور اس فعل کی نسبت جو حدیث میں حضورؐ کی طرف کی گئی ہے یہ مجازاً ہے اس لئے یہ فعلِ کثیر نہ[2] ہوا۔ یا حضورؐ نے اسے فعل کثیر کے بغیر ایک آدھ مرتبہ بیانِ جواز کے لئے اٹھایا ہو گا کیونکہ یہ فعل جائز مع الکراہت ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بچوں کے کپڑے اور بدن جب تک نجاست کا یقین نہ ہو طاہر ہی سمجھے جائیں گے۔ یہ اُمامہؓ حضورؐ کی بڑی صاحبزادی حضرت زینبؓ کی بیٹی تھیں حضرت علیؓ نے جنابِ فاطمہؓ کے وصال کے بعد ان سے نکاح کیا تھا۔ لیکن ان سے کوئی اولاد باقی نہ رہی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

---

[1] مرقات ج ۳ ص۳، مظاہر حق ج ۱ ص۳۴۴۔

[2] امام مالکؒ نے اس حدیث پر موطا میں باب باندھا ہے باب العمل الیسیر لا یبطل الصلوٰۃ ج ۱ ص۱۲۳۔

حدیث ۸ : وعن أبی سعید الخدریؓ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم اذا تثاءب أحدکم فی الصّلٰوۃ فلیکظم ما استطاع فانّ الشیطان یدخل۔ رواہ مُسلم۔ وفی روایۃ البخاری عن ابی ھریرۃؓ قال اذا تثاءب احدکم فی الصّلٰوۃ فلیکظم ما استطاع ولا یقل ھا فانّما ذٰلکم من الشّیطان یضحک منہ۔

ترجمہ : حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہؐ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی شخص نماز میں جمائی لے تو حتّی الوسع منہ بھینچ کر رکھے کیونکہ شیطان اس میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہ مسلم کی روایت ہے۔ اور بخاری کی روایت میں، جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے، آیا ہے کہ فرمایا جب تم میں سے کوئی نماز میں جمائی لے تو حتی الوسع منہ بند رکھے اور ہا کی آواز نہ نکالے کیونکہ یہ شیطان کی طرف سے ہے وہ اس سے ہنستا ہے۔

شرح : شیطان کا منہ میں داخل ہونا یا ہنسنا امورِ غیبیہ میں سے ہے ممکن ہے عالمِ غیب میں واقعی شیطان ایسا ہی کرتا ہو لیکن[1] اس حدیث میں علماء نے کلام کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ جمائی سستی اور کسل مندی کا نشان ہے جس کا سبب پیٹ کا بھرا ہُوا ہونا اور ثقلِ بدن اور کدورتِ حواس ہے۔ چونکہ یہ چیزیں عبادت میں خلل انداز ہیں لہٰذا انھیں شیطان کی طرف منسوب فرمایا گیا کیونکہ شرع میں ہر اچھی چیز کی نسبت رحمان کی طرف اور ہر بُری چیز کی نسبت شیطان کی طرف کی جاتی ہے کیونکہ وہ اس کے مقاصد میں ممدّ ومعاون ہوتی ہے اور منہ میں گھس جانے سے مراد نمازی کو بہکانا اور عبادت سے باز رکھنا ہے اور ہنسنے سے مراد اُس کا اس بات پر خوش ہونا ہے کہ بندہ عبادت سے غافل ہو رہا ہے اور اُس پر سستی طاری ہے اور یہ جو فرمایا کہ حتی الوسع منہ بند رکھے تو یا تو اس سے مراد ہونٹوں کا بھینچ لینا ہے کہ منہ نہ کھلنے پائے یا دایاں سیدھا ہاتھ یا بایاں اُلٹا ہاتھ منہ پر رکھ دینا ہے تاکہ منہ کھلا نہ رہے۔

حدیث ۹ : وعن ابی ھریرۃؓ قال قال رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم اِنّ عفریتًا مِنَ الجِنّ تفلّت البارحۃ لیقطع علیّ

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۳۴۴، مرقات ج ۳ ص۔

صلاتی فامکننی اللہ منہ فاخذتہ فاردت ان اربطہ علی ساریۃ من سواری المسجد حتی تنظروا الیہ کلکم فذکرت دعوۃ اخی سلیمان رب ھب لی ملکا لا ینبغی لاحد من بعدی فرددتہ خاسئا۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جنوں میں سے ایک خبیث دیو گزشتہ رات اچانک آگیا تاکہ میری نماز کو قطع کر ڈالے تو اللہ تعالیٰ نے مجھے اس پر قدرت دی، پس میں نے چاہا کہ مسجد کے ستونوں میں سے ایک ستون کے ساتھ اُسے باندھ دوں یہاں تک کہ تم سب اُسے دیکھ لو۔ پھر مجھے اپنے بھائی سلیمانؑ کی دُعا یاد آگئی رَبِّ ھَبْ لِی مُلْکًا الخ "اے میرے پروردگار مجھے ایسی حکومت عطا کر جو میرے بعد کسی اور کے لئے مناسب نہ ہو۔" پس میں نے اسے ذلیل وخوار کرکے ہانک دیا۔ بخاری ومسلم۔

شرح: ان عفریتا[1] من الجن ایک سرکش اور خبیث جن۔ جن ناری مخلوق ہے یا عناصر اربعہ سے بنی ہے لیکن اُس پر نار کا غلبہ ہے جیساکہ انسان عناصر اربعہ سے بنا ہے لیکن اس پر مٹی کا غلبہ ہے۔ اور چونکہ ان کے اجسام میں لطافت ہے لہذا مختلف شکلیں تبدیل کرنے کی قوت رکھتے ہیں جیساکہ ملائکہ کا بھی یہی حال ہے لیکن ملائکہ چونکہ نور سے بنے ہیں لہذا خوبصورت اشکال میں ڈھلتے ہیں اور جن بیج قبیح وبدصورت اشکال میں متشکل ہوتے ہیں۔

حافظ ابن حجرؒ نے تفلّت کا معنی لکھا ہے چھوٹ بھاگا یعنی جس جزیرے میں قید تھا وہاں سے اچانک نکل بھاگا۔ اور یہ قید حضرت سلیمانؑ کے زمانے سے تھا۔ اور حضورؐ تو سیّد الوجود اور سرور کائنات ہیں آپؐ کی روحانی سلطنت کونین پر ہے اور ظاہری سلطنت بھی آپؐ کو حاصل ہوئی تھی محض سلیمان علیہ السلام کی دُعا کا احترام کرتے ہوئے ملکِ سلیمانؑ کے کارخانے میں دخل نہ دیا ورنہ آپؐ کو یہ قوت من جانب اللہ حاصل تھی۔ جیساکہ اس حدیث سے صراحۃً معلوم ہوتا ہے اور حدیث سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اگر سرکش جن کو اُس کی اختیار کردہ صورت میں گرفتار کر لیا جاتا تو وہ اپنی صورت میں جانے کی طاقت نہ رکھتا تھا شاید یہ حضورؐ کا معجزہ ہو یا عام حکم بھی یہی ہو کیونکہ حضرت

---

[1] مرقات ج ۳ ص ۹، مظاہر حق ج ا ص ۳۲۵۔

ابوھریرہؓ کے ایک خبیث جنؔ کو پکڑ لینے کا بھی حدیث صحیح میں ذکر آتا ہے۔
اور قطع صلوٰۃ سے مراد یا تو قطع خشوع ہے یا اِفسادِ صلوٰۃ بذریعہ عمل کثیر۔
اور مصنف ابن ابی شیبہ یا مصنف عبدالرزاق میں ہے کہ شیطان اس وقت بلّی کی صورت میں تھا۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شیطان کو چھونے سے نماز فاسد نہیں ہوتی اور محض خیالات کے آنے سے بھی نماز میں نقص نہیں آتا۔ حدیث میں ربّ ھب لی الخ ہے لیکن قرآن میں ربّ اغفرلی وھب لی ملکاً ہے اسے روایت بالمعنی پر محمول کیا جائے گا۔

حدیث ۱۰: وعن سہلؓ بن سعد قال قال رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم من نابہٗ شیٔ فی صلوٰتہٖ فَلْیُسَبِّحْ فانّما التَّصْفِیقُ للنسآء وفی روایۃٍ قال التسبیحُ للرّجال والتصفیق للنسآء۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت سہل بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کو نماز میں کوئی چیز پیش آجائے تو وہ سبحان اللہ کہے کیونکہ ہاتھ پر ہاتھ مارنا تو عورتوں کے لئے ہے۔ اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ تسبیح مردوں کے لئے ہے اور ہاتھ پر ہاتھ مارنا عورتوں کے لئے ہے۔ بخاری و مسلم

شرح: یہ حدیث دراصل ایک لمبی حدیث کا آخری حصّہ ہے جو بخاری نے باب من دخل لیؤمّ النّاس الخ میں بیان کی ہے۔ ایک مرتبہ حضورؐ مدینہ کی ایک آبادی میں صلح کرانے تشریف لے گئے۔ اتنے میں نماز کا وقت ہوگیا مؤذّن نے اذان کہی، جماعت کا وقت آیا تو مؤذن نے حضرت ابوبکر صدّیقؓ سے امامت کو کہا چنانچہ وہ کھڑے ہوگئے۔ آپؐ تشریف لے آئے اور صفیں چیر کر اگلی صف میں آکھڑے ہوئے۔ لوگوں ہاتھ مارنے تاکہ حضرت ابوبکر صدّیقؓ کو مطلع کریں۔ وہ مطلع ہوئے تو پیچھے ہٹنے لگے۔ حضورؐ نے اشارہ سے مصلّیؔ پر ہی رہنے کو فرمایا لیکن حضرت ابوبکر صدّیقؓ ادباً ہٹ آئے۔ نماز کے بعد حضورؐ نے وہ الفاظ فرمائے جو یہاں دیئے گئے ہیں۔
مَن نابہٗ شیٔ[۲] جب کسی کو آگاہ کرنے کی ضرورت پیش آجائے مثلاً ایک شخص

---

[۱] فیض الباری ج ۲ ص ۴۳۸ [۲] مظاہر حق ج ۱ ص ۳۴۵، مرقات ج ۳ ص ۱۰

گھر میں یا مسجد میں نماز پڑھ رہا ہے باہر اسے کوئی پکار رہا ہے تو یہ سُبحان اللہ کہہ دے تاکہ پتہ چل جائے کہ نماز میں ہے۔ اسی طرح امام کی اصلاح کے لئے بھی بعض دفعہ یہی لفظ استعمال ہوتا ہے کہ مقتدی سبحان اللہ کہہ کر اسے غلطی پر متوجہ کریں۔ اور عورت کو آواز نکالنے کی نماز میں بھی اجازت نہیں کیونکہ اس کی آواز بھی پردہ کے حکم میں داخل ہے۔ تصفیق سے مراد دائیں ہتھیلی کو بائیں ہاتھ کی پشت پر مارنا ہے نہ کہ تالی پیٹنا گانا گانے والیوں کی مانند، کیونکہ یہ چیز عمل کثیر ہو کر مُفسدِ نماز ہو جائے گی۔ واللہ اعلم بالصّواب۔

باب السّہو

یعنی[1] نماز میں سہو کا حکم کیا ہے؟ اور سہو سے مراد یہاں عمد و قصد کی ضد ہے۔ پس وہ خطا و نسیان (یعنی بھول چُوک) دونوں کو مشتمل ہے۔ لغت میں سہو کا معنی ہے کسی چیز سے غافل ہونا اور دل کا کسی اور چیز کی طرف چلے جانا اور اس لحاظ سے سہو و نسیان دونوں مترادف ہیں۔ باب السّہو سے مراد سجودِ سہو کے احکام کا باب بھی ہو سکتا ہے اور سجود سہو حنفیہ کے ہاں دلائل شرعی سے واجب ہے۔

جناب[2] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اقوال میں جو تبلیغ احکام اور اخبار عن الغیب سے متعلق ہوں، سہو کا ہونا ناممکن تھا کیونکہ اس طرح تو احکام دین سے ہی امان اُٹھ جاتی۔ ہاں[3] آپؐ کو افعال میں سہو ہوتا تھا تاکہ لوگوں کو اس کے مسائل سکھائے جاسکیں اور سہو منافیٔ عصمت نہیں کیونکہ یہ گناہ نہیں اور عصمت کا تعلق گناہ سے ہوتا ہے۔ سجدۂ سہو کی کیفیت اور اُس کا مقام وغیرہ دیگر مسائل احادیث کی شرح کے ضمن میں آرہے ہیں۔ واللہ ولیّ التوفیق۔

الفصل الاوّل

حدیث ۱: عن ابی ھریرۃؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ

---

[1] مرقات ج ۳ صـ ۲۱ [2] مظاہر حق ج ۱ صـ ۳۵۲

[3] مؤطاء مع شرح ج ۱ صـ ۱۲۳۔

وسلّم اِنّ احدکُم اذا قام یُصلّی جاءہ الشّیطٰن فَلَبس علیہ حتّٰی لا یدری کم صلّٰی فاذا وَجَدَ ذٰلک اَحَدُکم سجدتَیْنِ وھُوَ جَالِسٌ۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی نماز پڑھنے کو کھڑا ہوتا ہے تو شیطان اس کے پاس آتا ہے پس اُسے شبہ میں ڈالتا ہے حتیٰ کہ وہ نہیں جانتا کہ کتنی نماز پڑھی ہے۔ پس جب تم میں سے کوئی یہ پائے تو بیٹھا ہونے کی حالت میں دو سجدے کر لیا کرے۔ بخاری و مسلم۔

شرح: [1] اس حدیث میں شک کا بیان ہے اس کا حکم بھی سہو کی مانند ہے یعنی اس سے بھی سجدۂ سہو واجب ہوتا ہے۔ شک اور سہو میں یہ فرق ہے کہ سہو میں ایک جانب کا یقین ہوتا ہے لیکن شک میں دونوں جانب برابر ہوتی ہیں۔ اور یہ جو فرمایا ہے کہ فلیسجد سجدتین ظاہری الفاظ تو وجوب ہی ثابت کرتے ہیں لیکن [2] علامہ قسطلانی نے شرح میں اس سجدہ کو مستحب کہا ہے۔ اور [3] جمہور کے نزدیک یہ واجب ہے اور سجدہ سہو تشہد کے بعد ہوتے ہیں۔ ہمارے نزدیک بعد از سلام اور امام شافعیؒ کے نزدیک قبل از سلام اور امام مالکؒ کے مسلک میں اس بارے میں تفصیل ہے [4] بعض صورتوں میں بعد از سلام اور بعض میں قبل از سلام اور [5] حنفیہ نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر کسی شخص کو پہلی مرتبہ سہو ہوا ہے تو وہ از سرِ نو نماز پڑھے لیکن اگر ایسا ہوتا رہتا ہے تو غلبۂ ظن پر بنا کرے اور اگر غلبۂ ظن میسر نہ ہو تو کم از کم جتنی رکعت یقیناً پڑھی ہوں ان پر بنا کرے۔

حدیث ۲: وعن عطاءؒ بن یسارٍ عن ابی سعیدٍؓ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلّم اذا شکّ احدکم فی الصلوٰۃ فلم یدر کم صلّی ثلاثاً اَوْ اربعاً فَلْیَطْرَحِ الشکّ وَلْیَبْنِ علٰی ما اسْتَیْقَنَ ثمّ یسجد سجدتین قبل ان یُسلّم فان کان صلّٰی خمساً شفعن لہٗ صلوٰتہٗ وان کان صلّٰی اتماماً

---

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۳۵۲   [2] قسطلانی ج ۲ ص ۱۱۱۔
[3] مرقات ج ۳ ص ۲۱   [4] موطّا مع شرح ج ۱ ص ۱۲۱، ۱۲۲
[5] مرقات ج ۳ ص ۲۲، مسوّٰی ج ۱ ص ۱۲۳۔

لا ربع كانتا ترغيمًا للشيطٰن رواه مسلم۔ ورواه مالك عن عطاءٍ مرسلاً وفي روايته شفعها بهاتين السجدتين۔

ترجمہ: عطاءؒ بن یسار نے حضرت ابوسعیدؓ سے روایت کی۔ انہوں نے کہا کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کسی کو نماز میں شک ہو جائے اور معلوم نہ ہو کہ تین رکعت پڑھی ہیں یا چار تو اُسے چاہیئے کہ شک کو پرے پھینک دے اور جتنی نماز کا یقین ہے اس پر بنا رکھے۔ پھر سلام سے پہلے دو سجدے کرے۔ پس اگر فی الحقیقت اس نے پانچ رکعت پڑھی ہیں تو یہ دو سجدے اس نماز کو جفت کر دیں گے (یعنی ایک رکعت کے قائم مقام ہو جائیں گے) اور اگر اس نے پوری چار ہی رکعت پڑھی ہیں تو دو سجدے شیطان کو ذلیل اور خاک آلود کرنے کے لئے ہونگے۔ اسے مسلم نے روایت کیا۔ اور امام مالکؒ نے اسے عطاء سے مرسل روایت کیا ہے اور ان کی روایت میں یہ لفظ ہیں شفعها الخ یعنی اگر اس شخص نے پانچ رکعت پڑھی ہیں تو انہیں ان دو سجدوں سے وہ جُفت بنا لے گا۔

شرح: صاحبِ مشکوٰۃ نے خلافِ عادت حضرت ابوسعیدؓ سے روایت کرنے والے عطاءؒ بن یسار کا نام روایت میں لیا ہے تاکہ پتہ چل جائے کہ موطاء کی روایت دراصل موصول ہے مرسل نہیں چنانچہ آخر میں خود اس طرف اشارہ فرما دیا ہے۔

[1] اس حدیث میں قبل ان یُسلّم کا لفظ ہے جس سے امام شافعیؒ نے استدلال کیا ہے کہ سجدۂ سہو کا وقت قبل از سلام ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور سفیان ثوریؒ کے نزدیک سجدۂ سہو بعد از سلام ہے اور انہوں نے ابن مسعودؓ اور ابوہریرہؓ کی قصّہ ذوالیدین کی متفق علیہ حدیثوں سے استدلال کیا ہے اور دراصل[2] یہ قبل التسلیم ما بعد التسلیم کا اختلاف محض افضلیت کا اختلاف ہے جواز ہر صورت میں ہے۔ [3] امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اگر سجدۂ سہو کسی نقصان کی وجہ سے ہو تو قبل از سلام ہے اور اگر کسی زیادتی کے باعث ہو تو بعد از سلام ہے۔ اور امام شافعیؒ کا قولِ قدیم بھی یہی ہے لیکن امام ابو یوسفؒ نے فقیہانہ طرز پر انہیں الزام دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ اگر کسی شخص نے نماز میں کچھ نقصان اور کچھ زیادتی کی ہو تو پھر کیا ہوگا۔ امام احمدؒ کے نزدیک نمازی شک کو پرے پھینک گا یا تو اقل رکعات کو لے کر

---

[1] مرقات ج ۳ صـ ۲۲ [2] فیض الباری ج ۲ صـ ۳۳۹
[3] مرقات ج ۳ صـ ۲۲

یا تحرّی کرے (یعنی اٹکل سے) اگر پہلی چیز کو اختیار کرے تو سلام سے قبل سجدہ کرے۔ اور اگر دوسری کو اختیار کرے تو بعد از سلام سجدہ کرے۔

اور حنفیہ نے قبل از سلام اور بعد از سلام کو جمع کرنے کے لئے کہا ہے کہ سجدۂ سہو تشہد پڑھ کر آخری سلام سے پہلے کیا جائے اور اس کے بعد دوبارہ تشہد و درود اور دعا وغیرہ کے بعد آخری سلام کہا جائے تاکہ احادیث جمع ہو جائیں۔ ہاں اگر آخری سلام کہہ کر بعد میں سجدہ کرے گا تو بھی جائز ہو گا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

فلیطرح الشّکّ شک کو پرے پھینک دے۔ یعنی جس رکعت میں شک ہے اُسے کالعدم سمجھتے ہوئے کم پر بنار کرے مثلاً تین اور چار میں شک ہے تو تین سمجھ لے یعنی کمتر کو جو یقینی ہے اختیار کرلے۔

فان کان صلّٰی خمسًا اگر اس شخص نے فی الحقیقت پانچ رکعات ادا کی ہیں تو سجدۂ سہو کی وجہ سے اس کی نماز چھ رکعت سمجھی جائے گی کیونکہ رکعت کا عظیم ترین رکن یعنی سجدہ پایا گیا ہے اور اگر اس نے چار پڑھی ہیں تو نماز مکمل ہو گئی اور دو سجدے شیطان کو ذلیل کرنے کے لئے ہو گئے جس نے شک میں مبتلا کیا تھا۔ اس صورت میں چار ہی رکعتیں ہوئیں اور وہی مطلوب تھیں لیکن پہلی صورت میں چار سے زائد ہو گئیں جو نفل شمار ہو جائیں گی (یعنی زائد والی)

اس حدیث میں تحرّی کا ذکر نہیں بلکہ یقین اور اقلّ پر بنیاد رکھنے کا ذکر ہے [۱] اور جمہور کا مذہب یہی ہے اور ترمذی نے کہا کہ بعض ائمہ کے نزدیک اس صورت میں نماز کا اعادہ کرے۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اگر شک پہلی بار ہوا ہو تو اعادہ کرے ورنہ تحرّی کرے۔ اور تحرّی کا ذکر صحیحین کی روایت ابن مسعودؓ میں صراحۃً موجود ہے۔ شیخ عبد الحقؒ فرماتے ہیں کہ اس باب میں تین قسم کی احادیث موجود ہیں: ا۔ اعادہ کی احادیث۔ ب۔ تحرّی کی احادیث۔ ج۔ زیر بحث حدیث جس میں اقل پر اور یقین پر بنار کا حکم ہے۔ پس امام ابو حنیفہؒ نے تینوں قسم کی احادیث کو یوں جمع فرمایا ہے۔ کہ اگر شک پہلی بار آیا ہے تو اعادہ کرے بموجب حدیث قسم اول اور اگر تحرّی (غلبۂ ظن) ایک جانب موجود ہو تو تحرّی کرے بموجب حدیث قسم دوم۔ اور اگر تحرّی کسی جانب نہ ہو تو اقل پر بنار رکھے اور باقی ہر چیز کو پرے پھینک دے۔ اس سے معلوم ہوا کہ امام اعظم کا مذہب کمالِ تحقیق اور جامعیت پر مبنی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] مظاہر حق ج ا ص ۳۵۳۔

حدیث ۳ : وعن عبد اللہ بن مسعود انّ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم صلّی الظّہر خمسًا فقیل لہ أزید فی الصّلوٰۃ فقال وما ذاک قالوا صلّیت خمسًا فسجد سجدتین بعد ما سلّم وفی روایۃٍ قال انّما انا بشرٌ مثلکم انسٰی کما تنسون فاذا نسیتُ فذکّرونی واذا شکّ احدکم فی صلوٰتہٖ فلیتحرّ الصّواب فلیُتمّ علیہ ثمّ یُسلّم ثُمّ یسجد سجدتین۔ متفق علیہ۔

ترجمہ : حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی نماز پانچ رکعت پڑھی۔ تو آپؐ سے عرض کیا گیا کہ کیا نماز کی رکعات بڑھا دی گئی ہیں؟ حضورؐ نے فرمایا وہ کیسے؟ صحابہ نے عرض کیا کہ آپؐ نے پانچ رکعات پڑھی ہیں۔ پس آپؐ نے دو سجدے کیئے سلام کے بعد۔ اور ایک روایت میں ہے کہ فرمایا بشر ہونے کی حد تک میں بھی تمہاری مانند ہوں جس طرح تُم بھولتے ہو میں بھی بھولتا ہوں۔ پس جب میں بھول جاؤں تو مجھے یاد کرا دیا کرو۔ اور جب تم میں سے کسی کو اپنی نماز میں شک ہو جائے تو درستی کے لئے تحرّی کرے (صواب کا قصد کرے اور غلبۂ ظن معلوم کرے) اور اس کی بنیاد پر نماز تمام کرے پھر اس کے بعد سلام کہے اور دو سجدے کرے۔ بخاری و مسلم۔

شرح[1] : اس حدیث میں دو چیزیں صراحۃً حنفیہ کی مؤید ہیں۔ ایک تو تحرّی کا حکم اور دوسرے سجدۂ سہو کا بعد از سلام ہونا۔ اور چونکہ یہ صحیح ترین حدیث ہے لہٰذا انہوں نے اس پر عمل کیا ہے رہی یہ بات کہ بات چیت ہونے کے باوجود نماز کو فاسد نہ سمجھا گیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ کلام الناس کو صریح احادیث میں مفسد صلوٰۃ کہا گیا ہے بحث اوپر گزری اور اس پر سب کا اتفاق ہے۔ پس[2] اس واقعہ کو تحریم کلام سے پہلے کا شمار کیا گیا ہے اور ہمارے نزدیک اس حدیث میں حضورؐ نے چوتھی رکعت پر تشہد کیا تھا ورنہ فرض نفل بن جاتے اور ظاہر حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ حضورؐ نے چھٹی رکعت نہیں ملائی سو یہ بیان جواز کے لئے ہے۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ چھٹی رکعت ملا لینا ایسی صورت میں مستحب ہے تاکہ نفل بھی دو رکعت ہو جائیں۔ یہ وہ حدیث نہیں ہے جسے

---

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۳۵۴، مرقات ج ۳ ص ۲۳ [2] فیض الباری ج ۲ ص ۴۳۹

ذوالیدین یا ذوالشمالین کی حدیث کہا گیا ہے اور کتب حدیث میں کئی الفاظ سے مختلف صحابہؓ سے مروی ہے۔ فیض الباری (ج ۲ ص ۴۳۹) کے مؤلف فرماتے ہیں کہ معجم طبرانی میں صراحۃً اس حدیث میں چوتھی رکعت پر حضورؐ کے قعدہ نہ کرنے کی روایت موجود ہے۔ اس صورت میں معاملہ سخت مشکل ہے اور اس کا جواب میں نے اپنے استاد حضرت سید انور شاہؒ سے نہیں سنا نہ سوال کا موقع مل سکا۔ واللہ اعلم۔

حدیث ۴: وعن ابن سیرین عن ابی ھریرۃؓ قال صلّٰی بنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم إحدٰی صلوتی العشیّ قال ابن سیرینؒ سمّاھا ابوھریرۃؓ ولکن نسیتُ انا قال فصلّٰی بنا رکعتین ثُمّ سلّم فقام الی خشبۃٍ معروضۃٍ فی المسجد فاتّکأ علیھا کأنّہ غضبان و وضع یدہ الیمنٰی علی الیسرٰی و شبّک بین اصابعہٖ و وضع خدّہ الایمن علی ظھر کفّہ الیسرٰی و خرجت سرعان القوم من ابواب المسجد فقالوا قصرت الصّلوٰۃ و فی القوم ابوبکرؓ و عمرؓ فھاباہ ان یکلّماہ و فی القوم رجلٌ فی یدیہ طولٌ یقال لہ ذوالیدین قال یارسول اللہ انسیت ام قصرت الصّلوٰۃ فقال لم انس ولم تقصر فقال اکما یقول ذوالیدین فقالوا نعم فتقدّم فصلّٰی ما ترک ثمّ سلّم ثمّ کبّر و سجد مثل سجودہٖ او اطول ثمّ رفع راسہ و کبّر ثمّ کبّر و سجد مثل سجودہ او اطول ثمّ رفع راسہ و کبّر فربما سالوہ ثمّ سلّم فیقول نُبّئتُ انّ عمرانؓ بن حصینٍ قال ثمّ سلّم۔ متفق علیہ۔ ولفظہ للبخاری و فی اُخرٰی لھما فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بدل لم انس ولم تقصر وکلّ ذالک لم یکن فقال قد کان بعض ذالک یارسول اللہ۔

ترجمہ: محمد بن سیرینؒ سے روایت ہے انہوں نے ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ انہوں نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر و عصر کی نمازوں میں سے ایک نماز ہمیں پڑھائی۔ ابن سیرینؒ کہتے ہیں کہ ابوھریرہؓ نے تو اس نماز کا نام لیا تھا لیکن مجھے بھول گیا ہے۔ حضرت ابوھریرہؓ نے فرمایا کہ حضورؐ نے ہمیں دو

رکعتیں پڑھائیں پھر سلام پھیر دیا پھر آپؐ ایک لکڑی کی طرف تشریف لے گئے جو مسجد میں پڑی تھی سو آپؐ نے اس پر سہارا لگایا گویا کہ آپؐ غصہ میں تھے اور دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھا اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسری میں ڈال لیں اور اپنا دایاں رخسار بائیں ہاتھ کی ہتھیلی کی پُشت پر رکھ لیا اور جلدی نکل جانے والے لوگ مسجد کے دروازوں سے نکل گئے اور کہنے لگے کہ نماز کم ہوگئی ہے اور لوگوں میں ابوبکرؓ و عمرؓ بھی موجود تھے لیکن انہوں نے ہیبت کے مارے حضورؐ سے بات نہ کی اور قوم میں ایک آدمی تھا جس کے ہاتھ کچھ لمبے تھے اُسے ذوالیدین کہا جاتا ہے اُس نے کہا یا رسول اللہؐ! کیا آپؐ بھول گئے یا نماز میں کمی کر دی گئی ہے؟ حضورؐ نے فرمایا نہ بھولا ہوں اور نہ نماز میں کمی کی گئی ہے۔ پھر آپؐ نے لوگوں سے فرمایا کیا ایسا ہی ہوا ہے جیسا کہ ذوالیدین کہتا ہے؟ تو لوگوں نے کہا کہ ہاں! پس آپؐ آگے بڑھے اور جتنی نماز چھوڑ دی تھی وہ پڑھی پھر سلام کہا پھر تکبیر کہی اور اپنے عام سجدے کی مانند یا اُس سے لمبا سجدہ کیا پھر اپنا سر مبارک اٹھایا اور تکبیر کہی۔ پھر تکبیر کہی اور پہلے سجدے کی مانند یا اس سے لمبا سجدہ کیا پھر اپنا سر اٹھایا اور تکبیر کہی۔ پس لوگوں نے بار ہا حضرت ابن سیرینؒ سے پوچھا کہ کیا پھر سلام کہا؟ تو وہ کہا کرتے کہ مجھے بتایا گیا ہے کہ حضرت عمرانؓ بن حصین نے فرمایا کہ پھر حضورؐ نے سلام کہا۔ بخاری و مسلم۔ اور اس حدیث کے الفاظ بخاری کے ہیں۔ اور ان دونوں کی ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لم انس ولم تقصر کی بجائے یہ فرمایا تھا کہ کلّ" ذلک لم یکن" ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہوئی۔" تو ذوالیدینؓ نے کہا کہ یا رسول اللہؐ دو میں سے ایک بات ضرور ہوئی ہے!

شرح: اوپر کی حدیث میں زیادتی کا ذکر تھا اس حدیث میں کمی کا بیان ہے اور بظاہر یہ دونوں واقعات الگ الگ ہیں۔ عمرانؓ بن حصین کی روایت کے متعلق بعض شارحین کا قول ہے کہ اُس میں بیان کیا جانے والا واقعہ اِس سے بھی الگ تھا۔ اصل بات یہ

ؔ مرقات ج ۳ ص ۲۶، قسطلانی ج ۲ ص ۲۱۴۔ لیکن علامہ قسطلانیؒ نے جنگ بدر میں شہید ہونے والے کا نام ذوالشمالینؓ اور اس حدیث والے کا نام ذوالیدینؓ بتایا ہے اور دونوں کو الگ الگ قرار دیا ہے گو امام زہریؒ کی حدیث کا اضطراب تسلیم کر لیا ہے۔

ہے کہ ذوالیدین یا ذوالشمالین کی حدیث جو امام زہریؒ نے روایت کی ہے امام نوویؒ نے اس پر اضطراب کی وجہ سے ترک کر دیا۔ اضطراب کا مطلب یہ کہ کہیں کچھ بیان ہوا ہے کہیں کچھ۔ نماز کی تعیین اور دیگر واقعات میں بھی سخت اختلاف ہوا ہے پس حدیث گو روایتہً صحیح ہے لیکن اس اضطراب کی بنار پر ناقابلِ عمل ٹھہرائی گئی ہے۔

ذوالیدین[1] اور ذوالشمالین ایک ہی شخص کے دو عُرف ہیں یا الگ الگ اشخاص ہیں؟ اس میں بہت اختلاف ہوا ہے۔ محقق نیمویؒ نے نسائیؒ، بزارؒ اور طبرانیؒ کی روایات کی بناء پر کہا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی شخصیت کے نام ہیں[2]۔ ان کا اصلی نام خرباقؓ اسلمی الحجازی یا عمیرؓ تھا۔ پھر اس میں بھی اختلاف ہوا ہے کہ یہ واقعہ کیا پیش آیا؟ کیونکہ ذوالیدینؓ کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ غزوۂ بدر میں شہید ہو گئے تھے۔ اور حضرت ابوہریرہؓ راوی حدیث جنگِ خیبر کے زمانہ میں اسلام لاتے تھے جو جنگِ بدر سے پانچ سال بعد کا واقعہ ہے بعض شارحین کہتے ہیں کہ ذوالیدینؓ کافی دیر بعد تک زندہ رہے تھے۔ اگر ان کی شہادت جنگِ بدر میں مان لی جاتے تو معاملہ یُوں مشکل ہوگا کہ حضرت ابوہریرہؓ اس حدیث میں یہ کیسے فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے ہمیں نماز پڑھائی اور کوئی دلیل اس بات پر قائم نہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ خود اس واقعہ میں موجود نہ تھے اور کہ انہوں نے یہ حدیث دوسرے صحابہؓ سے سُنی تھی۔ گو مُرسل صحابہؓ بالاتفاق قابلِ قبول ہے لیکن اس حدیث میں کوئی قرینہ اس کے مرسل ہونے پر قائم نہیں ہے۔

پھر[3] اگر یہ واقعہ جنگِ خیبر کے بعد کا ہے تو سوال ہوگا کہ اس میں کلام کا ذکر ہے لیکن حضورؐ نے نہ خود نماز لوٹائی نہ کسی کو ایسا حکم دیا۔ اس کا جواب شارحین یہ دیتے ہیں کہ یہ حدیث اور اس میں ثابت ہونے والا کلام صحیح احادیث کی رُو سے منسوخات میں سے ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ حضورؐ کے خصائص میں سے ہے۔ امام طحاویؒ نے اس حدیث پر طویل کلام کیا ہے جس کے ضمن میں ثابت کیا ہے کہ کلام مدینہ میں منسوخ ہوا تھا لیکن اس واقعہ میں حضرت ابوہریرہؓ موجود نہ تھے کیونکہ ذوالیدینؓ جنگ بدر میں شہید ہوئے تھے اور ابوہریرہؓ کا اسلام اس کے دُور بعد کا ہے لیکن اُنہوں نے صحابہؓ کے محاورے کے مطابق صلّی بنا کا لفظ بولا ہے جس سے مراد یہ ہے کہ حضورؐ نے صحابہؓ کو نماز پڑھائی۔ پھر اس قسم کے محاورات صحابہؓ اور تابعینؒ سے بیان کر کے ثابت کیا ہے کہ ایسا محاورہ اس زمانے میں شائع تھا[4]۔ اس حدیث کی بناء پر حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ نماز میں

---

[1] مرقات ج ۳ ص ۲۶، ۲۷۔ [2] مؤطاؒ کی دو روایتوں کو ملا کر دیکھیں تو بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے، مؤطاؒ مع شرح ج ۱ ص ۱۱۹۔ [3] مظاہر حق ج ۱ ص ۳۵۵ [4] مرقات ج ۳ ص ۲۷، ۲۸

اگر سہواً کلام ہوجائے تو وہ مُفسدِ صلاۃ نہیں ہے اور قصداً ہو تو مُفسد ہے
لیکن افسوس کہ اس حدیث میں اس کی دلیل نہیں اس کے برعکس جسقدر کلام ثابت ہے سب قصداً ہوا سوال وجواب ہوئے اور اس کے علاوہ اور بھی کئی اعمالِ کثیرہ سرزد ہوتے۔ پس شافعی مسلک کی بنا پر بھی اس حدیث کو یا تو امام نوویؒ کی طرح مضطرب کہہ کر چھوڑنا پڑے گا یا قبل از تحریم کلام کا واقعہ ماننا ہوگا۔ امام احمدؒ کا مسلک ہے کہ کلام مطلقاً (قصداً ہو یا سہواً) مُفسدِ صلوٰۃ ہے لیکن اگر نمازی کی اصلاح کی غرض سے ہو تو مفسدِ صلاۃ نہیں اور یہی حدیث اُن کی دلیل بھی ہے۔ ظاہر حدیث سے امام احمدؒ کا مسلک شافعیؒ مسلک سے قوی تر نظر آتا ہے لیکن حنفیہ اسے منسوخ کہہ کر ذمہ داری سے بری ہوجاتے ہیں۔

اور[1] اس سے قبل گزر چکا ہے کہ حضورؐ کو سہو ونسیان اُن اخبار واحکام الٰہیہ میں لاحق نہیں ہوسکتا جن کی تبلیغ پر آپؐ مامور تھے دیگر اخبار یا افعال میں سہو ونسیان ممکن ہے جیسا کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ اس[2] حدیث میں سجدۂ سہو کے لئے الگ سلام اور اس کی ادائیگی کے بعد آخری سلام کا ذکر صراحۃً موجود ہے حنفیہ کا اس پر عمل ہے۔ گو اس حدیث میں سجدۂ سہو کے بعد تشہد وغیرہ پڑھ کر سلام کہنے کی صراحت نہیں ہے نہ نفیاً نہ اثباتاً۔ اور[3] حنفیہ کے پاس اس سلسلے میں اور دلائل موجود ہیں۔ ترمذی کی روایت جسے "حسن غریب" فرمایا گیا ہے اس میں سجدۂ سہو کے بعد تشہد کی صراحت موجود ہے اور اسے امام طحاویؒ نے بسند صحیح روایت کیا ہے۔

حدیث ۵: وعن عبد اللہ بن بُحینۃ انّ النبیّ صلیّ اللہ علیہ وسلم صلّی بھمُ الظھر فقام فی الرّکعتین الاولیین لم یَجْلِس فقام النّاسُ معہٗ حتّیٰ اذا قضی الصّلوٰۃ و انتظر النّاس تسلیمہٗ کبّر وَھُوَ جالِسٌ فَسَجَدَ سجد قبل ان یُسلّم ثمّ سَلَّمَ۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن بحینہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو ظہر کی نماز پڑھائی پس آپؐ پہلی دو رکعتوں

---

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۳۵۵۔ [2] مرقات ج ۳ ص ۲۷، ۲۸
[3] فیض الباری ج ۲ ص ۴۲۰؛ مرقات ج ۳ ص ۲۸۔

کے بعد نہیں بیٹھے بلکہ اُٹھ کھڑے ہوئے تو لوگ بھی آپ کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے حتیٰ کہ جب نماز ختم کرلی (پوری کرلی) اور لوگوں نے آپ کے سلام کا انتظار کیا تو آپ نے تکبیر کہی درانحالیکہ آپ بیٹھے ہوئے ہی تھے پس سلام سے پہلے دو سجدے کئے اور پھر سلام کہا۔ بخاری و مسلم۔

شرح: [1] اس حدیث سے امام شافعیؒ نے استدلال کیا ہے کہ سجدۂ سہو کے لئے الگ سلام نہیں نہ اس کے بعد تشہد و سلام ہے لیکن [2] دوسری روایات ہیں ہے کہ حضورؐ نے یہ سجدہ سلام کے بعد کیا تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بعد سلام کے سجدہ ثابت ہوا ہے اور ظاہر یہ ہے کہ یہ واقعہ ابتدار کا ہے۔ نیز قبل از سلام یا بعد از سلام کا سارا اختلاف محض افضلیت کا ہے۔

عبداللہ کے باپ کا نام مالک اور والدہ کا نام بحینہ ہے گویا یہاں ان کے والدین ہر دو کا نام لیا گیا ہے۔ حدیث سے پہلے قعدہ کا وجوب نکلتا ہے۔ اسی لئے اس کے رہ جانے پر سجدۂ سہو کیا گیا۔ نیز سلام سے قبل ہی صحابیؓ کہتا ہے فلما قضیٰ صلوٰتہ اس سے ثابت ہوا کہ سلام رکنِ صلوٰۃ نہیں ہے ورنہ قضیٰ کا لفظ نہ آتا۔ علّامہ قسطلانی نے حنفیہ کے اس استدلال کا ذکر کرکے سکوت فرمایا ہے گویا ان کے نزدیک بھی یہ دلیل لاجواب ہے۔ واللہ اعلم بالصّواب۔

باب سجود القرآن

[4] سجود القرآن جمہور علماء کے نزدیک سنّت ہیں اور حنفیہ کے ہاں واجب۔ اور اختلاف دراصل کچھ نہیں کیونکہ حنفیہ جسے واجب کہتے ہیں دیگر علمائے امّت اسے سنت کا نام دیتے ہیں صرف اتنی بات ہے کہ حنفیہ کے ہاں واجب کا مرتبہ عام سنت سے کچھ بلند تر ہے اور جمہور کے ہاں واجب کا کوئی درجہ نہیں ہے وہ اسے سنت ہی کہتے ہیں۔ اس فرق کو ملحوظ رکھا جائے تو بہت سے اختلافاتِ فقہیہ ختم

---

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۳۵۶۔ [2] مرقات ج ۳ ص ۲۹، فیض الباری ج ۲ ص ۴۳۹، صحاح ستہ عن عبداللہ بن مسعود نصب الرایہ ج ۲ ص ۱۶۸
[3] قسطلانی ج ۲ ص ۱۲۸۔ [4] فیض الباری ج ۲ ص ۳۸۷۔

ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح یہ بات بھی ملحوظ رکھنے کے قابل ہے کہ جمہور فرض کا دوسرا نام واجب رکھتے ہیں لیکن حنفیہ کے نزدیک واجب کا مقام فرض سے ذرا نیچے ہے پس عملی لحاظ سے جمہور کی سنت اور حنفیہ کی واجب میں تقریباً کوئی فرق نہیں ہے اور میں نے امام احمدؒ سے منقول دیکھا ہے کہ سجدۂ تلاوت نماز میں سنت مؤکدہ ہے لیکن نماز سے باہر غیر مؤکدہ ہے۔

حنفیہ کی دلیل قرآن پاک کا استقرار ہے کیونکہ قرآن میں یا تو اس کا حکم دیا گیا ہے جیسے وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۝ یا کافروں کا اس سے باز رہنا اور ہٹنا بیان کیا گیا ہے مثلاً وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ لَا يَسْجُدُونَ ۝ حافظ ابن القیمؒ فرماتے ہیں کہ جو لوگ خدا کا کلام سُن کر سجدے میں گر پڑتے ہیں ان کی اللہ تعالیٰ نے مدح فرمائی ہے اور جو لوگ سجدہ نہیں کرتے ان کی مذمت فرمائی ہے اس لئے جو لوگ سجدۂ تلاوت کو واجب قرار دیتے ہیں ان کی دلیل قوی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آیاتِ قرآنیہ کو سُن کر سجدہ کرنے والوں کی تعریف فرمائی ہے؛ وَإِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ آيَاتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوا سُجَّدًا وَبُكِيًّا ۝ یا قرآن نے سجود میں انبیاء کا فعل حکایت کیا ہے اور یہ سب وجوب کے دلائل ہیں کیونکہ امر اصلاً وجوب کے لئے ہے اور مذمت کا استحقاق بھی ہوتا ہے جو واجب کو ترک کرے اور ہمیں انبیاء کی اقتدار کا حکم دیا گیا ہے۔ اور مسلم کی حدیث إِذَا قَرَأَ ابْنُ آدَمَ آيَةَ السَّجْدَةِ فَسَجَدَ اعْتَزَلَ الشَّيْطَانُ يَبْكِي وَيَقُولُ أُمِرَ ابْنُ آدَمَ بِالسُّجُودِ فَسَجَدَ فَلَهُ الْجَنَّةُ وَأُمِرْتُ بِالسُّجُودِ فَلَمْ أَسْجُدْ فَلِيَ النَّارُ[1] بھی وجوب کی دلیل ہے گو یہ ابلیسؑ کا قول ہے لیکن سیاقِ تسلیم میں ہے نہ کہ سیاقِ تردید میں۔

شاہ ولی اللہ الدہلویؒ فرماتے ہیں کہ سجدۂ تلاوت وسجدۂ شکر کی شرطیں بھی وہی ہیں جو نماز کی ہیں کیونکہ سجدہ نماز کے ساتھ مناسبت تامہ رکھتا ہے اور بعض علماء نے اسے طریق ادا میں بھی نماز سے مشابہت دی ہے یعنی اس کے لئے بھی تکبیر تحریمہ اور قیام سے سجود کے لئے تکبیر انتقال اور سر اٹھانے کی تکبیر اور سلام کا حکم دیا ہے لیکن دوسرے علماء نے اسے فقط سجدہ صلوٰۃ سے تشبیہ دی ہے یعنی اس کے لئے تکبیر تحریمہ اور سلام نہیں ہے۔ اور سجدۂ تلاوت قاری اور سُننے والے دونوں پر ہے اور قاری کے سجدہ سے اور بھی مؤکد ہو جاتا ہے۔

---

[1] مصفّیٰ ج ا ص ۱۹۲۔

قرآن پاک میں حنفیہ کے ہاں ۱۴ سجدے ہیں: اعراف کے آخر میں، سورۂ رعد میں، نحل میں، بنی اسرائیل میں، مریم میں، اور الحج کا پہلا سجدہ، اور سورۂ الفرقان میں اور النمل میں، الٓمٓ تنزیل میں، صٓ میں، حٰمٓ السجدہ میں، النجم میں، الانشقاق میں اور العلق میں۔ امام شافعیؒ اور احمدؒ کے نزدیک بھی چودہ ہی سجدے ہیں لیکن وہ سورۂ صٓ کے قائل نہیں حالانکہ اس سورہ میں حضورؐ نے سجدہ کیا ہے (رواہ الدار قطنی ورواتہ، ثقاتٌ درایہ ص۱۲۸ النسائی ج ۱ ص۱۵۲)۔ اور ہر دو حضرات کے نزدیک سورۂ حج میں دو سجدے ہیں۔ اور جن حضرات نے صٓ کے سجدے کو سجدۂ شکر قرار دیا ہے اس سے اس کا سجدۂ تلاوت سے، خارج ہو جانا ثابت نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم بالصّواب

؎۲ علامہ علی القاریؒ فرماتے ہیں کہ سجدۂ تلاوت ایک ہی سجدہ ہوتا ہے جس میں نیّت شرط ہے اور یہ دو تکبیریں ہیں ایک نیچے جاتے ہوئے دوسری اوپر اٹھتے ہوئے اور اس کی شرطیں وہی نماز والی ہیں لیکن اس میں ہاتھ اٹھانا، قیام، تشہّد اور تسلیم نہیں ہے اور قاری اور سامع دونوں پر واجب ہے اگرچہ سامع نیّت سے اُسے نہ ہی سن رہا ہو۔ حنفیہ کے علاوہ دوسرے علماء کے نزدیک قاری اور نیّت سے سننے والے کے لئے سجدۂ تلاوت سُنّت ہے اور جو اچانک اور بلا قصد و نیّت سُن لے اس کے متعلق دو قول ہیں صحیح تر قول شافعیہ کے ہاں بھی یہی ہے کہ ایسے شخص کے لئے بھی مستحب ہے۔ امام نوویؒ نے فرمایا کہ عالم اور شاگرد (یعنی قرآن پڑھنے پڑھانے والے) پر جب وہ بار بار آیتِ سجدہ پڑھیں سنیں صرف پہلی مرتبہ میں سجدہ آئے گا اور بعض علماء کے نزدیک ان پر سجدہ نہیں ہے اور حنفیہ کے نزدیک اگر مجلس ایک ہو تو سجدوں میں تداخل ہو جائے گا چاہے پہلے یا بعد میں ایک سجدہ کر لیں۔ واللہ اعلم بالصّواب۔

الفصل الاوّل

حدیث ۱: عن ابن عباسؓ قال سجد النبی صلّی اللہ علیہ وسلّم بالنّجم وسجد معہ المسلمون والمشرکون والجنّ والانس۔ رواہ البخاری۔

؎۱ قدوری باب سجود التلاوۃ ؎۲ مرقات ج ۳ ص۳۱۱۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ سورۃ النجم کی آیتِ سجدہ کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ کیا اور آپ کے ساتھ مسلمانوں، مشرکوں، جنوں اور انسانوں نے بھی سجدہ کیا۔ بخاری۔

شرح: یہ ۵ھ مکہ کا واقعہ ہے۔ حضرت ابن عباسؓ اس کے بیان سے سجدۂ تلاوت کی اہمیت بیان کرنا چاہتے ہیں کہ مسلم تو رہے ایک طرف جس قدر حاضرین تھے مشرکوں سمیت سب نے سورۂ النجم کی آیتِ سجدہ پر سجدہ کیا تھا اور جنوں کا سجدہ عبداللہ بن عباسؓ کو حضورؐ کے بتانے سے معلوم ہوا ہوگا اور اس کی قوی دلیل یہ بھی ہے کہ ابن عباسؓ خود موقع پر موجود نہ تھے کیونکہ وہ اس وقت صغیر السن تھے۔

مشرکوں کے سجدے کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ اسلام لے آئے تھے بلکہ چونکہ سورۂ النجم میں اُن کے بتوں کا ذکر ہے (گو علی سبیل القدح والانکار سہی) لیکن انھوں نے جب حضورؐ کو اور اہلِ اسلام کو سجدہ کرتے دیکھا تو وہ بھی سجدہ میں گر گئے اور اُن کی نیت اپنے بتوں کی تعظیم تھی۔ اور ممکن ہے[۱] کسی شیطان قسم کے مشرک نے زمانۂ جاہلیت کا مشہور وظیفہ اللّات والعزّیٰ تلك الغرانیق العلیٰ وانّ شفاعتھن لترتجیٰ۔ الاپ دیا ہو اور مشرک اپنا یہ پرانا راگ سن کر جھک گئے ہوں۔

بخاریؒ نے ابن عباسؓ کی اس روایت سے پہلے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی اسی قسم کی ایک حدیث روایت کی ہے جس میں ایک بڈھے ـــــ اُمیّہ بن خلف یا اور کوئی ـــــ کے سوا سب مشرکوں کا سجدہ بھی مذکور ہے۔ علامہ قسطلانی فرماتے ہیں کہ دونوں روایتوں میں بیان ہونے والا قصّہ ایک ہی ہے۔ بعض شارحین کا یہ کہنا ہے کہ شیطان نے حضورؐ کی آواز میں آواز ملا کر تلك الغرانیق العُلیٰ الخ کہا تھا جس سے مشرک خوش ہوئے اور سجدے میں گر گئے محقق علماء کے نزدیک مردود ہے کیونکہ اس سے نبوّت اور احکامِ الٰہیہ سے امان اُٹھ جاتی ہے اور یہ بات تو بالکل ہی باطل ہے کہ معاذ اللہ شیطان نے حضورؐ سے یہ بات نکلوا دی تھی۔

اس[۳] سلسلے میں سب سے لطیف بات حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے فرمائی ہے کہ مشرکین کا سجدہ اپنے بتوں کے لئے یا ان کی تعریف کے زعم میں نہ تھا بلکہ دراصل وہ مدہوش و مبہوت ہوگئے تھے جیسا کہ حضرت الامام شاہ ولی اللہؒ کی تحقیق ہے

۱؎ فتح الباری ج ۴ ص ۵۷۱، قسطلانی ج ۲ ص ۳۲۱۔ ۲؎ فیض الباری ج ۲ ص ۳۸۸۔
۳؎ فیض الباری ج ۲ ص ۳۸۹ (حاشیہ)

اور وہ مشرک حضورؐ کے معجزے سے مغلوب ہو کر اسی طرح سجدہ میں گر گئے تھے جس طرح کہ فرعون کے جادوگر۔ قرآن کہتا ہے وَ اُلقِیَ السحرۃ سُجّدًا۔ پس ان کے لئے اس وقت سجدہ کرنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہ رہا تھا اور مسند بزار کی روایت کہ حضورؐ کی محفل میں سورۃ النجم لکھی گئی تو قلم و دوات نے بھی سجدہ کیا اور دار قطنی میں ہے کہ جنّ و انس اور درختوں نے بھی سجدہ کیا۔ اور یہی سبب ہے کہ جس سنگدل معاند کافر نے اس موقع پر بھی سجدہ نہ کیا حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ میں نے اس کے بعد اُسے حالتِ کفر پر مقتول دیکھا اور دوسرے لوگ ایمان لے آئے تھے۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ سُوَرِ مفصل میں سجدہ تلاوت ہے خلافاً لمالکؒ — واللہ اعلم بالصّواب۔

حدیث ۲: وعن ابی ھریرۃ قال سجدنا مع النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم فی اذا السّماءُ انشقّت و اقرأ باسم ربّک۔

رواہ مسلم۔

ترجمہ: حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سورۃ انشقاق اور سورۃ اقرأ میں سجدے کیے۔

شرح: یہ حدیث بھی امام مالکؒ کے خلاف دلیل ہے جو کہتے ہیں کہ سُوَرِ مفصّل میں سجدہ نہیں۔

حدیث ۳: وعن ابن عمر رضی اللہ عنہما قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقرأ السّجدۃ ونحن عندہٗ فیسجد ونسجد معہٗ فنزدحم حتی ما یجد اُحدُنا لجبھتہٖ موضعًا یسجد علیہ۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ کی آیت تلاوت فرمایا کرتے اور ہم آپؐ کے پاس ہوتے۔ پس آپؐ بھی سجدہ کرتے اور ہم بھی آپؐ کے ساتھ سجدہ کرتے تھے حتی کہ ہم میں سے کوئی اپنی پیشانی رکھنے کی جگہ نہ پاتا جہاں سجدہ کرتا۔ بخاری و مسلم۔

شرح: اُس حدیث سے سجدۂ تلاوت کا اہتمام اور سجدہ کرنے والوں کا اژدحام معلوم ہوتا ہے حتی کہ بعض کو جگہ تک نہ ملتی تھی۔ ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ یہ بات

ل مظاہر حق ج ۱ ص ۳۸۵، مرقات ج ۳ ص ۳۳۔

سجدۂ تلاوت کے وجوب پر دلالت کرتی ہے۔

حدیث ۴: وعن زید بن ثابت قال قرأت علی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم والنجم فلم یسجد فیھا متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سورۂ والنجم پڑھی تو آپؐ نے اس میں سجدہ نہ فرمایا۔ بخاری و مسلم۔

شرح: علامہ قسطلانیؒ[1] فرماتے ہیں کہ حضورؐ کا اس موقع پر سجدہ نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ سجدۂ سہو واجب نہیں ہے لیکن مسند بزار، دارقطنی اور ابن مردویہ کی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ حضورؐ نے سورۂ النجم میں سجدہ فرمایا تھا۔

لیکن[2] حافظ ابن حجرؒ عسقلانی فرماتے ہیں کہ حضورؐ کا اُس وقت سجدہ نہ کرنا اس بات کی دلیل نہیں کہ سجدہ بالکل ہی نہیں کیا کیونکہ ہوسکتا ہے اس وقت وضو نہ ہو یا وقت کراہت کا ہو۔

علامہ[3] سید انورؒ شاہ فرماتے ہیں کہ قاری ہونے کی حیثیت سے اس موقع پر حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو امام جیسی حیثیت حاصل تھی چونکہ انہوں نے کسی عذر سے سجدہ نہ کیا لہذا حضورؐ نے بھی نہیں کیا۔ امام ابنؒ الہمام نے فرمایا کہ مستحب یہی ہے کہ اگر کوئی شخص تلاوت کر رہا ہو اور دوسرے سن رہے ہوں تو قاری کو امام کی حیثیت یہی ہے کہ اگر کوئی شخص تلاوت کر رہا ہو اور دوسرے سن رہے ہوں تو قاری کو امام کی حیثیت حاصل ہو وہ سجدہ کرے اور دوسرے اس کے ساتھ سجدہ کریں۔ لیکن وہ آگے بڑھ کر امام نہ بنے کیونکہ حقیقت میں یہ جماعت نہیں ہے۔ اور بخاری[4] میں ہے کہ ایک لڑکے تمیم بن خدیم نے حضرت عبداللہ بنؓ مسعود کے سامنے آیتِ سجدہ پڑھی تو عبداللہؓ نے فرمایا اُسجد فانک امامنا فیھا۔ پس معلوم ہوا کہ اگر تلاوت کرنے والا سجدہ کرے تو سننے والوں کے حق میں بھی وجوب کی تاکید زیادہ ہو جاتی ہے۔ اور اگر وہ کسی وجہ سے تاخیر کرے تو سننے والے بھی متاخر کر سکتے ہیں۔

---

[1] قسطلانی ج ۲ صـ ۳۲۲۔

[2] فتح الباری ج ۴ صـ ۵۱۱۔ [3] فیض الباری ج ۲ صـ ۳۹۱۔

[4] بخاری باب من سجد لسجود القاری الخ صـ ۱۴۲

حدیث ۵ : وعن ابن عباسؓ قال سجدۃ صٓ لیس من عزائم السجود وقد رأیت النبیّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یسجد فیھا وفی روایۃٍ قال مجاھدٌ قلتُ لابنِ عباسؓ أأسجد فی صٓ فقرأ ومن ذریتہٖ داؤد وسلیمان حتی اتٰی فبھدٰا ھم اقتدہ فقال نبیکم ممّن اُمِرَ اَن یقتدی بھم

رواہ البخاری۔

ترجمہ : حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ صٓ کا سجدہ فرضی سجدوں میں نہیں ہے اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس میں سجدہ کرتے دیکھا ہے۔ اور مجاہدؒ تابعی نے فرمایا کہ میں نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا کہ کیا سورۃ صٓ میں سجدہ ہے ؟ تو انہوں نے یہ آیت پڑھی۔ ومن ذریتہٖ داؤد وسلیمان حتیٰ کہ وہ ان الفاظ تک آگئے فَبِھُدٰاھُمُ اقْتَدِہ۔ پس فرمایا کہ تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان میں سے ہیں جن کو ان حضرات کی پیروی کا حکم ملا تھا۔ اسے بخاری نے روایت کیا۔

شرح : لیسؔ من عزائم السجود کا مطلب یہ ہے کہ فرض تو نہیں لیکن میں نے حضورؐ کو سجدہ کرتے دیکھا ہے اس لئے واجباتِ تلاوت میں سے ہے۔ اور حضور نے سورۃ صٓ کا سجدہ داؤد علیہ السلام کی موافقت میں کیا تھا۔ داؤد علیہ السلام کا سجدہ قبولِ توبہ کے شکریے میں تھا اور حضورؐ نے بھی ارشاد فرمایا کہ ہم ادائے شکر میں یہاں سجدہ کرتے ہیں۔ لیکن سجدہ اگر ادائے شکر میں ہے تو بھی وجوب سے تو نہیں نکلتا۔ اور عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے آیت پڑھ کر ثابت کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو ان پیغمبروں کی اقتدار کرنے کا حکم دیا ہے۔ پس آپؐ نے اس حکم کی وجہ سے سجدہ کیا۔ اس لفظ سے بھی سجدۂ تلاوت کا وجوب ہی ثابت ہوا کیونکہ اُمِرَ کا لفظ ہے جو وجوب پہ دلالت کرتا ہے اور جب حضورؐ نے سجدہ کیا تو اُمت کو بھی کرنا چاہیئے۔ حدیث کی یہ تقریر تو حنفی مسلک پر ہے شافعی مسلک کے مطابق عزائم الامور سے مراد واجبات ہونگے اور معنیٰ یہ ہوگا کہ سجدۂ تلاوت سورۃ صٓ میں واجب نہیں بلکہ سُنت ہے وعلیٰ ھٰذا القیاس۔

ؔ مرقات ج ۳ ص ۳۴ ، مظاہر حق ج ا ص ۳۵۹

باب اوقات النّہی

اوقات مکروہ پر کچھ گفتگو اوقاتِ صلوٰۃ کے باب میں گزر چکی ہے بقیہ اب آرہی ہے۔ حنفیہ[1] کے نزدیک اوقاتِ مکروہہ پانچ ہیں: طلوع شمس، غروبِ شمس، استوارِ شمس، فجر کی نماز سے لے کر طلوعِ آفتاب تک اور عصر کی نماز کے بعد غروبِ آفتاب تک۔ پہلے تین اوقات میں نماز مطلقاً جائز نہیں نہ نمازِ جنازہ اور نہ سجدۂ تلاوت ہاں اس دن کی عصر بروئے حدیث مستثنیٰ ہے۔ آخری دو اوقات میں نفل ادا کرنا مکروہ ہے اور فوت شدہ نمازوں کے قضاء کرنے، سجدۂ تلاوت اور نمازِ جنازہ میں کوئی حرج نہیں۔ ان پانچ قسموں میں ہم نے جو فرق کیا ہے یہ معنیٰ کراہت کے واضح ہونے کی وجہ سے کیا ہے کیونکہ پہلے تین وقتوں میں کراہت اس وقت کے اندر معنیٰ کراہت کے پائے جانے کی وجہ سے ہے اور وہ ہے ان اوقات میں شیطان کی معاونت۔ پس ان میں فرائض وغیر فرائض کا کوئی فرق نہ رہا۔ اور دوسرے دو وقتوں میں فی نفسہما کوئی کراہت نہیں ہے کیونکہ اگر اُس وقت کا فرض ان میں پڑھا جائے یا بالفرض اسے کافی لمبا کردیا جائے تو جائز ہے حدیث میں حضورؐ کی ان اوقات میں طویل قرآتیں بھی روایت ہوئی ہیں۔ پس ان اوقات میں جو کراہت ہے وہ حق فرض کی وجہ سے ہے فی نفسہٖ وقت کی وجہ سے نہیں ہے کیونکہ اگر وقت کی وجہ سے ہوتی تو فجر اور عصر کی تاخیر آخری وقت تک جائز نہ ہوتی۔ اور ان اوقات کی وارد شدہ نہی ایسے طور پر آئی ہے کہ ہم نے اس سے پہچان لیا ہے کہ کراہت یہاں وقت میں نہیں کسی اور وجہ سے ہے اور وہ فرض کا حق ہے تاکہ یہ وقت فرض میں ہی مصروف ہوں بس دیگر فرائض و واجبات کے حق میں یہ نہی نہ ہوگی مثلاً سجدۂ تلاوت۔ پس حنفیہ نے ان اوقات کی کراہت دلائل کی وجہ سے مانی ہے اور ہر دلیل کو اس کا اپنا مقام دیا ہے۔ بعد از فجر اور بعد از عصر کے اوقات میں نہی کو حدیث میں فجر اور عصر پر معلق کیا گیا ہے پس یہ نہی معلق ہوئی اور فی نفسہٖ وقت میں کسی نقص کی وجہ سے نہیں مانی جائے گی۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عصر کے بعد دو رکعتیں ثابت ہوئی ہیں جنہیں حضورؐ نے قضاء پڑھا تھا۔ پس معلوم ہوا کہ ان دو وقتوں میں صلاحیت اور توسع موجود ہے لیکن

---

[1] فیض الباری ج ۲ ص ۱۳۷، مظاہر حق ج ۱ ص ۳۶۳

ان تین اوقات میں ایسا نہیں ہے۔

حنفیہ کے علاوہ دوسرے علمار امت نے ان اوقات میں فرق نہیں کیا اور سب کی نہی کو ایک ہی جیسا تسلیم کیا ہے۔ پس حسب معمول حنفیہ کی نگاہ اس مسئلہ میں بہت گہری ہے۔

امام مالکؒ نے استوار کا وقت مکروہ اوقات سے خارج کردیا ہے اور باقی چاروں اوقات میں فرائض کو جائز رکھا ہے نوافل کی اجازت نہیں دی۔ امام شافعیؒ کے نزدیک مکروہ اوقات تو ہماری مانند پانچ ہی ہیں لیکن انہوں نے فرائض، واجبات اور سبب والے نوافل کو ان میں جائز قرار دیا ہے۔ سبب والے نوافل سے مراد مثلاً تحیۃ المسجد و تحیۃ الوضور ہے جن کو شرع نے کچھ اسباب سے معلق کیا ہے۔ اور وہ نوافل جو خود بندے کی طرف سے بطور تطوع شروع کیے جائیں انہوں نے ان کی ان اوقات میں اجازت نہیں دی۔ امام شافعیؒ کے اس استثنار کی بنار پر بہت کم نوافل نہی میں داخل رہتے ہیں حالانکہ ان اوقات کی نہی میں احادیث صحیحہ تواتر تک پہنچ گئی ہیں (جیساکہ ابو عمروؒ نے فرمایا) پس ان احادیثِ نہی پر عمل در اصل احناف کا ہی ہے جنہوں نے نہی کو اپنے حال پر رکھا اور دلائل شرع سے اس کی علت نکال کر اس کے افراد و معلولات پر اسے نافذ کیا۔

الفصل الاوّل

حدیث ۱: عن ابن عمرؓ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لا یتحرّی احدکم فیصلّی عند طلوع الشمس ولا عند غروبھا وفی روایۃٍ قال اذا طلع حاجبُ الشمس فدعوا الصّلوٰۃ حتّٰی تبرُزَ واذا غاب حاجبُ الشمسِ فدعوا الصّلوٰۃ حتّٰی تغیبَ ولا تحیّنوا بصلوٰتِکُم طلوع الشمسِ ولا غروبھا فانّھا تطلع بین قرنی الشیطان. متفق علیہ

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم میں سے کوئی قصداً ایسا نہ کرے کہ سورج کے طلوع اور غروب کے وقت نماز پڑھنے لگے اور ایک روایت میں ہے کہ جب سورج کا کنارہ ظاہر ہوجائے تو نماز کو چھوڑ دو حتی کہ سورج خوب ظاہر ہوجائے اور جب سورج کا کنارہ غائب ہوجاتے تو نماز چھوڑ دو حتی کہ سورج

غائب ہو جائے اور اپنی نماز کے لئے طلوعِ آفتاب اور غروبِ آفتاب کے وقت کا قصد مت کرو کیونکہ سورج شیطان کے دو سینگوں کے درمیان طلوع ہوتا ہے۔ بخاری و مسلم۔

شرح: تطلع بین قرنی الشیطان کی مناسب شرح اوقات الصلوٰۃ میں گزر چکی ہے اس سے مراد یہ ہے کہ یہ[1] اوقات سورج پرستوں کی عبادت کے ہیں اور ان میں وہ یہ شیطانی کام سرانجام دیتے ہیں اس لئے ان اوقات سے منع فرما دیا گیا تاکہ مشرکوں سے مشابہت نہ ہو۔

حدیث کے الفاظ بالکل واضح ہیں ان میں کوئی استثناء نہیں ہے مطلقاً ان اوقات میں نماز سے منع فرمایا گیا ہے فرض ہو یا نفل اور اسباب پر مبنی ہو یا نہ ہو۔ لاتحینوا حین سے نکلا ہے بمعنیٰ وقت۔ یعنی ان اوقات کو نماز کا وقت مت بناؤ یہ لفظ بھی بالکل واضح ہے اور اس میں کوئی استثناء نہیں ہے۔ پس ان اوقات میں مطلقاً نماز حرام ہے فرض، نفل، قضا، وغیرہ کسی کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

علمائے[2] شافعیہ فرماتے ہیں کہ فرائض اور اسباب والے نوافل میں بندے کی تحریٰ قصد کا کوئی دخل نہیں ہے کیونکہ یہ نمازیں من جانب اللہ ہیں پس اس لفظ لایتحرّیٰ احدکم سے صرف وہ نمازیں حرام ہوں گی جن میں بندے کی تحرّی کا دخل ہے یعنی عام نوافل جو اسباب سے وابستہ نہیں ہوتے۔ لیکن شریعت ان اوقات کو شیطانی قرار دیتی ہے پس صرف لفظ تحرّی کی آڑ میں اکثر نمازوں کو نہی سے نکال لے جانا غیر معقول ہے درانحالیکہ تحرّی کا معنیٰ یہاں قصد ہے اور مطلب یہ ہے کہ جان بوجھ کر دیر مت کرو کہ یہ اوقات آجائیں اور تمہاری نماز ضائع ہو جائے۔

حدیث ۲: وعن عقبۃ بن عامر قال ثلاث ساعات[3] کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ینھانا ان نصلی فیھن او[4] نقبر فیھن موتانا حین تطلع الشمس بازغۃ حتی ترتفع و حین یقوم قائم الظھیرۃ حتی تمیل الشمس و حین تضیف الشمس للغروب حتی تغرب۔ رواہ مسلم۔

---

[1] مظاہر حق ج ۱ صـ۳۶۴، مرقات ج ۳ صـ۴۱۔

[2] وعند مسلم وحینئذ یسجد لھا الکفار۔ قسطلانی ج ۱ صـ۵۸۵۔

[3] فیض الباری ج ۲ صـ۱۳۹۔ [4] قال ابن المبارک معنی ان نقبر فیھن موتانا (بقیہ

اگلے صفحہ پر)

ترجمہ: حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تین اوقات ایسے ہیں جن میں ہمیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھنے یا اپنے مُردوں کو دفنانے (یعنی ان پر نماز جنازہ پڑھنے) سے منع فرمایا ہے پہلا وقت تو وہ ہے جب سورج طلوع ہوتا ہے حتیٰ کہ وہ بلند ہو جائے اور دوسرا وہ جبکہ دو پہر کا سایہ کھڑا ہو جاتا ہے یعنی عین نصف النہار حتی کہ سورج ڈھل جائے اور تیسرا وقت جبکہ سورج غروب کے لئے جھکتا ہے حتی کہ غروب ہو جائے۔ مسلم۔

شرح: [۱] یہ حدیث ان لوگوں پر حجت ہے جو ان تین اوقات میں فرائض اور اسباب والے نوافل کو جائز قرار دیتے ہیں اس حدیث میں تو لا یتحرّی یا لا تحرّوا کا لفظ بھی نہیں ہے بلکہ کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ینھانا کے واضح الفاظ ہیں جو مطلق حرمت کو چاہتے ہیں۔ اور قائم الظہیرہ سے مراد دوپہر کا سایہ ہے جو کچھ دیر کے لئے حرکت سے رک جاتا ہے اور پھر تھوڑی دیر کے بعد زوال شروع ہو جاتا ہے اور اس سے استوار کا وقت مراد لیا گیا ہے۔

حدیث ۳: وعن ابی سعیدؓ الخدری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا صلوٰۃ بعد الصبح حتی ترتفع الشمس ولا صلوٰۃ بعد العصر حتی تغیب الشمس۔ متفق علیہ

ترجمہ: حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ صبح کے بعد سورج کے طلوع ہونے تک کوئی نماز نہیں اور عصر کے بعد غروبِ آفتاب تک کوئی نماز نہیں۔ بخاری ومسلم۔

شرح: [۲] لا صلوٰۃ میں نفیٔ کمال مراد ہے کیونکہ ان دو وقتوں میں نمازِ نفل مکروہ تو ہے حرام نہیں اور حضورؐ سے ان اوقات میں احیاناً نماز ثابت ہے جیسا کہ آگے آرہا ہے اور [۳] یہ نہی اُس شخص کے لئے ہے جس نے ان اوقات کے فرائض ادا کر لئے ہوں۔ ورنہ حدیث کا معنی کچھ نہیں بن سکتا۔ [۴] اور ابو الفتح الیعمری سلف کی ایک جماعت سے حکایت کرتے ہیں کہ صبح کے بعد اور عصر کے بعد نماز سے نہی صرف اس لئے ہے کہ بتایا جائے کہ ان اوقات میں نفلی نماز نہ پڑھنی چاہیئے اور اس نہی سے وقت کی

(سابقہ حاشیہ) الصلوٰۃ علی الجنازۃ ذکرہ الطیبیؒ۔ مرقات ج ۳ ص ۴۱

[۱] مرقات ج ۳ ص ۴۲۔ [۲] مظاہر حق ج ۱ ص ۳۶۴۔ [۳] مرقات ج ۳ ص ۴۲۔

[۴] فتح الباری ج ۳ ص ۳۲۵۔

نہی مراد نہیں جیسا کہ طلوع و غروب کے اوقات کی نہی ہے اور ابو داودؒ اور نسائیؒ کی روائت اس کی تائید کرتی ہے۔

حدیث ۴ : وعن عمروؓ بن عبسہ قال قدم النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم المدینۃ فقدمت المدینۃ فدخلت علیہ فقلت اُخبرنی عن الصّلاۃ فقال صلّ صلوٰۃ الصّبح ثم اُقصر عن الصّلاۃ حین تطلع الشمس حتی ترتفع فانّھا تطلع حین تطلع بین قرنی الشیطان وحینئذٍ یسجد لھا الکفّار ثمّ صلّ فان الصلوٰۃ مشھودۃ محضورۃٌ حین یستقل الظلّ بالرمح ثم اقصر عن الصّلوٰۃ فانّ حینئذٍ تُسجر جھنّم فاذا اُقبل الفیٔ فصلّ فان الصّلاۃ مشھودۃٌ محضورۃٌ حتیّٰ تصلیّ العصر ثم اُقصر عن الصلوٰۃ حتی تغرب الشّمس فانّھا تغرب بین قرنی الشیطان وحینئذٍ یسجد لھا الکفّار قال قلت یا نبیّ اللہ فالوضوء حدثنی عنہ قال ما منکم رجل یقرب وضوءہ فیمضمض ویستنشق فیستنثر الاخرت خطایا وجھہٖ وفیہ وخیاشیمہٖ ثمّ اِذا غسل وجھہٗ کما اَمرہ اللہ الاخرت خطایا وجھہٖ من اَطراف لحیتہٖ مع الماء ثم یغسل یدیہ الی المرفقین الاّخرّت خطایا یدیہ من اَنامِلہٖ مع الماء ثمّ یمسح رأسہٗ الاخرت خطایا رأسہٖ من اَطراف شعرہٖ مع الماء ثم یغسل قدمیہ الی الکعبین الاخرّت خطایا رجلیہ من اَناملہٖ مع الماء فان ھو قام فصلیّ فحمد اللہ واَثنیٰ علیہ و مجدہٗ بالّذی ھو لہٗ اھل وفرغ قلبہ للہ اِلا انصرف من خطیئتہٖ کھیئتہٖ یوم ولدتہٗ اُمّہٗ۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ : حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم (ہجرت کرکے) مدینہ میں تشریف لائے تو میں مدینہ میں آیا اور آنجنابؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پس میں نے گزارش کی کہ مجھے نماز کے متعلق (یعنی اس کے اوقات کے بارے میں) ارشاد فرمایئے۔ سو حضورؐ نے

فرمایا کہ تو صبح کی نماز پڑھ پھر طلوع آفتاب کے وقت نماز سے باز رہ حتیٰ کہ سورج بلند ہو جائے کیونکہ جب وہ طلوع ہوتا ہے تو شیطان کے دو سینگوں کے درمیان طلوع ہوتا ہے اور اس وقت اُسے کفّار سجدہ کرتے ہیں۔ پھر جب سایہ نیزہ پر چڑھ جائے تو نماز پڑھ (یعنی اشراق اور چاشت کی نماز) پھر جب سایہ آجائے (زمین پر پھیل جائے) تو نماز پڑھ لے کیونکہ اس نماز میں فرشتے گواہ ہوتے ہیں اور حاضری دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ تو عصر کی نماز پڑھ لے پھر نماز سے باز رہ حتیٰ کہ سورج غروب ہو جائے کیونکہ وہ شیطان کے دو سینگوں کے درمیان غروب ہوتا ہے اور اُس وقت کفار سجدہ کرتے ہیں۔ صحابی کہتا ہے کہ میں نے عرض کیا اے اللہ کے نبیؐ! پس آپؐ مجھے وضو کے متعلق کچھ فرمایئے۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص جب پانی کو وضو کرنے کے لئے تیار کرتا ہے پھر کُلّی کرتا اور ناک میں پانی ڈالتا ہے پھر ناک صاف کرتا ہے تو اس کے چہرے اور مُنہ اور نتھنوں کے گناہ جھڑ جاتے ہیں پھر جب وہ اپنا چہرہ دھوتا ہے جیسا کہ اُسے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے تو پانی کے ساتھ اس کے چہرے کے گناہ ڈاڑھی کے اطراف سے گر جاتے ہیں۔ پھر وہ کہنیوں سمیت اپنے ہاتھ دھوتا ہے تو اُس کے ہاتھوں کے گناہ پانی کے ساتھ انگلیوں کی پوروں سے گر جاتے ہیں۔ پھر وہ اپنے سر کا مسح کرتا ہے تو اس کے سر کے گناہ پانی کے ساتھ بالوں کے اطراف سے جھڑ جاتے ہیں۔ پھر وہ اپنے پاؤں گٹوں سمیت دھوتا ہے تو پانی کے ساتھ اُس کے پیروں کے گناہ انگلیوں سے نیچے گر جاتے ہیں۔ پھر اگر وہ کھڑا ہو جاتے اور نماز پڑھے پس اللہ تعالیٰ کی حمد وثنار اور اس کی بزرگی وعظمت بیان کرے ایسے طریقے اور الفاظ سے جس کا اللہ تعالیٰ اہل ہے اور اپنے دل کو اللہ تعالیٰ کے لئے فارغ، مخلص اور حاضر کرلے (اور ماسوار سے غائب کرلے) تو وہ اپنے گناہوں سے اس طرح پاک وصاف ہو کر واپس ہوگا جس طرح کہ وہ اس دن تھا جب اُس کی ماں نے اُسے جنا تھا۔ مسلم

شرح: اس سے پہلے کتاب الصلوٰۃ کی ابتدار میں یہ بحث صحیح احادیث سے ثابت کی جاچکی ہے کہ وضو اور نماز سے صغیرہ گناہوں کی بخشش اور کفارہ ہو جاتا ہے۔ اور کبیرہ گناہ توبہ یا مشیئت ایزدی پر موقوف ہیں۔ اُس حدیث کے آخری الفاظ سے

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

معلوم ہوتا ہے کہ صغائر و کبائر ہر دو قسم کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر الفاظ حدیث کو غور سے دیکھا جائے اور جس اخلاص، اقبال علی اللہ اور غیر اللہ سے دل کو فارغ کر لینے کی شرطیں حضورؐ نے بیان فرمائی ہیں ان سے یہی پتہ چلتا ہے کہ یہ شخص صحیح معنیٰ میں تائب ہو جاتا ہے پس اس میں کوئی اشکال نہ رہا کہ صغیرہ کے علاوہ اس کے کبیرہ گناہ بھی معاف ہو جاتے ہیں۔ اور اگر توبہ موجود نہ ہو یعنی اخلاص صحیح درجے کا نہ ہو تو صغائر کی معافی تو ثابت شدہ ہی ہے جس میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ حافظ ابن حجرؒ نے صغائر کی معافی مراد لی ہے جو بالاجماع ثابت ہے علامہ علی القاریؒ کی تقریر کے مطابق حدیث کا ظاہر صغائر و کبائر دونوں کی معافی ثابت کرتا ہے۔ پس اس کی توجیہہ وہی ہوگی جو ابھی بیان ہوئی ہے۔

فَاِنَّ الصَّلٰوۃَ مَشْهُوْدَةٌ مَحْضُوْرَةٌ یعنی نماز میں اعمال کے کاتب فرشتے حاضر ہوتے ہیں اور وہ نمازی کے گواہ بن جاتے ہیں ان کے علاوہ سیاح فرشتے بھی موجود ہوتے اور شاہد و حاضر ہوتے ہیں۔[۱]

یستقل الظل بالرمح ای الیٰ حین یستقل الخ یعنی جب تک سایہ زائل نہ ہو جائے اور استواءِ شمس کا وقت نہ ہو جائے نماز کی اجازت ہے۔ یہ محاوراتی کلام ہے اس سے مراد یہ ہے کہ نیزے کا سایہ تقریباً معدوم و ناپید ہو جائے گویا اس کا سایہ نیزہ پر چڑھ گیا یا اس میں سما گیا۔ اہل عرب وقت کا اندازہ کرنے کے لئے نیزہ زمین میں گاڑ دیتے تھے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں اس کلام کا مطلب یہ ہے کہ نیزے کا سایہ بالکل جانبِ شمال ہو جائے مشرق یا مغرب کی طرف مائل نہ ہو اور یہی استوار کا وقت ہے جس میں نماز ممنوع ہے۔ حافظ فضل اللہ التورپشتیؒ فرماتے ہیں کہ مصابیح کے نسخوں میں یستقل الظل بالرمح کے الفاظ ہیں لیکن ان میں تحریف ہوئی ہے۔ اصل میں ہے یستقل الرمح بالظلّ اور استقلال کا لفظ قلت سے نکلا ہے معنی یہ ہوا کہ جب نیزے کا سایہ کم سے کم رہ جائے اور یہی وہ سایہ ہے جسے فقہاء سایۂ اصلی کہتے ہیں اور یہ ظہر و عصر کی ایک مثل یا دو مثل میں شمار نہیں ہوتا کیونکہ اتنا سایہ تو بہر حال ناگزیر ہے اس لئے حساب کرتے وقت اسے چھوڑ کر شمار کیا جائے گا۔

(گذشتہ صفحے کا حاشیہ) [۵] مظاہر حق ج ۱ ص ۳۶۵، مرقات ج ۳ ص ۴۵۔

(حاشیہ صفحہ ہذا)۔ [۱] مرقات ج ۳ ص ۴۳، مظاہر حق ج ۱ ص ۳۶۵

حافظ ابنِ حجرؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں امام مالکؒ کے خلاف صریح دلیل موجود ہے جنہوں نے استوارِ شمس کو اوقاتِ ممنوعہ سے اس دلیل سے خارج کر دیا ہے کہ لوگ ہمیشہ جمعہ کے دن اس وقت میں نماز پڑھتے آئے ہیں۔ حافظ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ لوگوں کی نماز کے عین استوارِ شمس کے وقت جمعہ کے دن واقع ہونے میں تحقیق و تدقیق کی ضرورت ہے پس اس سے استدلال نہیں ہو سکتا۔ حافظ صاحبؒ یہ بھی فرماتے ہیں کہ جمعہ کا دن (شافعیہ کے نزدیک) اس نہی سے مستثنیٰ ہے لیکن یہ استثناء مطلق نہیں ہے جمعہ کے علاوہ نہی باقی ہے۔ لیکن حنفیہ ان تکلفات میں نہیں پڑے انہوں نے نہی کو مطلق لیا جیساکہ گزشتہ حدیث سے ثابت ہوتا ہے اور کئی دیگر صحیح احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں۔ پس جمعہ یا غیر جمعہ کوئی بھی اس نہی سے باہر نہیں ہے۔

تسجر جہنم یا تو کنایہ ہے شدید گرمی پڑنے سے اور یا مطلب یہ ہے کہ آفتاب کے پجاریوں کی یہ عبادت کا وقت ہے اِدھر یہ شرک میں مصروف ہوتے ہیں اور اُدھر ان کی سزا کے لئے جہنم کو دھکایا اور تیار کیا جا رہا ہوتا ہے۔

اس حدیث میں پانچ اوقاتِ مکروہہ کا ذکر موجود ہے لیکن جو الفاظ طلوع و غروب اور استوار کے لئے بولے گئے ہیں وہ بعد الفجر اور بعد العصر کے لئے نہیں آئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان پانچ اوقات میں سے یہ تین زیادہ شدید ہیں اسی لئے حنفیہ نے ان میں کسی قسم کی نماز تجویز نہیں کی نہ فرض نہ نفل اور باقی دو اوقات کی نہی کے لئے وہ لہجہ اور عنوان اختیار نہیں فرمایا گیا اس لئے معلوم ہوا کہ ان کی نہی اتنی شدید نہیں۔ اسی لئے حنفیہ نے ان اوقات میں فقط نوافل کی کراہت سمجھی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۵: وعن کریبؒ ان ابن عباس والمسورؓ بن مخرمۃ وعبد الرحمٰنؓ بن الازھر ارسلوہ الی عائشۃؓ فقالوا اقرأ علیھا السلام وسلھا عن الرکعتین بعد العصر قال فدخلت علی عائشۃؓ فبلغتھا ما ارسلونی فقالت سل امّ سلمۃؓ فردونی الی امّ سلمۃ فقالت امّ سلمۃ سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم ینھی عنھما ثم رأیتہ یصلیھا ثم دخل فارسلت الیہ الجاریۃ فقلت قولی لہ تقول امّ

لہ علامہ شوکانیؒ نے دلائل سے اس باب میں حنفیہ کی تائید کی ہے۔ نیل الاوطار ج ۲ ص ۳۳۶

سلمۃ رضؓ یارسول اللہ سمعتک تنھی عن ھاتین الرکعتین واراک تصلیھما قال یا ابنۃ ابی امیۃ سالت عن الرکعتین بعد العصر وانہ اتی ناس من عبد القیس فشغلونی عن الرکعتین اللتین بعد الظھر فھما ھاتان۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس کے آزاد کردہ غلام کریبؒ سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ، المسور بن مخرمہ اور عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے مجھے حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت اقدس میں بھیجا اور کہا کہ ان کی خدمت میں ہمارا سلام عرض کیجو اور عصر کے بعد والی دو رکعتوں کے بارے میں ان سے سوال کیجو۔ کریبؒ کہتے ہیں کہ میں حضرت ام المؤمنین عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان حضرات نے جو پیغام دیا تھا انہیں پہنچایا۔ تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ اُمِّ سلمہ سے پوچھو۔ پس (میں نے یہ پیغام ان حضرات کو دیا تو) انہوں نے مجھے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں بھیجا تو اُمِّ سلمہ نے فرمایا کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان رکعتوں سے (عام نہی کے ضمن میں یا خاص نہی کے ذریعے) ان سے منع کرتے سنا تھا پھر آپؐ کو یہ رکعتیں پڑھتے دیکھا۔ آپؐ اس کے بعد مسجد سے گھر میں یا گھر سے مسجد میں داخل ہوگئے تو میں نے لونڈی کو آپؐ کی خدمت میں روانہ کیا اور اُسے کہا کہ حضورؐ سے عرض کرنا اُمِّ سلمہؓ کہتی ہے کہ اے رسول خدا میں نے آپؐ کو ان دو رکعتوں سے منع فرماتے سنا تھا۔ پھر میں دیکھتی ہوں کہ آپؐ انھیں پڑھ رہے تھے! (اس کی وجہ ارشاد ہو!) حضورؐ نے فرمایا اے ابو اُمیّہ کی بیٹی! تو نے عصر کے بعد دو رکعتوں کے بارے میں دریافت کیا ہے۔ بات یہ ہوئی کہ بنی عبدالقیس کے قبیلے کے کچھ لوگ میرے پاس آئے تھے اور انہوں نے مجھے ظہر کے بعد والی دو رکعتوں سے مشغول رکھا (یعنی ان کی مصروفیت کی وجہ سے یہ دو رکعتیں بروقت نہ پڑھ سکا) پس وہ دو رکعتیں یہ ہیں (جو میں نے عصر کے بعد پڑھی ہیں!) بخاری و مسلم۔

شرح: حدیث[1] کے ظاہر سے پتہ چلتا ہے کہ ظہر کی دو سنتوں کی بعد از نماز عصر قضاء جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت تھی کیونکہ دوسروں کے لئے

---

[1] مرقات ج ۳ ص ۴۶

تو عام نہی اس باب میں موجود ہے۔ امام طحاویؒ نے اپنی سند سے اس حدیث کی روایت میں اتنا لفظ زائد ذکر کیا ہے: فقلتُ یا رسُولَ اللّٰہ افنقضیھما اذا فاتتا قال لا۔ اور حضرت عائشہ کی احادیث میں آیا ہے کہ حضورؐ ان دو رکعتوں کو پھر پڑھتے ہی رہے یہ بھی خصوصیت کی دلیل ہے۔ اس لیے حافظ ابن حجرؒ نے اس حدیث کا معنٰی یہ بیان کیا ہے: وقد علمت ان من خصائصی انی اذا علمت عملاً داومت علیہ فمن ثم فعلتھا و نہیتُ غیری عنھما۔ یہ تو تھی بحث ظہر کی سُنتوں کی قضاء کی۔ لیکن حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ قضاء نماز کی اس وقت میں گنجائش موجود ہے (گو سنتوں کی قضاء خصائصِ نبوت میں سے ہے!) جب حضورؐ نے اُس وقت میں سُنت کی قضاء کی تو بالفرض اگر وہ سنت نہ ہوتی فرض نماز ہوتی تو اس کے اس وقت میں پڑھنے کی ضرور گنجائش تھی۔ یہی وجہ ہے کہ حنفیہ نے اس وقت میں، اور اسی طرح بعد از نمازِ فجر تا طلوعِ آفتاب صرف نوافل کو مکروہ جانا ہے اور نمازیں، مثلاً فوت شدہ کی قضاء، نمازِ جنازہ، سجدۂ تلاوت وغیرہ، ان وقتوں میں جائز رہیں گی۔ اس ضمن میں کچھ بحث اس سے قبل بھی ہو چکی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

؎ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تعلیمِ دین اور تبلیغ احکام شرع اور خلقِ خدا کی ہدایت نفل نمازوں پر مقدم ہے۔ اگرچہ وہ سننِ رواتب ہی کیوں نہ ہوں۔ اس حدیث سے شافعیہ نے استدلال کیا ہے کہ سنت بھی قضاء ہے۔ حنفیہ کا مسلک اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ نیز حنفیہ کے نزدیک سنن و نوافل اگر شروع کر دیئے جائیں تو واجب ہو جاتے ہیں پس احتمال اس امر کا موجود ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سنتوں کی نیت کی ہو لیکن تعلیم و ارشاد کی اہمیت کے پیشِ نظر انہیں توڑ دیا ہو لیکن اصل بات وہی ہے جو اوپر گزری کہ یہ آنحضورؐ کے خصائص میں سے ہے۔ حافظ ابنِ حجرؒ کا قول بھی اوپر گزر چکا ہے۔ خصائص کی مثال ایک صومِ وصال بھی ہے صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ آپؐ مسلسل کئی کئی دن بغیر کچھ کھائے پیئے روزہ رکھتے تھے لیکن لوگوں کو سختی سے منع فرماتے تھے۔

ابو اُمیہ حضرت امِ سلمہؓ کے والد کا نام یا کنیت تھی اور عبدالرحمٰنؓ بن الازھر سے مراد مشہور صحابی حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف ہیں۔ واللہ اعلم۔

؎ مظاہر حق ج ۱ ص ۳۶۶

بابُ الجماعۃ و فضلھا

اسلام ایک جامع طریق زندگی ہے جس نے اپنے ہر شعبے میں جماعت پسندی اور اجتماعیت کو بہت اہم مقام دیا ہے۔ سیاست ہو یا معاشرت، عبادات ہوں یا معاملات ہر جگہ جماعتی زندگی کی اہمیت واضح کی ہے۔ عبادات میں نماز کو جو اعلیٰ مقام حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ دراصل نماز اسلامی نظامِ حیات کا ایک جامع نمونہ ہے جسے چھوٹے پیمانے پر ہر وقت مسلمانوں کو اپنی علمی و عملی زندگی میں پیشِ نظر رکھنا ہوتا ہے اور زندگی کے باقی تمام حصّوں کو اس کے مطابق ڈھالنا ہوتا ہے لہٰذا نماز میں جماعت کو بہت بلند مقام حاصل ہے۔ حکم دیا گیا ہے کہ دو آدمی بھی موجود ہوں تو وہ بھی نماز کو جماعتی حیثیت سے ادا کریں۔ اسی جماعتی زندگی اور مرکزیت کو زندہ و پائندہ رکھنے کے لئے مساجد کی تعمیر و تطہیر اور دیکھ بھال کے احکام دیئے گئے ہیں۔ جماعت کو اتنی اہمیت حاصل ہے کہ بعض ائمہ اسلام کے نزدیک وہ فرض ہے فقہی نقطۂ نظر سے اس پر گفتگو کی جائے گی لیکن اس سے اتنا تو پتہ چل گیا کہ جماعت کی اہمیت اور اس کا مقام کتنا بلند ہے۔

[1] امام احمدؒ، داؤد ظاہریؒ، عطاءؒ اور ابو ثورؒ کے نزدیک جماعت فرضِ عین ہے اور عذر کی حالت اس سے مستثنیٰ ہے۔ ان حضرات کے نزدیک اذان سن کر جو شخص مسجد میں جماعت کے ساتھ شامل نہ ہوا اس کی نماز درست نہیں۔ امام شافعیؒ کے نزدیک جماعت فرضِ کفایہ ہے۔ اور امام ابو حنیفہؒ اور ان کے اصحاب کے نزدیک سنتِ مؤکدہ ہے جو عملاً واجب ہوتی ہے۔ امام ابن الہمامؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے اکثر مشائخ حنفیہ جماعت کے وجوب کے قائل ہیں اور اسے سنّت کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا وجوب سنّت سے ثابت ہوا ہے جیسے کہ نمازِ عید۔ بدائع الصنائعؒ میں ہے کہ ہر عاقل و بالغ آزاد مرد پر مسجد میں جماعت کے لئے حاضر ہونا واجب ہے لیکن اگر اسے ایک مسجد میں جماعت نہ مل سکے تو دوسری مسجد میں جانا واجب نہیں گو مستحب ہے۔ امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ اس صورت میں اپنے اہل و عیال کو جمع کر کے گھر میں جماعت کرالے۔ اور محلہ کی مسجد اور جامع مسجد میں سے کس میں نماز باجماعت افضل ہے؟ اس امر میں علمائے حنفیہ کا اختلاف ہے۔ بعض محلہ کی

---

[1] مظاہر حق ج ا ص ۳۶۹۔

مسجد کو اور بعض جامع کو افضل بتاتے ہیں۔ اگر ایک محلہ میں دو مسجدیں ہوں تو قدیم مسجد افضل ہے۔ اگر دونوں اس امر میں برابر ہوں تو قریب تر افضل ہے۔ اور جماعت بالاتفاق[1] عذر سے ساقط ہو جاتی ہے، عذر سے مراد بیماری ہے اور اتنی کمزوری کہ مسجد تک نہ جا سکے اور اندھاپن، لولھاپن یا مقطوع الاعضاء ہونا، بارش، کیچڑ، شدید سردی اور سخت اندھیرا بھی اعذار ہیں گو ان میں سے بعض میں اختلاف ہوا ہے۔

علامہ[2] سید انور شاہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جماعت کے متعلق ہمارے ائمہ کے دو قول ہیں: ایک یہ کہ وہ سنتِ مؤکدہ ہے اور دوسرا یہ کہ وہ واجب ہے۔ صاحب البحر نے کہا ہے کہ وجوب کا ادنیٰ درجہ اور سنتِ مؤکدہ کا اعلیٰ درجہ ایک ہی ہے پس اختلاف نہ رہا۔ اور بعض شافعیہ نے بھی جماعت کو سنت مؤکدہ کہا ہے اور امام احمدؒ کا مشہور مذہب بھی یہی ہے کہ جماعت واجب ہے اور دراصل وجوب و سنیت کا اختلاف دلائل پر نظر کرنے کے طریقے سے پیدا ہوا ہے۔ جن لوگوں نے فقط تاکیدِ جماعت کے احکام کو دیکھا اور اس کے ترک کی وعیدیں دیکھیں انہوں نے اس کے وجوب بلکہ فرضیت کا حکم دے دیا اور جنہوں نے اعذارِ شرعیہ کی بنا پر جماعت کے حکم میں تخفیف دیکھی انہوں نے اس کی سنیت کا حکم دیا۔ یہی حال نمازِ وتر کے وجوب و سنیت کے متعلق بھی ہے۔ اور اگر اس چیز پر نظر رکھی جائے تو بہت سے اختلافات ہلکے بلکہ معدوم ہو جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں متقدمین حنفیہ مثلاً طحاویؒ اور امام محمدؒ کے ہاں واجب و سنت میں کچھ فرق نہ تھا ہاں سنت کے مراتب اور درجے ضرور تھے مثلاً مؤکدہ اور غیر مؤکدہ۔ اور شاید یہی مؤکدہ متاخرین کے ہاں واجب کہلاتی ہے جیسا کہ اوپر ہم نے البحر سے نقل کیا ہے۔ غرض اس باب میں اختلاف محض اجتہادی ہے یعنی مراتب کو قائم کرنے کا اختلاف۔ نصوص میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اگرچہ فقہاء کی بحثیں دیکھ کر شبہ ہوتا ہے کہ یہاں نصوص کا اختلاف ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت[3] امام ولی اللہ الدہلوی نے حسب عادت فقہاء کے مختلف مذاہب کو ملانے اور اختلاف کو ختم کرنے کے لئے ایک عجیب انداز استعمال فرمایا ہے۔

---

[1] مصفّٰی ج ۱ ص ۱۲۹ [2] فیض الباری ج ۲ ص ۱۹۱

[3] مصفّٰی ج ۱ ص ۱۲۸

وہ فرماتے ہیں اقویٰ قول یہی ہے کہ جماعت فرض کفایہ ہے اس طریقے سے کہ شعارِ اسلام ظاہر ہو جائے مثلاً چھوٹی بستی میں ایک جگہ اور بڑی میں چند جگہ اسے قائم کیا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اقیموا الصلوٰۃ اور اقامت کا معنی اس کا اظہار و ترویج ہے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اظہار و ترویج کو اقامتِ جماعت کے ساتھ ضبط فرمایا ہے۔ اور ابوداؤد کی حدیث میں آیا ہے کہ تین آدمی شہر یا جنگل میں ہوں اور جماعت قائم نہ کریں تو شیطان ان پر غالب آجاتا ہے۔ اور افراد کے حق میں جماعت سنتِ مؤکدہ ہے جس کا بلا عذر ترک کرنا ملامت کا حقدار بنا دیتا ہے اور مسجدوں میں حاضر ہونا بھی سُنّت مؤکدہ ہے۔ پس اگر گھروں میں نماز باجماعت ادا کریں ایسے انداز میں کہ وہ مشہور ہو جائے اس سے فرض کفایہ تو ادا ہو جائے گا لیکن استحقاقِ ملامت مسجدوں کی عدم تعمیر اور غیر آبادی پر باقی رہے گا۔ شاہ صاحبؒ کی اس توجیہ سے حنفیہ اور شافعیہ کا اختلاف اٹھ جاتا ہے۔ نیز فقہاءِ حنفیہ کا باہمی اختلاف کہ جماعت واجب ہے یا سنت اس کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ واللہ اعلم۔

علامہ قسطلانیؒ نے قطب الدینؒ سے نقل کیا ہے کہ جماعت کی مشروعیت کی حکمت (جو مقاصدِ نماز میں داخل ہے) نمازیوں کے درمیان الفت کا نظام قائم کرنا ہے اور اسی لئے محلوں میں مسجدیں بنانا شروع کیا گیا ہے تاکہ ہمسایوں کے درمیان اوقاتِ نماز میں ملنے جلنے سے اتحاد و یگانگت پیدا ہو اور یہ مقصد بھی ہے کہ نہ جاننے والے جاننے والوں سے احکامِ دین سیکھ سکیں۔ نیز عبادت میں لوگوں کے مراتب کم و بیش ہیں پس جماعت سے کامل کی برکت ناقص پر چھا جاتی ہے اور سب کی نماز کامل ہو جاتی ہے۔

الفصل الاوّل

حدیث ۱: عن ابن عمرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلوٰۃ الجماعۃ تفضل صلوٰۃ الفذ بسبعٍ وعشرین درجۃً۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ جناب رسولِ خدا

لہ ارشاد الساری ج ۲ ص ۲۷

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جماعت کی نماز اکیلے آدمی کی نماز پر ستائیس درجے فضیلت رکھتی ہے۔ بخاری و مسلم۔

شرح: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ اگر جماعت فرضِ عین ہوتی — جیسا کہ ظاہریہؒ کا مسلک ہے تو اکیلے آدمی کی نماز کالعدم ہوتی اس کا وجود تسلیم کر کے جماعت کی نماز کو اس پر فضیلت دینے کا مطلب یہی ہے کہ جماعت واجب یا سنّت مؤکدہ تو ہے لیکن فرض نہیں۔ اور حدیث میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اگر کوئی شخص عذر کی بنار پر جماعت میں شامل نہ ہوا ہو تو اسے جماعت کا ثواب حاصل ہو جائے گا یہ اشارہ "الفذ" کے لفظ سے نکلتا ہے۔

بہت[1] سی احادیث میں ۲۵ درجے کی فضیلت فرمائی گئی ہے اور اس حدیث میں ۲۷ کا ذکر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے ۲۵ کا ثواب مقرر ہوا ہو گا پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اضافہ کر کے ۲۷ کر دیا۔ رہی ان اعداد کی خصوصیت تو یہ علومِ نبوّت میں سے ہے کسی پیمانے یا معیار سے اسے جانچا نہیں جا سکتا۔ امام نوویؒ نے دونوں قسم کی احادیث کو یوں جمع فرمایا ہے کہ قلیل سے کثیر کی نفی نہیں ہوتی (گویا یہ لفظ بطور ترغیب و مبالغہ فرمایا گیا ہے)۔ یا یہ فرق نمازی کے احوال کے اختلاف اور نماز کی جگہ کے اختلاف سے ہوتا ہے پس بعضوں کو ۲۵ کا ثواب ملتا ہے اور دوسرے بعض کو ۲۷ درجے کا۔ اور یہ فرق نماز کے کمال و صفت، خشوع و خضوع کے درجات اور مسجد و غیر مسجد کی جماعت میں ہوتا ہے۔ علامہ[2] علی القاریؒ فرماتے ہیں کہ پہلا قول جو حافظ تورپشتیؒ کا ہے وہی بہتر ہے۔

علامہ[3] حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے مسجد کے قرب و بعد کا فرق بھی بیان کیا ہے نیز بعض نمازوں میں مثلاً فجر، عشاء اور عصر میں ۲۷ اور باقی میں ۲۵ درجہ کی فضیلت بتائی ہے۔ پھر فرماتے ہیں میرے نزدیک سب سے بہتر قول یہ ہے کہ ۲۷ درجے جہری نمازوں کے لئے اور ۲۵ درجے سرّی نمازوں کے لئے ہیں۔ پھر طیبیؒ سے حافظ تورپشتیؒ حنفی کا قول نقل کیا ہے کہ جماعت کی فضیلت کا باعث مسلمانوں کا اجتماع اور فرشتوں کی مانند ان کی صف بندی، امام کی اقتدا اور

---

[1] مرقات ج ۳ ص ۵۱

[2] مظاہر حق ج ۱ ص ۳۶۹، ایضاً مرقات، قسطلانی ج ۲ ص ۳۰

[3] فتح الباری ج ۲ ص ۳۶، قسطلانی ج ۲ ص ۳۰

شعائر اسلام کا اظہار ہے۔

حدیث ۲: وعن ابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم والذی نفسی بیده لقد هممت ان آمر بحطب فیحطب ثم آمر بالصلوٰة فیؤذن لها ثم آمر رجلاً فیؤم الناس ثم اخالف الی رجال وفی روایة لا یشهدون الصلوٰة فاحرق علیهم بیوتهم والذی نفسی بیده لو یعلم احدهم انه یجد عرقاً سمیناً او مرماتین حسنتین لشهد العشاء رواه البخاری ولمسلم نحوه۔

ترجمہ: حضرت ابوھریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اُس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے میں نے قصد کیا کہ ایندھن جمع کرنے کا حکم دوں پس وہ جمع کیا جائے پھر میں نماز کا حکم دوں تو اس کی اذان دی جائے پھر ایک آدمی کو حکم دوں تو وہ لوگوں کو نماز پڑھائے پھر میں ان لوگوں کی طرف جاؤں (اور ایک روایت میں یہ لفظ ہیں کہ) جو نماز میں حاضر نہیں ہوتے پس میں اُن سمیت ان کے گھروں کو جلا ڈالوں۔ اس خدا کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اگر ان میں سے کسی کو معلوم ہو جائے کہ وہ موٹی گوشت والی ہڈی پائے گا یا دو خوبصورت کھریاں پائے گا تو ضرور عشاء کی نماز میں حاضر ہو جاتا۔ بخاری اور مسلم میں بھی ایسا ہی ہے۔

شرح: اس حدیث سے جماعت کی فرضیت یا وجوب و سنیت پر استدلال کرنے کے لئے شارحین نے بڑی طویل و عریض بحثیں کی ہیں لیکن[1] حضرت شاہ ولی اللہ نے بڑی عجیب اور لطیف بات لکھی ہے کہ لقد هممت کا کلمہ فرضیتِ جماعت پر دلالت نہیں کرتا اور نہ اس سے ترکِ جماعت کی حرمت نکلتی ہے کیونکہ بارہا آدمی کسی مصلحت سے بعض چیزوں کا قصد کرتا ہے اس کے بعد کوئی ایسا معارض ظاہر ہوتا ہے جو اس مصلحت کو درہم برہم کر دیتا ہے۔ اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس زمانہ میں جماعت سے پیچھے رہنے والے منافقوں کے سوا کوئی نہ تھے

---

[1] مسوّی و مصفّیٰ ج ۱ ص ۱۲۸۔

اور ترکِ جماعت علامتِ نفاق بھی پس حضورؐ کا یہ قصد بنا بر نفاق تھا۔ اور حضورؐ کے آخری الفاظ کہ اگر انہیں موٹی ہڈی یا دو کھر ملنے کی اُمید ہوتی تو ضرور عشاء کی نماز میں حاضر ہوتے اس پر صراحۃً دلالت کرتے ہیں کہ ذکر منافقوں کا ہو رہا ہے۔ کیونکہ یہ کردار منافقوں کا ہی تھا۔

مولانا قطب الدینؒ[۱] نے اس ارشاد کو مبالغہ و تخویف پر مبنی قرار دیا ہے تاکہ اس سے نماز با جماعت کی اہمیت واضح ہو۔ اور لکھا ہے کہ حدیث سے اس امر کا جواز معلوم ہوتا ہے کہ امام کسی عذرِ شرعی اور مصلحتِ دینی سے کسی اور کو اپنا نائب و خلیفہ بنا کر خود جماعت میں حاضر نہ ہو۔ بالفرض اگر ایسا ہوتا تو حضورؐ تو جماعت میں موجود نہ ہوتے پس اسے فرضیتِ جماعت کی دلیل بنانا غلط ہوا۔

حافظ ابن حجرؒ[۲] نے اس حدیث پر ایک طویل بحث کی ہے اور لکھا ہے میرے نزدیک ظاہر یہی ہے کہ یہ حدیث منافقین کے متعلق وارد ہوئی ہے کیونکہ حدیث میں ہے کہ منافقوں پر عشاء اور فجر سے بڑھ کر کوئی نماز بوجھل نہیں۔ اور یہ جو فرمایا کہ لو یعلم احدھم انہ یجد عرقا سمینا الخ یہ وصف بھی منافقوں کے ہی لائق ہے۔ اور بعض علماء جن کا ذکر قاضی عیاضؒ نے کیا ہے فرماتے ہیں کہ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب جماعت ابتداء اسلام میں فرض تھی تاکہ جماعت سے غیر حاضری کا سدِّ باب کیا جائے پھر فرضیت منسوخ ہوگئی صرف تاکید (وجوب سنیت) باقی رہ گئی۔

علامہ قسطلانیؒ[۳] نے لکھا ہے کہ حضورؐ نے صرف ایسا کرنے کا ارادہ فرمایا تھا لیکن کیا نہیں اس سے معلوم ہوا کہ جماعت فرضِ عین نہیں ہے۔ نیز اس میں منافقین کے لئے تہدید ہے لیکن نفاق سے مراد نفاقِ معصیت ہے نفاقِ اعتقاد نہیں کیونکہ ابو داؤد کی حدیث میں ہے کہ وہ لوگ یصلون فی بیوتھم۔ ہاں یہ حدیث مبالغہ کے طور پر جماعت کے وجوب پر دلالت ضرور کرتی ہے اور محلِ اختلاف جمعہ کے علاوہ ہے کیونکہ جمعہ میں جماعت بالاتفاق شرطِ صحت ہے پس فرضِ عین ٹھہرے گی۔ اور حضورؐ نے یہ جو ارشاد فرمایا ہے کہ الی رجالٍ اس سے عورتیں اور بچے خارج ہوگئے ان پر جماعت کی حاضری واجب نہیں ہے۔

---

[۱] مظاہر حق ج ۱ صـ۳۷ [۲] فتح الباری ج ۳ صـ۳۵۷، ۳۵۸

[۳] ارشاد الساری ج ۲ صـ۲۸

علامہ علی القاریؒ نے لکھا ہے کہ یہ حدیث جماعت کی فرضیت کفایہ کو بھی ردّ کرتی ہے کیونکہ بعض لوگوں کا اس سے پیچھے رہنا فرضِ کفایہ ہونے کی صورت میں اس قدر قابلِ مذمت نہیں ہو سکتا تھا جتنی فرمائی گئی ہے بلکہ فرضِ کفایہ کی تو تعریف ہی یہ ہے کہ چند آدمیوں کے ادا کرنے سے سب کی طرف سے ادا ہو جائے۔ جو لوگ نمازِ جنازہ میں شامل نہ ہوتے تھے حضورؐ نے کبھی ان کے متعلق ایسے الفاظ نہیں فرمائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

فقہی ابحاث کو ایک طرف رکھ دیں تو اس میں تو کسی کو بھی شک نہیں کہ جماعت کی بہت تاکید ہے اور جماعت جماعتی زندگی کی ایک زندہ علامت ہے۔ پس اس نقطۂ نظر سے اس حدیث کو پڑھیں تو ثابت ہوتا ہے کہ اسلام نے جماعت کی شدید تاکید فرمائی ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی فرضیت میں بحث ہوئی ہے۔

حدیث ۳ : وعنه قال اَتی النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم رجلٌ أعمٰی فقال یارسول اللّٰہ انّه لیس لی قائدٌ یقودنی الی المسجد فسأل رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم ان یُرخّص له، فیصلّی فی بیته فرخّص له، فلمّا ولّٰی دعاه فقال هل تسمعُ النّداء بالصّلوٰة قال نعم قالَ فَاَجِبْ۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ : حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا ایک اندھا آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے کہا یا رسول اللہ! میرا کوئی رہبر نہیں جو مجھے مسجد تک لے جائے پھر اس نے (یہ کہہ کر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ آپؐ اسے اجازت دے دیں کہ وہ اپنے گھر میں نماز پڑھ لیا کریں پس حضورؐ نے اسے رخصت دے دی۔ پھر جب وہ واپس چلا گیا تو حضورؐ نے اسے واپس بلایا اور فرمایا کیا تو نماز کی پکار یعنی اذان سنتا ہے؟ اس نے عرض کیا ہاں! آپؐ نے فرمایا کہ پھر نماز میں حاضر ہو جایا کر۔ مسلم۔

شرح : یہ[2] حضرت عبداللہ بن ام مکتوم کا قصہ ہے جو بڑے جلیل القدر صحابی اور فضلاء مہاجرین میں سے تھے یہی وہ صاحب ہیں جن کے حق میں سورۂ عبس نازل ہوئی تھی اور حضورؐ کو ان کی خاطر داری بہت منظور تھی۔ کئی مرتبہ حضورؐ نے انہیں مدینہ

---

[1] مرقات ج ۲ ص ۵۳ [2] مظاہر حق ج ۱ ص ۳۷۰، مرقات ج ۳ ص ۵۴

میں اپنا نائب بنا کر جہاد وغیرہ کے سفر فرمائے تھے۔ انہیں پہلے اجازت دے دی پھر اجتہاد بدل گیا یا بذریعہ وحی دوبارہ بلا کر تاکید فرمائی کہ اگر اذان کی آواز سُنتے ہو تو نماز میں حاضر ہو جایا کرو۔ یہ ارشاد بالاتفاق بطریقِ مبالغہ تھا ورنہ صحیحین میں حضرت عتبانؓ بن مالک انصاری کو حضورؐ کے اجازت دے دینے کا ذکر صراحۃً موجود ہے بلکہ حضورؐ ان کی گھر کی مسجد کا افتتاح فرمانے کو خود تشریف لے گئے تھے۔ عبداللہ چونکہ مقام و مرتبہ کے لحاظ سے بلند تھے لہٰذا ان کی شان کے لائق یہی تھا کہ انھیں اولیٰ کو اختیار کرنے کا حکم دیا جاتا اور دوسرے صحابی کو نابینا ہونے کی بنا پر رخصت دے دی گئی۔

حافظ ابن حجرؒ[1] نے لکھا ہے کہ جماعت باجماع المسلمین عُذر کی وجہ سے ساقط ہو جاتی ہے اور یہ قول ان کا بھی ہے جنہوں نے اسے فرضِ عین کہا ہے لیکن بعینہٖ یہی دلیل جماعت کے فرضِ عین نہ ہونے کی ہے ہاں اس حدیث میں جماعت کی تاکید اور اس میں مبالغہ ضرور ہے۔

حدیث ۴: وعن ابنِ عمرؓ انّہ اذّن بالصّلوٰۃ فی لیلۃٍ ذاتِ بردٍ وّریحٍ ثمّ قال اَلاَ صَلّوا فی الرّحالِ ثمّ قال اِنّ رسُولَ اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم کان یأمرُ المؤذّن اِذا کانت لیلۃٌ ذاتُ بردٍ و مطرٍ یقول اَلاَ صَلّوا فِی الرِّحَالِ۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک ٹھنڈک اور ہوا والی رات میں نماز کی اذان دی پھر فرمایا سُنو لوگو! گھروں میں ہی نماز پڑھ لو۔ پھر فرمایا کہ جب ٹھنڈک اور ہوا والی رات ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مؤذّن کو حکم دیا کرتے تھے کہ کہے: اَلاَ صَلّوا الخ اے لوگو! سُنو، ڈیروں میں ہی نماز پڑھ لو! بخاری و مسلم۔

شرح: موطا[2] کی شرح میں حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ منہاج میں مذکور ہے کہ ترکِ جماعت میں کسی حالت میں رخصت نہیں ہے ہاں عذر کی حالت میں رخصت ہے مثلاً بارش یا تیز ہوا رات کو، اسی طرح بہت سا کیچڑ یا کوئی خاص عذر مثلاً بیماری۔ اور عالمگیری میں ہے کہ جماعت اعذار سے ساقط ہو جاتی ہے چنانچہ مریض پر اور لُولھے پر اور ان جیسے اور لوگوں پر واجب نہیں اور اس طرح بارش، کیچڑ، شدید سردی اور سخت تاریکی کی وجہ سے بھی جماعت ساقط ہو جاتی ہے۔ امام ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ امام ابو یوسفؒ فرماتے

---

[1] مرقات ج ۳ ص ۵۴۔ [2] مصفّٰی ج ا ص ۱۲۹۔

ہیں میں نے امام ابو حنیفہ رح سے کیچڑ میں جماعت کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ میں اس میں جماعت کے ترک کو درست نہیں سمجھتا ہوں۔ امام صاحب کا یہ قول بھی مبالغے اور اولویت پر محمول ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث: وعنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اِذَا وُضِعَ عَشَاءُ اَحَدِکُم وَاُقِیمَتِ الصَّلٰوۃُ فَابْدَءُوا بِالْعَشَاءِ وَلَا یَعْجَلْ حَتّٰی یَفْرُغَ مِنْہُ وکان ابن عُمَرؓ یوضع لَہُ الطَّعام وتقام الصَّلٰوۃُ فَلَا یَأتِیھَا حَتّٰی یَفْرُغ منہ وانہ لیسمع قراءۃ الامام۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کسی کا رات کا کھانا رکھ دیا جائے اور نماز کھڑی ہو جائے تو پہلے کھانا کھالو۔ اور کھانے والا جلدی نہ کرے حتیٰ کہ اس سے فارغ ہو جائے اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کھانا رکھا جاتا اور نماز کھڑی ہوتی تو وہ اس سے فارغ ہو کر ہی نماز کے لیے آتے حالانکہ وہ امام کی قرأت سن رہے ہوتے تھے۔ (بخاری ومسلم)

شرح[1]: وُضِعَ عَشَاءُ اَحَدِکُم۔ عَشَاء بفتح العین کا معنی ہے رات کا یا پچھلے پہر کا کھانا۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ یہ ایک مثال ہے اور اس سے مراد کھانا ہے جس کے لیے دل میں بہت طلب اور شوق ہو اگرچہ وہ پچھلے وقت کا کھانا ہی ہو۔ امام ابو حنیفہؒ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا مجھے یہ بات زیادہ پسند ہے کہ میرا کھانا نماز بن جائے۔ یعنی کھانے میں نماز کی فکر رہے تو یہ بات اس کی نسبت زیادہ بہتر ہے کہ نماز میں کھانے کی طرف دھیان لگا رہے۔

اس حدیث سے بھی ایک عذر کی بنا پر جماعت سے بعض لوگوں کا استثناء نکلتا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ جماعت فرض نہیں ورنہ اس کے ترک کی اس حال میں اجازت نہ دی جاتی۔ واللہ اعلم۔

حدیث ۶: وعن عائشۃ رضی اللہ عنہا قالت سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول لا صلوٰۃ بحضرۃ طعام ولا ھو یدافعہ الاخبثان۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی

---

[1] مرقات ج ۳ ص ۵۵، مظاہر حق ج ۱ ص ۳۷۱

اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سُنا کہ کھانے کی موجودگی میں نماز نہیں اور نہ وہ آدمی نماز پڑھے جسے بول و براز کی حاجت ستا رہی ہو۔ مسلم۔

شرح :۔ امام نوویؒ[1] فرماتے ہیں کہ جب کھانا سامنے ہو یا بول و براز کا تقاضا ہو تو نماز کی کراہت اس وجہ سے ہے کہ دل تو ان میں مشغول ہو گا پس کمالِ خشوع و خضوع ضائع ہو جائے گا اور اس طرح کی اور حاجتیں بھی یہی حکم رکھتی ہیں۔ لیکن یہ حکم اس وقت جب ہیں فراخی ہو ورنہ بہر صورت نماز سے فراغت حاصل کر لینا چاہیئے۔

معلوم ہوا کہ یہاں لَا نفیٔ کمال کے لیے ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے۔

افسوس ہے کہ لَا کی بحث جب اور احادیث میں چلتی ہے تو معاملہ دور جا پہنچتا ہے۔ مثلاً لَا صَلٰوۃَ اِلَّا بفاتحۃ الکتاب۔

حدیث ۷ :۔ وعن ابی ھریرۃؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اذا اُقیمت الصّلٰوۃ فلا صلٰوۃ اِلّا المکتوبۃ۔

رواہ مسلم۔

ترجمہ :۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب نماز کھڑی ہو جائے تو فرض نماز کے سوا اور کوئی نماز نہیں۔ مسلم۔

شرح :۔ یہ حدیث امام بخاریؒ کی شرط کے مطابق نہیں تھی لیکن ہے صحیح لہٰذا انہوں نے اسے ایک باب کا عنوان بنا دیا ہے۔ لَا صَلٰوۃ میں گفتگو ہوئی ہے[2]۔ علامہ قسطلانی فرماتے ہیں کہ مطلب ہے لَا صَلٰوۃ کاملۃً یا مطلب ہے لَا تصلّوا حینئذٍ۔

[3] علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ اہلِ ظواہر میں سے کچھ حضرات ظاہر حدیث سے استدلال کر کے کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص نماز میں ہو اور جماعت کھڑی ہو جائے تو اس کی نماز باطل ہو جاتی ہے لیکن ائمہ فقہاء و محدّثین میں سے کسی کا یہ قول نہیں ہے بلکہ جمہور کہتے ہیں کہ اس نماز کو قطع نہ کرے بلکہ پورا کرے۔ اب رہی فجر میں مذاہب کی تفصیل، سو امام شافعیؒ کا جدید قول یہ ہے کہ جب نماز فجر کھڑی ہو جائے تو مطلقاً کوئی نماز نہیں ہوتی پس اس حالت میں مسجد کے اندر یا باہر فجر کی سنت ادا نہ کی جائے۔ اور امام شافعیؒ کا قدیم قول حنفیہ کی مانند ہے اور امام مالکؒ کا قول بھی یہی ہے لیکن ان کے نزدیک مسجد کے اندر اور باہر کا فرق ہے پس باہر

---

[1] مظاہر حق ج ا صـ ۳۷۱، مرقات ج ۳ صـ ۵۵ ۔ [2] قسطلانی ج ۲ صـ ۳۸

[3] فیض الباری ج ۲ صـ ۱۹۰ ۔

سنّت ادا کر لے مسجد کے اندر نہیں لیکن بشرطیکہ اسے اُمید ہو کہ فرض کی دونوں رکعات مل جائیں گی ورنہ نہ پڑھے۔ اور میرے نزدیک امام ابوحنیفہؒ کا مسلک جو اس بارے میں ثابت ہے وہ یہ ہے کہ اگر نمازی کو ایک رکعت جماعت سے مل جانے کی اُمید ہو تو مسجد سے باہر سنتیں پڑھ لے۔ اور ایک رکعت شاید اس لیے فرمائی کہ حدیث میں ہے من ادرك ركعة من الصّلوٰة فقد ادرك الصّلوٰة۔ اور میرے نزدیک مسجد کے اندر کی امام ابوحنیفہؒ سے کوئی روایت نہیں جیسا کہ بدائع اور الجامع الصغیر میں لکھا ہے اور صاحب ہدایہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے اور دوسرے فقہی مذاہب کے علماء مثلاً قسطلانیؒ شافعیؒ اور ابن رشدؒ اور باجیؒ مالکی نے بھی امام ابوحنیفہؒ کا یہی مسلک بیان فرمایا ہے۔ پھر امام محمدؒ نے اس مسلک میں توسیع کی اور ایک رکعت کو آخری قعدے تک پہنچا دیا اور امام طحاویؒ نے ان رکعات کی مسجد کے ایک کونے اور گوشے میں پڑھنے کی اجازت کی توسیع کر دی اور ان توسیعات سے امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کی دونوں شرطیں ختم ہو گئیں۔ پس میرا عمل تو امام اعظمؒ کے قول پر ہے اور جو شخص امام محمدؒ یا امام طحاویؒ کے مسلک پر عمل کرے میں اس سے لڑتا بھی نہیں ہوں۔

اس حدیث کے اطلاق کو اگر عام رکھا جائے تو جب کہیں دنیا بھر میں نماز کھڑی ہو جائے تو اس فرض کے سوا کسی کی نماز بھی نہ ہو سکے گی۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء اسلام نے اس میں شروط و قیود لگائے جو دیگر دلائل شرع سے ماخوذ ہیں[1]۔ فجر کی سنّت کی بحث دراصل اس لئے اُٹھ کھڑی ہوئی کہ حدیث میں اس کی بڑی تاکید آئی ہے۔ چنانچہ ابوداؤد میں اس کے متعلق یہ الفاظ ہیں: لا تدعوهما وان طردتكم الخيل اور دیگر کتب میں یہ الفاظ ہیں: صلّوها وان طردتكم الخيل۔ ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ ان حدیثوں کی وجہ سے فجر کی سُنّتیں اذا اُقیمت الصّلوٰة والی حدیث کی نہی سے خارج اور مخصوص ہو گئی ہیں۔ اور حنفیہ نے دونوں حدیثوں پر عمل کرنے کا درمیانہ راستہ تجویز کیا ہے کیونکہ بقول علّامہ ابن الھمامؒ فجر کی سُنّتیں سب سُنن سے قوی تر ہیں۔

حدیث ۸: وعن ابن عمرؓ قال قال النبی صلّی اللّٰہ علیہ

---

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۳۷۱، مرقات ج ۳ ص ۵۶

وسلّم اذا استاذنت امرأة احدكم الی المسجد فلا یمنعنّها - متفق علیہ -

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کسی کی بیوی مسجد کی طرف جانے کی اجازت مانگے تو وہ اسے نہ روکے - بخاری و مسلم -

شرح: لے حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ معاملہ پھر بھی مرد کے ہاتھ میں رہا اس سے معلوم ہوا کہ عورتوں کے مسجدوں میں جانے کی اس قدر کھلی اجازت بھی نہیں ہے - چنانچہ اس حدیث کی ایک روایت میں باللّیل کا لفظ امام بخاریؒ نے ہی روایت کیا ہے جس سے اجازت صرف رات سے مخصوص ہوگئی - امام بخاریؒ نے باب باندھا ہے - باب خروج النساء الی المساجد فی اللّیل والغلس اس سے ان کا اپنا رجحان بھی معلوم ہوگیا کہ اجازت کی دو شرطیں ہیں رات اور تاریکی - پھر اسی باب میں حضرت عائشہؓ ام المؤمنین کا اثر لاتے ہیں وہ فرماتی ہیں کہ لوادرك رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم ما احدث النساء لمنعهنّ المسجد کما مُنِعَتْ نساءُ بنی اسرائیل - ان سب چیزوں سے عورتوں کے مسجد میں جانے کے معاملے کی نزاکت معلوم ہوتی ہے -

لے حضرت سیّد المحدثین مولانا انور شاہ فرماتے ہیں کہ احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ عورتیں حضورؐ کے زمانے میں فرائض اور عیدین میں حاضر ہوتی تھیں لیکن اس کے باوجود فقہاء نے اس معاملے میں تنگی کی ہے اور متأخرین نے بالکل منع کر دیا ہے - اور یہاں ایک راز ہے کہ شریعت نے عورتوں کو جماعت میں حاضری کی ترغیب نہیں دی بلکہ انھیں گھر میں اور گھر کے بھی تاریک گوشے میں نماز پڑھنے کی ترغیب دی ہے جیسا کہ ابوداؤد میں ہے اور دوسری طرف مردوں کو انھیں منع کرنے کا بھی حکم نہیں دیا اس سے ثابت ہوا کہ عورت کو چند شرطوں سے اجازت دی گئی ہے: ایک تو یہ کہ بڑی عمر کی ہوں پھر یہ کہ سنگار کر کے نہ جائیں اور خوشبو کا استعمال نہ کریں وغیرہ وغیرہ - اور اس حدیث

لے فتح الباری ج ۲ ص ۲۷۴

لے فیض الباری ج ۲ ص ۳۲۱، ۳۲۲، مظاہر حق ج ۱ ص ۳۷۲، مرقات ج ۳ ص ۵۶

کی نہی کو انہی دلائل کی بناء پر بالاتفاق نہی تنزیہی پر محمول کیا گیا ہے۔ اور فتنے کے وقت منع کیا جا سکتا ہے۔

حدیث ۹ : وعن زینب رضؓ امرأة عبداللہؓ بن مسعود قالت قال لنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اِذَا شَہِدَتْ اِحْدٰا کُنَّ المسجد فلا تمسّ طیبًا۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ : حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی بیوی زینب رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہمیں (یعنی عورتوں کو) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی عورت مسجد میں حاضر ہو تو خوشبو لگا کر نہ آئے۔ مسلم۔

حدیث ۱۰ : وعن ابی ھریرۃؓ قال قال رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم أیما امرأة أصابت بَخُورًا فلا تشھد معنا العشاء الآخرة۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ : حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور رسولِ خدا صلّی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس عورت نے خوشبو لگائی ہو وہ ہمارے ساتھ عشاء کی نماز میں مت آئے۔ مسلم۔

شرح : عشاء کی شرط یا تو اس لیے ہے کہ عورتیں عموماً رات ہی کی نمازوں میں (فجر و عشاء) حضورؐ کے ساتھ شامل جماعت ہوتی تھیں۔ اورؔ یا اس لیے کہ بسبب ظلمت اور راستوں کے خالی ہونے کے اس وقت میں فتنے کا خوف زیادہ ہے اور خوشبو اسے ابھارنے کا باعث ہوتی ہے۔ اور پچھلی حدیث میں کسی وقت کی قید کے بغیر خوشبو لگا کر مسجد میں آنے سے منع فرمایا گیا ہے۔[۱]

باب تسویۃ الصّف

اسلامی تعلیمات میں صف بندی اور اجتماعیت کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ میدانِ جہاد ہو یا جماعت کی نماز صف بندی کی دونوں جگہ شدید ضرورت ہے۔ حدیث میں اس کی بہت تاکیدات وارد ہوتی ہیں۔ بعض احادیث میں صف بندی میں کوتاہی کرنے

۱؎ مظاہر حق ج ۱ صـــ۳۷۲، مرقات ج ۳ صـــ۵۷۔

کو اختلاف و شقاق اور خود غرضیوں کا باعث ٹھیرایا گیا ہے۔ صفیں سیدھی کرنے کے لیے خاص طور پر تاکیدی احکام موجود ہیں۔ کندھے سے کندھا ملانے کا حکم دے کر فرمایا گیا ہے کہ صفیں سیدھی رکھو، خوب مل کر کھڑے ہو جاؤ۔ صف بندی حسنِ صلوٰۃ ہے تمامِ صلوٰۃ ہے۔ صفوں میں دراڑ چھوڑنے پر وعیدیں وارد ہوئی ہیں۔ اسی لیے صف بندی[1] (تسویہ و اقامتِ صفوف) کو حنفیہ واجب قرار دیتے ہیں۔ جس کا ترک مکروہِ تحریمی ہے۔ شافعیہ کے ہاں چونکہ واجب کا مرتبہ ہی نہیں لہٰذا وہ اسے سنت کہتے ہیں اور ابن حزم ظاہریؒ اس کی فرضیت کے قائل ہوئے ہیں۔

قاعدۂ مسلّمہ ہے کہ ظاہر کا اثر باطن پر پڑتا ہے اسی لیے جتنی صف بندی مضبوط ہو گی اتنا ہی اہلِ اسلام میں دلی اتحاد اور ائتلاف ہو گا اور جتنا صف بندی میں نقص ہو گا اسی قدر باطنی اتحاد اور دلی خیر سگالی کمزور پڑ جائے گی یہی سبب ہے کہ حدیث میں صف بندی کے اندر کوتاہی کرنے کو مخالفت اور شقاق کا باعث بتایا گیا ہے۔ خلفائے راشدینؓ صف بندی کا اس قدر اہتمام فرماتے تھے کہ اس مقصد کے لیے ان کے مقدس زمانے میں خاص اصحاب مقرر تھے جب یہ لوگ اطلاع دیتے کہ صفیں سیدھی ہو چکی ہیں تو پھر یہ حضرات تکبیر تحریمہ کہتے تھے۔ صفوں کا تسویہ اقامتِ صلوٰۃ کے وقت بھی ہو سکتا ہے اور اس کے بعد بھی صحابہؓ کا قاعدہ عموماً یہی تھا کہ حضورؐ کی تشریف آوری سے پہلے ہی صفیں بنا رکھتے تھے تاکہ جب اٹھیں تو صف بالکل تیار ہو۔ ابوداؤد کی ایک حدیث میں یہ بھی ثابت ہے کہ حضورؐ محراب میں ایک لکڑی کا سہارا لگائے کھڑے رہتے اور جب دیکھتے کہ صفیں درست ہیں تو پھر تکبیر تحریمہ کہتے تھے۔ یعنی اوّل اوّل ایسا ہوتا ہو گا بعد میں جب وہ حضرات عادی ہو گئے تو حضورؐ کی گھر سے تشریف آوری پر فوراً صفیں بنا لیتے تھے۔

مؤطا[2] کی ایک حدیث کے مطابق حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ تقریباً ہر خطبے میں صفیں سیدھی کرنے اور کندھوں کو آمنے سامنے رکھنے کی تاکید فرمایا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے: اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ صَفًّا کَاَنَّہُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝ اسی آیت کی وجہ

---

[1] فیض الباری ج ۲ ص ۲۳۴، ۲۳۵۔

[2] مؤطاء مع شرح ج ۱ ص ۱۳۵۔

سے اس سورت کا نام سورۂ صف ہوا۔ قرآنِ پاک کی سورت کا نام صف ہونے اور میدانِ جہاد و قتال کی صف بندی پر اہلِ ایمان کی مدح فرمائے جانے سے صف بندی کی اہمیت وحیثیت ظاہر و باہر ہے۔

الفصل الاوّل

حدیث ۱: عن النعمانؓ بن بشیرٍ قال کان رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم یُسوّی صفوفنا حتّٰی کأنّما یُسوّی بِہَا القداح حتّٰی رأی انّا قد عقلنا عنہ ثمّ خرج یومًا فقام حتّٰی کاد ان یُکبّر فرأی رَجُلًا بَادِیًا صَدْرُہٗ من الصّفّ فقال عِبَادَ اللّٰہِ لَتُسَوُّنَّ صُفُوفَکُمْ اَوْ لَیُخَالِفَنَّ اللّٰہُ بَیْنَ وُجُوہِکُمْ۔ رواہ مسلم

ترجمہ: حضرت نعمان بن بشیر رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ہماری صفیں درست فرمایا کرتے تھے حتیٰ کہ گویا صفوں کے ساتھ تیروں کو سیدھا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ آپؐ نے دیکھ لیا کہ ہم نے آپؐ سے یہ چیز اچھی طرح سمجھ لی ہے۔ پھر ایسا ہوا کہ ایک دن آپؐ گھر سے باہر تشریف لائے پس مصلّٰی پر نماز پڑھانے کھڑے ہوتے حتیٰ کہ قریب تھا کہ تکبیر کہیں جبکہ آپؐ نے ایک شخص کا سینہ آگے کو نکلا ہوا دیکھا تو فرمایا: تم ضرور بالضرور صفیں درست کیا کرو ورنہ اللّٰہ تعالیٰ تمہارے چہروں کے درمیان مخالفت پیدا کر دے گا: مسلم۔

شرح:[1] لیُسوّی بھا القداح۔ قِداح قِدح کی جمع ہے جس کا معنیٰ تیر ہے۔ تیر بنانے والے اُسے سیدھا کرنے کے لیے آگ میں تپاتے اور اِدھر اُدھر دبا کر بالکل سیدھا کر دیتے۔ یہ لفظ یہاں بطورِ محاورہ استعمال ہوا ہے کہ حضورؐ صفوں کو تیر کی طرح سیدھا کیا کرتے تھے۔ تیر کی طرح سیدھا کرنا اُردو پنجابی وغیرہ میں بھی مستعمل ہے یعنی نہایت احتیاط اور مبالغے سے کسی چیز کو درست کرنا۔ اور مراد اس سے صفوں کی ترتیب اور درستی میں پوری کوشش صرف کرنا ہے۔ بعض شارحین نے اس کا معنیٰ یوں کیا ہے کہ اصل عبارت یوں ہے

---

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۳۷۸، مرقات ج ۳ ص ۶۷، ۶۸۔

كأنما يُسوّى الصفوف بالقداح اور عبارت قلب پر محمول ہے معنی یوں ہوا کہ گویا آپ صفوں کو تیروں کے ساتھ سیدھا کرتے تھے۔ اور یہ عکس جو کیا گیا اس سے مبالغہ مراد ہے۔

اَوْ لَيُخالفنّ الله الخ یعنی ظاہر کا اثر باطن پر ہوتا ہے اگر تم نے صفیں درست نہ کیں تو ضرور تمہارے دلوں میں اختلاف پڑ جائے گا اور ہر شخص کا قصد دوسرے سے مختلف ہو جائے گا۔ جدھر کسی کا منہ اُٹھے گا ادھر ہی کو چل دے گا۔ اتحاد و اتفاق پارہ پارہ ہو جائے گا۔ دلوں میں کدورتیں اور حسد و بُغض پیدا ہو جائے گا اور آخر اس کا نتیجہ عداوت اور دشمنی ہوگا۔ اس حدیث پاک سے صف بندی اور باہمی اتحاد کی اہمیت واضح ہوگئی۔[1]

حدیث ۲: وَعَنْ اَنَسٍ قال اُقِيمتِ الصّلوٰةُ فاقبل علينا رسول الله صلّى الله عليه وسلّم بوجهه فقال اقيموا صفوفكم وَتراصّوا فاِنّي أراكم من وراء ظهرى۔ رواه البخارى۔ وفى المتّفق عليه قال اتمّوا الصّفوف فانّي اراكم مِنْ وراءِ ظهرى۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نماز کی اقامت کہی گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا چہرۂ مبارک ہماری طرف کیا اور فرمایا اپنی صفیں ٹھیک کرو اور خوب مل کر کھڑے ہو جاؤ کیونکہ میں تمہیں اپنی پیٹھ کے پیچھے سے دیکھتا ہوں۔ یہ تو بخاری کی روایت ہے اور بخاری و مسلم دونوں کی روایت میں ہے کہ حضور نے فرمایا صفوں کو پورا کرو پس یقیناً میں تمہیں پیٹھ کے پیچھے سے دیکھتا ہوں۔

شرح: دوسری روایت کے الفاظ سے اتمامِ صفوف کا حکم معلوم ہوا گو اس کا معنی صفوں کی درستی اور سیدھا کرنا بھی ہو سکتا ہے لیکن بظاہر اس کا معنی یہ ہے کہ صفوں میں خالی جگہ مت رہنے دو پہلے ایک صف پوری کرو پھر دوسری وعلیٰ ہذا القیاس۔ یعنی تسویۂ صفوف کی ایک خاص قسم کا ذکر اس لفظ میں فرمایا گیا ہے۔

---

[1] مرقات ج ۳ صـ ۶۸، مظاہر حق ج ۱ صـ ۳۷۹۔

۱؎ تراصّوا سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جاؤ۔ صف میں کوئی رخنہ اور دراڑ نہ چھوڑو خوب مل کر کھڑے ہو۔ کندھے سے کندھا ملالو۔ یہ لفظ سورۃ صف کی آیت اِنَّ اللّٰہَ یحبّ الّذین یُقاتلون فی سبیلہٖ صفّاً کأنّھم بنیانٌ مرصُوصٌ ہ سے لیا گیا ہے۔ پس میدان کی صف بندی اور مسجد کی صف بندی میں پوری مشابہت مطلوب ہوگئی۔ اس حدیث سے یہ بھی پتہ چل گیا کہ امام کو صفیں درست کرنے کا پورا اہتمام کرنا چاہیئے اور وقتاً فوقتاً لوگوں کو اس طرف متوجہ کرتے رہنا چاہیئے۔

۲؎ فانّی اراکم من وراء ظہری۔ یہ اس لیے فرمایا کہ صف بندی میں اگر کوتاہی ہوگی تو میں دیکھ لوں گا پس اس کا پورا اہتمام کرو۔ اور حضورؐ کا پیٹھ پیچھے سے دیکھ لینا بذریعۂ کشف و معجزہ ہوتا تھا اور حالتِ نماز سے خاص تھا کہ نماز میں آپؐ صحابہؓ کی حرکات و سکنات کو دیکھ لیتے تھے۔ اس پر کچھ گفتگو کتاب الصلوٰۃ کی ابتداء میں بھی گزر چکی ہے وہاں دیکھ لیا جائے۔

بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی یہ روایت دونوں طرح موجود ہے۔ ایک تو مسلم کی روایت کے بالکل مطابق اور دوسری میں کچھ الفاظ کا اختلاف ہے مصنف نے اسی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

۳؎ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ انّی اراکم من وراء ظہری میں تاویل کرنا غلط ہے اسے اپنے ظاہر پر ہی رکھنا چاہیئے اور روایت سے مراد حقیقی روایت ہے یہی معنی مراد لینے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اور بزرگی ہے۔ امام احمدؒ سے روایت ہے کہ یہ حضورؐ کا معجزہ تھا۔

حدیث ۳: وعنہ قال قال رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم سوّوا صفوفکم فان تسویۃ الصفوف من اقامۃ الصّلوٰۃ۔ متّفق علیہ۔ الّا ان عند مسلم من تمام الصّلوٰۃ

ترجمہ: حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد

۱؎ مرقات ج ۳ ص ۶۸ ۲؎ ایضاً مرقات، ایضاً مظاہر حق۔

۳؎ فتح الباری ج ۳ ص ۳۹۸ ۔ ۴؎ فیض الباری ج ۲ ص ۲۲۵

فرمایا اپنی صفیں درست رکھو کیونکہ صفوں کا سیدھا کرنا نماز کو قائم کرنے میں داخل ہے۔ بخاری ومسلم۔ لیکن مسلم نے من تمام الصلوٰۃ کا لفظ روایت کیا ہے اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ صفوں کو درست کرنا نماز کو مکمل کرنے میں داخل ہے۔

شرح: بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث میں یہ الفاظ ہیں فانّ اقامۃ الصّف من حُسن الصّلوٰۃ۔ مختلف الفاظ کے اختلاف سے فقہاء نے کئی مسائل اخذ کیے ہیں۔ علامہ ابن حزم ظاہریؒ نے من تمام الصّلوٰۃ کے لفظ سے یہ سمجھا کہ صفیں درست کرنا بھی فرض ہے۔ کیونکہ امام راغب اصفہانی نے تمام اور کمال میں یہ فرق بتایا ہے کہ تمام کا تعلق اجزاء سے ہوتا ہے اور کمال کا اوصاف سے۔ پس صفوف کی درستی نہ کرنے سے اجزاء صلوٰۃ میں نقص واقع ہوا۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تسویۂ صفوف [1] فرض ہے۔ علاوہ ازیں مِن اقامۃ الصلوٰۃ [2] سے بھی ابنِ حزمؒ نے استدلال کیا ہے کیونکہ اقامۃ الصّلوٰۃ ازروئے قرآن فرض ہے اور اللہ تعالیٰ نے بار بار اقامتِ صلوٰۃ کا حکم دیا ہے۔ پس جو چیز اقامتِ صلوٰۃ میں داخل ہوگی وہ بھی فرض ہوگی۔ اور شافعیہ نے تمام الصّلوٰۃ یا حُسن الصّلوٰۃ کے لفظ سے صف بندی کا سنّت ہونا ثابت کیا ہے۔ کیونکہ کسی چیز کا تمام اور حُسن اس اصل چیز سے زائد ایک وصف ہے۔ حنفیہ نے بین بین کا راستہ تجویز کیا اور تسویۂ صفوف کو واجب قرار دیا۔ وہ اس سلسلے میں لفظی بحث میں کم پڑتے ہیں۔ شرع کی تاکیدات کو دیکھ کر وجوب کا حکم لگاتے ہیں۔

[3] مِن اقامۃ الصّلوٰۃ کے لفظ کا اشارہ آیتِ قرآنی أقیموا الصّلوٰۃ کی طرف ہے کہ اقامت کا مطلب ہے نماز کو تعدیلِ ارکان اور رعایتِ سُنن و آداب کے ساتھ پڑھنا اور صفیں درست کرنا بھی اس میں داخل ہے۔

حدیث ۴: وعن ابی مسعود الانصاریؓ قال کان رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم یمسح مناکبنا فی الصّلوٰۃ ویقول استوُوا ولا تختلفوا فتختلف قلوبکم لیلنی مِنکُم

---

[1] فیض الباری ج ۲ ص ۲۳۶۔ [2] فتح الباری ج ۳ ص ۳۹۹
[3] مظاہر حق ج ۱ ص ۳۷۹، مرقات ج ۳ ص ۶۸

اُولوالاحلام والنّھٰی ثمّ الّذین یلونھم ثمّ الّذین یلونھم قال ابو مسعودؓ فانتم الیوم اشدّ اختلافاً رواہ مسلم۔

ترجمہ: حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں ہمارے کندھوں کو چھوتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ سیدھے اور برابر ہو جاؤ اور آگے پیچھے مت ہو ورنہ تمہارے دلوں میں اختلاف پڑ جائے گا۔ تم میں سے جو عقلمند، بڑی عمر کے اور سمجھدار ہیں۔ وہ میرے قریب رہیں، پھر وہ لوگ جو ان سے قریب ہوں۔ پھر وہ جو ان سے قریب ہوں۔ حضرت ابو مسعودؓ نے حدیث بیان کر کے فرمایا کہ آج تم لوگ سخت اختلاف کرنے والے ہو۔ مسلم۔

شرح: [1] یمسح مناکبنا فی الصّلوٰۃ یعنی حضورؐ ہاتھ کندھوں پر رکھ کر صفیں سیدھی کرتے تھے تاکہ لوگ آگے پیچھے نہ ہوں۔ اور فی الصّلوٰۃ سے مراد ہے فی حال ارادۃ الصّلوٰۃ یعنی جب نماز پڑھنے کا ارادہ فرماتے تو اس میں داخل ہونے سے قبل ایسا کیا کرتے تھے۔ فتختلف قلوبکم یعنی ظاہر و باطن کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ ظاہری افعال و اعمال کا تعلق دل پر اور دل کی صفائی اور درستی کا تعلق ظاہر پر ہوتا ہے۔ [2] لیلنی منکم اولوا الاحلام والنّھٰی اس جملہ میں صفوں کی ترتیب ارشاد ہوئی ہے کہ بالغ و عاقل اور سمجھ والے لوگ اگلی صف میں کھڑے ہوں تاکہ حضورؐ کے اعمال و افعال کو دیکھ کر سمجھیں اور دوسروں تک پہنچائیں پھر دوسری صف میں ان سے چھوٹی عمر کے اور پھر تیسری میں ان سے بھی چھوٹے مثلاً لڑکے اور بچے۔

قال ابو مسعودؓ الخ یعنی آج مسلمانوں میں جو باہمی سر پھٹول اور فتنے راہ پا گئے ہیں تو اس کا اصل سبب یہی ہے کہ ان کی صفیں کج ہو گئی ہیں اس وجہ سے دل مختلف ہو گئے ہیں اور باہمی اختلاف تک نوبت پہنچ گئی ہے۔

حدیث ۵: وعن عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال قال رسول اللہ صلیّ اللہ علیہ وسلّم لیلنی منکم

---

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۳۷۹، مرقات ج ۳ ص ۶۹۔

[2] مرقات ج ۳ ص ۶۹، مظاہر حق ج ۱ ص ۳۷۹۔

اولوا الاحلام والنّھٰی ثم الّذین یلونھم ثلاثاً و ایّاکم وھیشات الاسواق۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے بڑی عمر والے اور عاقل لوگ میرے قریب رہا کریں پھر وہ جوان سے قریب ہیں یہ لفظ حضورؐ نے تین مرتبہ فرمایا اور خبردار بازاروں کے شور وغل سے بچ کر رہو۔ مسلم۔

شرح: اس حدیث سے فقہاء نے صفوں کی ترتیب یہ سمجھی ہے کہ پہلی صفوں میں بڑی عمر کے سمجھدار لوگ پھر ان کے بعد نوجوان پھر ان کے بعد بچے پھر اگر کوئی ہیجڑا ہو تو وہ اور آخر میں عورتیں ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ عورتوں کی صفیں عموماً مسجدوں سے باہر حجروں، برآمدوں اور دالانوں وغیرہ میں ہوتی ہیں۔

[1] وھیشات الاسواق صفیں اگر بے ترتیب ہوں، بڑے چھوٹے مل جل کر کھڑے ہوں اور عقلمند اگلی صفوں میں نہ ہوں تو شور وغل ہوگا، بے ترتیبی کیوجہ سے بازاروں کے شور وغل جیسی نوبت آجاتے گی۔ یہ معنیٰ اس مقام کے بہت قریب ہے اور شارح طیبیؒ نے لکھا ہے کہ حضورؐ نے بازاری معاملات میں بالکل کھو جانے سے منع فرمایا مبادا مسجدوں میں آنے اور حضورؐ کے قریب صفوں میں کھڑے ہونے میں نقص واقع ہو جائے۔ یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ مسجدوں میں وقار اور سکون سے رہو۔ بازاری شور وغل اور چھینا جھپٹی مسجدوں میں نہ ہونے پاتے۔ واللہ اعلم بالصّواب۔

حدیث ۶: وعن ابی سعیدؓ الخدری قال رأی رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم فی أصحابہٖ تأخّراً فقال لھم تقدّموا وأتمّوا بی ولیأتمّ بکم من بعدکم لایزال قوم یتأخرون حتّی یؤخّرھم اللہ۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ: حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھیوں میں کچھ جھجک اور سستی دیکھی تو ارشاد فرمایا:

---

[1] مرقات ایضاً، مظاہر حق ایضاً۔

آگے بڑھو اور میری اقتداء کرو اور تم سے پچھلوں کو تمہاری اقتداء کرنی چاہیئے۔ (یا کرنا ہوگی) کچھ لوگ برابر پیچھے ہٹتے رہیں گے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ انھیں پیچھے ہٹا دے گا۔ مسلم۔

شرح :لہ فی اصحابہ تأخرًا ظاہر یہ ہے کہ یہاں پیچھے ہٹنے سے مراد پہلی صفوں میں کھڑا نہ ہونا ہے یعنی کچھ لوگ جان بوجھ کر اگلی صفوں میں نہ آتے اور جھجک کی وجہ سے یا اس خیال سے کہ جلدی اُٹھ کر چلے جانا ہے پیچھے رہتے۔ یا اس تاخر سے مراد یہ ہے۔ کہ بعض لوگوں میں حضورؐ نے علم و فضل حاصل کرنے اور مسائل پوچھنے سے گریز کی حالت کا مشاہدہ کیا تو یہ فرمایا۔ اس حدیث میں صحابہؓ کی ذمہ داری اور ساتھ ہی ان کا مرتبہ بھی بیان ہوا ہے کہ وہ حضورؐ کے شاگرد ہیں اور باقی دنیا اُنکی شاگرد ہے۔ لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ علیکم شھیدًا۔ پس انہیں آگے بڑھ کر ہمت وسعی سے حضورؐ سے دین سیکھ کر لوگوں کو سکھانا تھا۔

لایزال قوم یتأخرون الخ یا تو عام قانون بیان فرمایا ہے کہ دنیا میں پیچھے ہٹنے والے، علم و عمل سے گریز کرنے والے اور خواہ مخواہ جھجک کا شکار ہونیوالے ہمیشہ پیچھے ہی رہ جاتے ہیں۔ قوموں کی ترقی اور تنزل کا راز یہی ہے کہ جو لوگ علم و فن اور نیکی و فضیلت میں آگے بڑھیں گے وہ ہر میدان میں آگے نکل جائیں گے اور امامت و سرداری ان کا مقام ہوگا اور جو لوگ ان چیزوں کے حصول سے گریز کریں گے وہ پستی کے گڑھے میں گر جائیں گے۔

اور یا خاص طور پر جو لوگ حضورؐ کے سامنے اور آگے آنے سے گریز کرتے ان سے متعلق ہے۔ چنانچہ صحابہؓ جنہوں نے حضورؐ کی صحیح اقتداء کی وہ دنیا کے امام بن گئے اور جو لوگ آپؐ سے دور رہے آج ان کا نام و نشان بھی باقی نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

حدیث ۷ : وعن جابرؓ بن سمرة قال خرج علینا رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم فرآنا حلقًا فقال مالی أراکُم عِزِینَ ثُمّ خرج علینا فقال ألا تصفّون کما تصفّ

لہ مرقات ج ۳ صـ۷، مظاہر حق ج ا صـ ۳۸۰

الملائكة عند ربّها فقلنا يا رسول الله وكيف تصفّ الملائكة عند ربّها قال يُتمّون الصفوف الاولىٰ ويتراصّون فی الصفّ رواه مسلم۔

ترجمہ: حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے ہمارے پاس مسجد میں تشریف لائے تو ہمیں مختلف حلقوں کی صورت میں دیکھا پس فرمایا کیا بات ہے کہ میں تمہیں منتشر اور متفرق دیکھ رہا ہوں؟ پھر ایک اور مرتبہ تشریف لائے تو فرمایا کہ تم اس طرح صف بندی کیوں نہیں کرتے جس طرح فرشتے اپنے پروردگار کے پاس رہتے ہیں؟ تو ہم نے کہا یا رسولؐ اللہ فرمایئے کہ فرشتے اپنے رب کے پاس کس طرح صف بندی کرتے ہیں۔ ارشاد فرمایا، پہلے اگلی صفوں کو پورا کرتے ہیں اور صف میں خوب مل کر کھڑے ہوتے ہیں۔ مسلم۔

شرح: حدیث ۲ میں أتمّوا الصفوف کا لفظ گزر چکا ہے اس حدیث میں اس کی شرح آگئی کہ فرشتے پہلے اگلی صفوں کو مکمل کرتے ہیں پھر پچھلی کو پھر ان سے پچھلی کو۔ یہی حکم نماز کی صفوں میں بھی ہے جب تک اگلی صف پوری نہ ہو پچھلی صف میں کھڑا ہونے کی اجازت نہیں ہے: یتراصّون فی الصّف خوب مل کر کھڑے ہوتے ہیں کوئی رخنہ اور دراڑ نہیں چھوڑتے گویا بنیانٌ مرصوصٌ کا مصداق بن جاتے ہیں۔

اور یہ جو فرمایا کہ حضورؐ نے ہمیں حلقے بناتے دیکھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ امام کے آنے سے پہلے ہی صف بندی ہو جانی چاہیئے۔ متفرق حلقے بنا کر بیٹھنا درست نہیں ورنہ امام کے آنے پر از سر نو صف بندی کرنا ہوگی اور وقت ضائع ہوگا۔ اسی لیے حضورؐ نے ازراہِ انکار فرمایا تھا مالی أراكم عِزِين۔

حدیث ۸: وعن أبی هريرةؓ قال قال رسول الله صلّى الله عليه وسلّم خير صفوف الرّجال اوّلها وشرّها آخرها وخير صفوف النّساء آخرها وشرّها اوّلها۔ رواه مسلم

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مردوں کی بہترین صف پہلی ہے اور ان کی سب سے بُری صف پچھلی ہے اور عورتوں کی بہترین صف پچھلی ہے۔ اور ان کی بدترین

صف پہلی ہے۔ مسلم۔

شرح: اس حدیث میں خیر و شر کا لفظ محض صفوں کی ترتیب اور درجے بیان کرنے میں وارد ہوا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ فی نفسہٖ نماز کی صفوں میں کوئی برائی بھی پائی جاتی ہے محض مقابلۃً ایسا فرمایا گیا ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ[1] مردوں کی پہلی صف امام کے قریب ہوتی ہے اور عورتوں سے دُور ہوتی ہے امام سے جس قدر قرب ہوگا اور عورتوں سے جتنا بُعد ہوگا نماز میں اُسی قدر اچھا ہے۔ اور عورتوں کی پہلی صف مردوں سے قریب تر اور پچھلی بعید تر ہوتی ہے اس لیے پچھلی صف بہتر ہوئی بہ نسبت پہلی کے۔ مردوں کو امام کے قریب آنے اور آگے بڑھنے کا حکم ہے اور عورتوں کو مردوں سے دُور کھڑا ہونے کا۔ اس وجہ سے مردوں کو پہلی صف کی رغبت کرنی چاہیئے اور عورتوں کو پچھلی صف کی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

بابُ المَوقف

موقف اسم ظرف ہے وقوف مصدر سے اور اس کا معنیٰ ہے جائے وقوف (کھڑا ہونے کی جگہ)۔ اس سے یہاں مراد مقتدی اور امام کے کھڑا ہونے کی جگہ ہے اس باب میں ایسی احادیث آئیں گی جن سے امام اور مقتدی کے موقف کا پتہ چل جائے۔ نیز یہ کہ جب مقتدی صرف ایک ہو تو کہاں کھڑا ہو اور زیادہ ہوں تو کہاں کھڑے ہوں؟ [2] علامہ سید انور شاہؒ الکشمیری فرماتے ہیں کہ حنفیہ کا عمل عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث کے ظاہر پر ہے جو آگے آرہی ہے کہ جب امام کے علاوہ صرف ایک آدمی ہو۔ تو وہ امام کے دائیں طرف کھڑا ہو اور تھوڑا سا اُس کے پیچھے رہے مثلاً اس کے پنجے اس کی ایڑیوں کے برابر ہوں۔ لیکن جب مقتدی دو ہوں تو احسن یہی ہے کہ امام آگے اور وہ دونوں پیچھے صف بنالیں [3] حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ سعید بن المسیبؒ کا قول ہے جب مقتدی ایک ہو تو وہ امام کے بائیں طرف کھڑا ہو لیکن جمہور کا مسلک اس کے خلاف ہے اور کسی اور کا یہ مذہب نہیں ہے [4] امام مالکؒ نے مؤطا میں باب

---

[1] مظاہر حق ج ۱ صفحہ ۳۸۰، مرقات ج ۳ صفحہ ۷ [2] فیض الباری ج ۲ ص ۲۲۳
[3] فتح الباری ج ۳ ص ۳۹۰ [4] مؤطا مع شرح ج ۱ ص ۱۳۴

باندھا ہے۔ باب یقف الماموم الواحد علی یمین الامام والاثنان خلفہٗ۔ حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ وھذا قول عامۃ اھل العلم۔

الفصل الاوّل

حدیث ۱: عن عبد اللہ بن عباسٍ رضی اللہ عنہما قال بِتُّ فی بیتِ خالتی میمونۃ رضؓ فقام رسولُ اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم یُصلّی فقمتُ عن یسارہٖ فاخذ بیدی من وراءِ ظھرہٖ فَعَدَلَنی کذالک من وراءِ ظھرہٖ الی الشقِ الایمن۔ متّفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی خالہ امّ المؤمنین میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں رات گزاری۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُٹھ کر نمازِ تہجد پڑھنے لگے تو میں بھی آپؐ کے بائیں طرف کھڑا ہو گیا سو آپؐ نے میرا ہاتھ اپنی پیٹھ کے پیچھے سے پکڑا اور مجھے اُسی طرح اپنے پیچھے سے دائیں طرف کو پھیر لیا۔ بخاری و مسلم۔

شرح: حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما دراصل حضورؐ کی نمازِ تہجد ہی دیکھنے کے شوق میں اپنی خالہ کے گھر سوئے تھے اور حضورؐ اس رات کو وہیں تھے۔ [۱] بخاری کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ حضورؐ نے عبد اللہ بن عباسؓ کا سر پکڑ کر انھیں دائیں جانب پھیر لیا تھا۔ ممکن ہے دو واقعات ہوں یا پہلے تو ہاتھ ہی پکڑا ہو مگر پیچھے لے جا کر سر پکڑ کر اُنھیں دائیں طرف گھما دیا ہو۔ بہر حال یہ معمولی تعبیر کا اختلاف ہے۔

[۲] شرح السنہ میں لکھا ہے کہ اس حدیث سے کئی مسئلے نکلتے ہیں ایک تو یہ کہ نمازِ نفل کی جماعت بھی جائز ہے۔ دوسرا یہ کہ مقتدی ایک ہو تو امام کے دائیں طرف کھڑا ہو۔ تیسرا یہ کہ نماز میں ——— بالخصوص نفل میں ——— تھوڑے سے عمل کی گنجائش ہے اور چوتھا یہ کہ مقتدی کو امام کے آگے ہونا جائز نہیں کیونکہ حضورؐ

---

[۱] بخاری مع فتح الباری ج ۲ صفحہ ۳۹۰ — [۲] مظاہر حق ج ۱ صفحہ ۳۸۳، مرقات ج ۳ صفحہ ۷۴

نے ابن عباسؓ کو پیچھے سے پھیرا تھا حالانکہ آگے سے پھیرنا آسان تھا۔ پانچوں یہ کہ جس شخص نے امامت کی نیت نہ کی ہو اس کے پیچھے نماز جائز ہے کیونکہ حضورؐ نے تو اپنی ہی نماز شروع کی تھی اور عبداللہ بن عباسؓ بعد میں شامل ہوئے تھے ـــــ علامہ ابن الہمام نے فرمایا ہے کہ اس حدیث سے نفل کی جماعت ثابت ہوتی ہے حالانکہ نفل کی جماعت کو بدعت کہا گیا ہے۔ بات یہ ہے کہ نفل کی جماعت میں فرض جیسا اہتمام کرنا بدعت ہے اگر اُسے بلا اذان واقامت ایک دو آدمیوں کے ساتھ ادا کریں تو جائز ہے۔ علاوہ ازیں ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ تہجد کی نماز حضورؐ پر فرض تھی اور اُمت کے لیے نفل۔ پس یہاں نفل پڑھنے والے نے فرض والے کی اقتداء کی ہے اس میں کراہت کا کوئی سوال نہیں۔

علامہ سید انور شاہؒ[1] فرماتے ہیں کہ کراہت جب نماز کے اندر طاری ہو تو نماز کے اندر اُسے دُور کرنا اور اس کا ازالہ کرنا جائز ہے اور میں نے یہ مسئلہ اس حدیث سے نکالا ہے۔ کیونکہ عبداللہ بن عباسؓ کا بائیں طرف کھڑا ہونا خلافِ سنت تھا۔ اس کراہت کو دُور کرنے کے لیے حضورؐ نے انھیں پھیر کر دائیں طرف کرلیا تھا پس عمل کثیر یا قلیل ولیسیر کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

حدیث ۲: وَعَنْ جَابِرٍؓ قَالَ قَامَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِیُصَلِّیَ فَجِئْتُ حَتّٰی قُمْتُ عَنْ یَسَارِہٖ فَاَخَذَ بِیَدِیْ فَاَدَارَنِیْ حَتّٰی اَقَامَنِیْ عَنْ یَمِیْنِہٖ ثُمَّ جَاءَ جَبَّارُؓ بْنُ صَخْرٍ فَقَامَ عَنْ یَسَارِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاَخَذَ بِیَدَیْنَا جَمِیْعًا فَدَفَعَنَا حَتّٰی اَقَامَنَا خَلْفَہٗ - رواہ مسلم۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھنے کھڑے ہوئے پس میں آیا حتیٰ کہ آنجنابؐ کے بائیں طرف کھڑا ہو گیا تو آپؐ نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے پیچھے سے گھمایا یہاں تک کہ مجھے اپنے دائیں طرف کھڑا کرلیا پھر حضرت جبارؓ بن صخر آئے تو وہ حضورؐ کے بائیں

---

[1] فیض الباری ج ۲ ص ۲۲۳۔

طرف کھڑے ہو گئے۔ پس حضورؐ نے ہم دونوں کے ہاتھ پکڑے اور ہمیں پیچھے دھکیلا یہاں تک کہ ہمیں اپنے پیچھے کھڑا کر لیا۔ مسلم۔

شرح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایک مقتدی ہو تو امام کے دائیں طرف اور دو یا زیادہ ہوں تو پیچھے صف بنا کر کھڑے ہوں۔ ^ۓ^ علامہ علیؒ القاری فرماتے ہیں کہ حدیث کے ظاہری الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں جو کچھ ہوا وہ نماز شروع کرنے سے پہلے ہوا۔ کیونکہ لفظ یہ ہیں: قام رسول اللّٰہ صلیؐ اللّٰہ علیہ وسلّم لِیُصَلّی الخ یعنی آپؐ نماز پڑھنے کو اُٹھے ابھی شروع نہیں فرمائی تھی۔ لیکن دُوسرا نسخہ لِیُصَلّی کی بجائے یُصَلّی ہے جس سے بظاہر یہ واقعہ نماز کے اندر کا معلوم ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہو تو اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ ایک یا دو حرکتیں نماز کو باطل نہیں کرتیں۔ پھر یہ واقعہ نفل کا ہے کیونکہ حضورؐ سے فرض اکیلے ادا کرنا ثابت نہیں۔ اور نفل میں فرض کی نسبت زیادہ گنجائش ہوتی ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ معلم اوّل اور رسولؐ ہونے کی حیثیت سے ممکن ہے اس قسم کی حرکات بعض دفعہ حضورؐ کی خصوصیت پر محمول کر لی جائیں کیونکہ تعلیم و تلقین کی مصلحت سب سے بلند اور اولیٰ۔ واللّٰہ اعلم بالصّواب۔

حدیث ۳: وعن انسؓ قال صلّیتُ انا و یتیمٌ فی بَیتِنا خلف النّبی صلّی اللّٰہ علیہ وسلم وَ اُمُّ سلیمٍؓ خلفنا۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہمارے گھر میں مَیں نے اور یتیم نے حضورؐ کے پیچھے نماز پڑھی اور حضرت اُم سلیمؓ ہمارے پیچھے تھیں۔

شرح: ^ۓ^ امام بخاریؒ نے اس حدیث کو باب المرأۃ وحدھا تکون صَفًا میں روایت کیا ہے حضرت میرکؒ شاہ فرماتے ہیں کہ تعجب ہے صاحب مشکوٰۃ نے حدیث کو متفق علیہ کیوں نہیں کہا؟ علامہ علی القاریؒ کا ارشاد ہے کہ نسیان اور غفلت سے پاک ذات صرف اللّٰہ سبحانہ، کی ہے۔

ۓ مرقات ج ۳ ص ۷۵، مظاہر حق ج ۱ ص ۳۸۳۔

ۓ مرقات ج ۳ ص ۷۶۔

۱؎ شرح السنہ میں لکھا ہے کہ اس حدیث میں دلیل ہے کہ مردوں کی صف عورتوں سے پیچھے ہو۔ علامہ قاریؒ فرماتے ہیں کہ یہ بات تب مستقیم ہے جبکہ حضرت انسؓ کا اس وقت تک بالغ ہونا ثابت ہو جائے کیونکہ ہجرت کے وقت ان کی عمر صرف دس سال تھی۔ ہاں لڑکوں کی صف کا عورتوں سے آگے ہونا ضرور ثابت ہوا۔

۲؎ اُمّ سلیمؓ حضرت انسؓ کی والدہ کا نام ہے چنانچہ بخاری کی روایت کے الفاظ ہیں وَ اُمّی اُمّ سَلِیم خلفنا۔ اور یتیم یا تو حضرت انسؓ کے چھوٹے بھائی کا نام ہے یا اُن کا عرف ہے اور اصلی نام ضمیرہ تھا۔

۳؎ حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ بچہ اگر ایک ہو تو وہ بالغوں کے ساتھ کھڑا ہو ورنہ مردوں کی صف کے پیچھے بچوں کی صف بنائی جائے مردوں کے ساتھ ان کا کھڑا ہونا مکروہ ہے لیکن عورت ایک ہو یا زیادہ اس کی جگہ سب صفوں کے پیچھے ہے۔ شریعت نے عورت کی صف کو مردوں کے برابر میں بالکل برداشت نہیں کیا۔ یہیں سے امام ابو حنیفہؒ کی نگاہ اس طرف گئی ہے کہ عورت کی محاذات نماز کو فاسد کر دیتی ہے۔ والتفصیل فی الفقہ واللہ اعلم۔

حدیث ۴: وعنہ ان النبی صلّی اللہ علیہ وسلّم صلّی بامّہٖ اَوْخالتہٖ قال فاقامنی عن یمینہٖ و اقام المرأۃ خلفنا۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی والدہ یا خالہ کو نماز پڑھائی۔ انسؓ فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے مجھے اپنے دائیں طرف کھڑا کیا اور عورت کو ہمارے پیچھے کھڑا کیا۔

شرح: بظاہر یہ واقعہ اوپر والی حدیث کے علاوہ کوئی اور معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس میں یتیمؓ کا ذکر بھی تھا اور کہ حضورؐ نے دونوں کو اپنے پیچھے اور عورت کو ان کے پیچھے کھڑا کیا تھا۔

۱؎ مرقات ج ۳ صـ۷۴ ۔ ۲؎ مظاہر حق ج ۱ صـ۳۷۴

۳؎ فیض الباری ج ۲ صـ۲۳۸ ۔

حدیث ۵: وعن ابی بکرۃ رضؓ انّہٗ انتھٰی الی النبی صلی اللہ علیہ وسلّم وھو راکع فرکع قبل ان یصل الی الصف ثم مشٰی الی الصف فذکر ذٰلك للنبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال زادك اللہ حرصاً ولا تعد۔ رواہ البخاری۔

ترجمہ: حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ (یعنی خود) اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے جبکہ آپؐ رکوع میں تھے پس انہوں نے صف میں ملنے سے پہلے ہی رکوع کر لیا اور اسی حالت میں صف کی طرف چل کر گئے۔ پھر انہوں نے یہ واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیان کیا تو حضورؐ نے فرمایا اللہ تیری نیکی اور نماز کی حرص زیادہ کرے اور پھر ایسا نہ کرنا۔ بخاری۔

شرح: [1] جمہور علماء کے نزدیک ایسی صورت میں نماز صحیح ہے۔ کیونکہ حضورؐ نے اسے نماز لوٹانے کا حکم تو نہیں دیا ہاں چونکہ یہ نماز کے وقار اور خشوع وسکون کے خلاف تھا۔ لہٰذا آئندہ کو ایسا کرنے سے منع فرما دیا۔ اس حدیث میں یہ دلیل پائی جاتی ہے کہ جسے رکوع مل جائے اس کی رکعت پوری ہوگئی۔ امام بخاریؒ کا مسلک یہ ہے کہ رکوع کو پا لینے سے رکعت نہیں ملتی اور اس مسئلے کا دارو مدار قرأۃ فاتحہ پر ہے۔ چونکہ اس شخص نے قرأۃ فاتحہ نہیں پائی لہٰذا رکعت بھی نہیں پائی کیونکہ لَاصَلوٰۃَ اِلَّا بِفَاتِحَۃِ الکِتَاب۔ لیکن یہ مسلک تواتر سلف کے خلاف ہے۔ اور حضورؐ کا یہ ارشاد کہ لا تعد اس میں اس صحابیؓ کی نیّت کی تصویب اور اس کے عمل کی خطا کا بیان ہے۔ لَاتَعُدْ میں تین قرأتیں ہیں لَاتَعُدْ (آئندہ ایسا مت کیجیو) لَاتُعِدْ (نماز مت لوٹاؤ) لَاتَعْدُ (بھاگ کر نماز میں مت شامل ہو)۔
[2] حافظ ابن حجرؒ نے لَاتَعُدْ ترجیح دی ہے اور فرمایا ہے کہ تمام روایات میں اسی طرح ضبط کیا گیا ہے۔ اور اس حدیث میں یہ دلالت موجود ہے کہ صف کے پیچھے اکیلے آدمی کی نماز باطل نہیں گو مکروہ ہے۔ امام احمدؒ اور بخاریؒ کا مسلک یہ ہے کہ حضورؐ نے گو اسے اعادہ کا حکم نہیں دیا لیکن لَاتَعُدْ فرما کر آئندہ کو اس فعل کی حرمت ظاہر کر دی پس اس طرح نماز باطل ہے لیکن جمہور کے نزدیک نماز صحیح ہے کراہت میں شک نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

---

[1] فیض الباری ج ۲ ص ۲۹۶۔ [2] مرقات ج ۳ ص ۷۶، مظاہر حق ج ۱ ص ۳۸۴

بابُ الامامۃ

امامت مصدر ہے جس کا معنیٰ ہے امام بننا، مُقتدا ہونا اور رہنما ہونا۔ باب الجماعۃ کی احادیث سے دلالۃً امامت کی اہمیت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ چونکہ امام نماز جیسی عبادت میں رہنمائی کے فرائض ادا کرتا ہے۔ اس لیے اسے لوگوں میں سے عام وفضل اور تقویٰ و طہارت کے لحاظ سے بہترین آدمی ہونا چاہیئے۔ ویسے تو ہر مسلمان کے پیچھے نماز ہو جاتی ہے کیونکہ جماعت کی بہت زیادہ تاکید ہے اور ہر جگہ ہر وقت معیاری آدمی کا میسر آنا عموماً مشکل ہوتا ہے لہٰذا جواز میں تو شبہ نہیں لیکن جب کسی شخص کو منصب امامت کے لیے منتخب کیا جاتے تو اس میں بہترین صفات کا پایا جانا ضروری ہے تاکہ اس کی شخصیت مسلمانوں کی مرکزیت حاصل کر سکے۔ وہ ایسا شخص ہونا چاہیئے جس پر لوگوں کو اچھا اور بھلا آدمی ہونے کی حیثیت سے اعتماد ہو۔ اُسے کم از کم نماز کے ضروری مسائل کا علم ہونا چاہیئے تاکہ لوگوں کی رہنمائی کر سکے، انھیں صحیح طور پر نماز پڑھا سکے اور جب لوگ اس سے نماز کے مسائل دریافت کریں تو بتا سکے۔ احادیث میں امام کو ذمّہ دار قرار دیا گیا ہے پس اس کا ایسا شخص ہونا لازم ہے جو اس ذمہ داری کی اہلیت رکھتا ہو۔

امام بخاریؒ نے امامت کے متعلق باب باندھا ہے باب اھل العلم و الفضل احقّ بالامامۃ اور اس کے نیچے حضورؐ کے مرض الوفات میں جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے امام بناتے جانے کی حدیثیں لائے جن سے یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ چونکہ اعلم اور افضل تھے۔ قال ابو سعید الخدریؓ کان ابو بکرؓ اعلمنا۔ الحدیث۔ اس لیے حضورؐ نے انھیں امامت کا حقدار بنایا۔۔۔ صاحب مشکوٰۃ نے اس باب میں مسلم کی دو احادیث بیان کی ہیں اور تیسری حدیث کا حوالہ دیا ہے جو ایک اور باب میں آتی ہے۔ ان دو احادیث میں اقراء کو امامت کا زیادہ حقدار ٹھیرایا گیا ہے[1] حافظ ابن حجرؒ نے امام نوویؒ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ شافعیہ کے نزدیک افقہ (یعنی اعلم)، امامت میں اقراء پر مقدم ہے کیونکہ قرأت کے مسائل تو ضبط میں آچکے ہیں اور علم وفقہ کے مسائل جن کی نماز میں حاجت ہوتی ہے۔

---

[1] فتح الباری ج ۲ ص ۳۷۹۔

وہ غیر مضبوط ہیں (معلوم نہیں کس وقت کس مسئلہ کی ضرورت آپڑے) اور نماز میں بعض دفعہ ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ سوائے کامل فقیہ اور عالم آدمی کے نماز کی نگرانی و مراعات کوئی نہیں کر سکتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے لوگوں پر حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کو مقدم فرمایا تھا حالانکہ حضورؐ خود ایک حدیث (واقرأھم اُبی بن کعب) میں صراحت فرما چکے تھے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ سے بعض اور لوگ زیادہ قاری تھے۔ اور ہمارے اصحاب شافعیہ نے یؤم القوم اقرأھم کی حدیث کے سلسلے میں یہ جواب دیا ہے کہ صحابہؓ میں سے جو لوگ اقرأ تھے وہی افقہ ہوتے تھے لہٰذا احادیث میں کوئی تعارض نہیں اور امامت کا حقدار اعلم و افضل ہی ہے۔

لہ سید المحدثین علامہ انور شاہؒ فرماتے ہیں کہ حنفیہ کے نزدیک اعلم اقرأ پر مقدم ہے اور امام شافعیؒ سے بھی ایک روایت یہی ہے اور امام شافعیؒ کی مشہور روایت میں اقرأ مقدم ہے اور اصحابِ ابو حنیفہؒ میں سے امام ابو یوسفؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اقرأ کا عرف جو بعد میں حادث ہوا وہ یہاں مراد نہیں ہے بلکہ یہ لفظ صحابہ رضؓ کے حالات اور ان کے زمانے کے عرف کے مطابق فرمایا گیا ہے۔ ان کے ہاں اقرأ وہ شخص ہوتا تھا جو قرآن کا زیادہ حافظ ہوتا تھا اور فقہ میں اقرأ سے مراد وہ شخص ہے جو تجویدِ قرآن میں اعلیٰ ہو اور یہ بعد کی اصطلاح ہے۔ صحابہؓ خود اہلِ زبان تھے اور تصحیح حروف کے محتاج نہیں تھے۔ پس اس معنیٰ کی بناء پر یہ حدیث (اقرأ والی) موقع نزاع سے خارج ہو گئی۔ کیونکہ فقہ میں جو اختلاف ہے وہ یہ ہے کہ زیادہ تجوید جاننے والا مقدم ہے یا زیادہ عالم۔ نہ یہ کہ وہ شخص جو قرآن کا زیادہ حافظ ہو۔ اور صاحبِ ہدایہ نے جو یہ کہا ہے کہ صحابہؓ میں سے جو اقرأ تھے وہی اعلم ہوتے تھے۔ یہ نہایت درست بات ہے کیونکہ صحابہؓ قرآن کے محض الفاظ ہی نہیں پڑھتے تھے بلکہ اس کے علم کی گہرائیوں اور عمل کی بنیادوں میں بھی اُترتے تھے۔ اور ان کے حفظ قرآن کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ وہ اسے معانی سمیت محفوظ کرتے تھے اس لیے ان میں جو اقرأ ہوتا تھا وہی اعلم بھی ہوتا تھا۔ اور اس حدیث میں گو اقرأ کو ترجیح دی ہے لیکن جب بہت سے یا چند اقرأ جمع ہوں تو ان میں ترجیح پھر اعلم کو ہی دی گئی ہے کیونکہ فرمایا گیا ہے کہ اگر لوگ قرأت میں برابر ہوں تو اعلمھم بالسنۃ امامت کا زیادہ حقدار ہے۔ پس معلوم ہوا کہ

لہ فیض الباری ج ۲ صـ ۲۰۸ ۔

قرآن کے الفاظ کو یاد کر لینا یا اچھی طرح ادا کر دینا وجہ ترجیح نہیں ہے بلکہ وجہِ ترجیح علمِ سُنّت ہے اور حاصلِ حدیث یہی نکلا کہ وہ شخص جو اقراء اور اعلم ہو اسے دوسروں پر ترجیح دی جائے گی۔ اس سے ثابت ہوا کہ ہمارے فقہاء نے حدیث کی جو اصل غرض ہے۔ اس پر عمل کیا ہے کیونکہ شارع کی اصل غرض یہ ہے کہ اَعلم کو مقدم کیا جائے اور اقراء کو اس وجہ سے مقدم فرمایا گیا ہے کہ اس زمانے کا اقراء علم میں بھی مقدم ہوتا تھا۔ پھر یہ بھی یاد رہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سارے صحابہ سے فہمِ دین میں سب سے بہتر تھے اور تعلق باللہ اور خوفِ خدا میں سب سے بڑھ کر تھے اور قرآن کہتا ہے اِنّما یخشی اللّٰہ من عبادہ العلمآء۔ ورنہ جہاں تک حفظِ حدیث کا تعلق ہے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سارے صحابہ سے بڑھے ہوئے تھے۔

الفصل الاوّل

حدیث ۱: عن ابی مسعودؓ قال قال رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم یؤمّ القوم اقرأھم لکتاب اللّٰہ فان کانوا فی القرأۃ سواءً فأعلمھم بالسنّۃ فان کانوا فی السنّۃ سواءً فاقدمھم ھجرۃً فان کانوا فی الھجرۃ سواءً فأقدمھم سنّاً وَلَا یَؤُمَّنَّ الرّجل الرّجل فی سلطانہٖ ولا یَقْعُدُ فی بیتہٖ علی تکرمتہٖ اِلّا باذنہٖ۔ رواہ مسلم۔ و فی روایۃٍ لہٗ وَلَا یؤمّنّ الرجل الرّجل فی اھلہٖ۔

ترجمہ: حضرت ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ لوگوں کی امامت وہ شخص کرے جو کتاب اللہ کا سب سے بہتر قاری ہو۔ پھر اگر وہ قرأت میں برابر ہوں تو جو سنّت کا زیادہ جاننے والا ہو۔ اگر وہ سنّت کے علم میں بھی برابر ہوں تو جو عمر میں زیادہ بڑا ہے۔ اور کوئی شخص کسی دوسرے کے اختیار و سلطنت اور حدودِ حکومت میں ہرگز اُس کا امام نہ بنے اور اُس کے گھر میں اُس کی اجازت کے بغیر اُس کی مسند پر نہ بیٹھے۔ اسے مسلم نے روایت کیا۔ اور اس کی ایک روایت میں یہ لفظ ہے کہ کوئی آدمی ہرگز

کسی دوسرے کے گھر میں اس کا امام نہ بنے۔

شرح: لہ حضرت عمروؓ بن سلمہ کی حدیث میں یہ الفاظ ہیں ولیؤمکم اکثرکم قرآناً
بخاری نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ حضورؐ کی مدینہ میں تشریف آوری سے قبل مہاجرین اولین نے قباء کے مقام پر حضرت سالمؓ مولیٰ ابی حذیفہ کو امام مقرر کر رکھا تھا۔ و کان اکثرھم قرآناً اور وہ قرآن کا سب سے زیادہ عالم تھا۔ ان دلائل سے معلوم ہوا کہ صحابہؓ میں اقراء کا محاورتی معنی یہی تھا کہ جو شخص قرآن کو زیادہ جانتا ہو یا زیادہ قرآن سیکھ چکا ہو۔ یہیں سے فقہاء حنفیہ نے کہا ہے کہ حدیث میں اقراء کا وہی معنی مراد ہے جو اس وقت رائج تھا یعنی اعلم وافقہ۔ یہ سالمؓ حضرت ابوحذیفہؓ کے آزاد کردہ غلام تھے بڑے جلیل القدر صحابی تھے، حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دورِ خلافت میں جنگِ یمامہ میں شہید ہوئے تھے۔

۲ے امام احمدؒ اور امام ابویوسفؒ کا مسلک ہے کہ امامت کے لیے قاریٔ قرآن مقدم ہے اور انہوں نے اس حدیث کے الفاظ اقرأھم سے استدلال کیا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام محمدؒ اور امام شافعیؒ کا مذہب یہ ہے کہ امامت میں اعلم مقدم ہے کیونکہ اقراء کی تو صرف ایک رکن یعنی قرأت میں احتیاج ہے اور اعلم کی ضرورت تمام ارکانِ صلوٰۃ میں ہے۔ اور اس زمانے میں اعلم ہی اقرا بھی ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ لوگ قرآن کو احکام و معانی سمیت سیکھتے تھے۔ ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ اب چونکہ ہجرت منقطع ہو چکی ہے لہٰذا اس حدیث میں اقدمھم ھجرۃً سے اب معاصی سے ہجرت مراد لی جائے گی یعنی اتقیٰ کو اعلم و اقراء کے بعد مقدم کیا جائے گا۔ اور اس حدیث میں تو صرف اتنے ہی مراتب بیان ہوئے ہیں لیکن اسنّ (بڑی عمر والا) کے بعد بعض علماء نے زیادہ خوش خلق کو رکھا ہے، اس کے بعد خوبصورت ترین شخص کو اور اس کے بعد شرافتِ نسب کا لحاظ ہوگا۔ اور اگر بالفرض ان سب امور میں برابر ہوں تو قرعہ اندازی کی جائے گی۔

۳ے اور اس حدیث میں جو فرمایا ہے کہ لا یؤمّنّ الرّجل الرجل سلطانہ،

لہ فتح الباری ج ۲ صـ ۳۸۷ ۔ ۲ے مظاہر حق ج ۱ صـ ۳۸۷ ، مرقات ج ۳ صـ ۸
۳ے مرقات ج ۳ صـ ۸۲ ، مظاہر حق ج ۱ صـ ۳۸۷ ۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص کے حدودِ سلطنت و اختیار مثلاً امارت و حکومت میں وہی امام بنے یا اُس کا ماذون نائب۔ اس میں شرعاً بڑی بڑی مصلحتیں ہیں۔ سب سے بڑی یہ کہ اسلام میں دین و دنیا کا تصوّر الگ الگ نہیں ہے۔ پھر یہ ایک انتظامی مسئلہ بھی ہے کہ سب سے بڑا حاکم اپنے دار الحکومت میں خود امامِ صلوٰۃ بنے اور اس کی اجازت کے بغیر کوئی اور امامت نہ کرے تاکہ بدنظمی، حسد و بغض اور ترکِ تعلقات تک نوبت نہ پہنچے ورنہ اختلافات ظہور میں آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اتحاد و اتفاق کو برقرار رکھنے کے لیے حضرت عبد اللہ بن عمرؓ اپنے سارے شرف و فضل کے باوجود حجاج بن یوسف جیسے ظالم گورنر کے پیچھے نماز پڑھتے تھے۔ حدودِ سلطنت کے معاملے میں محلّے کا مقرّر امام بھی شامل ہے کہ اس کی موجودگی میں باقی تمام شرطیں کالعدم ہو جائینگی اور اعلم و اقرآء سب اسی کے پیچھے نماز ادا کریں گے۔ ہاں وہ اجازت دے دے تو الگ بات ہے۔ اور دوسری حدیث کے لفظ فی اھلہٖ سے بھی تقریباً یہی مراد ہے۔

حدیث ۲ : وعن ابی سعیدؓ قال قال رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم اذا کانوا ثلاثۃ فلیؤمّھم احدھم و احقّھم بالامامۃ اقرأھم۔ رواہ مسلم

ترجمہ : حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب تین آدمی جمع ہوں تو ان میں سے ایک ان کا امام بنے اور امامت کا زیادہ حقدار اُن میں سے اقرأ ہے۔ مسلم۔

شرح : اقراء پر گفتگو ہو چکی۔ اس حدیث میں ہر مسلمان کی امامت کے جواز کی دلیل ہے کیونکہ زیادہ مستحق امامت کے ذکر سے قبل فرمایا فلیؤمّھم احدھم۔ اور تین آدمیوں کا لفظ لازمی قید نہیں لگاتا بلکہ یہ اتفاقی قید ہے۔ [1] مالکؓ بن الحویرث کی حدیث جس پر امام بخاریؒ نے باب رکھا ہے۔ اثنان فما فوقھما جماعۃ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جماعت کی

---

[1] بخاری مع شرح ج ۳ ص ۳۶۵۔

کم از کم تعداد دو ہے۔ حضورؐ نے مالکؓ بن الحویرث اور ان کے بھائی سے فرمایا تھا اذا حضرت الصلوٰۃ فاذّنا واقیما ثم لیؤمّکما اکبرکما۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ دونوں حضرات چونکہ علم و قرات وغیرہ میں برابر تھے اس لیے اکبرکما کا لفظ ارشاد فرمایا گیا۔ اور یہی وہ حدیث ہے جس کا حوالہ صاحب مشکوٰۃ نے دیا ہے کہ میں نے مالکؓ بن الحویرث کی حدیث کو باب فضل الاذان کے بعد والے باب میں درج کیا ہے۔

لہ شارح طیبیؒ فرماتے ہیں کہ حضورؐ کے صحابہؓ زیادہ تر بڑی عمر میں اسلام لاتے تھے پس وہ قرأت قرآن سیکھنے سے پہلے علم و فقہ سیکھتے تھے لہٰذا اُن میں جو قاری ہوتا وہ فقیہ بھی ہوتا تھا۔ لیکن بعد والے لوگوں نے بچپن میں قرأت سیکھنا اور اس کے بعد علم و فقہ حاصل کرنا شروع کیا۔ واللہ اعلم۔

حدیث ۳: وَذُکِرَ حدیثُ مالکٍؓ بن الحویرث فی بابٍ بعد باب فضل الاذان۔

ترجمہ: اور حضرت مالکؓ بن الحویرث کی حدیث باب فضل الاذان کے بعد والے باب میں بیان کی گئی ہے۔

یعنی مصابیح میں وہ حدیث یہاں باب الامامۃ میں تھی لیکن میں نے اُسے دوسری جگہ رکھا ہے۔ یعنی اس حدیث کا تعلق بھی گو مسئلہ امامت کے ساتھ ہے اور اسی لیے صاحب مصابیح نے اسے اس باب میں رکھا تھا لیکن اس میں اذان کا ذکر بھی ہے جس کی بناء پر میں نے اسے دوسری جگہ رکھ دیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

بابُ ما علی الامام

۱ اس باب میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ امام کے لیے مقتدیوں کی رعایت و سہولت کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ امام کو ایسی صورت اختیار نہیں کرنی چاہیے

لہ مرقات ج ۳ ص ۸۲، مظاہر حق ج ۱ ص ۳۸۸۔

جس سے مقتدیوں میں اختلاف اور فتنہ پڑے بلکہ اسے سب لوگوں میں اتحاد و یگانگت پیدا کرنا اور انھیں مرکزیت سے وابستہ رکھنا لازم ہے۔ اس کے پیشِ نظر تخفیف ہونی چاہیئے اور سارے مقتدیوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ ورنہ مقتدیوں میں نفرت پھیلے گی اور جماعت کی وحدت انتشار کا شکار ہو جائے گی۔ دین کے ساتھ براہ راست تعلق رکھنے والے مبلّغین ائمہؒ، علماء اور مشائخ کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اسلام کو پیش کرنے میں حکمت اور تیسیر کو مدِّنظر رکھیں۔ اسے آسان اور سادہ بنا کر پیش کریں تاکہ لوگ اسے قبول کریں کوئی حرکت ایسی نہ کریں جس سے عوام میں نفرت پیدا ہو۔

الفصل الاوّل

حدیث ۱: عن انسؓ قال ما صلّیتُ وراء امامٍ قطّ اَخَفَّ صلوٰۃً وَ لَا اُتَمّ صلوٰۃً مِن النّبی صلّی اللہ علیہ وسلّم وَ ان کان لَیَسْمَعُ بُکاءَ الصّبیِّ فَیُخَفِّفُ مَخَافَۃَ اَنْ تُفْتَنَ اُمُّہٗ۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے کسی ایسے امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھی جس کی نماز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ ہلکی پھلکی اور زیادہ پوری ہو۔ آپؐ کا تو یہ حال تھا کہ بچّے کے رونے کی آواز سُنتے تو اس خیال سے نماز میں تخفیف فرما دیتے تھے کہ کہیں اس کی ماں کو تشویش نہ ہو۔ بخاری و مسلم۔

شرح: ؎ حدیث کے پہلے جملے کا معنی یہ ہے کہ حضورؐ کی نماز میں دو وصف پائے جاتے تھے؛ پہلا یہ کہ وہ سُبک ہوتی تھی اور دوسرا یہ کہ سُبک ہونے کے باوجود پوری اور مکمل ہوتی تھی۔ سُبک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ حضورؐ قرأت اور تسبیحات حد سے زیادہ نہ پڑھتے تھے اور قرأت میں بے محل شدّ و مدّ نہ کرتے تھے بلکہ آپؐ کی قرأت بے تکلّف اور ترتیل کے ساتھ ہوتی تھی اور بعض اوقات اگر نماز طویل بھی ہوتی تو بھی لوگوں پر گراں نہ گزرتی بلکہ انھیں ہلکی ہی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود تعدیلِ ارکان میں نقصان نہ آتا تھا اور رکوع و سجود اور قومہ و جلسہ بالکل درست اور پورے ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ امام کو تسبیح وغیرہ اتنی طویل نہ کرنی چاہیئے

؎ مظاہر حق ج ا صـ ۳۹۲، مرقات ج ۳ صـ ۹۰۔

کہ لوگ ملول ہونے لگیں کیونکہ اس طرح کرنے سے لوگوں میں نفرت پھیلتی ہے۔ ہاں اگر سب مقتدی خوش ہوں تو نماز لمبی کرنے میں حرج نہیں جیسا کہ بعض احادیث میں ایسا بھی آتا ہے۔ لیکن عام حکم یہی ہے کہ امام کو تخفیف کرنی چاہیئے کہ مقتدی اکتا نہ جائیں اور جماعت میں سے کمزور ترین آدمیوں کو پیش نظر رکھ کر نماز پڑھانی چاہیئے۔ صحیحین کی روایت میں حضورؐ نے اس پر سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا تھا کہ لوگ تو کاروباری تھے، تھکے ماندے تھے اور نماز سے فارغ ہو کر جلد آرام کرنا چاہتے تھے لیکن امام لمبی سورتیں پڑھنا شروع کر دیتا تھا۔ آخر نتیجہ یہی ہوا کہ ایک شخص نماز توڑ کر اکیلا پڑھ گیا اور حضورؐ سے دوسرے دن جا کر شکایت کر دی۔ حضورؐ نے اس امام کو ڈانٹا اور آئندہ اس کا سدّباب فرما دیا۔ امام کو قرأت و تسبیحات میں سنّت کے اندر رہتے ہوئے کم از کم پڑھنا چاہیئے تاکہ لوگوں میں بیزاری نہ پیدا ہو جائے۔

لہ حدیث کے آخری جملے کا مطلب یہ ہے کہ بچّے کے رونے کی آواز سن کر اس خیال سے کہ کہیں اس کی ماں ہمارے ساتھ شریکِ جماعت نہ ہو اور اسے تشویش نہ لاحق ہو جائے نماز میں تخفیف فرما دیتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ چیز خشوع و خضوع کے منافی نہیں ہے۔ امام خطابیؒ فرماتے ہیں کہ اگر امام کسی شخص کی آہٹ پاتے جو وضو کر کے نماز میں شامل ہونے کے ارادہ سے آرہا ہے اور امام رکوع میں ہے تو اسے اتنا انتظار کر لینا کہ وہ شامل ہو جائے جائز ہے اور خلافِ خشوع نہیں ہے۔ لیکن امام مالکؒ وغیرہ نے اس سے منع فرمایا ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ چیز غیر اللہ کے لیے نہیں بلکہ تکبیرِ جماعت کے لیے ہے اور مطلوب شرع ہے۔ اور بعض علماء نے اس میں شرط لگا دی ہے کہ اگر امام اُس آنے والے کو پہچانتا نہیں اور محض للّٰہ انتظار کر رہا ہے کہ اسے بھی رکعت ملنے کا ثواب حاصل ہو جائے تب تو جائز ہے ورنہ شرک کا خطرہ اور نماز کے ایک حصّے کا غیر اللہ کے لیے ہو جانے کا اندیشہ ہے اس لیے اس کا ترک ہی اَولیٰ ہے۔ لیکن تخفیف کا معاملہ اس کے برعکس ہے جیسا کہ اُوپر گزرا ہے۔ وہاں بندے کا حق نہیں بلکہ خدا کا تعلق فائق ہے اور اسی کے لیے تخفیف ہو رہی ہے۔ فقہ کی کتابوں میں اس مسئلے کا نام مسئلۃ الریاء ہے۔

حدیث: وعن ابی قتادہ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم انی لأدخل فی الصّلوٰۃ وانا اُرید اطالتھا

لہ مرقات ج ۳ ص ۹۰ ۔

فاسمعُ بکاء الصّبی فاتجوّز فی صلاتی ممّا اعلم بہٖ من شدّۃ وجد اُمّہٖ من بُکائہٖ۔ رواہ البخاری۔

ترجمہ: حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ میں نماز میں داخل ہوتا ہوں اور اسے لمبا کرنے کا ارادہ کرتا ہوں پھر بچے کے رونے کی آواز سنتا ہوں تو نماز کو مختصر کر دیتا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اس کی ماں کو اس کے رونے سے سخت فکرمندی اور تشویش لاحق ہوگی۔ بخاری۔

شرح: ؎۱ امام ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے بچوں کو مسجد میں داخل کرنے کے جواز پر استدلال کیا گیا ہے لیکن یہ استدلال کامل نہیں کیونکہ ممکن ہے رونے والا بچہ مسجد کے آس پاس کے کسی گھر میں ہو۔ اور اس حدیث سے عورتوں کے مردوں کے ساتھ با جماعت نماز پڑھنے کے جواز پر استدلال کیا گیا ہے۔ اس حدیث سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنے اصحاب پر شفقت اور ان میں سے ہر بڑے چھوٹے کی رعایت ثابت ہوتی ہے۔ اور حضورؐ نے یہ جو ارشاد فرمایا کہ میں نماز کو طویل کرنا چاہتا ہوں لیکن بچے کے رونے کی آواز سن کر مختصر کر دیتا ہوں اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص نماز میں کسی مستحب کام کو کرنا چاہے اسے کسی عذر سے ترک کر سکتا ہے اور اس پر اپنے ارادے کا اتمام واجب نہیں۔ اور وجد کا معنی غم و حزن ہے اور ماں کا ذکر اس بناء پر ہے کہ غالباً بچہ ماں کی جدائی سے رو پڑتا ہے ورنہ ماں کے علاوہ جو لوگ اور بھی اس معنی میں یہی مقام رکھتے ہیں اُن کا بھی یہی حکم ہے۔ اس حدیث سے ایک خالص دنیوی مصلحت کی وجہ سے نماز کو مختصر کرنے کا ثبوت ملتا ہے پس اگر کسی دینی مصلحت سے اسے مختصر کیا جاتے تو بدرجہ اولیٰ جائز ہوگا۔ لیکن یہ حکم صرف تخفیف کے لیے ہے۔ نماز کو کسی شخص کے لیے لمبا کرنا اس سے الگ ایک دوسری چیز ہے گو بعض علماء نے اسے بھی جائز قرار دیا ہے۔ بشرطیکہ جماعت پر شاق نہ گزرے۔

؎۲ لیکن اس تخفیف کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تعدیلِ ارکان یا رکوع و سجود اور قومہ و جلسہ وغیرہ میں نقص پیدا کر دیا جاتے بلکہ نماز میں جہاں تطویل ہو سکتی ہے مثلاً لمبی قرأت

؎۱ فتح الباری ج ۳ ص ۳۹۵، ۳۹۶۔

؎۲ قسطلانی ج ۲ ص ۶۵۔

کرنا، اس میں تخفیف مراد ہے چنانچہ امام بخاریؒ نے ایک باب باندھا ہے باب تخفیف الامام فی القیام و اتمام الرکوع والسجود اور ایک اور باب رکھا ہے باب ایجاز الصلوٰۃ واکمالہا ۔ علیٰ ہذا القیاس رکوع وسجود وغیرہ ارکان میں بھی بہت زیادہ تطویل کرنے سے روکنا مدنظر ہے۔

[۱] نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت سے اور آپؐ کے طریقے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کے رکوع اور سجود کی ایک محدود مقدار ہوتی تھی لیکن قیام میں ایسا نہیں تھا کیونکہ وہ اختلافِ احوال سے بدلتا رہتا تھا۔ اور یہ حکم فرض کے لیے ہے، رہ گئی صلوٰۃ اللیل تو اُس کے رکوع وسجود اور قیام سب غیر محدود ہوتے تھے کیونکہ وہ آپؐ کی اپنی نماز ہوتی تھی۔ اور ہر آدمی اپنی الگ نماز میں مختار ہے۔

حدیث ۳ : وعن ابی ھریرةؓ قال قال رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم اذا صلّٰی احدکم للنّاس فلیخفّف فان فیھم السّقیمَ و الضّعیفَ والکبیر و اذا صلّٰی احدکم لنفسہٖ فلیُطوّل ما شاءَ ۔ متّفق علیہ۔

ترجمہ : حضرت ابوھریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا: جب تم میں کوئی آدمی لوگوں کو نماز پڑھائے تو ہلکی پڑھائے کیونکہ ان میں بعض بیمار، کمزور اور بڑی عمر کے بھی ہوتے ہیں اور جب تم میں سے کوئی اکیلا نماز پڑھے تو جتنی چاہے لمبی کرے۔ بخاری ومسلم۔

شرح : [۲] حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ تخفیف کا معنی ہے ارکان و ابعاض کو ادا کرنا اور اذکارِ مسنونہ متوسطہ کو اختیار کرنا نہ کہ لمبے لمبے اذکار پڑھنا۔ اور مقتدیوں کی جماعت جب تطویلِ صلوٰۃ پر راضی ہو تو وہ منفرد کے ہی حکم میں ہے۔ فتاویٰ عالمگیریؒ میں ہے کہ مستحب قرأت سے امام زائد نہ پڑھے اور قوم پر بوجھ نہ ڈالے بلکہ نماز کو کامل اور مستحب طریقہ پر ادا کرتے ہوتے تخفیف کرے۔

[۳] علامہ ابن دقیق العیدؒ فرماتے ہیں کہ تطویل وتخفیف امورِ اضافیہ میں سے ہیں کیونکہ

---

[۱] فیض الباری ج ۲ ص ۲۳۲ ۔ [۲] مسوّٰی و مصفّٰی ص ۱۳۴ ۔
[۳] فتح الباری ج ۳ ص ۳۹۴ ۔

ایک چیز ایک قوم کی عادت کے لحاظ سے خفیف ہوتی ہے اور دوسری قوم کی عادت کے لحاظ سے طویل ہوتی ہے۔ اور فقہاء کا یہ قول کہ امام رکوع وسجود میں تین تسبیحات پر اضافہ نہ کرے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم سے ثابت ان احادیث کے خلاف نہیں ہے کہ آپؐ تین سے زائد تسبیحات کہتے تھے کیونکہ صحابہؓ کی عادت اور نیکی میں ان کی رغبت کے پیشِ نظر یہ تطویل نہ تھی علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ تخفیف کی بہترین حد ابو داؤد اور نسائی کی اُس حدیث میں آئی ہے جس میں حضورؐ نے عثمانؓ بن ابی العاص کو ان کی قوم کا امام مقرّر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ واقد والقوم با ضعفھم لوگوں کا اندازہ اُن میں سے کمزور ترین شخص کے مطابق لگاؤ۔" اور ضعیف میں بیمار، نحیف اور بوڑھے سبھی داخل ہیں۔ اور دوسری حدیث میں ضعیف، بوڑھے اور حاجت مند کے الفاظ آتے ہیں۔

ا۔ فلیطوّل ماشاء علّامہ علیؒ القاری فرماتے ہیں کہ حدیث کے ظاہری الفاظ سے بعض شافعیہ کے اس قول کا ردّ ہوتا ہے کہ اعتدال اور دو سجدوں کے درمیانی جلسے کو لمبا کرنا نماز کو باطل کرنے والا ہے۔

حدیث ۴: وعن قیسؒ بن حازم قال اخبرنی ابو مسعودؓ انّ رجلاً قال واللہ یا رسول اللہ انّی لَا تأخّرُ عن صلوٰۃِ الغداۃِ من اجلِ فُلانٍ مِمّا یُطیل بنا فما رأیتُ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم فی موعظۃٍ اشدّ غضباً منہ یومئذٍ ثُمّ قال انّ منکم منفّرین فایّکم ماصلّی بالنّاس فَلیتجوّز فَاِنّ فیھم الضعیف وَالکبیر وَ ذا الحاجۃ۔ متّفق علیہ۔

ترجمہ: قیسؒ بن ابی حازم سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا مجھے ابو مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بتایا کہ ایک شخص نے حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہ میں خدا کی قسم فجر کی نماز باجماعت سے اس لیے پیچھے رہ جاتا ہوں کہ فلاں شخص ہمیں لمبی نماز پڑھاتا ہے۔ سو میں نے اس دن سے زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وعظ میں کبھی ناراض نہیں دیکھا۔ پھر حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ یقیناً تم میں سے بعض لوگ نفرت دلانے والے ہیں پس

ا۔ مرقات ج ا ص ۹۱

تم میں سے کوئی شخص جو نماز لوگوں کو پڑھائے تو اسے مختصر پڑھائے کیونکہ لوگوں میں کمزور، بوڑھے اور حاجت مند بھی ہوتے ہیں۔ بخاری و مسلم۔

شرح: مقتدیوں میں جماعتی احساس کا زندہ رکھنا اور ان کے اتحاد کو قائم رکھنا امام کے فرائض میں سے ہے۔ چونکہ اُس امام کی لمبی نماز سے جماعت میں انتشار پیدا ہو رہا تھا اور اتفاق ٹوٹ رہا تھا۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم شدید غضبناک ہوتے اور نفرت انگیزی سے منع فرما دیا۔ [1] امام بخاریؒ نے باب من شکی امامہ اذا طوّل میں اس حدیث کے علاوہ جابر بن عبداللہؓ کی حدیث بھی درج کی ہے جس میں حضرت معاذ بن جبلؓ کا نام آیا ہے کہ ان کی لمبی قرأت کی وجہ سے ایک آدمی نماز سے الگ ہو گیا اور حضورؐ سے شکایت کر دی تو حضورؐ نے تین مرتبہ ارشاد فرمایا کہ اے معاذؓ کیا تم فتنے میں ڈالنے والے ہو؟ تم نے سورۂ اعلیٰ، سورۂ شمس اور واللیل کیوں نہ پڑھیں۔ کیونکہ تیرے پیچھے بوڑھے، کمزور اور ضرورت مند بھی نماز پڑھتے ہیں۔ یہ واقعہ نماز عشاء کا ہے اور حضرت ابو مسعودؓ انصاری والی اوپر کی حدیث کا واقعہ فجر کا ہے۔ پس یہ دو الگ الگ واقعات ہیں۔ اس حدیث سے امام کے فرائض اور ذمہ داریوں پر واضح روشنی پڑتی ہے۔

[2] علامہ قسطلانی فرماتے ہیں کہ حدیث کا جملہ فانّ فیھم الضعیف والکبیر و ذا الحاجۃ حضورؐ کے مذکور حکم کی تعلیل ہے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ جب مقتدیوں میں ان صفات سے موصوف کوئی نہ ہو یا وہ محصور (گھرے ہوتے یا قیدی) ہوں، اور تطویل پر راضی ہوں تو تطویل مضر نہیں کیونکہ علّتِ نہی موجود نہیں۔ اور حضورؐ کا دوسری حدیث میں یہ ارشاد فرمانا کہ میں نماز کو لمبا کرنے کا ارادہ کرتا ہوں۔ مگر بچے کے رونے کی آواز سُن کر نماز کو مختصر کر دیتا ہوں اس بات کی دلیل ہے کہ حضورؐ نے تطویل کا ارادہ تو فرمایا لیکن ایک علّت کی وجہ سے ترک فرما دیا۔

حدیث ۵: وعن ابی ھریرۃؓ قال قال رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم یُصلّون لکم فان اصابُوا فلکم و اِن اخطأوا فلکم وعلیھم۔ رواہ البخاری۔

---

[1] بخاری مع فتح الباری ج ۳ ص ۳۹۴۔ [2] ارشاد الساری ج ۲ ص ۶۶

ترجمہ: حضرت ابوھریرہؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ امام تمہیں نماز پڑھائیں گے پس اگر انہوں نے ٹھیک ٹھیک پڑھائی تو تمہاری نماز ٹھیک ٹھیک ہوگئی۔ لیکن اگر انہوں نے درست نہ پڑھائی اور خطا کی تو تمہاری نماز تو ہوگئی لیکن گناہ کا وبال اُن پر ہے۔ بخاری۔

شرح: ؎۱ یہ حدیث اس بارے میں وارد ہوئی ہے کہ امام نماز کے خارجی امور میں تقصیر کریں مثلاً نماز کے مکروہ وقت میں ادا کریں۔ نہ یہ کہ واجبات وارکان میں تقصیر کریں جو کہ نماز کے اجزاء ہیں اور یہ چیز کتنی اور حدیثوں میں صراحت سے آگئی ہے۔ قاضی عیاض رحمۃ اللہ نے یہی فرمایا ہے۔ ابوداؤد میں ایک حدیث کے الفاظ ہیں کہ جو شخص لوگوں کا امام ہو اور صحیح وقت پر پڑھاتے تو اسے بھی اجر ملتا ہے اور لوگوں کو بھی۔ اور اگر وہ وقت میں نقص ڈالے تو گناہ امام پر ہے مقتدیوں پر نہیں۔ مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ جب تک حکّام جور نماز قائم رکھیں ان کا ساتھ دیا جاتے اور بغاوت نہ کی جاتے۔ یعنی ان کی اطاعت کا معیار یہ ہے کہ ان کی نماز پر نماز کا نام بولا جا سکے لیکن جب اس پر سے نماز کا نام ہی اُٹھ جاتے تو کوئی اطاعت نہیں۔ البحر میں ہے کہ امام اگر فاسق بھی ہو تو بھی جماعت اکیلے نماز پڑھنے سے افضل ہے اور اس کے فسق کا گناہ اس کے ذمہ ہے۔ پس دراصل یہ حدیث ایسے ہی اماموں کی اقتداء میں نماز ادا کرنے پر مقتدیوں کو تسلّی کے لیے آئی ہے اور اس میں ائمہ جور وفسق کا ذکر ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اگر امام بے وضو نماز پڑھا دے یا تعدیلِ ارکان کو ترک کردے یا اس کے اجزاء میں نقص وارد کردے تو اس کے لیے بھی حدیث سندِ جواز ہے جیسا کہ شافعیہ نے سمجھا ہے اور اس پر لمبی چوڑی بحثیں کی ہیں۔

اس حدیث سے التزامِ جماعت کی اہمیت کے علاوہ امام کی ذمہ داری بھی ثابت ہوتی ہے۔ ؎۲ امام احمدؒ نے اس حدیث کی روایت میں یہ الفاظ درج فرماتے ہیں فان صلّوا الصلوٰۃ لوقتھا واتمّوا الرّکوع والسجود فھی لکم ولھم۔ ابن بطالؒ نے ابوھریرہؓ کی روایت کے ظاہر سے تمسک کرتے ہوتے کہا ہے کہ فان اصابوا سے مراد اصابۃ الوقت ہے۔ ؎۳ اور نسائی

؎۱ فیض الباری ج ۲ ص ۲۲، مظاہر حق ج ۱ ص ۳۹۳

؎۲ فتح الباری ج ۳ ص ۳۸۸، ؎۳ قسطلانی ج ۲ ص ۶۰

وغیرہ میں ابن مسعودؓ سے جو روایت ہے اس سے بھی اَصَابُوا سے مرادِ اصابۃ الوقت ہی معلوم ہوتی ہے ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

بابُ ماعلی المأموم من المتابعۃ وحکم المسبُوق

اِس باب میں یہ بیان ہوگا کہ مقتدی پر امام کی متابعت لازم ہے اور جو شخص شروع سے امام کے ساتھ نہیں تھا بعد میں آکر شامِل جماعت ہوا اس کے احکام کیا ہیں ؟

لہ حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ ارکانِ نماز میں مقتدیوں کو امام کی متابعت کرنا واجب ہے اور یہ صفت قطعًا نفسِ صلوٰۃ سے متعلق ہے بروئے حدیث اِنّما جُعِلَ الامام لِیُؤتَمّ بہٖ ۔ اور افرادِ جماعت کے درمیان عرفًا اتحادِ مکان ضروری ہے اور عرف کی قید ہم نے اس لیے لگائی ہے کہ صفوں کی کثرت اور ان کا ایک دوسری سے متصل ہونا بعید کو قریب کر دیتا ہے اور دیواروں کا حائل ہو جانا قریب کو بعید کر دیتا ہے ۔ اور مسجد عرفِ شرع میں ایک ہی مکان ہے ۔ اور نیّتِ اِقتداء کا پایا جانا بھی ضروری ہے کیونکہ مقتدی اور امام میں بغیر نیّتِ اقتداء کے اقتداء نہیں ہو سکتی ۔ اور عددِ رکعات میں موافقت واجب نہیں کیونکہ مقیم کی اقتداء مسافر کے پیچھے ہو سکتی ہے ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اثر میں ہے کہ وہ مکّہ میں نماز قصر پڑھ کر اعلان کیا کرتے تھے یا اھل مکّۃ اتمّوا صلوٰتکم فانّا قومٌ سفرٌ ۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم آخری بیماری میں بیٹھ کر نماز پڑھ رہے تھے اور صحابہؓ کھڑے تھے پس معلوم ہوا کہ نماز کی شروط و ارکان کی ادائیگی میں امام کا مقتدیوں کے ساتھ لگا فؤیا امام کی ان پر اس امر فضیلت لازم نہیں ہے ۔ اور یہیں سے ہے وضو کرنے والے کا موزوں کا مسح کرنے والے کے پیچھے نماز پڑھنا اور وضو کرنے والے کا تیمم کرنے والے کے پیچھے نماز پڑھنا کہ جائز ہے ۔ حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے موزوں پر مسح فرمایا اور لازمًا قوم کے اندر ایک بڑا گروہ پاؤں دھونے والا ہو گا ۔ اور مسلم کی حدیث سے مفہوم ہوتا ہے کہ مقتدی کے افعال کی ابتداء

لہ مصفّٰی شرح موطّا ج ا صنہ ۱۳۱، ۱۳۳ ۔

امام کی ابتداء سے متاخر ہو اور امام کے کسی فعل کو ختم کرنے سے پہلے پہلے مقتدی کی اس فعل کی ابتداء واقع ہو جائے۔ اور اگر دونوں کا فعل ایک ہی وقت میں واقع ہو تو مضر نہیں سوائے تکبیرِ تحریمہ کے کیونکہ اس سے پہلے تو ابھی امام نماز میں داخل ہی نہیں ہوا کہ اس کی اقتداء کی نیت کی جائے۔ اگر مقتدی کا فعل امام کے بعد واقع ہو۔ تو اگر تخلف تھوڑا ہے یا عذر کی وجہ سے ہے تو اقتداء منقطع نہ ہوگی۔ اور اگر بلا عذر تخلّفِ کثیر کیا ہے تو نماز سے کھیلنا متحقق ہو گیا پس نماز باطل ہو جائے گی۔

امام بخاری[1] نے اپنی الجامع الصحیح میں باب رکھا ہے۔ باب انما جُعِلَ الامام لیؤتم بہٖ الخ اس ترجمۃ الباب سے معلوم ہوا کہ بیٹھے ہوئے امام کے پیچھے بیٹھ کر نماز پڑھنا واجب نہیں اور اقتداء کے لوازم میں سے نہیں پس حضورؐ کے قول انّما جُعِلَ الامام لیؤتم بہٖ میں بقول[2] حافظ ابنِ حجرؒ تخصیص ہوگئی۔ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ اگر کسی شخص نے امام سے پہلے سر اٹھا لیا تو وہ واپس سجدہ میں چلا جائے اور جتنی دیر امام سے پہلے اٹھا تھا اب اتنا متاخر ہو جائے۔

الفصل الاوّل

حدیث ۱ : عن البراء بن عازبؓ قال کُنّا نُصلّی خلف النبی صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم فاذا قال سمع اللّٰہ لمن حمدہٗ لم یحن احدٌ منّا ظہرہٗ حتّیٰ یَضَعَ النبی صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم جَبْہَتَہٗ علی الأرض ۔ متّفق علیہ ۔

ترجمہ: حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے پیچھے نماز پڑھا کرتے تھے پس جب آپؐ سَمِعَ اللّٰہ لمن حمدہٗ کہتے تو ہم میں سے کوئی شخص اس وقت تک سجدہ میں جانے کے لیے اپنی پیٹھ نہ جھکاتا جب تک کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی پیشانی مبارک زمین پر نہ رکھ دیتے۔ بخاری ومسلم۔

شرح[3]: اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ صحابہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہی سجدہ میں نہیں چلے جاتے تھے بلکہ آپؐ کے اقتداء میں پیچھے پیچھے رہتے تھے۔ اگر

---

[1] فیض الباری ج ۲ ص ۲۱۳ [2] فتح الباری ج ۳ ص ۳۸۰ ۔
[3] مظاہر حق ج ۱ ص ۳۹۴ ، مرقات ج ۳ ص ۹۳ ۔

مقتدی پیچھے پیچھے تو رہے لیکن اتنی ڈھیل نہ کرے تو بھی جائز ہے ہاں تکبیر احرام میں امام کے فارغ ہونے سے پہلے تکبیر کہنا جائز ہی نہیں۔ اور حنفیہ کے نزدیک امام کی اقتداء بطورِ مواصلت واجب ہے یعنی اس کے ساتھ ساتھ افعال کرتا جائے حتیٰ کہ اگر امام رکوع و سجود سے مقتدی کے تین مرتبہ تسبیح کہنے سے پہلے ہی سر اُٹھا لے تو مقتدی کو اس کی اقتداء میں سر اُٹھا لینا چاہیئے لیکن اگر مقتدی نے کبھی امام سے پہلے سر اُٹھا لیا تو پھر واپس امام سے مل جائے اور اسے یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس نے دو رکوع یا دو سجدے کیے ہیں۔

۱؎ حافظ الدنیا علامہ ابن حجرؒ عسقلانی فرماتے ہیں کہ حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مقتدی امام سے انتقالاتِ ارکان میں متاخر رہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ جب تک امام دُوسرا رکن شروع نہ کر دے مقتدی پہلے رکن میں ہی رہے بلکہ صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ مقتدی امام پر متقدم نہ ہو جائے۔

۲؎ علامہ سیّد انور شاہ الکشمیری فرماتے ہیں کہ سب علماء و فقہاء اس پر متفق ہیں کہ امام پر سبقت لے جانا اور مبادرت کرنا مکروہ تحریمی ہے لیکن اگر کوئی ایسا کرے تو نماز اس کی ہو جائے گی۔ اور یہاں سے ثابت ہوا کہ صحت و کراہیت ایک جگہ جمع ہو سکتی ہیں لیکن اس میں امام ابن تیمیہؒ کا اختلاف ہے۔ ائمہ فقہ میں صرف اتنا اختلاف ہوا ہے کہ امام کے افعال کی تعقیب واجب ہے یا مقارنت۔ امام شافعیؒ تعقیب کے قائل ہوتے ہیں اور امام ابو حنیفہؒ مقارنت کے۔ لیکن یہ اختلاف تقریباً لفظی ہے۔ اصل مسئلہ میں عملاً کوئی اختلاف نہیں ہے۔ مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے صحابہؓ کو یہ حکم دیا تھا کہ جب تک میں سجدے میں نہ چلا جاؤں تم کمر مت جھکاؤ اور یہ اُس زمانے کا ذکر ہے جب حضورؐ کا جسم مبارک قدرے بوجھل ہو گیا تھا اور خدشہ تھا کہ کوئی شخص آپؐ پر متقدم نہ ہو جائے۔ مسلم کی اس حدیث سے بالکل واضح ہو گیا کہ مسئلہ کی اصل حیثیت کیا ہے۔

حدیث ۲: وعن انسؓ قال صلّٰی بنا رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم ذات یوم فلمّا قضٰی صلٰوتہ اقبل علینا بوجھہ فقال ایّھا النّاس اِنّی اِمامکم فلا تسبقونی بالرّکوع ولا

۱؎ فتح الباری ج ۳ ص ۳۸۶، قسطلانی ج ۲ ص ۵۸۔ ۲؎ فیض الباری ج ۲ ص ۲۱۶۔

بالسّجود ولا بالقیام ولا بالانصراف فانّی اراکم اَمامی ومن خلفی۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ: حضرت اُنس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نماز پڑھائی پس جب آپؐ نے نماز ختم کر لی تو ہماری طرف منہ کیا اور فرمایا: اے لوگو! میں تمہارا امام ہوں پس تم رکوع، سجدے، قیام یا نماز سے فارغ ہونے میں مجھ پر سبقت مت لے جاؤ۔ کیونکہ میں تمہیں اپنے سامنے سے بھی دیکھتا ہوں اور پیچھے سے بھی دیکھتا ہوں۔ مسلم۔

شرح: [1] حضورؐ نے اپنے لیے لفظ امام بولا تاکہ پتہ چل جائے کہ امام تو ہوتا ہی اس لیے ہے کہ اُس کا ائتمام یعنی اقتداء کی جاتی ہے یعنی اس لفظ کی وجہ تسمیہ کا تقاضا ہی یہ ہے کہ امام کی اقتداء کی جائے۔ اور اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ ارکانِ فعلیہ میں امام کی اقتداء واجب ہے اور انصراف سے مراد یہاں نماز سے فارغ ہونا ہے۔ مسجد سے باہر نکلنا نہیں۔ اور حضورؐ کے بطورِ خرقِ عادت پیچھے سے دیکھنے پر کسی جگہ گفتگو ہو چکی ہے۔ علّامہ علی القاریؒ نے اسے نماز کی حالت سے مخصوص مانا ہے اور حافظ ابن حجرؒ اسے مطلق قرار دیتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۳: وعن ابی ھریرۃ رضؓ قال قال رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم لَا تُبَادِرُوا الامام اِذَا کبّر فکبّروا وَاِذَا قَالَ وَلَا الضَّالّین فقُولُوا آمین واذا رکع فارکعُوا وَاِذَا قَالَ سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ فَقُولُوا اَللّٰھُمَّ ربّنا لک الحمد۔ متّفق علیہ۔ اِلَّا اَنَّ البخاری لم یذکر وَاِذَا قَالَ وَلَا الضَّالّین۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: امام سے پہل نہ کرو جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب وہ ولا الضّالّین تو تم آمین کہو اور جب وہ رکوع کرے تو تم بھی رکوع کرو اور جب وہ سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو تم اللّٰھُمّ ربّنا لک الحمد

---

[1] مرقات ج ۳ ص ۹۴۔

کہو۔ بخاری و مسلم۔ لیکن بخاری نے وَاذا قال ولا الضّالّین کا ذکر نہیں کیا۔

شرح: ؎ اس سے قبل اس حدیث کی شرح بعض مقامات پر گزر چکی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ قرأت کرنا امام کا وظیفہ ہے کیونکہ حضورؐ فرماتے ہیں کہ جب امام ولا الضّالّین کہے تو تم آمین کہو۔ اسی طرح اس حدیث سے سمع اللّٰہ لمن حمدہ کہنا امام کا وظیفہ اور اللّٰھم ربّنا لك الحمد کہنا مقتدی کا وظیفہ ثابت ہوا اور یہی حنفیہ کا مسلک ہے۔

حدیث ۴: وعن أنسٍؓ ان رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم رکب فرسًا فصرع منہ فجحش شقّہٗ الایمن فصلّی صلاۃ من الصّلوات وھو قاعد فصلّینا وراءہٗ قعودًا فلمّا انصرف قال انّما جعل الامام لیؤتمّ بہٖ فاذا صلّی قائمًا فَصَلُّوا قِیامًا وَاِذا رَکَعَ فارْکَعُوا وَاِذا رفع فارفعوا وَاِذَا قَالَ سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ فَقُولُوا ربّنا لَکَ الحمد وَاِذا صَلّٰی جَالِسًا فَصَلُّوا جُلُوسًا اَجْمَعُونَ قَالَ الْحُمیدیّ قولہٗ اِذا صَلّٰی جَالِسًا فَصَلُّوا جُلُوسًا ھُوَفی مَرَضِہِ الْقَدِیم ثُمَّ صَلّٰی بعد ذٰلك النّبی صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم جَالِسًا وَالنّاسُ خَلْفَہٗ قِیامٌ لَمْ یَاْمُرْھُمْ بالقعودِ وَ اِنّما یُؤْخَذُ بِالْاٰخِرِ فالْاٰخر من فعل النّبی صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم۔ ھذا لفظ البخاری۔ واتّفق مسلم اِلٰی اجمعون وزاد فی روایۃٍ فَلَا تَخْتَلِفُوا علیہ وَاِذا سَجَدَ فَاسْجُدُوْا۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جناب رسول خدا صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم ایک گھوڑے پر سوار ہوئے تو اُس سے نیچے گر گئے پس آپؐ کی دائیں کروٹ چھل گئی۔ پس آپؐ نے نمازوں میں ایک نماز بیٹھ کر پڑھی تو ہم نے بھی آپؐ کے پیچھے بیٹھ کر پڑھی۔ پھر جب آپؐ نماز سے فارغ ہو گئے

؎ مظاہر حق ج ۱ ص ۳۹۵، مرقات ج ۳ ص ۹۴۔

تو فرمایا کہ امام تو صرف اسی لیے مقرر کیا گیا ہے کہ اُس کی اقتداء کی جائے سو جب وہ کھڑا ہو کر نماز پڑھے تو تم بھی کھڑے ہو کر پڑھو اور جب وہ رکوع کرے تو تم بھی رکوع کرو اور جب وہ سر اٹھائے تو تم بھی اٹھاؤ اور جب وہ سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو تم ربنا لک الحمد کہو اور جب وہ بیٹھ کر نماز پڑھے تو تم بھی سب بیٹھ کر پڑھو۔ امام حمیدیؒ نے فرمایا کہ حضورؐ کا یہ ارشاد: اِذَا صلّٰی جالسًا فصلّوا جلوسًا آپؐ کی کسی پہلی بیماری میں واقع ہوا تھا پھر اس کے بعد مرض الوفات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیٹھ کر نماز پڑھی اور لوگ آپؐ کے پیچھے کھڑے تھے آپؐ نے انھیں بیٹھنے کا حکم نہیں دیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال میں سے پچھلے اور پچھلے کو اختیار کیا جاتا ہے۔ یہ بخاری کا لفظ ہے۔ اور مسلم نے اجمعون کے لفظ تک اس سے اتفاق کیا ہے اور ایک روایت میں اس نے یہ لفظ زیادہ بیان کیا ہے۔ فلا تختلفوا علیہ الخ امام سے اختلاف مت کرو اور جب وہ سجدہ کرے تو تم بھی سجدہ کرو۔

شرح: [1] اس حدیث کا واقعہ پانچ ہجری میں پیش آیا تھا جیسا کہ حافظ ابن حبانؒ نے تصریح کی ہے لیکن علامہ حافظ ابنؒ حجر عسقلانی کو یہاں سہو ہوا ہے کہ انہوں نے اسے نو ہجری کا واقعہ قرار دیا ہے حالانکہ نو ہجری کا واقعہ ایلاء کا واقعہ تھا اور سہو کا باعث یہ ہے کہ حضورؐ ان دونوں واقعات میں مسجد کے بالاخانہ میں رونق افروز ہوتے تھے۔ بعض رُواۃِ حدیث نے ان واقعات کو ایک ہی سلسلہ بیان میں ذکر کر دیا تو غلط فہمی ہوگئی کہ دونوں واقعات نو ہجری کے ہیں۔ اور امام مسلم نے اس حدیث میں وَاِذَا قرأ فانصتوا کی زیادتی روایت کر کے اس کی تصحیح کی ہے اور جمہور مالکیہ اور حنابلہ نے اس کی تصحیح کی ہے۔ اور اس کی تصحیح سے صرف وہی لوگ پیچھے ہٹے ہیں جنہوں نے قرأتِ خلف الامام کو اختیار کیا ہے پس درحقیقت یہ فقہ کو حدیث پر ترجیح دینا ہے نہ کہ حدیث کو فقہ پر ترجیح دینا اور انھیں یہ بات شک میں ڈالتی ہے کہ اس روایت کے بعض راوی اس زیادتی کا ذکر نہیں کرتے لہٰذا یہ زیادتی غیر محفوظ سمجھی گئی ہے۔ اور ہم نے بفضلِ خدا اس غلط فہمی کو کھول کر اور اس کے باعث کو واضح کر کے رکھ دیا ہے۔ اور وہ یہ کہ حضورؐ نے حدیثِ ائتمام دو مرتبہ ارشاد فرمائی تھی: ایک مرتبہ پانچ ہجری والے واقعہ میں جب آپؐ زخمی ہوئے تھے اور دوسری مرتبہ اس کے کافی عرصہ بعد ایک اور واقعہ میں۔ پس یہ دو حدیثیں ہیں نہ کہ ایک

---

[1] فیض الباری ج ۲ ص ۲۱۴

جس کے الفاظ مختلف ہیں۔ پس حضرت انسؓ اور عائشہؓ اور جابرؓ جو حدیث بیان کرتے ہیں وہ بھی پانچ ہجری والی روایت ہے جو اس غرض کے لیے بیان ہوئی ہے کہ جب امام کھڑا ہو کر نماز پڑھے تو کھڑے ہو کر پڑھو اور جب بیٹھ کر پڑھے تو تم بھی بیٹھ کر پڑھو۔ اور دوسری حدیث جو دوسرے واقعہ کے متعلق ہے۔ اس میں حضرت ابوموسیٰؓ اور ابوہریرہؓ صرف ائتمام واقتدار کو بیان فرماتے ہیں نہ کہ کوئی اور چیز۔ اور پہلی روایت میں وَاِذَا قَرَأَ فَانْصِتُوا والی زیادتی موجود ہے اور حضرت عائشہؓ والی روایت میں یہ لفظ ہیں کہ حضورؐ نے نماز بیٹھ کر پڑھی اور لوگوں نے آپؐ کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھی پھر آپؐ نے اشارے سے بیٹھنے کا حکم دیا تو وہ بیٹھ گئے اور زیر بحث حدیث میں یہ الفاظ ہیں، کہ فصلّینا وراءہٗ قعوداً علامہ شیخ بدرالدین عینیؒ نے فرمایا ہے کہ اس اختلافِ تعبیر کا باعث یہ ہے کہ یہ دو واقعات ہیں، انسؓ والی حدیث پانچ ہجری کے واقعہ میں ہے اور حضرت ام المومنینؓ والی حدیث دوسرے واقعہ کے متعلق ہے۔

اس حدیث میں بھی امام کا وظیفہ سمع اللہ الخ کہنا اور مقتدی کا وظیفہ ربّنا لک الحمد کہنا فرمایا گیا ہے۔ اور یہ تقسیم دو جگہ آئی ہے ایک جگہ قرأت میں امام جب ولا الضّالّین کہے تو تم آمین کہو اس سے معلوم ہوا کہ قرأت امام کا وظیفہ ہے نہ کہ مقتدی کا۔ اور دوسری جگہ تسمیع وتحمید میں کہ پہلا امام کا وظیفہ ہے اور دوسرا مقتدی کا۔

لہ وانّما یؤخذ بالآخر فالآخر امام حمیدیؒ جو امام بخاریؒ کے استاد ہیں۔ انہوں نے یہاں نسخ کی تصریح کی ہے اور اسے بخاریؒ نے اختیار کیا ہے۔ اکثر ائمہ کے نزدیک امام کے بیٹھ کر پڑھنے کی صورت میں مقتدی کا کھڑے ہو کر پڑھنا واجب ہے۔ یعنی صرف جائز ہی نہیں بلکہ واجب ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۵: وعن عائشۃؓ قالت لمّا ثَقُلَ رَسُولُ اللّٰہِ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم جاءَ بِلَالٌ یُوذِنُہٗ بِالصَّلٰوۃِ فَقَالَ مُرُوْا اَبَا بَکْرٍؓ اَن یُّصَلِّیَ بِالنَّاسِ فَصَلّٰی اَبُوْبَکْرٍؓ تِلْکَ الْاَیَّامَ ثُمَّ اِنَّ النَّبِیَّ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم وَجَدَ فِیْ نَفْسِہٖ خِفَّۃً فَقَامَ یُھَادٰی بَیْنَ رَجُلَیْنِ وَ رِجْلَاہُ تَخُطَّانِ فِی الْاَرْضِ حَتّٰی دَخَلَ الْمَسْجِدَ فَلَمَّا سَمِعَ اَبُوْبَکْرٍؓ حِسَّہٗ ذَھَبَ یَتَاَخَّرُ

لہ مظاہر حق ج ۱ ص ۳۹۵، مرقات ج ۳ ص ۹۵۔

فَاَوْمٰی اِلَیْہِ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ علیہ وَسَلَّم اَنْ لَّا یَتَأَخَّر فَجَاءَ حَتّٰی جَلَسَ عَنْ یَسَارِ اَبِیْ بَکْرٍؓ فَکَانَ اَبُوْبَکْرٍؓ یُصَلِّیْ قَائِمًا وَّکَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ علیہ وسلّم یُصَلِّیْ قَاعِدًا یَقْتَدِیْ اَبُوْبَکْرٍؓ بِصَلوٰۃِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ علیہ وسلّم وَالنَّاسُ یَقْتَدُوْنَ بِصَلوٰۃِ اَبِیْ بَکْرٍؓ۔ متفق علیہ۔ وَفِیْ رِوَایَۃٍ لَّھُمَا یُسْمِعُ اَبُوْبَکْرٍؓ النَّاسَ التَّکْبِیْر

ترجمہ: اُمّ المؤمنین عائشہ سلام اللہ علیہا سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ بیمار ہو گئے بلالؓ آپؐ کو (حسبِ معمول) نماز کی اطلاع دینے حاضر ہوئے تو حضورؐ نے فرمایا ابوبکرؓ کو حکم دو کہ لوگوں کو نماز پڑھائے پس ان دنوں میں حضرت ابوبکرؓ نے لوگوں کو نماز پڑھائی۔ پھر ایسا ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنی طبیعت میں کچھ تخفیف محسوس فرمائی تو آپؐ اس طور پر اُٹھے کہ دو آدمیوں کے درمیان آپؐ کو چلایا جا رہا تھا اور آپؐ کے پاؤں زمین پر لکیر بنا رہے تھے۔ آپؐ تشریف لائے یہاں تک کہ مسجد میں داخل ہو گئے۔ پس جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضورؐ کی آہٹ سُنی تو پیچھے ہٹنے لگے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا کہ وہ پیچھے نہ ہٹیں۔ پس حضورؐ تشریف لا کر حضرت ابوبکرؓ کے بائیں ہاتھ بیٹھ گئے۔ پس حضرت ابوبکرؓ کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ کر نماز پڑھ رہے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی اقتداء کر رہے تھے۔ اور لوگ حضرت ابوبکرؓ کی نماز کی اقتداء کر رہے تھے۔ بخاری و مسلم۔ اور ان دونوں کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابوبکرؓ لوگوں کو تکبیر سناتے تھے۔

شرح: [1] مُرُوْا اَبَا بَکْرٍؓ اَنْ یُّصَلِّیَ بِالنَّاسِ شرح السُّنّہ میں لکھا ہے کہ اس میں حضرت ابوبکرؓ کے افضل ہونے کی دلیل موجود ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد سب سے افضل ہیں اور آپؐ کی خلافت و نیابت کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔ اور حضورؐ کے اس حکم کو صحابہؓ نے بعد میں بطورِ دلیل پیش کر کے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کی تھی کہ حضورؐ نے جس شخص کو نماز جیسے دینی فریضے کے لیے ہمارا امام پسند فرمایا ہم اپنے انتظامی اور دنیوی اُمور کے لیے اُسے کیوں امام نہ بنائیں اور حضورؐ کا بعد میں

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۳۹۶، مرقات ج ۳ ص ۹۶

خود تشریف لانا اور ابوبکرؓ کی اقتداء میں نماز پڑھنا بھی ثابت ہے، یہ اس لیے تھا تاکہ قولی وفعلی دلیلیں جمع ہوجائیں اور ابوبکرؓ کی امامت پختہ طور پر ثابت ہوجائے۔

فقام یُهادی بین رجلین یہ دو شخص جناب علی وعباس رضی اللہ عنہما تھے بعض نے حضرت علیؓ کی جگہ فضل بن عباسؓ کا اور بعض نے اُسامہ بن زیدؓ کا ذکر کیا ہے۔

فلما سمع ابوبکرؓ حسّہٗ اس سے صراحۃً ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت ابوبکرؓ نے نماز شروع کردی تھی پس درحقیقت تو امام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے، اور حضرت ابوبکرؓ سمیت سب لوگ حضورؐ کے مقتدی تھے ہاں حضرت کی بیماری اور ضعف کیوجہ سے حضرت ابوبکرؓ آپؐ کے انتقالات اور تکبیروں کو دوسروں تک پہنچاتے تھے۔ اس چیز کو حدیث میں یوں بیان کیا گیا کہ حضرت ابوبکرؓ آپؐ کے مقتدی تھے اور باقی سب لوگ ابوبکرؓ کی اقتداء کر رہے تھے۔ وجہ یہ ہے کہ مقتدی کی اقتداء نہیں ہوسکتی۔ امام ابن عبدالبر مالکی نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ یہ واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص میں سے ہے بعد میں کسی اور کو ایسا کرنا جائز نہیں کیونکہ مقتدی تو خود مقتدی ہے دوسرے کا امام کیسے بن سکے گا۔ یا حدیث میں امام کا معنیٰ مبلغ ہے جیساکہ دوسری روایت میں تصریح ہے کہ یُسمع ابوبکرؓ النّاس التکبیر پس ان کی امامت اس معنوں میں تھی کہ وہ امام کی تکبیرات کو مقتدیوں تک پہنچاتے تھے اور یہ بالاتفاق جائز ہے جیساکہ جمعہ اور عیدین میں اس پر ہر جگہ عمل ہوتا ہے۔ لیکن امام شافعیؒ نے حدیث کے ظاہری الفاظ پر عمل کیا ہے اور کہا ہے کہ دو اماموں کی اقتداء علی وجہ التعاقب جائز ہے بغیر اس کے کہ دوسرے کی نیتِ اقتداء کی جائے۔ اور اس مسئلے کا نام تسلسل بالاقتداء یا انشاء الاقتداء فی اثناء الصلوٰۃ ہے امام شافعیؒ کے علاوہ باقی سب لوگ اسے حضورؐ کی خصوصیت مانتے ہیں، امام سیوطیؒ بھی شافعی ہونے کے باوجود اسی کے قائل ہیں۔

[1] سید المحدثین انور شاہؒ فرماتے ہیں کہ راوی کا یہ قول فکان ابوبکرؓ یصلی بصلاۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی مراد ہے کہ حضورؐ امام تھے۔ اور حضرت ابوبکرؓ مبلغ تھے اور حضورؐ نماز کے بالکل شروع ہونے سے قبل ہی تشریف لے آئے تھے اور نماز آپؐ نے پڑھائی تھی۔ اور جمہور دو اماموں کی اقتداء کے منکر ہیں امام

---

[1] فیض الباری ج ۲ ص۲۱۰۔

صرف ایک ہی ہوسکتا ہے یہ نہیں کہ پہلی صف والے دوسری والوں کے اور دوسری والے تیسری والوں کے امام ہوں گو امام عینیؒ نے امام بخاریؒ کے اسی کے قائل ہونے کا ذکر کیا ہے اور سلف میں سے امام شعبیؒ اور علامہ ابن جریرؒ اسکے قائل ہوئے ہیں لیکن جمہور نے اس کا انکار کر دیا ہے۔

لہ اس حدیث میں حضورؐ کا حضرت ابوبکرؓ کے بائیں طرف آکر بیٹھ جانا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ امام حضورؐ تھے لیکن چونکہ حضرت ابوبکرؓ مبلغ تھے اس لیے راوی نے اس کی تعبیر اس طرح کر دی کہ ابوبکرؓ حضورؐ کے مقتدی تھے اور باقی لوگ حضرت ابوبکرؓ کے مقتدی تھے۔ اور اگر اس تعبیر کو ہی درست مانا جائے تو یہ حضورؐ کی خصوصیت تھی جیساکہ قبل ازیں گزر چکا ہے۔

حدیث ۶ : وعن ابی ھریرۃؓ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم اَمَا یخشی الّذی یرفعُ رأسَہٗ قبل الامام ان یُحوّل اللّٰہ رأسَہٗ رأسَ حمارٍ۔ متّفق علیہ۔

ترجمہ : حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کیا وہ شخص جو امام سے پہلے سر اُٹھا لیتا ہے اس بات سے نہیں ڈرتا کہ اللہ تعالیٰ اس کا سر گدھے کے سر میں تبدیل کر دے؟ بخاری و مسلم۔

شرح : لہ اس حدیث کی دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں: اَو یجعل اللّٰہ صورتَہٗ صورۃَ حمارٍ" کہ کیا وہ اس سے نہیں ڈرتا کہ اللہ تعالیٰ اس کی صورت گدھے جیسی کر دے؟

لہ موطا میں یہ حدیث ابوھریرۃؓ پر موقوف ہے اور اس کے الفاظ ہیں۔ الّذی یرفع رأسہٗ ویخفضہٗ قبل الامام فانّما ناصیتہٗ بید الشیطان" جو شخص امام سے قبل سر کو اٹھاتا اور جھکاتا ہے اس کی پیشانی یعنی باگ ڈور شیطان کے ہاتھ میں ہے"۔ مصنفؒ عبدالرزاق میں بھی یہ روایت موقوفاً آئی ہے اور مسند بزار میں مرفوعاً آئی ہے۔ صورت اور سر کا لفظ جو مختلف روایات میں آیا ہے یہ راویوں کے تصرف کی وجہ سے ہے۔ قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں کہ تمام روایات متفق ہیں کیونکہ چہرہ سر میں ہے

لہ مرقات ج ۳ ص ۹۷۔ لہ بخاری مع شرح ج ۳ ص ۳۸۷۔

لہ موطا مع شرح ج ا ص ۱۳۳۔ لہ فتح الباری ج ۳ ص ۳۸۷۔

ہے اور انسانی صورت کا بڑا حصّہ سر میں ہی واقع ہے۔

لہ گدھے کی صورت یا گدھے کے سر میں تبدیل کرنا یا تو حماقت و بلادت میں مبالغے کے بیان کے لیے آیا ہے کیونکہ حماقت میں گدھے سے تشبیہ دی جاتی ہے اس صورت میں مسخ سے مراد معنوی ہوگا نہ کہ حِسّی۔ اور اس کو حقیقی مسخ پر حمل کرنا جائز ہے۔ کیونکہ اس سے کوئی مانع نہیں ہے کیونکہ اس امت میں مسخ کا واقع ہونا احادیث صحیحہ سے ثابت ہے اور خاص اس فعل کے باعثِ مسخ ہونے کا ثبوت بھی عملاً موجود ہے علامہ قاریؒ فرماتے ہیں کہ کسی واقعہ میں اگر مسخ واقع ہوا ہو تو وہ شاید اس کے فاعل کی طرف سے اسے بعید جاننے پر ہوا ہوگا ورنہ بہت سے لوگ امام پر سبقت لے جاتے ہیں اور ان کے چہرے مسخ نہیں ہوتے اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ یہ تہدیدِ شدید ہے اور مؤکدِ وعید ہے اور یہی کہنا ممکن ہے کہ یہ مسخ معلّق ہے عدم خشیت پر کیونکہ ارشاد ہے۔ اَمَا یَخشٰی الخ نہ کہ محض عدمِ متابعت پر۔ ہوسکتا ہے کہ عالمِ برزخ میں یا جہنّم میں یہ حقیقی سزا بھی ہو۔

لہ اور اسے محض حماقت و بلادت پر محمول کرنا اس لیے درست نہیں کہ یہ چیز تو اس فعل کے کرنے والے میں پہلے سے موجود ہے ورنہ وہ ایسا کیوں کرتے؟ اور جن علماء نے اس اُمّت میں جوازِ مسخ کا انکار کیا ہے اس سے مراد عام مسخ ہے اور یہ مسخ خاص ہے جو اس کے منافی نہیں ہے۔

لہ حدیث کے ظاہر کا تقاضا تو اس فعل کی حرمت ہے اور امام نوویؒ نے یہی کہا ہے لیکن نماز بالاتفاق ہو جائے گی اور یہ چیز صحّت اور حرمت کے جمع ہونے کی دلیل ہے۔ لیکن اس میں امام ابن تیمیہؒ کا اختلاف ہے۔ اور تمام علماء و فقہاء کا اس مسئلہ پر اتفاق ہے۔ اس میں کوئی فقہی اختلاف نہیں ہے۔ اور حافظ ابن حجرؒ نے امام احمد سے (ایک روایت کے مطابق)، اور اہلِ ظاہر سے نماز کا فساد نقل کیا ہے کیونکہ تحریم فساد کی مقتضی ہے۔ واللہ اعلم بالصّواب۔

۱ہ ایضاً، عسقلانی ۲ صہ ۵۹، مرقات ج ۳ صہ ۹۸، مظاہر حق ج ۱ صہ ۳۹۶، فیض الباری ج ۲ صہ ۲۱۷

۲ہ فتح الباری ج ۳ صہ ۳۸۷، عسقلانی ج ۲ صہ ۵۹۔

۳ہ فتح الباری ایضاً، فیض الباری ج ۲ صہ ۲۱۶، عسقلانی ایضاً، مسوّیٰ شرح مؤطا ج ۱ صہ ۱۳۳۔

بابُ مَن صَلّٰی صَلوٰۃً مرّتین

[1] جہاں تک اصل مسئلہ یعنی ایک ہی نماز کے دو مرتبہ پڑھنے کا سوال ہے اس کی بعض صورتوں کے سب قائل ہیں۔ اختلافِ فقہاء صرف ایک صورت میں ہے کہ کوئی شخص پہلے فریضہ ادا کر چکے تو اب چونکہ اس کے ذمہ فرض ہے ہی نہیں لہٰذا اس فرض کو چاہے فریضہ کی نیت سے، چاہے نفل کی نیت سے اور چاہے محض نماز کی نیت سے دوبارہ ادا کرے گا تو یہ دوسری نماز لازماً نفل ہی واقع ہوگی۔ اس مسئلہ پر حنفیہ، مالکیہ اور حنابلہ کا پورا اتفاق ہے کیونکہ اسی مسئلہ پر ایک اہم مسئلہ کی بنیاد ہے اور وہ ہے۔ اقتداء المفترض خلف المتنفّل یعنی فرض پڑھنے والے کی نفل والے کے پیچھے نماز پڑھنا۔ اور شافعیہ نے اسے اختیار کیا ہے اور اس کی دلیل صرف حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واقعہ والی حدیث ہے جسے امام بخاریؒ نے باب اذا طوّل الامام و کان للرجل حاجۃ فخرج وصلّٰی میں روایت کیا ہے اور دوسری مرتبہ باب من شکا امامہٗ اذا طوّل الخ میں یہی حدیث حضرت جابر بن عبد اللہ الانصاری سے روایت کی ہے لیکن کہیں بھی یہ صراحت نہیں کہ حضرت معاذؓ ایک ہی نماز حضورؐ کے ساتھ پڑھ کر پھر اپنی قوم کو وہی پڑھاتے تھے۔ صاحبِ مشکوٰۃ نے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ دونوں جگہ نمازِ عشاء ہی پڑھتے تھے پہلے بخاری و مسلم کی حدیث بیان کی لیکن اس میں یہ صراحت نہ تھی پھر ایک روایت بیان کر کے جس میں دونوں جگہ نمازِ عشاء کی صراحت تھی بعد میں رواہ کہہ کر خاموش ہو گئے کیونکہ صحاحِ ستّہ میں کہیں یہ روایت نہیں تھی اور ہم ابھی اس پر کلام کریں گے۔ اس دوسری روایت پر کلام کیا گیا ہے اور امام طحاویؒ، امام احمدؒ، علامہ ابن الجوزیؒ اور علامہ حافظ ابن تیمیہؒ نے اسے معلول قرار دیا ہے اور وجدان فیصلہ کر دیتا ہے کہ یہ کلام مدرج ہے جو در اصل ابن جریجؒ کا ہے جس کا مسلک یہی ہے کہ فرض والے کی اقتداء نفل والے کے پیچھے جائز ہے۔

[2] شافعیہ کے علاوہ جمہور علماء فرض والے کی اقتداء نفل والے کے پیچھے جائز نہیں ٹھیراتے کیونکہ امام ضامن ہے جیسا کہ ترمذی کی حدیث میں ہے اور اگر فرض والا

---

[1] فیض الباری ج ۲ ص ۲۲۳ تا ۲۳۱۔ [2] فیض الباری ج ۲ ص ۲۲۴۔

نفل والے کی اقتدار کرے گا تو امام کی نماز مقتدی سے نصف ہو گی کیونکہ جیسا کہ امام طحاویؒ نے تصریح کی ہے کہ فرض میں دو باتیں ہیں: ایک تو ذاتِ صلوٰۃ اور دوسری وصفِ صلوٰۃ ہے۔ جبکہ نفل میں صرف ایک ہے یعنی ذاتِ صلوٰۃ۔ اگر کہا جائے کہ اس میں بھی وصفِ صلوٰۃ ہے یعنی اس کا نفل ہونا تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ وصف مغلوب ہے اور اس پر صرف نماز والی حیثیت غالب ہے لیکن فرض میں وصف یعنی اس کا فرض ہونا غالب ہے۔ پس اگر نفل والے کے پیچھے فرض والے کی نماز جائز ٹھیرائی جائے تو امام کی نماز مقتدی سے نصف رہ جائے گی اور وہ ضامن نہیں رہے گا۔ کیونکہ ضمانت صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے جبکہ مقتدی کی اُس کے مساوی یا اس سے کمتر ہو اور جب مقتدی کی نماز اُس سے اعلیٰ تر ہو تو ضمانت جاتی رہے گی۔

لہ حضرت جابرؓ والی آئندہ روایت کے سلسلے میں حافظ ابنؒ العربی نے کہا ہے کہ اس میں یہ نہیں ہے کہ معاذؓ حضورؐ کے ساتھ جو نماز پڑھتے تھے وہ فرض ہوتی تھی اور پھر بعینہٖ اُسی نماز کو اپنی قوم میں آکر پڑھاتے تھے۔ اور جن لوگوں نے کہا ہے کہ دونوں جگہ عشاء کی نماز ہوتی تھی اگر ان کی بات مان لی جائے اور فرض کر لیا جائے کہ دونوں جگہ ایک ہی نماز تھی تو حضرت معاذؓ کی نیت کی کیفیت کو خدا کے سوا کون جانتا ہے، یہ کیوں نہیں کہا جاتا کہ وہ حضورؐ کے ساتھ نفل پڑھتے اور اپنی قوم کو فرض پڑھاتے تھے؟ حضرت معاذؓ نے خود اس کی صراحت نہیں کی پس ان پر یہ حکم لگانا دھینگا مشتی سے کم نہیں۔ اگر حضرت معاذؓ دونوں جگہ ایک ہی نماز پڑھتے تھے تو پہلی صرف حضورؐ کے ساتھ جماعت کی فضیلت حاصل کرنے کی خاطر ہوتی تھی اور نفل تھی اور فرض وہ تھی جسے وہ اپنی قوم میں آکر پڑھاتے تھے۔ اس سلسلے میں اور بھی بہت کچھ کہا گیا ہے جسے ابھی حدیث کی شرح کے ضمن میں بیان کیا جائے گا۔ واللہ ولیّ التوفیق۔

الفصل الاوّل

حدیث ۱: عن جابرؓ قال کان معاذ بنؓ جبل یصلّی مع النبی صلّی اللہ علیہ وسلّم ثمّ یأتی قومہٗ فیصلّی بھم۔ متّفق علیہ۔

لہ مظاہر حق ج ا صـ۳۲، مرقات ج ۳ صـ۱۰۴، فیض الباری ج ۲ صـ۲۲۵۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھتے تھے پھر اپنی قوم میں آتے اور انھیں نماز پڑھاتے تھے۔ بخاری و مسلم۔

شرح: ۱؎ یہاں یہ ذکر نہیں کہ حضورؐ کے ساتھ کونسی نماز پڑھتے تھے اور آیا وہی اپنی قوم کو پڑھاتے تھے یا اور؟ حنفیہ، مالکیہ اور حنابلہ متفقہ طور پر کہتے ہیں کہ حضرت معاذؓ اگر ایک ہی نماز دو مرتبہ پڑھتے تھے تو حضورؐ کے ساتھ بہ نیتِ نفل ہوتی تھی۔ اور اپنی قوم کے ساتھ بہ نیتِ فرض۔

۲؎ امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ دونوں جگہ ایک ہی نماز ایک ہی نیت سے پڑھتے تھے تو ثابت ہو چکا ہے کہ حضورؐ نے معاذؓ کو اس سے منع فرما دیا تھا۔ چنانچہ طحاویؒ نے صحیح سند سے روایت کیا ہے کہ حضورؐ نے جب معاذؓ کی نماز کا قصہ سنا تو فرمایا: اِمّا اَن تُصلّی معی وَ اِمّا ان تخفف عن قومك۔ یہ حدیث مسند بزار اور مسند احمدؒ میں بھی موجود ہے لیکن علامہ ابنؒ حزم نے اس پر مرسل ہونے کا حکم لگایا ہے اور امام طحاویؒ نے اس قول کی شرح یہ کی ہے کہ دو باتوں میں سے ایک کرو یا تو صرف میرے ساتھ پڑھو (اور اس صورت میں اپنی قوم کو مت پڑھاؤ) اور اگر ایسا نہیں تو اپنی قوم کو نماز پڑھاؤ اور ہلکی نماز پڑھاؤ۔

۳؎ امام طحاویؒ اس کا تیسرا جواب یہ دیتے ہیں کہ اگر مان لیا جائے کہ حضرت معاذؓ دونوں جگہ عشا ہی پڑھتے تھے تو یہ اُس زمانے کا ذکر ہے جبکہ ایک نماز دو مرتبہ جائز تھی اور بعد میں یہ حکم منسوخ ہو گیا تھا جیسا کہ امام طحاویؒ نے باب صلوٰۃ الخوف میں بیان کیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: لا تصلّوا صلاۃ فی یوم مرتین۔

امام طحاویؒ کے جوابات نقل کر کے السید العلامۃ انور شاہؒ فرماتے ہیں کہ تکرارِ صلوٰۃ حضورؐ کی زندگی میں احادیث میں صرف ایک مرتبہ آئی ہے اور وہ بھی فقط ایک واقعہ میں۔ وہ یوں کہ حضرت معاذؓ اپنی قوم بنی سلمہ سمیت مغرب کی نماز حضورؐ کے ساتھ مسجدِ نبویؐ میں ادا کرتے تھے جیسا کہ طحاوی ص ۱۲۵ میں ہے۔ اور امام ترمذی نے بھی بیان کیا ہے کہ معاذؓ حضورؐ کے ساتھ نمازِ مغرب پڑھتے تھے اور اس حدیث پر ترمذی نے حسنؒ صحیحؒ کا حکم لگایا ہے۔ پھر صرف ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ معاذؓ نے اپنی

۱؎ مظاہر حق ج ۱ ص ۷۸۰، مرقات ج ۳ ص ۱۰۳، فیض الباری ج ۲ ص ۲۲۷۔

۲؎ ایضاً فیض الباری۔ ۳؎ فیض الباری ج ۲ ص ۲۲۸۔

عادت کے خلاف عشاء کی نماز بھی حضورؐ کے ساتھ ادا کی اور پھر وہی نماز جاکر قوم کو پڑھانے لگے اور اسی نماز میں اختلاف ہوا کیونکہ وہ کافی لمبی تھی اور معاذؓ پہلے ہی کافی مؤخر ہو چکے تھے تو لوگ لمبی سورتوں سے گھبرا گئے حضورؐ کو جب اطلاع ملی تو آپؐ نے سخت غصے کا اظہار فرمایا بلکہ یہاں تک فرما دیا کہ کیا تو فتنہ گر ہے؟ بلکہ[۱] بخاری کی ایک روایت کے مطابق تو یہ لفظ تین مرتبہ فرمایا اور سخت غضب ناک ہوئے پس اس میں شافعیہ کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے۔

حدیث ۲: وعنہ قال کان معاذؓ یُصلّی مع النبیّ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم العشآء ثم یرجع الی قومہٖ فیصلّی بھم العشاء وھی لہٗ نافلۃ۔ رواہ ....

ترجمہ: اور حضرت جابرؓ سے ہی روایت ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھتے تھے پھر اپنی قوم کی طرف لوٹتے تھے تو ان کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھتے تھے پس وہ ان کے لیے نفل ہوتی تھی۔ اسے روایت کیا ....

شرح:[۲] وھی لہٗ نافلۃٌ کی زیادتی معلول ہے جیسا کہ پہلے گزرا اور بعض حفّاظِ حدیث اسے امام شافعیؒ کا قول کہتے ہیں۔ یہ حدیث کا حصّہ نہیں ہے بلکہ حضرت امام شافعیؒ کا اپنا اجتہاد ہے ورنہ حضرت معاذؓ کی نیّت کا حال خود اُن کے سوا کسے معلوم ہو سکتا ہے؟ نیز یہ روایت جس میں یہ زیادتی اور نمازِ عشاء کا ذکر ہے۔ صحاح اور سُنن میں سے کسی میں نہیں آئی اسی لیے مؤلف نے اس پر بیاض چھوڑ دیا ہے۔ حافظ تورپشتیؒ فرماتے ہیں کہ حدیثِ جابرؓ میں وھی لہٗ نافلۃ کی زیادتی غیر محفوظ ہے۔ جیسا کہ مفصّل اُوپر گزر رہا ہے۔ امام طحاویؒ نے فرمایا ہے کہ یا تو ابن جریجؒ راوی حدیث کا قول ہے یا عمروؒ بن دینار کا اور یا حضرت جابرؓ کا تینوں صورتوں میں یہ ثابت نہیں کہ فعلِ معاذؓ کی حقیقت واقعی یہی تھی اور نہ انہوں نے خود معاذؓ سے یہ روایت کی ہے صرف اپنے خیال کا اظہار کیا ہے اور ہو سکتا

۱۔ بخاری مع فتح الباری ج ۳ ص ۳۹۲۔

۲۔ مظاہر حق ج ۱ ص ۴۱۲، مرقات ج ۳ ص ۱۰۴، فیض الباری ج ۲ ص ۲۲۶۔

ہے کہ حقیقت اس کے خلاف ہو۔ اگر معاذؓ سے یہ ثابت بھی ہوجاتا تو یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ حضورؐ کے علم و اطلاع یا حکم سے ایسا تھا۔ اور باقی تفصیل اوپر گزری ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

باب السُّنن وفضائلہا

سُنَن سُنت کی جمع ہے اور اس میں موکدہ اور مستحبہ سب شامل ہیں۔ سنت، نفل، تطوع، مندوب، مستحب، مرغب فیہ اور حسن کے الفاظ ہم معنی ہیں اور ان سے مراد وہ عبادات یا اعمال ہیں جن کے کرنے کو شارع نے نہ کرنے پر ترجیح دی ہے اور ان کا ترک بھی جائز ہے۔ اگرچہ بعض سُنن دوسری سُنتوں سے زیادہ موکد ہیں۔ اور حدیث صحیح میں آیا ہے کہ بندے کا سب سے پہلا محاسبہ قیامت کے دن نماز کے متعلق ہوگا۔ پس اگر وہ درست نکلی تو کامیاب ہوگیا اور فلاح پاگیا ورنہ وہ ناکام و نامراد ہوگیا۔ پس اگر فرضوں سے کچھ کم نکلا تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ کہ دیکھو میرے بندے کا کوئی نفل ہے؟ اگر نفل ہوا تو اس سے فریضہ میں جو کمی ہوگی اسے پورا کیا جائے گا۔ پھر اس کے تمام اعمال کا اسی طرح حساب وکتاب ہوگا۔ امام نوویؒ نے اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ فریضہ کے ناقص ہونے کے باوجود نفل مقبول ہو سکتے ہیں۔ اور وہ حدیث ضعیف ہے جس میں کہا گیا ہے کہ جب تک فریضہ ادا نہ کیا جائے نفل مقبول نہیں۔ اور اگر یہ حدیث صحیح ہو تو اس سے مراد وہ نفل ہونگے جو فرضوں کے بعد ہوتے ہیں کیونکہ ان کی بعدیت اس امر کی متقاضی ہے کہ پہلے فرضوں کو ادا کیا جائے ورنہ نفل صحیح نہ ہوں گے۔ لیکن اس میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ نفل کی ذاتی صحت فرض پر موقوف نہیں صرف اس کی بعدیت موقوف ہے۔ علامہ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ جس شخص کے ذمہ فرض کی قضاء باقی ہو اس کا نفل درست نہیں ہے ان کا قول ضعیف ہے کیونکہ یہ شخص اگرچہ گناہ گار ہے لیکن اس کا گناہ ایک خارجی امر کی وجہ سے ہے۔ اس لیے اس کا نفل باطل نہیں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

لہ مرقات ج ۳ ص ۱۰۸، مظاہر حق ج ا ص ۴۰۳۔

الفصل الاوّل

حدیث ۱: عن امّ حبیبۃ رضؓ قالت قال رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم من صلّٰی فی یوم ولیلۃٍ ثنتی عشرۃ رکعۃً بُنی لہٗ بیتٌ فی الجنّۃ اربعاً قبل الظھر و رکعتین بعدھا و رکعتین بعد المغرب و رکعتین بعد العشاء و رکعتین قبل صلوٰۃ الفجر۔ رواہ الترمذی۔ وفی روایۃٍ لمسلم انھا قالت سمعت رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلم ما من عبد مسلم یُصلّی لِلّٰہِ فی کل یوم ثنتی عشرۃ رکعۃً تطوّعاً غیر فریضۃٍ اِلّا بنی اللّٰہ لہٗ بیتاً فی الجنّۃ اَو اِلّا بُنی لہٗ بیتٌ فی الجنّۃ۔

ترجمہ: اُم المؤمنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے دن رات میں بارہ رکعات پڑھیں اس کے لیے جنّت میں گھر بنا دیا گیا۔ چار رکعتیں نمازِ ظہر سے پہلے اور دو اس کے بعد۔ دو رکعتیں مغرب کے بعد اور دو رکعتیں عشاء کے بعد اور دو رکعتیں نمازِ فجر سے پہلے۔ اسے ترمذی نے روایت کیا۔ اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ ام المؤمنین رضؓ نے فرمایا کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا کہ جو مسلم بندہ ہر روز بارہ رکعاتِ نفل فرضوں کے علاوہ پڑھے اللہ تعالیٰ اُس کے لیے جنت میں گھر بنا دے گا۔ یا یوں فرمایا کہ اُس کے لیے جنّت میں گھر بنا دیا جائیگا۔

شرح[۱]: علامہ علی القاریؒ فرماتے ہیں کہ یہ تمام سنتیں موکدّہ ہیں اور نماز فجر کی دو سنتیں سب سے زیادہ مؤکدّ ہیں حتیٰ کہ بعض بزرگوں نے اُن کے وجوب کا قول کیا ہے۔ مثلاً حضرت امام حسن بصریؒ اور بعض حنفیہ اور حضرت سعید بنؒ جبیر۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ وجوب کے قائل حضرات کا ردّ اس حدیث میں موجود ہے۔ حضرت حسن بصریؒ نے تو مغرب کی تو دو سُنتوں کو بھی واجب کہا ہے۔ لیکن ایک بات یاد رہنی چاہیئے کہ حنفیہ

---

[۱] مرقات ج ۳ صفحہ ۱۰۹، مظاہر حق ج ۱ صفحہ ۴۰۳۔

کے نزدیک وجوب کا معنی فرضیت نہیں بلکہ سُنت سے اُوپر اور فرض سے نیچے کا درجہ مراد ہے۔ اور فجر کی سُنتوں کی تاکید عام سُنن سے زیادہ آئی ہے امام بخاریؒ نے باب باندھا ہے۔ باب المداومة علی رکعتی الفجر اور اس میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کی حدیث لائے ہیں جس میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ ولم یکن ید عهما ابداً وہ حضورؐ ان سنتوں کو کبھی نہیں چھوڑتے تھے[1] علامہ قسطلانی فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے وجوب کے قائلین نے استدلال کیا ہے اور یہ حضرت حسن بصریؒ سے مروی ہے جیساکہ ابن ابی شیبہ نے ان سے روایت کیا ہے اور بعض شافعیہ نے قولِ قدیم میں اس حدیث سے استدلال کرکے کہا ہے کہ یہ سب تطوّعات سے افضل ہیں[2] اور امام ابوحنیفہؒ سے بھی ایک روایت ان سنتوں کے وجوب کی موجود ہے۔

تطوّعاً غیر فریضةٍ۔ تطوّع کا معنی یہاں سُنّت ہے جس کی دو قسمیں ہیں۔ موکّدہ (رواتب) اور غیر موکّدہ یا غیر رواتب۔ اور یہاں مراد رواتب یعنی موکّدہ ہیں اور غیر فریضةٍ کا لفظ اس کی وضاحت کے لیے بطور بیان یا بدل یا حال واقع ہوا ہے۔ یا تطوّعاً کا معنی ہے کہ بخوشی ادا کرے، ریاکاری اور شہرت و نمود کی غرض سے نہ ہو۔

[3] رواہ الترمذی محی السنہ کا حق تو یہ تھا کہ وہ مسلم کی حدیث کو پہلے بیان کرتے تاکہ ترمذی کی روایت مسلم کی حدیث کی تفصیل میں بیان ہوتی۔ اس سلسلے میں ان پر اعتراض کیا گیا ہے کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ واللہ اعلم بالصوّاب۔

حدیث ۲: وعن ابن عمرؓ قال صلّیت مع رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم رکعتین قبل الظهر ورکعتین بعدها و ورکعتین بعد المغرب فی بیته ورکعتین بعد العشاء فی بیته قال وحدّثتنی حفصةؓ أن رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم کان یصلّی رکعتین خفیفتین حین یطلع الفجر۔ متّفق علیہ۔

---

[1] ارشاد الساری ج ۲ ص ۳۷۵۔ [2] فیض الباری ج ۲ ص ۴۲۶۔
[3] مرقات ج ۳ ص ۱۰۹۔

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دو رکعتیں ظہر سے قبل اور دو ظہر کے بعد پڑھیں اور دو رکعتیں مغرب کے بعد آپؐ کے گھر میں پڑھیں اور دو رکعتیں بعد از عشا بھی آپؐ کے گھر میں پڑھیں۔ عبد اللہ رضؓ فرماتے ہیں کہ ام المومنین حفصہ رضؓ نے مجھ سے بیان کیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فجر چڑھے دو ہلکی رکعتیں پڑھا کرتے۔ بخاری و مسلم۔

شرح: ؎۱ فی بیتہٖ سے مراد حفصہ رضؓ بنتِ عمر رضی اللہ عنہما کا حجرہ ہے جو جناب عبد اللہ رضؓ کی بہن تھیں۔ اس حدیث میں ظہر کی نماز سے قبل بھی دو رکعت کا بیان ہے اور حضرت امام شافعیؒ کا عمل اس پر ہے لیکن حنفیہ کہتے ہیں کہ یہاں دو کا ذکر چار کے منافی نہیں ہے۔ چار کے بارے میں حضرت علی رضؓ، عائشہ رضؓ اور امِ حبیبہ رضؓ سے احادیثِ صحیحہ وارد ہوئی ہیں۔ ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب رضؓ کا اور ان کے بعد کے اہلِ علم کا عمل اکثر چار پر ہی ہے اور سفیان ثوریؒ، عبد اللہ بنؒ مبارک، اسحاق بنؒ راھویہ کا اسی پر اتفاق ہے اور امام شافعیؒ اور احمدؒ سے بھی چار رکعتوں کی روایات موجود ہیں لیکن احمدؒ فرماتے ہیں کہ چار رکعات دو سلام سے پڑھی جائیں۔ شاید حضورؐ گھر میں ہی چار رکعات پڑھتے ہوں گے اور اسی لیے ازواجِ مطہرات رضؓ نے چار بیان کیں اور مسجد میں تشریف لاکر حضورؐ دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھتے ہوں گے جن کی روایت اس حدیث میں عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرما رہے ہیں۔ اور صبح کی دو رکعات کے وقت چونکہ عبد اللہ رضؓ موجود نہ ہوتے تھے لہذا ان کی روایت اپنی بہن سے کر رہے ہیں۔

؎۲ رکعتین خفیفتین سے مراد یہ نہیں ہے کہ حضورؐ ان میں قرأت مطلقاً نہ کرتے تھے جیسا کہ بعض نے سمجھا ہے یا صرف سورۂ فاتحہ پڑھتے تھے جیسا کہ بعض اوروں کا خیال ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان رکعات کی قرأت طویل نہ ہوتی تھی۔ امام طحاویؒ نے ان دونوں اقوال کے ردّ میں کئی احادیث روایت کر کے حضورؐ کے ان رکعات میں قرأت کے ثبوت پیش کیے ہیں۔

رکعتین قبل الظھر الخ بظاہر ان الفاظ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نے یہ سُنن مسجد میں ادا فرمائی تھیں لیکن اَحادیث میں سُنن و نوافل کے گھر میں ادا

؎۱ مظاہر حق ج ۱ ص ۴۰۴، مرقات ج ۲ ص ۳۰۹۔ ؎۲ مرقات ج ۲ ص ۱۰۹، فیض الباری ج ۲ ص ۴۳
؎۱ قسطلانی ج ۲ ص ۳۸۸۔

کرنے کی فضیلت وارد ہے۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا ہے: صلّوا ایّھا النّاس فی بیوتکم فان افضل صلاۃ المرأ فی بیتہٖ الّا المکتوبۃ۔ اور یہ اس لیے بھی مشروع ہے کہ ریاء و سُمعہ نہ ہو۔ رحمتِ خداوندی کا نزول ہو اور گھر بھی نماز سے خالی نہ رہیں۔ اور اس سے جمعہ کے دن کے نوافل، طواف کی دو رکعتیں، احرام کی رکعات اور نماز تراویح مستثنیٰ ہے۔ اور فقہاءؒ نے نماز تراویح کے سوا نوافل کی جماعت کو مکروہ کہا ہے۔ لیکن بعض جہلاء یہ سمجھے کہ رمضان میں تراویح کے علاوہ شاید دیگر نوافل کی بھی جماعت ہو سکتی ہے۔ حالانکہ نوافل کی جماعت اور اس کی تداعی ہمارے نزدیک مکروہ ہے۔

حدیث ۳: وعنہ قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلّم لَا یُصلّی بعد الجمعۃ حتّٰی ینصرف فیصلّی رکعتین فی بیتہٖ۔ متّفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے بعد گھر تشریف لانے سے پہلے نماز نہ پڑھتے تھے۔ پس گھر میں تشریف لا کر دو رکعت پڑھا کرتے تھے۔ بخاری و مسلم۔

شرح: [1] اس نماز سے مراد جمعہ کی سُنت ہے اور اس کی سُنت بھی ظہر کی مانند ہے۔ لیکن بعض صحیح روایات میں ثابت ہو چکا ہے کہ حضورؐ جمعہ سے قبل چار رکعت اور اس کے بعد بھی چار رکعت پڑھا کرتے تھے اور ایک روایت میں جمعہ کے بعد چھ رکعات آئی ہیں۔ امام ابو یوسفؒ نے چھ کو افضل کہا ہے امام شافعیؒ نے دو کو اور اکثر حنفیہ کا قول چار کا ہے۔

حدیث ۴: وعن عبدِ اللہ بن شقیق قال سألتُ عائشۃ عن صلاۃ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم عن تطوّعہٖ فقالت کان یصلّی فی بیتی قبل الظھر اربعًا ثمّ یخرج فیصلّی بالنّاس ثمّ یدخل فیصلّی رکعتین وکان یصلّی بالنّاس المغرب ثم یدخل فیصلّی رکعتین ثمّ یُصلّی بالنّاس

---

[1] فیض الباری ج ۲ ص ۴۳۳۔

[2] مرقات ج ۳ ص ۱۱۱، مظاہر حق ج ۱ ص ۴۰۴۔

العشاء ویدخل بیتی فیصلّی رکعتین وکان یصلّی من اللّیل تسع رکعاتٍ فیھنّ الوتر وکان یصلّی لیلاً طویلاً قائماً و لیلاً طویلاً قاعداً وکان اذا قرأ و ھو قائم رکع وسجد وھو قائم وکان اذا قرأ قاعداً رکع وسجد وھو قاعدٌ وکان اذا طلع الفجر صلّی رکعتین- رواہ مسلم - وزاد ابوداؤد ثمّ یخرج فیصلّی بالنّاس صلاۃ الفجر-

ترجمہ: عبداللہ بن شقیق تابعی فرماتے ہیں کہ میں نے امّ المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے حضورؐ کی نفلی نماز کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ حضورؐ میرے گھر میں ظہر سے قبل چار رکعات پڑھتے تھے پھر گھر سے نکلتے اور لوگوں کے ساتھ نماز پڑھتے پھر گھر میں آتے تو دو رکعتیں پڑھتے تھے۔ اور لوگوں کو مغرب کی نماز پڑھاتے پھر گھر میں داخل ہوتے تو دو رکعتیں پڑھتے تھے۔ پھر لوگوں کو عشاء کی نماز پڑھاتے اور میرے گھر میں تشریف لاتے تو دو رکعتیں پڑھتے تھے۔ اور رات کو تہجّد کی نماز نو رکعات وتر سمیت پڑھتے تھے۔ اور کافی رات تک کھڑے ہو کر اور کافی رات تک بیٹھ کر نماز پڑھا کرتے تھے اور جب کھڑے ہو کر نماز پڑھتے تو رکوع اور سجدہ میں بھی قیام سے ہی منتقل ہوا کرتے تھے اور جب بیٹھ کر پڑھتے تو رکوع وسجدہ بھی بیٹھ کر ہی کرتے تھے اور جب فجر طلوع ہوتی تھی تو دو رکعتیں پڑھتے تھے۔ مسلم۔

اور ابوداؤد نے یہاں اتنا لفظ بڑھایا ہے کہ پھر آپؐ باہر تشریف لے جا کر لوگوں کے ساتھ نماز فجر پڑھتے تھے۔

تشریح: لہ اس حدیث سے کئی مسائل نکلتے ہیں ایک یہ کہ نوافل کا گھر میں پڑھنا افضل و اَولیٰ ہے، اور ایک یہ کہ نوافل میں قیام وقعود دونوں جائز ہیں۔ اور حضورؐ کی صلاۃ اللّیل کی تعداد چھ، آٹھ، نو، دس، گیارہ اور تیرہ بھی آئی ہے مختلف اوقات میں حضورؐ نے مختلف رکعات پڑھی ہیں۔ اور نفل نماز یا تو بالکل کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر یا دونوں طرح کہ

لہ مظاہر حق ا صفحہ ۴۰۴، ۴۰۵، مرقات ج ۳ صفحہ ۱۱۰، ۱۱۱۔

قرأت کے وقت بیٹھ جاتے اور پھر اُٹھ کھڑے ہوتے اور اس کے خلاف ثابت نہیں کہ قرأت تو کھڑے ہو کر کی ہو اور رکوع و سجود بیٹھ کر۔ اور صلاۃ اللیل ساری پر بھی احادیث میں وتر کا لفظ آیا ہے۔ خالص صلوٰۃ اللیل اس کی ہے جو وتر پہلے پہر ادا کرلے اور پچھلے پہر صرف تہجّد پڑھے۔ ورنہ صلاۃ اللیل کو اگر وتر سمیت پڑھے گا تو اسی کو حدیث میں وتر کے لفظ سے ادا فرمایا گیا ہے اور یہ محض تعبیر و بیان کا اختلاف ہے حقیقت میں کوئی فرق نہیں۔ وتر حنفیہ کے نزدیک تین رکعت ایک سلام کے ساتھ ہے اور وہ اوّل شب یا آخرِ شب سے مقیّد نہیں ہے لیکن اس کا وقت عشاء کے بعد سے شروع ہوتا ہے اور صلاۃ اللیل بالاتفاق سُنّت ہے اور وہ آخر شب سے یا سو کر اُٹھنے کے بعد سے مقیّد ہے۔ اس حدیث میں جو بیٹھ کر پڑھنے کا ذکر ہے یہ آخری عمر کا بیان ہے۔ کیونکہ خود حضرت عائشہؓ سے اور احادیث میں اس کی یہی وضاحت آئی ہے۔

حدیث ۵: وعن عائشۃ قالت لم یکن النبی صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم علی شیءٍ من النّوافل اشدّ تعاھداً منہُ علی رکعتی الفجر۔ متّفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ سلام اللہ علیہا فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی دو سنتوں کے علاوہ کسی اور نفل کے اس قدر پابند نہ تھے۔

بخاری و مسلم۔

شرح: حضورؐ نے سفر و حضر میں انھیں پڑھا ہے اسی لیے فقہ میں ہے کہ بلا عذر بیٹھ کر ان کا پڑھنا جائز نہیں ہے۔ اور اسی تاکید و شدّت کی وجہ سے بعض بزرگانِ اُمّت ان کے وجوب کے قائل ہوتے ہیں۔ مثلاً حضرت حسن بصریؒ، سعید بن جبیرؒ اور ایک روایت کے مطابق امام ابوحنیفہؒ۔ مسلک حنفیہ کا یہی ہے کہ یہ سُنّت ہیں لیکن عام سنتوں سے زیادہ مؤکّد۔ اسی لیے جب کسی کو فجر کی نماز میں شامل ہو جانے کا یقین ہو تو مسجد سے باہر انھیں ادا کر سکتا ہے پھر جماعت سے جا ملے۔ واللّٰہ اعلم بالصّواب

حدیث ۶: وعنھا قالت قال رسُول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم رکعتا الفجر خیرٌ من الدّنیا و ما فیھا۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ: حضرت ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے۔ فرمایا کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا: فجر کی دو رکعات دنیا و ما فیہا (ساری کائنات) سے بہتر ہیں۔

مسلم۔

شرح: لہ ابن خزیمہ کی ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ نیکی کے کاموں میں سے سب سے زیادہ تیزی سے فجر کی دو رکعتوں کی طرف جایا کرتے تھے۔ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے کوئی فائدہ مند عمل بتایئے تو حضورؐ نے اسے فجر کی دو رکعتوں کی تاکید فرمائی کیونکہ ان میں فضیلت ہے۔ اور ایک روایت حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے ہے کہ حضورؐ نے فرمایا قبل فجر کی دو رکعتیں مت چھوڑو کیونکہ ان میں "رغائب" ہیں۔ ٢ے اور دنیا و مافیہا سے مراد مال و دولت اور جاہ و جلال ہے یعنی ان سب کو یا ان کے انفاق فی سبیل اللہ کو ایک طرف رکھو اور فجر کی سنتوں کو دوسری طرف تو معاملہ ایک جیسا ہوگا۔ اور علماء نے سب سے افضل فجر کی سُنتوں کو پھر مغرب کے بعد کی دو سُنتوں کو، پھر ظہر کے بعد کی دو سُنتوں کو قرار دیا ہے اور سب سے آخر میں رواتب میں سے ظہر کی پہلی رکعات کا نمبر آتا ہے۔

حدیث ٧: وعن عبدُ اللّٰه بن مُغفّل قال قال النبی صلّی اللّٰه علیه وسلم صلّوا قبل صلاة المغرب رکعتین قال فی الثالثة لمن شاء کراهیة ان یتخذ ها النّاس سُنّةً۔ متّفق علیه۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مُغفّل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: نمازِ مغرب سے پہلے دو رکعتیں پڑھو۔ تین مرتبہ یہ فرما کر فرمایا کہ "جو چاہے"۔ اس بات کو ناپسند کرنے کی وجہ سے کہ لوگ کہیں سُنت ہی نہ بنا بیٹھیں۔ بخاری و مسلم

شرح: ٣ے ان سنتوں کا جواز اب بھی باقی ہے جیسا کہ امام ابن الہمامؒ نے کہا ہے اور اس میں مختصر کلام یہ ہے کہ ان رکعات کا خمول اور عدم شہرت اور لوگوں کا ان پر عمل نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ محض مستحب رہ گئی ہیں اگر مؤکد ہوتیں تو تعامل ہوتا اور یوں گوشۂ گمنامی میں نہ جا پڑتیں۔ ابو داؤد ص ١٨٩ میں ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا میں نے حضورؐ کے زمانے میں ان رکعات کو پڑھتے کسی کو نہیں دیکھا اور بخاری ج ١ ص ١٥٨ میں ہے کہ مرثد بن عبداللہ نے اس امر پر اظہارِ تعجب کیا کہ ابو تمیمؒ ان رکعات

لہ مرقات ج ٣ ص ١١١۔ ٢ے مظاہر حق ج ١ ص ٤٠٥۔
٣ے فیض الباری ج ٢ ص ٤٣٢۔

کو کیوں ادا کرتے ہیں! یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ رکعات تعامل ہیں نہ آسکیں نہ مشہور ہوئیں
لہ خلفائے راشدینؓ اکثر فقہاء مثلاً مالکؒ، ابو حنیفہؒ وغیرھم نے ان دو رکعتوں کی حوصلہ
افزائی نہیں کی کیونکہ ان کی وجہ سے نماز مغرب میں تاخیر کا احتمال ہے۔
ان سُنتوں پر کافی گفتگو باب الاذان میں حدیث بین کل اذانین صلوٰۃٌ کے
ضمن میں گزر چکی ہے۔

حدیث ۸: وعن ابی ھریرۃؓ قال قال رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم من کان منکم مُصلّیاً بعد الجمعۃ فلیُصلِّ اربعاً۔ رواہ مسلم۔ وَفی اُخریٰ لہٗ اذا صلّی احدکم الجمعۃ فلیصلّ بعدھا اربعاً۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللّٰہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جمعہ کے بعد تم میں سے جس کو نماز پڑھنی ہو چار رکعات پڑھے۔ مسلم۔ اور مسلم کی دوسری روایت میں ہے کہ جب تم میں سے کوئی جمعہ پڑھ لے تو اس کے بعد چار رکعات پڑھے۔

شرح: لہ امام شافعیؒ (ایک قول میں)، امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کا اسی حدیث پر عمل ہے۔ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ جمعہ کے بعد چھ رکعات سُنت ہیں اور اس طرح دو حدیثیں جمع ہو جاتی ہیں۔ امام طحاویؒ نے بھی اسی کو مختار قرار دیا ہے۔ ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ پہلے چار رکعات اور پھر دو پڑھے۔ اور اس حدیث سے قبل از جمعہ کی رکعات کی نفی نہیں ہوتی بلکہ احادیث سے چار رکعات ثابت ہیں۔

بابُ صلاۃِ اللّیل

لہ عام طور پر تہجد، صلاۃ اللیل اور قیام اللیل کے الفاظ ہم معنیٰ ہیں۔ لیکن تہجد خاص طور پر وہ نماز ہے جو نیند سے بیدار ہو کر رات کو پڑھی جائے لیکن صلاۃِ اللیل

لہ مرقات ج ۳ ص ۱۱۲، مظاہر حق ج ۱ ص ۴۰۵۔
لہ مرقات ج ۳ ص ۱۱۲ لہ فیض الباری ج ۲ ص ۴۰۷۔

یا قیام اللیل میں سو کر اُٹھنے کی شرط نہیں ہے۔ ہر وہ نفل نماز جو رات کو پڑھی جاتے چاہے سونے سے پہلے ہو یا نیند سے بیدار ہو کر اُسے صلاۃ اللیل یا قیام اللیل کہہ سکتے ہیں۔ جس آدمی کو نیند زیادہ آتی ہو رات کو اُٹھ کر نماز نہ پڑھ سکے یا سفر کی حالت میں ہو تو اُسے سونے سے پہلے دو رکعتیں پڑھنا بتایا گیا ہے جن میں سے پہلی میں سورۃ زلزال اور دوسری میں سورۃ کافرون کی قرأت کرے تو حضورؐ نے فرمایا ہے کہ اُسے تہجد سے یہ کافی ہو جائیں گی لیکن ظاہر ہے کہ یہ معذوری کی تہجد ہے جس طرح کہ جو شخص پچھلے پہر اُٹھنے کا ظن غالب نہ رکھتا ہو اُسے حکم دیا گیا ہے کہ سونے سے پہلے ہی بعد از عشاء وتر ادا کر لے لیکن افضل و اولیٰ یہی ہے کہ وتر بھی پچھلے پہر پڑھے۔ لیکن یہ محض حکمی تہجد ہے اصل وہی ہے جو اُوپر بیان ہوا۔

شافعیہ کے نزدیک وتر اور صلاۃ اللیل متحد ہیں اگر قبل النوم پڑھے جائیں تو صلاۃ اللیل اور اگر بعد النوم پڑھے جائیں تو تہجد کہلائیں گے۔ پس ان کے نزدیک تہجد، وتر اور صلاۃ اللیل مصداق کے لحاظ سے متحد ہیں اور مفہوم و اعتبار کے لحاظ سے الگ الگ۔ لیکن حنفیہ کے نزدیک وتر اور تہجد (صلاۃ اللیل، قیام اللیل) دو الگ الگ نمازیں ہیں۔ اور مطلق نفل تہجد یا صلاۃ اللیل کے علاوہ ہیں انھیں چاہے کوئی سینکڑوں کی تعداد میں پڑھ لے۔ حنفیہ نے تہجد اور صلاۃ اللیل کی تعریف تو تقریباً وہی کی ہے جو شافعیہ کرتے ہیں لہٰذا اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے لیکن وتر ان کے نزدیک ایک مستقل نماز ہے جو اپنے وقت، تعداد رکعات، قضاء اور تعیین قرأت میں صلاۃ اللیل یا تہجد سے بالکل الگ تھلگ ہے۔ پس اگر وتر کو پہلے پہر پڑھا جائے جیسا کہ ابوھریرہؓ اور بعض اور بزرگوں سے ثابت ہے تو وہ صلاۃ اللیل سے بالکل عملاً بھی الگ ہو جاتے گی لیکن اگر اسے پچھلے پہر پڑھا جاتے تو بعض دفعہ ساری صلوٰۃ اللیل پر بھی وتر کا اطلاق ضرور ہوا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وتر کوئی مستقل نماز نہیں ہے۔ اور وتر کے متعلق پہلے پہل کچھ توسیع تھی اُسے عام نفل کی طرح سواری پر بھی پڑھا جا سکتا تھا لیکن آخر کار اس میں پابندی لگا دی گئی اور حضورؐ نے فرمایا ان اللّٰہ اَمدّکم بصلاۃٍ الخ جیسا کہ امام طحاویؒ نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ امام بخاریؒ نے وتر کے باب الگ اور تہجد کے الگ باندھے ہیں جس سے معلوم ہوا کہ ان کے ہاں یہ دو الگ نمازیں ہیں۔ اور وتر کی تین رکعتیں ایک سلام اور دو تشہد کے ساتھ ہیں جیسا کہ عام نمازوں میں بھی ہے لیکن شافعیہ نے عملاً تو وتر کی تین رکعتیں بیان کیں،

اور پڑھیں لیکن جائز صورتوں کے بیان میں ایک رکعت یا دو سلام کے ساتھ تین رکعت کا بیان بھی کر دیا ہے۔ باقی مسائل انشاء اللہ شرح احادیث کے ضمن میں آئیں گے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

لہ تہجد کی نماز کی مختلف تعدادِ رکعات ثابت ہے مثلاً ۱۳، ۱۱، ۹، ۷، اور بعض علماء نے پانچ تک تعداد بتائی ہے لیکن تیرہ سے زیادہ ثابت نہیں (یعنی وتر سمیت) اور بعض دفعہ اس عدد میں فجر کی دو سنتیں بھی شمار کر لی گئی ہیں۔ تفصیل آگے آئے گی۔ واللہ ھو الموفق للصواب۔

الفصل الاوّل

حدیث ۱: عن عائشۃ رضؓ قالت کان النبی صلی اللہ علیہ وسلّم یُصلّی فیما بین ان یفرغ من صلوٰۃ العشاء الی الفجر احدیٰ عشرۃ رکعۃً یُسلّمُ من کُلِّ رکعتین و یُوتِرُ بواحدۃٍ فیسجد السّجدۃ من ذلک قدر مایقرأُ احدکم خمسین آیۃ قبل ان یرفع رأسہٗ فاذا سکت المؤذّنُ من صلاۃ الفجر وتبیّن لہ الفجر قام فرکع رکعتین خفیفتین ثم اضطجع علی شقّہ الایمن حتّی یأتیہُ المؤذّن للاقامۃ فیخرجُ۔ متّفق علیہ۔

ترجمہ: امّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ سلام اللہ علیہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نمازِ عشاء سے فراغت سے لے کر فجر تک کے درمیان گیارہ رکعات پڑھا کرتے تھے ہر دو رکعتوں پر سلام کہتے اور ساری نماز کو ایک رکعت کے ساتھ وتر بنا دیتے تھے اور اس میں آپؐ اتنا لمبا سجدہ کیا کرتے تھے جتنی مقدار تم میں سے کسی کے پچاس آیتیں پڑھنے کی ہے۔ سر اٹھانے سے پہلے اتنی دیر سجدہ میں رہتے تھے۔ پھر جب نمازِ فجر کی اذان کہنے والا خاموش ہو جاتا تو آپؐ اُٹھتے اور دو ہلکی رکعتیں پڑھتے

لہ مظاہر حق ج ۱ ص ۴۱۱۔

تھے پھر اپنی دائیں کروٹ پر لیٹ جاتے یہاں تک کہ موذّن آپؐ کے پاس نماز کے کھڑے ہونے کی اطلاع دینے آتا تو آپؐ گھر سے تشریف لے جاتے تھے۔ بخاری ومسلم۔

شرح: لہ معلوم ہونا چاہیئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو صلاۃ اللّیل میں اپنی اقتداء سے روک دیا تھا کیونکہ آپؐ اس میں کمزوروں اور بیماروں کے حال کی رعایت فرماتے تھے اور اس سے معلوم ہوا کہ اس نماز کی بنیاد انفراد پر ہے اور اسی طرف قرآن نے نافلۃً لك کہہ کر اشارہ کیا ہے حالانکہ اس سے قبل پانچ نمازوں کے قائم کرنے کا حکم دیا ہے۔ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلوكِ الشمس الی غسق اللّیل وقرآن الفجر۔ الآیۃ۔ اور اس کا نام قرآن نے نافلہ اس لیے رکھا ہے کہ اس میں جماعت کی شرکت نہ ہوتی تھی۔ اسی لیے امام ابو حنیفہؒ نے صلاۃ اللّیل میں تداعی کو مکروہ کہا ہے اور تداعی کی حد جیسا کہ معروف ہے یہ ہے کہ لوگوں کو اس کے لیے بلانے کا اہتمام کیا جائے۔ اور یہی راز ہے اس حدیث کے ان الفاظ کا کہ لیسجد السجدۃ من ذلك قدر ما یقرأ احدکم خمسین آیۃً۔

لہ بخاری صفۃ الصلوٰۃ میں ہے کہ حضور صلوٰۃ اللیل کے رکوع اور سجدے میں کئی دعائیں پڑھتے تھے مثلاً سبحانك اللّٰھم وبحمدك اللّٰھم اغفرلی۔ اور امام احمدؒ نے صحیح سند سے مسند میں حضرت عائشہؓ سے روایت کی ہے کہ حضورؐ سجدہ میں کہا کرتے تھے سبحانك لا الٰہ الا انت۔ اور بزرگانِ سلف حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کے مطابق صلوٰۃ اللیل میں لمبے لمبے سجدے کیا کرتے تھے۔

سہ وَیُوتِرُ بِواحدۃٍ امام ابو حنیفہؒ کے علاوہ باقی ائمہ ثلاثہ کے نزدیک اس کا معنی یہ ہے کہ ایک ہی اکیلی رکعت وتر کی پڑھتے تھے لیکن امام اعظمؒ کا مسلک یہ ہے کہ اکیلی رکعت نہیں بلکہ تہجّد پڑھتے پڑھتے جب طلوع فجر کا گمان ہونے لگتا تو دو رکعتوں کے ساتھ ایک اور ملا کر اس شفع کو وتر بنا دیتے تھے۔ علامہ ابن حجرؒ نے حدیث سے یہ استدلال کیا ہے کہ کم از کم وتر کی رکعت ایک ہے۔ حنفیہ نے بہت سے روایات سے استدلال کیا ہے جن کا ذکر آگے باب الوتر میں انشاء اللہ آئے گا۔

لہ فیض الباری ج ۲ ص ۱۴۱ لہ عسقلانی ج ۲ ص ۳۵۲

سہ مرقات ج ۳ ص ۱۲۰، مظاہر حق ج ۱ ص ۴۱۲

ثمّ اضطجع علی شقّۃ الایمن یعنی صلاۃ اللیل کی وجہ سے ذرا تھکن محسوس ہوتی تھی اور فجر کی سنت اور فرض کے درمیان چونکہ کچھ وقفہ ہوتا تھا لہٰذا اس میں تھوڑا سا ستا لیتے تھے۔ یہ ستانا مستحب ہے تاکہ پھر تازہ دم ہو کر نمازِ فجر پڑھی جا سکے۔ اور یہ کہنا کہ فجر کی سنت اور فرض کے درمیان فاصلے کے لیے لیٹنا مستحب ہے تو یہ بات بے دلیل ہے کیونکہ حضورؐ سنت گھر میں ادا فرماتے تھے اور فرض مسجد میں۔ تو فصل تو خود بخود واقع ہو ہی جاتا تھا۔

لہ اس حدیث میں بیان ہونے والا لمبا سجدہ نماز میں ہوتا تھا جیسا کہ بخاری نے اس پر باب باندھا ہے باب طول السجود فی قیام اللیل۔ لیکن امام نسائی نے اس پہ باب رکھ دیا کہ یہ سجدہ نماز سے الگ اور اس سے باہر ہوتا تھا لیکن یہ بات بالکل بعید ہے۔ اور شافعیہ کے ہاں سجدۂ شکر بھی معمول بہا ہے کہ جب چاہیں جہاں چاہیں اکیلا سجدہ کر ڈالیں لیکن حنفیہ کے ہاں اس کی کوئی اصل نہیں ہے ہاں صلاۃِ شکر البتہ ثابت ہے اور سجدۂ شکر اگر نماز کے ضمن میں ہو تو اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے ۔ علامہ علی القاریؒ فرماتے ہیں کہ جاہل لوگ جو مشائخ کے سامنے سجدہ بجا لاتے ہیں چاہے قبلہ رُخ ہوں یا کسی اور طرف کو، اور چاہے نیّت عبادتِ الٰہی کی ہو بہر صورت یہ سجدہ حرام ہے۔ اس کی کسی نے بھی اجازت نہیں دی۔

حدیث ۲ : وعنہا قالت کان النبی صلّی اللہ علیہ وسلم اذا صلّی رکعتی الفجر فان کنت مستیقظۃً حدّثنی والّا اضطجع ۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ : اور حضرت عائشہ صدّیقہؓ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم جب فجر کی دو رکعتیں پڑھ لیتے تھے تو اگر میں بیدار ہوتی تو میرے ساتھ بات چیت کرتے ورنہ لیٹ جاتے تھے۔ مسلم۔

شرح لہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کو کسی اور کے کلام پر قیاس نہیں کیا جا سکتا آپؐ کی ہر بات دین ہوتی تھی۔ حنفیہ کے نزدیک سنتِ فجر کے بعد گفتگو میں اتنی گنجائش نہیں ہے۔

لہ فیض الباری ج ۲ ص ۴۱۰ ۔

لہ مرقات ج ۳ ص ۱۲۰ ، مظاہر حق ج ۱ ص ۴۱۲ ۔ لہ فیض الباری ج ۲ ص ۴۰۶ ۔

اور[1] سلف سے ثابت ہے کہ انہوں نے اسے ناپسند کیا ہے جیسا کہ مصنف ابن ابی شیبہ میں صراحت ہے اور سنتِ فجر کے بعد لیٹنا عبادات میں سے نہیں بلکہ حضورؐ کی عادات میں سے ہے۔ اگر کوئی شخص آپؐ کی عادات کا اتباع کر کے اجر حاصل کرنے کا ارادہ کرے تو اس کے لیے اس میں بھی گنجائش موجود ہے۔

حدیث ۳: وعنها قالت كان النبي صلّى الله عليه وسلّم اذا صلّى ركعتي الفجر اضطجع على شقّه الايمن۔ متفق عليه۔

ترجمہ: اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب فجر کی دو سنّت پڑھ لیتے تھے تو اپنی دائیں کروٹ پر لیٹ جاتے تھے۔ بخاری و مسلم

شرح:[2] حضرت عائشہ صدیقہؓ کا ارشاد موجود ہے کہ حضورؐ کا یہ لیٹنا بطور سنت نہ تھا بلکہ تھکن دُور کرنے کے لیے ہوتا تھا۔ اسے عبادت سمجھنا بدعت ہے یہی معنی ہے عبداللہ بن عمرؓ، امام مالکؒ اور امام احمدؒ وغیرہم کے قول کا کہ وہ اسے بدعت قرار دیتے تھے۔ امام شافعیؒ کے سوا کسی نے بھی اسے مستحب نہیں کہا لیکن علامہ ابن حزمؒ نے اسے واجب کہا ہے اور جو شخص نہ لیٹے اس کی نماز کے فاسد ہونے کا حکم لگا دیا ہے حالانکہ کئی صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ حضورؐ نہیں لیٹے یعنی یا تو استراحت کی حاجت نہ تھی یا بیانِ جواز کے لیے ایسا کیا۔ واللہ اعلم بالصّواب۔

حدیث ۴: وعنها قالت كان النبي صلّى الله عليه وسلّم يُصلّي من الليل ثلاث عشرة ركعةً منها الوتر و ركعتا الفجر۔ رواه مسلم۔

ترجمہ: حضرت عائشہؓ ام المؤمنین فرماتی ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رات کو وتر اور فجر کی دو سُنّت سمیت تیرہ رکعات پڑھتے تھے۔ مسلم۔

شرح:[3] شمائل ترمذی کی ایک حدیث ہے کہ حضرت اُم المؤمنینؓ نے فرمایا ثم یُصلّی ثلاثًا اور مسلم میں ثُمّ اوتر بثلاثٍ کا لفظ آیا ہے۔ پس اس حساب سے صلاۃ اللیل کی صرف آٹھ رکعات رہ جاتی ہیں اور عام طور پر حضورؐ کی تہجد کی یہی مقدار رہتی۔ جیسا کہ اور احادیث سے بھی ثابت ہے۔ ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ وتر اور سنتِ فجر کو

۱۔ جیسے امام مالکؒ فیض الباری ج ۲ ص ۴۲۷۔

۲۔ مرقات ج ۳ ص ۱۲۲۔ ۳۔ مظاہر حق ج ۱ ص ۴۱۳، مرقات ج ۳ ص ۱۲۲۔

تہجد کے ملانے کی وجہ یہ ہے کہ حضورؐ جاگتے رہتے تھے اور تہجد کے ساتھ وتر اور پھر اس کے متصل ہی سنّتِ فجر ادا فرماتے ہیں ورنہ ظاہر ہے کہ تہجّد، وتر اور سنّتِ فجر الگ الگ نمازیں ہیں۔ اور یہ حدیث صرف مُسلم میں ہی نہیں بلکہ متفق علیہ ہے شاید مصنف کو ذھول ہوگیا ہے۔

حدیث ۵ : وعن مسروقؒ قال سألتُ عائشۃؓ عن صلوٰۃِ رسُول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم باللّیل فقالت سبعٌ و تسعٌ و احدٰی عشرۃ رکعۃً سِوٰی رکعتی الفجر۔ رواہ البخاری۔

ترجمہ : حضرت مسروقؒ تابعی فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہا سے حضور صلی اللّٰہ علیہ وسلم کی رات کی نماز کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ فجر کی دو سُنّتوں کے علاوہ کبھی سات، کبھی نو اور کبھی گیارہ رکعات ہوتی تھیں۔ بخاری۔

شرح :[۱] یعنی اگر فجر کی دو رکعات کو شمار کریں تو تیرہ تک نوبت پہنچے گی۔[۲] علّامہ علی القاریؒ فرماتے ہیں کہ اس چیز سے کوئی امر مانع نہیں کہ بارہ رکعات تہجّد اور تین وتر شمار کی جائیں اور اس پر یہ چیز دلالت کرتی ہے کہ اگر کبھی حضور صلی اللّٰہ علیہ وسلم نیند کے غلبے کی وجہ سے سو جاتے اور تہجّد نہ پڑھ سکتے تو دن کو بارہ رکعات پڑھتے تھے۔

حدیث ۶ : وعن عائشۃؓ قالت کان النبی صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم اذا قام من اللّیل لیُصلّی افتتح صلٰوتہٗ برکعتین خفیفتین۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ : حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللّٰہ علیہ وسلم جب رات کو نماز پڑھنے کے لیے اُٹھتے تو دو ہلکی رکعتوں کے ساتھ اپنی نماز کو شروع فرمایا کرتے تھے۔ مسلم۔

شرح :[۳] ظاہر یہی ہے کہ یہ دو رکعتیں بھی تہجّد میں شامل تھیں گو بعض علماء نے فرمایا ہے کہ یہ دو رکعتیں تحیۃ الوضو کی ہوتی تھیں۔ بہتر قول پہلا ہے اور یہ دو رکعتیں خفیف

---

[۱] مظاہر حق ج ۱ ص ۴۱۳۔ [۲] مرقات ج ۳ ص ۱۲۲۔ [۳] ایضاً۔

ہوتی تھیں تاکہ نشاط پیدا ہو جائے گویا یہ ایک طرح سے تہجد کا مقدمۃ الجیش تھیں۔ واللہ اعلم۔

حدیث ۷ : وعن ابی ھریرۃؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا قام احدکم من اللیل فلیفتتح الصلوٰۃ برکعتین خفیفتین۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ : حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی آدمی رات کو اٹھے (نماز کا ارادہ کرے۔ تو اسے دو ہلکی رکعتوں کے ساتھ نماز کا افتتاح کرنا چاہیئے۔ مسلم۔

شرح : لیکن یہ امر وجوب کے لیے نہیں استحباب کے لیے ہے اور[1] اس میں یہ اشارہ ہے کہ شرعی احکام تخفیف سے شروع ہو کر آگے کو چلتے ہیں۔

حدیث ۸ : وعن ابن عباسؓ قال بتّ عند خالتی میمونۃؓ لیلۃً والنبی صلی اللہ علیہ وسلم عندھا فتحدث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مع اھلہٖ ساعۃً ثم رقد فلما کان ثلث اللیل الآخر او بعضہٗ قعد فنظر الی السماء فقرأ اِنّ فی خلقِ السّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ اختلافِ اللّیل والنّھار لاٰیاتٍ لاُولی الالباب حتّٰی ختم السورۃ ثمّ قام الی القربۃ فاطلق شناقھا ثمّ ھبّ فی الجفنۃ ثم توضّأ وضوءً احسناً بین الوضوئین لم یکثر وقد أبلغ فقام فصلّٰی فقمتُ و توضّأتُ فقمتُ عن یسارہ فأخذ باُذنی فادارنی عن یمینہٖ فتتامّتْ صلوٰتہٗ ثلاث عشرۃ رکعۃً ثمّ اضطجع فنام حتّٰی نفخ وکان اذا نام نفخ فآذنہٗ بلال بالصّلوٰۃ فصلّٰی وَ لم یتوضّأ وکان فی دعائہٖ اللّٰھُمّ اجعل فی قلبی نوراً و فی بصری نوراً و فی سمعی نوراً وعن یمینی نوراً وعن یساری

---

[1] مرقات ج ۳ ص ۱۲۳۔

نوراً وفوقی نوراً وتحتی نوراً واما می نوراً وخلفی نوراً واجعل لّی نوراً۔ و زاد بعضھم وفی لسانی نوراً و ذکر وعصبی و لحمی و دمی وشعری و بشری۔ متّفق علیہ۔ وفی روایۃ لھما واجعل فی نفسی نوراً و اعظم لی نوراً وفی اُخریٰ لمسلم اللّٰھم اعطنی نوراً

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے ایک رات اپنی خالہ ام المؤمنین میمونہ رضؓ کے ہاں بسر کی اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس رات وہاں تھے۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے گھر والوں سے ایک گھڑی بات چیت کی پھر سو گئے پس جب رات کا آخری تیسرا حصہ یا اس سے کچھ کم باقی رہ گیا تو حضورؐ اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ سو آسمان کی طرف نگاہ اُٹھائی اور یہ آیات سورۃ کے آخر تک پڑھیں: اِنَّ فی خلق السّمٰوٰت واختلافِ اللّیل والنّھار لاٰیاتٍ لِاُولی الالباب" یقیناً آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور دن رات کے یکے بعد دیگرے آنے میں عقلمندوں کیلئے بڑی نشانیاں ہیں"۔ پھر آپؐ مشک (پانی کی مشک) کی طرف اُٹھے اور اُس کا بند کھولا پھر پانی طشت میں ڈالا۔ پھر آپؐ نے بہت اچھا وضو کیا۔ آپؐ کا وضو دونوں وضوؤں کے درمیان تھا۔ آپؐ نے زیادہ پانی نہ خرچ فرمایا لیکن ضروری اعضاء تک خوب پہنچایا۔ پھر آپؐ اُٹھے تو نماز پڑھی۔ پس میں بھی اٹھا اور وضو کیا اور آپؐ کے بائیں طرف کھڑا ہو گیا تو حضورؐ نے میرا کان پکڑا اور مجھے پیچھے سے گھما کر دائیں طرف لے گئے۔ پس آپؐ کی نماز تیرہ رکعات خوب پوری ہوئی۔ پھر آپؐ لیٹ گئے تو سو گئے حتیٰ کہ خراٹے لینے لگے اور آپؐ جب سوتے تو خراٹے لیا کرتے تھے۔ پھر بلال رضؓ نے آپؐ کو نماز کی اطلاع دی۔ پس آپؐ نے نماز پڑھی لیکن وضو نہ فرمایا اور آپؐ کی دُعا میں یہ بھی تھا "اے اللہ میرے دِل میں نور بھر دے اور میری آنکھ میں نور ڈال دے اور میرے کانوں میں نور ڈال دے۔ اور میرے دائیں طرف نور کر دے اور میرے بائیں طرف نور کر دے۔ اور میرے اُوپر نور اور میرے نیچے نور اور میرے آگے نور اور میرے پیچھے نور کر دے اور میرے لیے نور مقرر فرما دے"۔

بعض راویوں نے یہ لفظ بڑھائے ہیں۔ "اور میری زبان میں نور پیدا کر دے" اور اُن راویوں نے "وعصبی ولحمی الخ کا بھی ذکر کیا ہے یقینی میرے پٹھے میں اور میرے گوشت میں اور میرے خون میں اور میرے بالوں میں اور میری کھال میں"۔ بخاری ومسلم۔ اور ان دونوں کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں"؛ اور میرے دل میں نور پیدا کر اور مجھے عظیم نور عطا فرما دے"۔ اور مسلم کی ایک روایت میں ہے" اور مجھے نور عطا فرما"۔

شرح؛ عبداللہ بن عباسؓ کی یہ حدیث مختصراً پہلے بھی گزر چکی ہے۔ اس حدیث سے کئی مسائل نکلتے ہیں مثلاً ایک[1] یہ کہ عشاء کے بعد گھر والوں سے بات چیت کرنا یا دینی بات چیت ممنوع نہیں۔ دوسرا یہ کہ اس حدیث میں سُنتِ فجر کے علاوہ تیرہ رکعات (وتر سمیت) ثابت ہیں اور بظاہر یہ حضرت عائشہؓ کی حدیث کے خلاف ہے لیکن حضورؐ کی نمازِ تہجد کی رکعات کی تعداد مختلف احوال وایام میں مختلف ہوا کرتی تھی۔ اور حضرت ابن عباسؓ اس زمانے میں کم سن تھے۔ حضورؐ کے متعلق جو فرمایا ہے کہ آپؐ خراٹے لیتے تھے سو خراٹے لینا اچھی صحت کی علامت ہے۔ اور حضورؐ نے عبداللہ بن عباسؓ کو کان سے پکڑ کر جو گھمایا سو اصل غرض تو انھیں گھمانا تھی اتفاقاً سر پر ہاتھ ڈالا تو کان پر ہی جا پڑا ہوگا۔ اور سونے کے باوجود آپؐ نے پھر وضو نہیں کیا۔ صحیح احادیث کی رُو سے یہ آپؐ کی خصوصیت ہے عام حکم نہیں ہے۔ اور حدیث کے آخر میں جس دُعا کا ذکر ہے عبداللہ بن عباسؓ نے یہ نہیں بتایا کہ نماز کے اندر تھی یا باہر۔ علامہ جزریؒ نے حصنِ حصین میں وضاحت کی ہے کہ یہ دعا گھر سے مسجد کو نکلتے وقت تھی۔ اور دُعا میں نُور سے مراد آخرت کا نور بھی ہو سکتا ہے اور علم وعمل اور ہدایت وحکمت کا نور بھی جیسا کہ قرآن کہتا ہے فھو علیٰ نورٍ من ربّہٖ اور وجعلنا لہٗ نوراً یمشی بہٖ فی الناس۔ اور دُعا کے آخر میں یہ واجعل لیّ نوراً کا لفظ ہے یہ گویا ساری دعا کا خلاصہ ہے۔ اور نسائی اور حاکم کی روایت میں ہے واجعلنی نوراً" مجھے مجسّم نور بنا دے"۔ اس دُعا میں حضورؐ نے تمام اطراف وجوانب اور اعضاء وجوارح کے لیے نور کی طلب فرمائی ہے ہر جگہ اور ہر عضو کا نور اس کے مناسب حال ہے۔ اور فی لسانی نوراً کا لفظ صرف مسلم میں آیا ہے صاحبِ مشکوٰۃ نے سہواً اسے بھی متفق علیہ فرمایا ہے۔ یا یوں کہو کہ متفق علیہ ہونے کے لیے ایک ایک لفظ کی موافقت ضروری نہیں فی الجملہ

---

[1] مرقات ج ۳ ص ۱۲۳، مظاہر حق ج ۱ ص ۴۱۴

اتفاق کافی ہے۔

حدیث ۹: وعنہ انّہٗ رَقَدَ عند رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم فَاسْتیقَظَ وتسوّک وتوضّأ وَھُوَ یَقُوْلُ اِنَّ فی خلق السّمٰوٰتِ والارض حتّٰی ختم السّورۃ ثمّ قام فصلّی رکعتین اَطَال فیھما القیام والرّکوع وَ السّجود ثُمّ انصرف فَقَامَ حَتّٰی نَفَخَ ثُمَّ فَعَلَ ذٰلک ثلٰث مرّاتٍ ستّ رکعاتٍ کلّ ذٰلک یستاک ویتوضّأ وَ یقراء ھٰؤلآء الاٰیات ثمّ اَوتر بثلاثٍ۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ہی روایت ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یعنی حضورؐ کے گھر میں سوتے۔ پس حضورؐ بیدار ہوتے اور مسواک فرمائی اور وضو کیا اور یہ آیت پڑھتے تھے۔ اِنَّ فی خلق السّمٰوٰت والارض آخر سورت تک تلاوت فرمائی۔ پھر اُٹھے پس دو رکعتیں پڑھیں جن میں قیام اور رکوع اور سجدہ طویل کیا۔ پھر آپؐ نے نماز چھوڑ دی اور سو گئے حتیٰ کہ خراٹے لینے لگے۔ پھر حضورؐ نے تین مرتبہ ایسا ہی کیا۔ چھ رکعات پڑھیں ہر بار مسواک و وضو کرتے اور یہ آیات پڑھتے۔ پھر آپؐ نے تین وتر پڑھے۔ مسلم۔

شرح: رقد عند رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم ۔ علامہ علی القاریؒ فرماتے ہیں کہ یہ عبداللہ بن عباسؓ سے روایت بالمعنی ہوئی ہے اور اصل عبارت یوں ہے کہ انہوں نے فرمایا میں اپنی خالہ میمونہؓ کے گھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سویا ہوا تھا[1] حضرت امام ولی اللہ الدہلویؒ فرماتے ہیں کہ سورۃ بقرہ کی ان آیات کی تخصیص کی وجہ یہ تھی کہ یہ وعدہ، وعید اور مناجات کی جامع ہیں اور ان کی تلاوت سے غرض عبادت کے لیے نشاط حاصل کرنا تھا۔ اور بظاہر یہ واقعہ گزشتہ حدیث کے واقعہ سے الگ ہے کیونکہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضورؐ کے چچا زاد بھائی تھے چھوٹی عمر کے تھے اور ان کی خالہ میمونہؓ ام المومنین تھیں لہٰذا کئی مرتبہ انھیں یہ

---

[1] مرقات ج ۳ ص ۱۲۶۔ [2] مصفّٰی ج ا ص ۱۷۳۔

شرف حاصل ہوا ہوگا چنانچہ اُوپر کی حدیث میں وضو سے پہلے ان آیات کی قرأت کا ذکر ہے اور یہاں وضو کرتے ہوئے اور اس کے ختم کے فوراً بعد ان کی تلاوت آئی ہے۔ اس طرح بار بار سونا اور اٹھنا پھر مسواک اور وضو فرمانا اور لمبی نماز پڑھ کر پھر سو جانا وعلیٰ ہذا القیاس نفس پر نہایت شاق ہے اور صرف وہی شخص ایسا کر سکتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے اُوپر پُورا اختیار بخشا ہوا اور جس کی فطرت نہایت صاف اور پاکیزہ ہو۔ ورنہ نیند پر کنٹرول کرنا سخت مشکل ہے۔

ثم اوتر بثلاثٍ [۱] اس حدیث میں وتر کے تین ہونے کی صریح دلیل ہے اور امام ابوحنیفہؒ اسی کے قائل ہیں۔ اور امام شافعیؒ اس بارے میں ان کے مخالف نہیں بلکہ ان کے ہاں ایک رکعت جائز تو ہے لیکن اس پر اکتفاء کرنا مکروہ ہے۔

حدیث ۱۰: وعن زیدؓ بن خالد الجهنی انّهٗ قال لأرْمُقَنَّ صلوٰة رسول الله صلّى الله علیه وسلّم اللّیلة فصلّٰی رکعتین خفیفتین ثمّ صلّی رکعتین طویلتین طویلتین طویلتین ثمّ صلّٰی رکعتین وهما دُون اللّتین قبلهما ثمّ صلّی رکعتین وهما دون اللّتین قبلهما ثمّ صلّی رکعتین وهما دُون اللّتین قبلهما ثمّ صلّی رکعتین. وهما دون اللّتین قبلهما ثم اوتر فذالك ثلاث عشرة رکعة۔ رواه مسلم۔ قولهٗ ثمّ صلّی رکعتین وهما دون اللّتین قبلهما اربع مرّاتٍ هٰکذا فی صحیح مسلمٍ وافرادِه من کتاب الحمیدی وَمُوطّا مالكٍ وسُنن ابی داؤد وجامع الاصول۔

ترجمہ: حضرت زیدؓ بن خالدؓ جُہنی سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا میں آج رات بالضرور رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کی نماز کو دیکھوں گا۔ پس آپؐ نے دو ہلکی رکعتیں پڑھیں۔ پھر دو لمبی لمبی، لمبی رکعتیں پڑھیں پھر دو رکعتیں پڑھیں

---

[۱] مظاہر حق ج ا ص ۴۱۵، مرقات ج ۳ ص ۱۲۶۔

جو پہلی رکعتوں سے کم لمبی تھیں۔ پھر دو رکعتیں پڑھیں جو اُن سے پہلی رکعتوں سے کم لمبی تھیں۔ پھر دو رکعتیں پڑھیں جو اُن سے بھی کم لمبی تھیں۔ پھر دو رکعتیں پڑھیں جو ان سے بھی کم لمبی تھیں۔ پھر آپؐ نے وتر پڑھے۔ پس یہ کل تیرہ رکعتیں ہوئیں۔ یعنی دس تہجدؔ کی اور تین وتر کی۔ مسلم۔ اور صحابیؓ کا یہ قول کہ "پھر آپؐ نے دو رکعتیں پڑھیں اور پہلی دو رکعتوں سے کم لمبی تھیں" چار مرتبہ ہے۔ صحیح مسلم میں اسی طرح ہے اور حُمیدی کی کتاب سے مسلم کے افراد میں بھی اسی طرح ہے۔ مؤطا امام مالکؒ، سُنن ابی داؤد اور جامع الاصول میں بھی اسی طرح ہے۔

شرح: ؎۱ زیدؓ بن خالد جہنی مدنی صحابی ہیں۔ جنہوں نے حضورؐ کی صلاۃ اللّیل کا یہ قصہ بیان فرمایا ہے۔ حضورؐ شاید اس رات اپنے حجراتِ مبارکہ سے باہر تھے چنانچہ ایک روایت میں ہے۔ فتوسّدت عقبتہٗ او فسطاطہٗ پس میں نے حضورؐ کی دہلیز یا آپؐ کے خیمہ کے ساتھ سہارا لگا لیا۔ اس مطلب یہ ہوا کہ ممکن ہے یہ واقعہ مدینہ سے باہر پیش آیا ہوا جہاں حضورؐ کسی بڑے خیمے میں تشریف فرما تھے۔

؎۲ ثلاث عشرۃ رکعۃً۔ تیرہ رکعات اس حساب سے ہوتی ہیں کہ پہلی دو ہلکی رکعات کو شمار نہ کیا جائے ورنہ پندرہ ہو جاتی ہیں۔ اور صاحبِ مصابیح نے غالباً اسی لیے ثمّ صلّی رکعتین الخ کا جملہ تین مرتبہ بیان کیا ہے اس حساب سے ساری نماز تیرہ رکعات بنتی ہے لیکن صاحبِ مشکوٰۃ نے مسلم، افراد حمیدی، مؤطا مالکؒ، ابوداؤد اور جامع الاصول کا حوالہ دے کہ باصرار کہا ہے کہ یہ جملہ چار مرتبہ آیا ہے اور تیرہ کے عدد میں پہلی دو ہلکی رکعات شامل نہیں ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر پہلی دو رکعات کو شامل رکھیں اور یہ جملہ چار مرتبہ ہو تو وتر ایک رکعت کا شمار ہوگا ورنہ تین رکعت کا۔ پس گویا ہر لحاظ سے تیرہ کا عدد سلامت رہے گا۔ اور شمائل ترمذی میں بھی یہ جملہ چار مرتبہ ہی آیا ہے۔ واللہ اعلم بالصّواب۔

حدیث ۱۱: وعن عائشۃؓ قالت لمّا بدّن رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم وثقل کان اکثر صلاتہٖ جالساً۔ متّفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت اُمّ المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے۔

؎۱ مرقات ج ۳ ص ۱۲۶۔ ؎۲ مظاہر حق ج ۱ ص ۴۱۵، مرقات ج ۳ ص ۱۲۷۔

انہوں نے فرمایا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بڑی عمر کے ہو گئے اور بوجھل ہو گئے یعنی بڑھاپے اور ضعف سے تو آپؐ کی اکثر نماز (نفل) بیٹھ کر ہوتی تھی۔ بخاری و مسلم۔

شرح !:[1] یعنی اس عذر کی حالت کے سوا حضورؐ عام طور پر نماز نفل کھڑے ہو کر پڑھا کرتے تھے۔ علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ یہ حضورؐ کے خصائص میں سے ہے کہ نفل نماز اگر بیٹھ کر پڑھتے تو بھی آپؐ کو کھڑے ہو کر پڑھنے کے برابر ہی ثواب ملتا تھا۔ حالانکہ بیٹھ کر پڑھنے کا اجر کھڑے ہو کر پڑھنے کی نسبت نصف ہے۔ اور حضورؐ اس سے مامون ہیں۔ علامہ قاریؒ فرماتے ہیں کہ حضورؐ کے حق میں اگر اس قید کو بالکل مطلق رکھا جاتے تب تو خیر ورنہ جو بھی بوجہ عذر یا بضرورت بیٹھ کر پڑھے گا اس کا ثواب نصف نہیں ہوتا اور حضورؐ کے لیے عذر اور غیر عذر دونوں برابر ہیں۔

متفق علیہ اس حدیث کے الفاظ مسلم کے ہیں بخاری میں یہ نہیں ہے کہ کان اکثر صلوتہ جالسًا بلکہ بخاری میں یوں ہے فلما کثر لحمہ صلّٰی جالسًا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بخاری کی اس روایت کے مطابق حضورؐ بڑھاپے میں بیٹھ کر ہی نفل پڑھتے تھے اور اُوپر کی روایت کے مطابق آپؐ کی اکثر نمازِ نفل بیٹھ کر ہوتی تھی۔ دونوں میں فرق ہے۔

حدیث ۱۲: وعن عبد اللہ بن مسعودؓ قال لقد عرفت النظائر التّی کان النبی صلّی اللہ علیہ وسلّم یقرنُ بینھُنّ فذکر عشرین سُورۃً من اوّلِ المفصّل علیٰ تالیف ابن مسعودؓ سورتین فی رکعۃٍ آخرھن حٰمٓ الدّخان وعمّ یتساءلون۔ متّفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے فرمایا ہے کہ میں ان ایک جیسی سورتوں کو پہچانتا ہوں جنہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ملاتے اور قرأت میں جمع کیا کرتے تھے پس عبد اللہ نے بیس سورتوں کا ذکر کیا مفصّل کے اوّل سے ابن مسعودؓ کی تالیف کے مطابق۔ ان میں سے ہر دو سورتیں ایک

---

[1] مرقات ج ۳ ص ۱۲۷۔

رکعت میں بتائیں اور ان میں سے آخری دو سورتیں حٰمٓ الدّخان اور عمّ یتسآءلون تھیں۔ بخاری و مسلم۔

شرح : قولِ مشہور کے مطابق مفصل کی ابتداء سورۃ حجرات سے ہوتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے قرأت و تعلیم کی سہولت کے لیے یا حضورؐ کو ان سورتوں کو جمع کرتے دیکھ کر اس طور پر تالیفِ قرآن کی تھی ورنہ صحابہؓ کا اس پر اجماع ہو چکا ہے کہ قرآنِ پاک کی ترتیب جو حضورؐ نے بتائی تھی وہ وہی ہے جو آج ساری دنیا میں موجود ہے اور اس میں تو کوئی شک نہیں کہ ترتیبِ نزول اور تھی اور ترتیب جمع اور تھی۔ پس اگر کسی مصلحت سے عبداللہ بن مسعودؓ نے ترتیب نزول پر یا حضورؐ کے بعض دفعہ دو سورتوں کو ملانے کی بنیاد پر مصحف کا نسخہ اس طرح مرتب کیا تھا تو وہ اصل مصحفِ عثمانی کی مخالفت میں نہ تھا۔ اور اس پر کافی کلام کی گنجائش ہے لیکن یہ اس کا موقع نہیں۔

[1] ابو داؤد کی روایت میں ان بیس سورتوں کی تفصیل یہ ہے : الرحمٰن اور النجم ایک رکعت میں، اقتربت الساعۃ اور الحاقۃ ایک رکعت میں، الطّور اور الذاریات ایک رکعت میں، سورۃ واقعہ اور نون ایک رکعت میں، سأل سائل اور النازعات ایک رکعت میں، سورۃ تطفیف اور عبس ایک رکعت میں، مدّثر اور مزّمل ایک رکعت میں، سورۃ دھر اور قیامۃ ایک رکعت میں، عمّ یتساءلون اور المرسلات ایک رکعت میں، الدّخان اور تکویر ایک رکعت میں۔

[2] صحیح ابن خزیمہ میں بھی اسی طرح ہے لیکن ترتیب میں کچھ اختلاف اور نقص ہے۔ اور حدیث کا آخری حصّہ اس ترتیب کے خلاف ہے کیونکہ اس میں ہے آخر ھن حٰمٓ الدّخان وعمّ یتساءلون۔ ہاں اگر یوں کہا جاتے کہ ان بیس سورتوں میں سے آخری دو جوڑے یہ ہیں۔ سورۃ الدّخان مع اپنی ساتھی کے اور سورۃ عمّ یتساءلون مع اپنی ساتھی کے۔

[3] امام جزریؒ نے کہا ہے کہ سورتوں کی ترتیب کے متعلق اختلاف ہوا ہے کہ کیا ساری ترتیب وحی سے ہوئی ہے یا ساری اجماع صحابہؓ سے یا بعض وحی سے اور بعض اجماع سے۔ لیکن اتنی بات پر اجماع ہے کہ قرآن کی ترتیبِ نزول اور ترتیبِ قرأت مختلف ہے۔ اور

---

[1] مرقات ج ۳ ص ۱۲۸، مظاہر حق ج ۱ ص ۴۱۶۔ [2] مرقات ایضاً۔
[3] مظاہر حق ج ۱ ص ۴۱۶، مرقات ایضاً۔

اس پر بھی اجماع ہؤا ہے کہ اس ترتیب کے سوا جو آج موجود ہے اسے پڑھنا جائز نہیں ہے۔ ہاں تعلیم کے لیے پچھلی سُورتوں سے شروع کرنا جائز ہے اور اگر نماز میں غیر مرتب پڑھیں تو خلافِ اَولیٰ ہے یا مکروہ ہے جیسا کہ امام احمدؒ نے فرمایا۔ اور اگر پہلی رکعت میں سورۂ ناس پڑھیں تو دوسری میں کیا پڑھیں؟ ابو حنیفہؒ نے فرمایا کہ اس میں بھی ناس ہی پڑھیں۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ دوسری میں الٓمٓ سے المفلحون تک پڑھیں اور یہی ابو حنیفہؒ سے بھی روایت ہے کیونکہ قرآن کو ختم کر کے از سرِ نو شروع کرنے کا حکم صحیح احادیث میں موجود ہے اور افادہ اعادہ سے بہتر ہے۔ اور ابن مسعودؓ کا یہ قول کہ یہ سُورتیں نظائر ہیں اس سے یہ مراد ہے کہ طول و قصر میں ایک جیسی ہیں۔ واللہ اعلم بالصّواب۔

بَابُ مَا یَقُولُ اِذَا قَامَ مِنَ اللّیل

اس باب میں حضور صلّی اللہ علیہ وسلم کی دعائیں اور اذکار جو آپؐ صلاۃ اللّیل میں نماز کے اندر یا آگے پیچھے پڑھتے تھے، بیان کی گئی ہیں۔ نماز تہجّد میں اور دیگر نوافل میں بھی ان دعاؤں کی کافی گنجائش ہے اور فرائض میں یہ گنجائش بہت کم رکھی گئی ہے کیونکہ فرائض باجماعت ہوتے ہیں اور ان کی بنیاد تخفیف پر رکھی گئی ہے نوافل ہر شخص اپنے اپنے پڑھتا ہے۔ ان میں جتنی چاہے تطویل کی گنجائش موجود ہے۔ ان دعاؤں سے ذاتِ باری کے ساتھ وہ تعلق جو جنابِ سیّد الوجود صلّی اللہ علیہ وسلم کو تھا اس کی ایک جھلک نظر آسکتی ہے۔ جن الفاظ میں اور جس انداز میں حضورؐ نے اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس اور حمد و ثناء بیان فرمائی ہے۔ کائنات میں سے اور کوئی ایسی حمد و ثناء نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ احمدؐ کی زبانِ حمد ترجمان ہے جو خدائے محمود کی حمد میں زمزمہ پردازیاں کر رہی ہے۔ فصلّی اللہ علیہ وآلِہ وسلّم۔

الفصل الاوّل

حدیث ۱: عن ابن عبّاسؓ قال کان النّبی صلّی اللہ علیہ وسلّم اذا قام من اللّیل یتہجّد قال اللّٰھم لك الحمد انت قیّم السّمٰوٰت والارض ومن فیھنّ ولك الحمد انت نور السّمٰوٰت والارض ومن فیھنّ ولك الحمد،

مَلِكُ السَّمٰوٰتِ والارض ومن فيهنّ ولك الحمد انت الحقّ و وعدك الحقّ و لقاءك حقّ و قولك حقّ والجنّة حقّ والنّار حقّ والنّبيّون حقّ و محمّدٌ حقّ والسّاعة حقّ اللّٰهمّ لك اسلمتُ و بك آمنتُ وعليك توكّلتُ و اليك انبتُ وبك خاصمتُ و اليك حاكمتُ فاغفر لي ما قدّمتُ وما اخّرتُ وما اسررتُ وما اعلنتُ وما انت اعلم به منّي انت المقدّم و انت المؤخّر لَا اِلٰهَ اِلَّا انت وَ لَا اِلٰهَ غيرك - متّفق عليه -

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلم جب رات کو تہجد پڑھنے کے لیے اُٹھتے تھے تو یُوں کہا (دُعا) کرتے تھے "اے اللہ تیرے ہی لیے تعریف ہے تو آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے اُس کا تھامنے والا ہے اور تیرے ہی لیے تعریف ہے تو آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اُس کا نور ہے اور تیرے ہی لیے تعریف ہے تو آسمانوں اور زمین اور انکی درمیانی کائنات کا بادشاہ ہے اور تیرے ہی لیے تعریف ہے تو برحق ہے اور تیرا وعدہ برحق ہے اور تیری ملاقات برحق ہے اور تیرا قول برحق ہے اور جنت برحق ہے۔ اور دوزخ برحق ہے اور سب نبی برحق ہیں اور قیامت برحق ہے۔ اے اللہ میں تیرے ہی لیے مُطیع و مُسلم ہُوا اور تجھ پر ہی ایمان لایا اور میں نے تجھ پر ہی بھروسہ کیا اور تیری ہی طرف جُھکا اور تیری مدد سے میں نے دشمنوں سے جھگڑا کیا اور تجھے ہی فیصلہ کرنے والا ٹھیرایا پس تو مجھے بخش دے جو میں پہلے کر چکا اور جو بعد میں کرونگا۔ اور جو کچھ میں نے پوشیدہ کیا اور جو کچھ میں نے علی الاعلان کیا اور جس کو تو مجھ سے زیادہ جانتا ہے تو ہی آگے بڑھانے والا ہے اور تو ہی پیچھے ہٹانے والا ہے تیرے سوا کوئی معبود نہیں اور تیرے سوا کوئی الٰہ نہیں"۔ بخاری و مسلم۔

شرح: علامہ علی بن سلطان القاریؒ فرماتے ہیں کہ ظاہر تو یہ ہے کہ حضورؐ یہ دُعا نماز

شروع کرتے تکبیر تحریمہ کے بعد یا رکوع سے اُٹھ کر قومہ میں مانگا کرتے تھے۔

[1] انت قیّم السّمٰوٰت والارض اور دوسری روایت میں قیّام کا لفظ ہے۔ اور قیمّ اور قیّام دونوں اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام ہیں اسی طرح قیّوم اور قائم۔ قرآن میں ہے۔ امّن ھو قائم علی کلّ نفس۔ اور قیّام کو قوّام بھی کہا جاتا ہے۔ ابن عباس رض سے اس کی تفسیر لازوال آئی ہے۔ علماء نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے۔ مخلوق کا مدبّر و منتظم۔ اور ربّ کا معنی ہے السید المطاع یہاں اس کا مطلب ہے۔ مالک و پروردگار۔ الحق کا معنی ہے جس کا وجود متحقق (ثابت شدہ) اور برحق ہو۔ بک خاصمت یعنی میں نے تیرے دشمنوں سے تیری عطا کردہ دلائل و براہین اور معجزات اور قوتِ جسمانی و روحانی کے ساتھ مقابلہ اور جھگڑا کیا۔ اور حضورؐ کی طلب مغفرت تواضع اور خضوع و خشوع کی بناء پر ہے اور اس لیے کہ آپؐ کے اُسوہ کو سامنے رکھ کر لوگ یہ دعائیں کریں۔

[2] انت نور السمٰوٰت والارض۔ نُور بمعنی منوّر اور خالق نور ہے۔ ابو عبیدؒ نحوی نے کہا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اہلِ کائناتِ ارضی و سماوی تیرے نُور سے ہدایت یاب ہیں۔ امام خطّابیؒ نے فرمایا کہ نُور سے مراد وہ ذات ہے جس کی پیدا کردہ اور عطا کردہ روشنی سے روحانی اندھے دیکھتے اور گمراہ ہدایت پاتے ہیں۔ نُور کا معنی ذوالنور بھی ہے اور نور فعل کی صفت ہے ذات کی نہیں۔ یعنی وہ جو خالقِ نور اور مدبّرِ نیّرات (سورج، چاند، ستارے) ہے۔

[3] ومحمّد حق آپؐ کا نام نامی اس خصوصیت کی وجہ سے لیا گیا ہے کہ آپؐ تمام انبیاء پر کئی مخصوص صفات کی وجہ سے فائق ہیں۔ نیز یہ بتانے کے لیے کہ خود حضورؐ کو بھی اپنے اُوپر ایمان لانا واجب ہے۔

حدیث ۲: وعن عائشۃ رض قالت کان النبی صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم اذا قام من اللّیل افتتح صلاتہٗ فقال اللّٰھمّ ربّ جبرئیل و میکائیل و اسرافیل فاطر السّمٰوٰت والارض عالِمَ الغیب والشھادۃ اَنت تحکم بین عبادک فیما کانُوا فیہ

---

[1] السراج الوہّاج ج ۱ ص ۲۴۲۔

[2] ایضاً السراج الوہّاج، مرقات ج ۳ ص ۱۳۵

[3] مرقات ج ۳ ص ۱۳۶۔

یختلفون اھدنی لما اختُلف فیہ من الحق باذنک انّک تھدی من تشاء الیٰ صراطٍ مُّستقیم۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ ام المؤمنین سلام اللہ علیہا فرماتی ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کو اُٹھتے (یعنی تہجد کا ارادہ فرماتے) تو اپنی نماز کو شروع کرتے اور یوں کہتے: "اے اللہ! اے جبریلؑ و میکائیلؑ اور اسرافیلؑ کے ربّ! اے کائنات ارضی و سماوی کے خالق! اے پوشیدگیوں اور ظاہر کو جاننے والے تو ہی اپنے بندوں کے درمیان ان امور میں فیصلہ کرے گا جن میں وہ اختلاف کرتے تھے۔ تو مجھے اپنے اذن و حکم سے اُس حق کی طرف رہنمائی فرما جس میں اختلاف کیا گیا ہے بے شک تو ہی جسے چاہتا ہے سیدھی راہ کی طرف اس کی راہنمائی فرماتا ہے۔" مسلم۔

شرح: ربّ جبرئیل الخ[۱] ان فرشتوں کی تشریف و تفضیل کی وجہ سے ان کا نام لیا ہے۔ ورنہ ربّ تو اللہ تعالیٰ ساری کائنات کا ہے۔ اور جبریلؑ کو مقدم کیا کیونکہ وہ آسمانی کتابوں کا امین ہے اور اسرافیلؑ کو مؤخر فرمایا کیونکہ وہ لوحِ محفوظ اور صُور کا امین ہے اور معاش و معاد کا انتظام اس کے ذمہ ہے۔ اور میکائیلؑ کا ذکر وسط میں فرمایا کیونکہ اس نے جبریلؑ و اسرافیلؑ دونوں سے حصّہ لیا ہے کیونکہ وہ بارش، نباتات اور دنیوی اور اُخروی رزق کا منتظم ہے۔ اور جبریلؑ و اسرافیلؑ دونوں میکائیلؑ سے افضل ہیں اور ان دونوں میں سے کون افضل ہے؟ اس میں اختلاف ہوا ہے۔

باذنک، اذن سے مراد توفیق و تیسیر ہے یعنی اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہتا ہے۔ راہِ حق کو موافق بنا دیتا ہے اور اسے آسان کر دیتا ہے۔ واللہ اعلم بالصّواب۔

حدیث ۳: وعن عبادۃ بن الصامت رضی قال قال رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم من تعارّ من اللّیل فقال لا الٰہ الّا اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ لہ الملک ولہ الحمد وھو علیٰ کلّ شیءٍ قدیر وسُبحان اللہ والحمد للہ ولا الٰہ الّا اللہ واللہ اکبر ولا حول ولا قوّۃ الّا باللہ ثمّ قال ربّ اغفر لی اُوقال ثمّ دعا استجیب لہٗ فان توضّأ وصلّی قبلت صلاتہ۔ رواہ البخاری۔

---

[۱] مرقات ج ۳ ص ۱۳۷۔

ترجمہ: حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص رات کو جاگا پھر اس نے یہ کہا:
"اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں بادشاہت اُسی کی ہے تعریف کا سزاوار وہی ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے اور اللہ پاک ہے تعریف اللہ ہی کے لیے ہے اور اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے اور نیکی کی طاقت اور گناہ سے بچنے کی قوت اللہ ہی کی طرف سے ہے"۔ پھر وہ یوں کہے: اے میرے پروردگار مجھے بخش دے۔ یا یوں فرمایا کہ پھر وہ شخص دعا مانگے تو اس کی دُعا قبول ہو گی۔ پھر اگر وضو کرے اور نماز پڑھے تو اُس کی نماز قبول کی جائے گی۔ بخاری۔

شرح: ۱؎ تعارّ یعنی نیند سے جاگے یا کروٹیں بدلے۔ اور اس کا ایک معنی ہے کہ آواز سے جاگے یعنی نیند میں بڑبڑا کر اُٹھ کھڑا ہو۔ اور اکثر یہ بڑبڑانا بے فائدہ اور فضول قسم کا کلام ہوتا ہے پس حضورؐ نے یہ دُعا سکھا دی تاکہ اگر کوئی شخص بڑبڑا کر اُٹھے تو فوراً یہ دعا پڑھنے لگے یا خواہ مخواہ اس کی زبان سے یہی نکلے اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب کوئی شخص ذکر و شغل کا عادی ہو۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصّواب۔

باب التحریض علی قیام اللّیل

یعنی نماز تہجد کی ترغیب و تحریض اور اس کے فضائل و ثواب بیان کر کے اس پر اُبھارنا۔ ۲؎ معلوم ہونا چاہیے کہ تہجد کی کتاب و سنت میں بہت ترغیب آئی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے: وَمِنَ اللَّیلِ فتھجّد بہٖ نافلۃً لک۔ اس آیت میں لفظ نافلہ کی تفسیر میں اختلاف ہوا ہے بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے فریضۂ زائدہ جو آپؐ کے لیے مخصوص ہے اور اُمّت پر فرض نہیں ہے۔ اور امام نودیؒ نے دعویٰ کیا ہے کہ حضورؐ سے بھی یہ فرضیت منسوخ ہو گئی تھی۔ اور بعض نے اس کا معنی نفل کیا ہے یعنی وہ نفل جو فرض کے مقابلے میں بولا جاتا ہے لیکن یہ فقہ کی اصطلاح ہے اور قرآنِ پاک میں یہ لفظ اس معنی

۱؎ مظاہر حق ج ۱ ص ۴۲۱، مرقات ج ۳ ص ۱۳۷۔
۲؎ فیض الباری ج ۲ ص ۴۰۸۔

میں نہیں آیا اگر اس معنی میں آتا تو تطوّع کا لفظ بولا جاتا۔ بلکہ یہ لفظ خالص لغوی معنی میں آیا ہے جس کا معنی ہے انعام اور بخشش جیسا کہ قرآن کہتا ہے ۔ وَوَهَبْنَا لَهُ اسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً: یعنی ہم نے ابراہیمؑ کو اسحاقؑ بخشا اور یعقوبؑ اپنی جانب سے بطورِ انعام و بخشش دے دیا۔ اسی طرح نافلہ کا لفظ بعض احادیث میں بھی اسی معنی میں آتا ہے مثلاً وضو کی فضیلت کی احادیث میں ہے کہ وضو گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے حتیّٰ کہ نماز نافلہ ہو جاتی ہے۔ پس اس بناء پر اس آیت میں بھی نافلہ کا لفظ فرض کے مقابلے میں نہیں بلکہ انعام اور بخشش کے معنی میں ہے ۔ اور ہم بیان کر چکے ہیں کہ صلاۃ اللیل کا ایک قطعہ وتر بھی ہے۔ پس صلاۃ اللیل شروع سے واجب تھی اور باقی حصّے تو مستحب رہ گئے لیکن اس کا ایک قطعہ یعنی وتر اب بھی واجب ہے ۔ اس معنی کے لحاظ سے نسخ کا قول ماننے کی ضرورت نہیں رہتی ۔ اور وتر کے ثبوت کا طریق اگر ظنی نہ ہوتا تو ہم اس کی فرضیت کا حکم کرتے لیکن اس کا ثبوت اخبار احاد سے ہوا ہے لیکن اس کی تاکید وارد ہونے کی وجہ سے ہم اس کے وجوب کے بھی قائل ہوتے ہیں ۔

اور قیام اللیل کے بالکلیہ منسوخ نہ ہونے بلکہ اس میں تغییر ہونے کی دلیل امام بخاریؒ کا وہ ترجمۃ الباب بھی ہے جس وہ کہتے ہیں باب قیام النبی صلی اللہ علیہ وسلم باللیل وما نسخ من قیام اللیل اور من یہاں تبعیضیہ ہے نہ کہ بیانیہ۔ یعنی ان کے نزدیک قیام اللیل کا کچھ حصّہ تو منسوخ ہے یعنی نوافل اور کچھ حصّہ منسوخ نہیں ہے (اور اسی کو حنفیہ صلاۃ الوتر کہتے ہیں) اور قاضی ابوبکر ابن العربی کے نزدیک بھی امام بخاریؒ کی مانند ساری صلاۃ اللیل منسوخ نہیں ہوئی بلکہ اس کا ایک حصّہ منسوخ ہوا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

الفصل الاوّل

حدیث ۱: عن ابی ھریرۃؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعقد الشیطان علیٰ قافیۃ رأس احدکم اذا ھُو نام ثلث عُقدٍ یضربُ علی کلّ عُقدۃٍ علیك لیلٌ طویلٌ فَارْقُدْ فان استیقظ فذکر اللہ انحلّت عقدۃ فان توضّأ انحلّت عُقدۃ فان صلّی انحلّت عقدۃ فاصبح نشیطًا طیّب النّفسِ وَاِلاّ اَصْبَحَ خبیث النفس کسلان ۔ متّفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسولِ خدا صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا: شیطان تم میں سے ایک کے سر کی گدّی پر اس کی نیند کی حالت میں تین گرہیں لگاتا ہے اور ہر گرہ لگاتے وقت ہاتھ مارتا اور سونے والے کو تھپک کر اس کے دل میں یہ ڈال دیتا ہے کہ تجھ پر بڑی لمبی رات ہے پس تو سو یا رہ۔ پس اگر وہ شخص جاگ پڑے اور اللہ کا ذکر کرے تو ایک گرہ کھل جاتی ہے پھر اگر وضو کرے تو دوسری گرہ بھی کھل جاتی ہے پھر اگر وہ نماز بھی پڑھ لے تو تیسری گرہ بھی کھل جاتی ہے پس وہ شخص سُبک جان اور خوشدل ہو کر صبح کرتا ہے ورنہ اس کی طبیعت بوجھل اور سُست ہو جاتی ہے۔ بخاری و مسلم۔

شرح: اس حدیث سے صلاۃ اللیل کے وجوب کا استدلال کیا گیا ہے اور امام بخاریؒ کا یہی مسلک ہے لیکن ہم اُوپر اس سلسلے میں کچھ فقہی بحث درج کر چکے ہیں اسے دوبارہ دیکھ لیا جائے۔

[1] یعقد الشیطان علی قافیۃ رأس احدکم ظاہری الفاظ سے تو تعمیم معلوم ہوتی ہے لیکن اس سے بعض لوگوں کو مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے چنانچہ انبیاء تو شیطان کے تصرّف سے بوجہ معصومیت محفوظ ہیں اور وہ لوگ جن کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّ عبادی لیس لک علیہم سُلطان وہ بھی اس سے مستثنیٰ ہیں اور اسی طرح آیۃ الکرسی پڑھ کر سونے والا بھی شیطان سے صبح تک محفوظ ہے اور وہ شخص جس نے نمازِ عشاءِ باجماعت پڑھی ہو وہ بھی محفوظ ہے۔

[2] اس عقد کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ عقد حقیقی ہے اور شیطان واقعی ایک لمبا دھاگہ لے کر جادوگروں جیسی پھونکیں مارتا اور کہتا جاتا ہے کہ علیك لیل طویل فارقد چنانچہ ابن ماجہ اور مسند احمد کی روایت میں دھاگے کا ذکر موجود ہے جس طرح کہ جادوگرنیوں کے ذکر میں قرآن کہتا ہے ومن شرّ النفّاثات فی العقد۔ پس اس بنا پر وہ سونے والے کو نیند پر پکا کرنے اور سُستی ڈالنے کے لیے جادو جیسی تاثیر کرتا ہے۔ اور بعض کے نزدیک جادوگروں جیسا فعل مراد ہے۔ اور بعض کے نزدیک اس سے مراد دل میں گرہ ڈالنا یعنی وسوسہ پیدا کرنا اور نیند پر اسے پکا کرنا ہے۔ اور بعض نے

---

[1] قسطلانی ج ۲ ص ۳۶۴ - [2] السراج الوہاج ج ۱ ص ۲۴۴، قسطلانی ج ۲ ص ۳۶۴، مظاہر حق ج ۱ ص ۴۲۳، مرقات ج ۳ ص ۱۴۱، فیض الباری ج ۲ ص ۴۱۹ -

کہا کہ یہ مجازی کلام ہے جس سے مراد یہ ہے کہ صلاۃ اللیل کے لیے نہ اُٹھنا اور سُستی کرنا شیطان جیسا فعل ہے۔ علماء حدیث کہتے ہیں کہ حقیقت مراد لینا اولیٰ ہے اور مجاز کی ضرورت نہیں۔ اور اس حدیث میں ذکر اللہ سے مراد وہ اذکار ہیں جو پچھلے باب میں گزرے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۲: وعن المغیرۃؓ قال قام النبی صلّی اللہ علیہ وسلّم حتّی تورّمت قدماہ فقیل لہٗ لِمَ تصنَعُ ھذا وقد غُفِرلک ما تقدّم من ذنبک وما تأخّر قال افلا اکون عبدًا شکورًا۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے تہجد کی نماز میں اتنا لمبا قیام فرمایا کہ آپؐ کے قدم مبارک سُوج گئے تو آپؐ سے کہا گیا کہ آپؐ یہ کیوں کرتے ہیں حالانکہ آپؐ کے اگلے پچھلے قصور معاف ہو چکے ہیں۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ میں شکر گزار بندہ نہ ہوں؟ بخاری و مسلم۔

شرح: [1] یہ اُس زمانے کا ذکر ہے جبکہ سورۃ مزّمل کی ابتدائی آیات نازل ہوئی تھی کیونکہ ان آیات میں آپؐ کو اکثر رات کے قیام کا حکم ہوا تھا۔ اور روایات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو گو قیام اللیل کے سلسلے میں اختیار دیا تھا لیکن آپؐ ایک سال تک اپنی طرف سے ساری رات کا قیام فرماتے رہے حتّٰی کہ قدم مبارک متورم ہو گئے اور پھر تیسیر کا حکم نازل ہوا۔

[2] افلا اکون عبدًا شکورًا یعنی میرے معصوم ہونے میں شک نہیں لیکن کیا مجھے اللہ کی اس نعمت کا شکر یہ ادا نہیں کرنا چاہیئے؟ پس میں شکر نعمت کے لیے اتنی عبادت و ریاضت کرتا ہوں۔ پس اللہ کی نعمت اور میری عصمت اس بات کا سبب ہے کہ میں رات بھر کھڑا رہوں اور شکر یے میں اس کی عبادت سرانجام دوں!

علّامہ علی القاریؒ نے جناب علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا ایک عارفانہ قول نقل کیا ہے کہ ایک قوم نے اللہ کی عبادت جنت اور ثواب کی رغبت کے لیے کی پس یہ تو تاجروں کی عبادت ہے۔ اور ایک قوم نے ڈر کے مارے عبادت کی کہ وہ جہنم کے عذاب اور خدا کی ناراضگی سے بچ جائیں پس یہ غلاموں کی عبادت ہے۔ اور ایک قوم نے شکر یے کے لیے عبادت کی پس آزاد مردوں کی عبادت یہی ہے۔ واللہ اعلم۔

---

[1] فیض الباری ج ۲ ص ۴۱۲۔ [2] مظاہر حق ج ۱ ص ۴۲۳، مرقات ج ۳ ص ۱۴۲، فیض الباری ج ۳ ص ۴۱۳

حدیث ۳: وعن ابن مسعودؓ قال ذکر عند النبی صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم رجلٌ فقیل لہٗ ما زال نائماً حتّی اصبح ما قام الی الصّلوٰۃ قال رجلٌ بال الشّیطان فی اُذُنہٖ او قال فی اُذُنیہ۔ متّفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے پاس ایک آدمی کا ذکر کیا گیا اور عرض کیا گیا کہ وہ برابر سویا رہا۔ یہاں تک کہ صبح ہوگئی وہ نماز کی طرف نہیں اُٹھا۔ حضورؐ نے فرمایا وہ ایسا شخص ہے کہ شیطان نے اس کے کان میں یا دونوں کانوں میں پیشاب کر دیا ہے۔ بخاری و مسلم۔

شرح: [1] ما قام الی الصّلوٰۃ میں نمازِ تہجّد بھی مراد ہو سکتی ہے اور نمازِ فجر بھی — اسی لیے مصنّف نے اسے اس باب میں رکھا ہے۔ شیطان کے بول سے مراد یا تو حقیقت ہے گو حسّی طور پر نظر نہ آئے کیونکہ یہ عالمِ مثال کا معاملہ ہے اور بعض بزرگوں نے واقعی اس کا ملاحظہ کیا ہے۔ اور یا اس سے مراد شیطان کا اس شخص کو بنگاہِ حقارت دیکھنا ہے اور سب اعضاء میں سے کان کو اس لیے مخصوص کیا گیا کہ بیداری اکثر آوازوں کے سُننے سے عمل میں آتی ہے۔ پس جب کان کو زیادہ بوجھل کر دیا تو گویا بیداری کا دروازہ بند کر دیا گیا۔

حدیث ۴: وعن اُمّ سلمةؓ قالت استیقظ رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم لیلةً فزعاً یقول سُبحان اللّٰہِ ماذا اُنزل اللّیلة من الخزائن وماذا اُنزل من الفتن من یُوقظ صواحب الحجرات یرید ازواجہٗ لکی یُصلّین رُبَّ کاسیةٍ فی الدُّنیا عاریةٌ فی الآخرة۔ رواہ البخاری۔

ترجمہ: حضرت اُمّ المؤمنین اُمّ سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک رات کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھبرا کر بیدار ہوئے۔ آپؐ یہ فرما رہے تھے: سُبحان اللہ! آج رات کس قدر خزانے اُتارے گئے ہیں اور کتنے فتنے نازل کیے گئے ہیں۔ کون ہے جو حجروں والیوں، یعنی حضورؐ کی ازواجِ مطہراتؓ، کو جگائے تاکہ وہ

---

[1] مظاہر حق ج ۱ صـ۴۲۳: مرقات ج ۳ صـ۱۴۳۔

نماز پڑھیں۔ بہت سی دنیا میں کپڑے پہننے والیاں آخرت میں ثواب سے عاری ہونگی۔ بخاری۔

شرح[1]: خزائن سے مراد یا تو سیاسی برتری، حکومت اور مال و دولت کے خزانے ہیں۔ جن کا امت کے لیے مقدر کیا جانا اس رات میں حضورؐ پر منکشف ہوا۔ اور یا اس سے مراد خدا کی رحمت کے خزانے ہیں جو وہ اپنے سچے عبادت گزاروں کو عطا فرماتا ہے۔ اسی طرح فتنوں سے مراد یا تو وہ آزمائشیں ہیں جن میں حضورؐ کی امت مبتلا ہونے والی تھی۔ اور یا عذابِ الٰہی مراد ہے جو خدا کے نافرمانوں کے لیے مقدر ہوا تھا۔

[2] رُبَّ کاسِیَۃٍ فی الدُّنیا عاریۃ فی الآخرۃ اس سے مراد یا تو وہ عورتیں ہیں جو برائے نام لباس پہنتی ہیں اور کپڑوں سے باہر ہو کر نمائش کی کوشش کرتی ہیں ان کے متعلق فرمایا کہ ایسی برائے نام لباس پہننے والی آخرت کے احکام کے لحاظ سے کپڑوں سے عاری شمار کی جائیں گی۔ اور یا یہ ارشاد حضورؐ کی ازواج کو عبادت پر اُبھارنے اور یادِ خدا سے غفلت اختیار نہ کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے کہ انھیں محض حضورؐ کی گھر والیاں ہونے کے زعم نہ رہنا چاہیئے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں تو نام و نسب کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اور یہاں خصوصِ سبب کا اعتبار نہیں بلکہ عموم لفظ کا ہے یعنی ہر عورت اس حکم کی مخاطب ہے گو اولین خطاب بطور ترغیب آنحضورؐ کی ازواجؓ ہی کو تھا۔ اسی لیے شارحین نے لکھا ہے کہ اصل میں عبارت یوں ہے: رُبَّ نفسٍ کاسِیَۃٍ الخ یعنی بہت سے نفوسِ انسانی ہیں جو دنیا میں تو خوب کپڑے پہنتے ہیں لیکن آخرت میں قربِ الٰہی اور رضاء خداوندی سے عاری ہوں گے۔ اور بعض شارحینِ حدیث نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ بعض لوگ جو دُنیا میں انواع و اقسام کے اسبابِ زینت و تفاخر استعمال کرتے ہیں آخرت میں ثواب اور رحمتِ خداوندی سے دُور رہوں گے۔

حدیث ۵: وعن ابی ھریرۃؓ قال قال رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم ینزل ربّنا تبارک وتعالیٰ کُلّ لیلۃٍ حین یبقیٰ ثلث اللّیل الآخر یقول من یدعونی فاستجیب لہٗ من یسألنی فاعطیہٗ من یستغفرنی فاغفر لہٗ۔

---

[1] مظاہر حق ج ۱ صـ ۴۲۴، ایضاً مرقات۔

[2] قسطلانی ج ۲ صـ ۳۵۴، مرقات ج ۳ صـ ۱۴۳۔

متفق علیہ - و فی روایۃ لمسلم ثمّ یبسط یدیہ و یقول من یُقرض غیر عدوم و لا ظلوم حتّٰی ینفجر الفجر -

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہمارا بابرکت اور بلند پروردگار ہر رات کو جبکہ رات کا پچھلا تیسرا حصہ باقی رہ جاتا ہے تو نزول فرماتا ہے۔ وہ فرماتا ہے کون ہے جو مجھے پکارے تاکہ میں اس کی دُعا قبول کروں۔ کون ہے جو مجھ سے سوال کرے تاکہ میں اسے عطا کروں۔ کون ہے جو مجھ سے بخشش مانگے کہ میں اُسے بخش دوں۔ بخاری و مسلم۔ اور مسلم ایک روایت میں ہے کہ پھر وہ اپنے ہاتھ پھیلا دیتا ہے اور کہتا ہے کون ہے جو اسے قرض دے جو نادار نہیں اور نہ ستمگار ہے۔ جب تک فجر پھوٹے (وہ اسی طرح فرماتا رہتا ہے۔)

شرح: ؎۱ ینزل ربنا الخ اس نزول سے مراد نزولِ رحمت و لطف اور قبولِ دعا ہے۔ نزولِ حرکت و انتقال مراد نہیں کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے لیے محال ہے۔ پس یہ نزولِ معنوی ہے۔ ہاں اس سے نزولِ حسّی بھی مراد لینا جائز ہے جس سے اس کے افعال مراد ہیں نہ کہ نزولِ ذات۔ اور فعلی نزول کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا امر و نہی لے کر اس کے فرشتے نزول کرتے ہیں اور اسی بنا پر بعض مشائخ نے ینزل کے لفظ کو یُنزل پڑھا ہے اور نسائی کی روایت اس پر دلالت کرتی ہے جس میں ہے کہ یأمر منادیًا یقول ھل من داعٍ الخ۔

؎۲ نواب سید صدیق حسنؒ خان بھوپالی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث احادیث صفات میں سے ہے اور اس کے مطلب کے بارے میں صحیح اور مختار مذہب جمہور سلف کا ہے اور بعض متکلّمین کا بھی۔ اور وہ یہ ہے کہ اس پر بلا کیف ایمان رکھا جائے کہ اس نزول سے مراد ایسا نزول ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے لائق ہے اور جس کی کیفیت مخلوق کو معلوم نہیں اور حدیث کا لفظ اپنے ظاہر پر جاری ہے اس میں تاویل نہیں کی جانی چاہیے۔ امام ابن تیمیہؒ نے کتاب النزول نامی ایک مستقل کتاب اسی موضوع پر لکھی ہے۔ اور چونکہ صحیح احادیث جو حدِ شہرت کو پہنچ گئی ہیں اس بارے میں وارد ہیں لہٰذا اللہ تعالیٰ کے لیے اس صفت کے ثبوت میں کوئی شک و شبہ نہیں کیا جانا چاہیے۔

؎۳ امام مالکؒ، امام اوزاعیؒ، ابو اسحاق شیرازیؒ، امام الحرمینؒ اور امام غزالیؒ وغیرھم نے اس قسم کی احادیث جن میں نزول، مجیئ (آنا)، صورت، شخص، پاؤں، قدم، ہاتھ، چہرہ،

؎۱ قسطلانی ج ۲ ص۳۶۷۔ ؎۲ السراج الوہاج : ص۲۴۵۔ ؎۳ مرقات ج ۳ ص۱۴۴

غضب، رحمت، استواء علی العرش، آسمان میں ہونا وغیرہ آیا ہے ان میں تاویل کی ہے اور یہ تاویل بھی اللہ تعالیٰ کی صفاتِ حدوث سے تنزیہ کے لیے ہے کیونکہ اگر ان الفاظ کی حقیقت جو مخلوق کے نزدیک ہے اس کو اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت کیا جائے تو کفر لازم آئے گا۔ پس سارے سلف و خلف نے تاویل کا راستہ تو ضرور اختیار کیا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال کے جو کچھ لائق ہے اُس کے ساتھ اس کے متصف ہونے کا عقیدہ رکھا جائے۔ اختلاف صرف اس میں ہے کہ یہ تاویل اجمالی ہو یا تفصیلی۔ پس تاویل اجمالی کا طریقہ تو اکثر سلف کا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ہمارا ان صفات پر ایمان ہے کما یلیق بشانہٖ تعالیٰ لیکن ہم اس کی کیفیت نہیں جانتے۔ اور اکثر خلف نے تاویل تفصیلی کا طریقہ اختیار کیا ہے لیکن خلف نے یہ کچھ اس لیے نہ کیا تھا کہ وہ سلف کی مخالفت کرنا چاہتے تھے۔ نہیں۔ بلکہ ان کے زمانے میں اہلِ بدعت، مجسّمہ اور جہمیہ وغیرہ باطل فرقے پیدا ہو چکے تھے ان کے بُرے عقائد کا ردّ کرنا اور اہلِ سنّت کو ان کے شکوک و شبہات سے بچانا ضروری تھا۔ امام سفیان ثوریؒ نے استواء کا معنی قصد و ارادہ بیان کیا ہے۔ اسی طرح حضرت جعفر صادقؒ نے بھی احادیثِ صفات کی تاویل تفصیلاً کی ہے حالانکہ یہ دونوں بزرگ امام مالکؒ اور اوزاعیؒ کی مانند سلف میں سے تھے۔ اسی طرح آیتِ قرآنی وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنْتُمْ کی تاویل پر سب متفق ہیں کہ اس میں معیّتِ ذاتی و حسّی مراد نہیں ہے بلکہ معیّتِ رحمت و نصرت مراد ہے۔ اسی طرح ونحن اقرب الیہ من حبل الورید اور فاینما تولوا فثمّ وجہ اللہ جیسی آیات کا بھی حال ہے۔ اگر غور کیا جائے تو سلف و خلف کے طریقۂ تاویل میں محض اختلافِ لفظی ہے حقیقی اختلاف نہیں ہے کیونکہ خلف بھی ان صفات کی حقیقت کا صحیح علم اللہ ہی کے لیے مانتے ہیں ہاں معنی و مفہوم سمجھانے اور فرقِ باطلہ کا ردّ کرنے کے لیے ان میں کلام کرتے ہیں۔

[1] فتح الباری کی آخری جلد میں بیہقیؒ سے نقل کرتے ہوئے حافظ ابنؒ حجر فرماتے ہیں۔ کہ ائمہ اربعہ اس بات پر متفق ہیں کہ نزول کی کیفیت کا معنی اور اس کی کُنہ معلوم نہیں ہو سکتی۔ ہم اس پر ایمان لاتے ہیں لیکن اس کے کیف سے بحث نہیں کرتے۔

[2] حین یبقی ثلث اللیل۔ حدیث کے راوی وقتِ نزول کے بارے میں مختلف ہوتے ہیں حافظ ابنؒ حجر نے تو ترجیح کا راستہ اختیار کیا ہے لیکن سارے اوقات صحیح

---

[1] فیض الباری ج ۲ ص ۴۱۸۔

[2] فیض الباری ج ۲ ص ۴۱۸۔

ہیں کیونکہ نزول متعدد ہیں۔ اور نزول کو رات کے ساتھ خاص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ غیر اللہ میں مشغول ہونے سے فراغت کا وقت ہے اور صوفیاء کی زبان میں نزول سے مراد تجلیّ الٰہی ہے جو افعال الٰہیہ کی صورتوں میں سے ایک صورت ہے جو عابد کے سامنے جلوہ گر ہوتی ہے اور صوفیاء اس صورت کو مخلوق مانتے ہیں۔ اور تفصیل کا یہ مقام نہیں ہے۔

[1] حافظ ابنؒ حبان فرماتے ہیں کہ نزول کے اوقات کا اختلاف اس بناء پر ہے کہ کسی رات کو یہ نزول پہلے پہر، کسی کو نصف شب میں اور کسی کو آخرِ شب میں ہوتا ہے۔ حافظ ابنِ حجرؒ نے آخرِ شب والی احادیث کو متفق علیہ ہونے کی وجہ سے اور سحر کے وقت میں استغفار کی ترغیب میں وارد ہونے والی دوسری احادیث کی بناء پر ترجیح دی ہے۔ علامہ علی القاریؒ فرماتے ہیں کہ زیادہ ظاہر یہ ہے کہ یہ نزول کسی خاص وقت سے مختص نہیں اور ان اوقات کا ذکر محض اس لیے فرمایا گیا ہے کہ قیام اللّیل کے پابند لوگ ان اوقات میں غفلت کی نیند سے بیدار ہو کر خدا کے حضور کھڑے ہوتے ہیں۔ اور مطلق رات اللہ تعالیٰ کی صفات جلال سے صفاتِ جمال کی طرف نزول فرمانے کا محل ہے۔ کیونکہ رات کو اللہ تعالیٰ اربابِ کمال کو اپنے وصال کے چبوترے کی طرف دعوت دیتا ہے۔

غیر عدوم و لا ظلوم جو مقروض نادار ہو وہ قرض واپس کرنے کے قابل نہیں ہوتا اور جو ستمگار ہو وہ زبردستی قرضخواہوں کا حق دبا بیٹھتا ہے، پُورا قرض یا اس کا کچھ حصّہ واپس نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں چیزوں سے بری اور بلند ہے وہ کسی حقدار کا حق بھی نہیں مارتا اور نہ ادائے حق سے عاجز ہے۔ پس جو کوئی بھی نیکی کرے گا اُس کے ہاں پوری پوری جزاء پالے گا۔ واللہ اعلم بالصّواب۔

حدیث ۷ : وعن جابرؓ قال سمعت النّبی صلی اللہ علیہ وسلّم یقول انّ فی اللّیلِ لساعۃً لا یوافقھا رجلٌ مُسلمٌ یسأل اللہ فیھا خیرًا من امر الدُّنیا والآخرۃ الّا اعطاہ ایّاہ و ذٰلک کلّ لیلۃٍ۔ رواہ مسلم

ترجمہ : حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو یہ

---

[1] مرقات ج ۳ ص ۱۴۵۔

فرماتے سُنا: یقیناً رات میں ایک گھڑی ایسی ہے کہ جس میں مردِ مسلم دنیوی وآخروی اُمور میں سے جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ سے مانگے اللہ اُسے ضرور دے دیتا ہے اور یہ ہر رات میں ہے۔ اُسے مسلم نے روایت کیا۔

شرح: ؎ رات کی اُس مستجاب الدعاء گھڑی کو لیلۃ القدر، الصلوٰۃ الوسطیٰ، اور جمعہ کے دن کی مبارک گھڑی کی مانند چھپا دیا گیا ہے تاکہ انسانی کوشش اور جہد وعمل کا دروازہ بند نہ ہو جائے اور نہ لوگ تھوڑے عمل پر تکیہ کر کے نہ بیٹھ جائیں۔ اور خوف ورجاء کی کیفیات آتی جاتی رہیں کہ ایمان انہی دونوں کے درمیان ہے۔

الّا اعطاہ ایّاہ یعنی حقیقۃً یا حکماً، حقیقۃً اس طرح کہ جو کچھ طلب کرے مل جائے۔ حکماً اس طرح کہ کسی مصلحت سے اس کی دعاء کا ثواب اس کے لیے محفوظ کر لیا جائے لیکن جو کچھ مانگتا ہے وہ علم الٰہی میں اس کے لیے مضر ہے اس لیے وہ اسے نہ ملے۔ یا اس کی دعا کی وجہ سے کوئی مصیبت ٹل جائے۔ یا بعینہٖ اس کی مطلوبہ چیز دینے کی بجائے کچھ اور دے دیا جائے وغیر ذٰلک۔

و ذٰلک کلّ لیلۃ۔ یعنی وہ اجابت کی گھڑی ہر رات کو ہوتی ہے۔ اس سے علماء نے خاص دنوں مثلاً جمعہ وغیرہ کے علاوہ بالعموم رات کو دن پر فضیلت حاصل ہونے کی دلیل نکالی ہے کیونکہ ہر دن میں ایسی مستجاب گھڑی نہیں فرمائی گئی۔ واللہ اعلم بالصّواب۔

حدیث ۷: وعن عبد اللہ بن عمرو رضی قال قال رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم احبّ الصّلوٰۃ إلی اللہ صلاۃ داؤدؑ و احبّ الصّیام الی اللہ صیام داؤد کان ینام نصف اللّیل و یقوم ثلثہ و ینام سُدسہ و یصوم یوماً و یفطر یوماً۔ متّفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ پیاری نماز داؤدؑ کی نماز ہے اور سب سے زیادہ محبوب روزہ داؤدؑ کا روزہ ہے۔ داؤدؑ علیہ السلام آدھی رات تک سوتے تھے اور پھر تیسرا حصّہ قیام کرتے اور پھر چھٹا

؎ مرقات ج ۳ ص ۱۴۶، مظاہر حق ا ص ۴۲۵، السّراج الوہاج ج ا ص ۲۴۳۔

حِصّہ سو رہتے تھے۔ اور ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن چھوڑ دیتے تھے بخاری ومسلم۔

شرح : لہ اس صلوٰۃ سے مراد نفلی نماز ہے اور اس کے محبوب ترین ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ نفس پر بہت شاق گزرتی ہے علی ہذا القیاس روزے کا بھی یہی حال ہے کہ یہ خلافِ عادۃ ہے اس لیے نفس پر بوجھل ہوتا ہے۔ ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ اس قسم کی نماز کے محبوبِ خدا ہونے کا باعث یہ ہے کہ رات کو دونوں مرتبہ سو کر طبیعت ہلکی ہو جاتی ہے گو اس طرح بار بار اُٹھنا مشکل ہوتا ہے لیکن سو کر اُٹھنے سے طبیعت میں نشاط پیدا ہو جاتا ہے اور جی عبادت میں خوب لگتا ہے۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کی نماز اور روزے کو اس لیے نہ اپنایا کہ آپؐ کی عبادات تمام انبیاء کی عبادتوں کی جامع ہو جائیں اور آپؐ اُمّت کے لیے اُسوہ قائم کرنا چاہتے تھے تاکہ کمزور اُمّتی بھی آپؐ کی سُنّت پر چل سکے۔ واللہ اعلم بالصّواب۔

حدیث ۸ : وعن عائشۃؓ قالت کان تعنی النبی صلّی اللہ علیہ وسلّم ینام اوّل اللّیل ویُحیی آخرہٗ ثُمّ ان کانت لہٗ حاجۃ الی اھلہٖ قضیٰ حاجتہٗ ثمّ ینام فان کان عند النداء الاوّل جنبًا وثب فافاض علیہ الماء و ان لم یکن جنبًا توضّأ للصّلوٰۃ ثم صلّی رکعتین۔ متّفق علیہ۔

ترجمہ : حضرت امّ المؤمنین عائشہ صدیقہ سلام اللہ علیہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم رات کے پہلے حصّے میں سو رہتے تھے اور آخری حصّہ کو زندہ رکھتے تھے (یعنی جاگ کر نماز پڑھتے تھے) پھر اگر آپؐ کو اپنے گھر والوں سے ملنے کی ضرورت ہوتی تو اپنی اس ضرورت کو پورا فرماتے پھر سو رہتے۔ پس اگر آپؐ اذانِ اوّل کے وقت حالتِ جنابت میں ہوتے تو جلدی سے اُٹھ کھڑے ہوتے اور اپنے جسم پر پانی بہاتے اور اگر نہانے کی حاجت نہ ہوتی تو نماز کے لیے وضو فرماتے۔ پھر دو رکعت پڑھتے۔

(بخاری ومسلم)

شرح لہ : نِداءِ اوّل سے مُراد یا تو وہ اذان ہے جو حضورؐ کے وقت میں طلوعِ فجر سے ذرا پہلے ہوتی تھی تاکہ روزہ دار کھانا کھالیں اور عبادت گزار ذرا آرام کر لیں۔ یہ اذان حضرت بلالؓ دیتے تھے اور فجر کی اذان حضرت عبداللہ بن اُمِ مکتوم کہتے تھے۔ علامہ علی القاریؒ فرماتے ہیں کہ زیادہ ظاہر یہ ہے کہ نِداءِ اوّل سے مُراد اس حدیث میں اذانِ فجر ہے۔ اس معنی کی رُو سے نداءِ ثانی

لہ مرقات ج ۳ ص ۱۴۶، مظاہر حق ج ۱ ص ۴۲۵ -

سے مُراد اقامتِ صلوٰۃ ہوگی۔ لیکن علامہ حافظ ابن حجرؒ نے ندائے اوّل سے مُراد اذانِ فجر کا لینا سخت غلطی قرار دیا ہے۔

اس حدیث سے حالتِ جنابت میں سو رہنے کا جواز ثابت ہوتا ہے گو افضل و اولیٰ یہی ہے کہ طہارت کاملہ کے بعد کوئی اور کام کیا جائے

واللہ اعلم بالصواب

باب القصد فی العمل

اس سے مراد افراط و تفریط سے بچنا اور درمیان کا فطری راستہ اختیار کرنا ہے۔ اسلام نے فرائض میں تو پہلے ہی بہت تخفیف رکھی ہے وہ کسی کو اس کی وسعت سے بڑھ کر زیر بار نہیں کرتا۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔ الآیۃ۔ جماعت کی نماز میں امام کو تخفیف و رعایت کا حکم دیا گیا ہے۔ اور نوافل کی ترغیب دینے کے باوجود ان میں بھی میانہ روی کو پسند کیا گیا ہے۔ ہر آدمی ایک جیسی صحت و فراغت نہیں رکھتا۔ اس لیے یہ میانہ روی ہر شخص کے ذاتی احوال و اوصاف کو مدِ نظر رکھ کر دیکھی جائے گی۔ عمل مقدار میں کم ہو لیکن دائمی ہو تو اسے محبوب ٹھہرایا گیا ہے۔ حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد بھی لگے ہوئے ہیں اور دونوں کی ادائیگی مطلوب ہے۔ جان کو عذاب میں ڈالنا اور جسم کو ہلکا کر دینا مدِ نظر نہیں ہے۔ بلکہ جسم و جان کی بیرونی و اندرونی طہارت و نظافت اور نفس کی اصلاح پیش نظر رکھی گئی ہے۔ اسی لیے حضورؐ کا ارشاد ہے: اِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا "تجھ پر تیری جان کا حق بھی لازم ہے" یعنی عبادت میں جان کو فنا کر دینا اور جسم کو مار ڈالنا مطلوب نہیں ہے بلکہ مادیت و روحانیت میں ایک حسین توازن قائم رکھنا ضروری ہے۔ جسم کے جائز تقاضوں کو پورا کرنا بھی ضروری ہے اور اس کے ساتھ ساتھ روحانی اقدار کو قائم و دائم رکھنا بھی لازم ہے۔

سید المحدثین علامہ انور شاہ کشمیریؒ[1] فرماتے ہیں کہ بعض لوگ جو عمل بالحدیث کے مدعی ہیں ان کا کہنا ہے کہ عبادت میں محنت کوشش کرنا بدعت ہے حالانکہ ان کا یہ قول قائلین کے علم و عمل دونوں سے فارغ ہونے کی دلیل ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ان کا قرآن پاک کی اس آیت کے متعلق کیا خیال ہے: وَكَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ○ اور اس طرح کی آیات قرآن پاک میں بہت سی ہیں۔ پھر متعدد احادیث میں عبادت اور اجتہاد فی العمل کے فضائل بیان ہوئے ہیں ہاں ان کے ساتھ ساتھ "قصد فی العمل" کی ترغیب بھی وارد ہوئی ہے۔ اور ان تمام دلائل کا جمع کرنا ایسے لوگوں کے لیے مشکل ہے جنہیں فہم سلیم اور ذوق صحیح عطا نہیں ہوا۔ دراصل اس میں راز

---

[1] فیض الباری ج ۲ ص ۴۲۳

یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو مختلف الطبائع پیدا فرمایا ہے ان میں سے بعض قوی الجثہ اور قوی العمل ہوتے ہیں وہ عزائم پر عمل کرتے ہیں اور رخصتوں سے گریز کرتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنا تمام فارغ وقت عبادت الٰہی میں بسر کرنا پسند کرتے اور اپنا سارا مال و متاع راہِ خدا میں لٹا دینا چاہتے ہیں۔ لیکن ان صاحب عزم و ہمت لوگوں کی تعداد تھوڑی ہے۔ ان کے پیش نظر یہ رہتا ہے کہ راہِ حق میں سب کچھ لٹا دیں اور جان و مال کی بے پناہ قربانیاں پیش کریں۔ بعض طبائع ان سے کم تر درجے کی ہوتی ہیں۔ وہ دین کی رخصتوں اور گنجائشوں پر عمل کرنا چاہتے ہیں پس اللہ ورسولؐ کے احکام ان سب لوگوں کے مختلف احوال وصفات کو پیش نظر رکھ کر دیئے گئے ہیں۔ اور عامۃ الناس چونکہ طبائع کی اس عزیمت اور ہمت کی اس بلندی کے مقام پر فائز نہیں ہوتے ہیں جو قسم اوّل کے لوگوں کا خاصہ ہے اس لیے ان کا معاملہ آسانی پر مبنی رکھا گیا ہے اور انہیں زیادہ عبادات سے روک دیا گیا ہے تاکہ پست ہمتی کی وجہ سے اکتا نہ جائیں اور ان کے دلوں میں بیزاری راہ نہ پا جائے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس مصلحتِ عامہ کی بناء پر دین کو آسان بنا دیا اور ہر عمل کرنے کے لیے اس میں گنجائش عمل رکھ دی۔ یہ احکام تعلیم دین کے لیے ایک خاص قسم کے طرزِ بیان کے حامل ہیں ان سے عبادات میں زیادہ تر کوشش کر سکنے والوں کی مذمت نہیں نکلتی۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ احادیثِ مبارکہ میں محاوراتی کلام ہوتا ہے جس سے کوئی خاص غلط فہمی دور کرنا یا کسی خاص معاملے پر زور دینا مقصود ہوتا ہے پس ایسے خطابات اور اسالیب بیان کو ان کے اصل مقام پر رکھ کر دیکھنا چاہیئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

الفصل الاوّل

حدیث ۱: عن انسؓ قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم یفطر من الشھر حتّٰی نظنّ ان لا یصوم منہ شیئًا ویصوم حتّٰی نظنّ ان لا یفطر منہ شیئًا وکان لا تشاء ان تراہ من اللیل مصلّیا الا رأیتہ ولانائمًا الا رأیتہ۔ متفق علیہ

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ حضورؐ کے خادمِ خاص۔ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم بارہا مہینے کے اکثر حصے میں روزہ نہ رکھتے تھے حتیٰ کہ ہمیں گمان ہوتا کہ آپؐ اس ماہ میں بالکل روزہ نہیں رکھیں

گئے۔ اور بار ہا ایسا ہوتا تھا کہ مہینے کا اکثر حصہ روزہ رکھتے تھے حتی کہ ہمیں گمان ہوتا تھا کہ اس ماہ میں آپؐ بالکل روزہ نہ چھوڑیں گے۔ اور آپؐ کا حال یہ تھا کہ اگر تم آپؐ کو رات میں نماز پڑھتے دیکھنا چاہتے تو دیکھ سکتے تھے اور اگر تم آپؐ کو سوتا دیکھنا چاہتے تو بھی دیکھ سکتے تھے۔ بخاری و مسلم

شرح [1] شارح طیبیؒ فرماتے ہیں کہ آپؐ کے معاملات میں اسراف و تقصیر نہ ہوتی تھی سونے کے وقت سوتے تھے اور تہجد کے وقت نماز پڑھتے تھے۔ اسی کی مزید وضاحت اس حدیث میں ہے جس میں تین شخصوں نے حضورؐ کی عبادت کا حال معلوم کر کے آپس میں کہا تھا کہ آپؐ تو معصوم ہیں زیادہ عبادت کی آپؐ کو ضرورت نہیں ہے پس ایک نے کہا کہ میں رات بھر نماز پڑھا کروں گا (یا پڑھتا ہوں) اور دوسرا بولا کہ میں ہمیشہ روزہ رکھا کروں گا (یا رکھتا ہوں) اور کبھی بے روزہ نہیں رہوں گا۔ تو حضورؐ گھر سے باہر تشریف لائے اور فرمایا کہ میں روزہ رکھتا ہوں اور کبھی نہیں بھی رکھتا۔ نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں۔ میرا طریقہ (سنت) یہی ہے۔ جو شخص میرے طریقے سے منہ پھیرتا ہے وہ مجھ سے نہیں ہے [2] اس حدیث سے ثابت ہوا کہ نفلی عبادات میں حضورؐ کا طریقہ افراط و تفریط سے پاک تھا اور آپؐ میانہ روی کو پسند فرماتے تھے۔ ایک [3] حدیث میں حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضؓ فرماتی ہیں کہ حضورؐ کا طریقہ نفلی عبادات میں دوام اور میانہ روی پر مبنی ہوتا تھا۔ ایک اور حدیث میں حضورؐ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کو سب سے محبوب وہ عمل ہے جو دائمی ہو اگرچہ قلیل ہی ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ تھوڑا دائمی عمل اس عمل سے بہتر ہے جو کثیر تو ہو لیکن منقطع ہو جائے اور اس کی پابندی نہ ہو سکے۔ اور یہ اس لیے کہ دوامِ عمل سے اطاعت، ذکر و مراقبہ اور اخلاص نیت وغیرہ قائم و دائم رہتے ہیں اور ایسے اعمال دوسری قسم کے اعمال پر حسی لحاظ سے بھی بڑھ جاتے ہیں۔

بعض احادیث صحیحہ سے حضورؐ کے رات بھر کھڑے رہنے سے پاؤں مبارک کا متورم ہو جانا ثابت ہوا ہے۔ لیکن ایسا کبھی کبھی ہوتا تھا۔ اکثر طریقہ آپؐ کا وہی تھا جس کا ذکر اس حدیث میں آیا ہے۔ اور بعض عبادات میں آپؐ کے کچھ خصائص بھی ثابت ہیں مثلاً صوم وصال (مسلسل روزہ) جس میں افطار تک کی نوبت نہ آتی تھی لیکن حضورؐ نے خود اسے اپنی خصوصیت ہونا ظاہر فرما دیا تھا۔ علیٰ ہذا القیاس ابتدا میں تہجد کی نماز آپؐ پر بحکم خداوندی فرض بھی کیا گیا تھا المزمل قم اللیل الا قلیلا ؏ الآیہ۔ اس زمانے میں حضورؐ نے قیام اللیل میں بہت جدوجہد فرمائی تھی جیسا کہ اس سے پہلے گزر چکا ہے۔ واللہ اعلم۔

بخاری [4] میں ایک حدیث ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عمرو العاصؓ

---

[1] مرقات ج ۳، ص ۱۵۳ [2] مظاہر حق ج ۱ ص ۴۲۹ [3] السراج الوہاج ج ۱، ص ۲۴۰ [4] بخاری مع قسطلانی ج ۲ ص ۳۴۲

رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے پوچھا تھا کہ مجھے معلوم ہوا ہے تم رات بھر نماز پڑھتے اور دن کو روزہ رکھتے ہو۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضور! میں ایسا ہی کرتا ہوں۔ اس پر حضور نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم ایسا کرتے رہو گے تو تمہاری آنکھیں دھنس جائیں گی اور جسم کمزور ہو جائے گا۔ اور تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے اور تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے سو کبھی روزہ رکھو کبھی نہ رکھو۔ رات کو کچھ نماز پڑھو اور سو بھی جایا کرو۔

حدیث ۲: وعن عائشۃ قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احب الاعمال الی اللہ ادومہا وان قل۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کو سب عملوں سے پیارا وہ عمل ہے جو ہمیشہ کیا جائے اگرچہ کم ہو۔ بخاری ومسلم۔

شرح: [۱] اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ تھوڑا عمل جس پر ہمیشگی اور باقاعدگی اختیار کی جائے اس زیادہ عمل سے بہتر ہے جس میں آداب وارکان کی مراعات نہ ہو اور اس کی نگرانی اور محافظت نہ کی جائے۔ اس حدیث سے صوفیاء کرام نے ترک اوراد کی مذمت کا استدلال کیا ہے۔ اور گو یہ ترکِ اولیٰ ہے لیکن جب بندہ بلاوجہ اطاعت کو ترک کردے تو گویا اس نے عبادت الٰہی سے منہ موڑ دیا اس لیے وہ ناراضگی اور مذمت کا مستحق ہوگا۔

حدیث ۳: وعنہا قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خذوا من الاعمال ما تطیقون فان اللہ لا یمل حتی تملوا۔ متفق علیہ

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ حضور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اعمال میں سے اس قدر عملوں کو اختیار کرو جن کی ادائیگی کی تمہیں طاقت ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تو نہیں اکتاتا وہ تم ہی ہوتے ہو جو آخر کار اکتا جاتے ہو۔ بخاری ومسلم

شرح: [۲] اعمال سے مراد اس حدیث میں نفلی اعمال ہیں مثلاً اوراد واذکار اور اقوال وافعال کی قسم کے اور عمل۔ ایسے اعمال کو اپنے اوپر لازم مت ٹھہرالو کہ پھر پابندی گراں گزرے اور ان پر مداومت کو مشکل جان کر ترک کردو۔ اور ان اللہ لا یمل کا ایک معنی تو وہ ہے جو اوپر بیان ہوا جس کی رو سے اللہ تعالیٰ سے مطلقاً ملال اور اکتاہٹ کی نفی کی گئی ہے۔

---

[۱] مرقات ج ۳ ص ۱۵۴، مظاہر حق ج ۱ ص ۴۲۹، [۲] مرقات ج ۳ ص ۱۵۴، مظاہر حق ص ۴۳۰، قسطلانی ج ۲ ص ۳۷۱

اور بتایا گیا ہے کہ وہ تو نہیں اکتائے گا تم ہی راستے میں رہ جاؤ گے۔ پھر اتنی شدت سے کیا حاصل ؛ پس میانہ روی اختیار کرو۔ اور یا اس کا معنی یوں کیا گیا ہے کہ جب تک تم نہ اکتا جاؤ گے اللہ تعالیٰ نہیں اکتائے گا اور خدا کے اکتانے سے مراد ثواب میں کمی کرنا یا مطلقاً ثواب نہ عطا کرنا ہے۔ اور ملال کا حقیقی معنی اللہ تعالیٰ کے لیے ماننا ناجائز ہے وہ ذات پاک اس سے بری ہے۔ ملال کا معنی ہے کسی چیز کو زیادہ کرنے سے دل میں جو فتور پیدا ہو جاتا ہے اور جس سے تھکنی اور اعراض پیدا ہوتا ہے پس لازماً ملال کا مجازی معنی مراد لینا پڑے گا۔ یا یوں کہیں گے کہ اللہ کا ملال کما یلیق بشانہ ہے اور اس کی کیفیت کی حقیقت سے مخلوق ناآشنا ہے کیونکہ مخلوق مخلوق ہے اور خالق خالق ہے۔ اور تغیر و انکسار مخلوق کے خواص میں سے ہے خالق اس سے ماورا ہے۔

حدیث ۴ : وعن انسؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیصلِّ احدکم نشاطَہٗ واذا فتر فلیقعد۔ متفق علیہ

ترجمہ : حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا : تم میں سے کوئی آدمی اس وقت تک نماز پڑھے جب تک دل میں نشاط ۔ آمادگی اور خوشی ۔ موجود ہے۔ اور جب سستی پیدا ہو جائے تو بیٹھ جائے۔ بخاری و مسلم

شرح[1] : فلیقعد کے دو معنے بیان کئے گئے ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ جب تک طبیعت میں آمادگی اور نشاط ہو نماز پڑھو اور جب یہ کیفیت نہ ہے تو نوافل چھوڑ دو۔ دوسرا معنی یہ کہ نوافل کو کھڑے ہو کر پڑھنے کی صورت میں جب تھکن اور سستی محسوس ہو تو بیٹھ کر پڑھنے لگو یا ان کے دوران میں ہی بیٹھ کر تکمیل کر لو مثلاً ایک رکعت اگر کھڑے ہو کر پڑھی ہے تو دوسری بیٹھ کر ادا کرنا جائز ہے۔

کسل[2] و ملال کے وقت عبادت کو چھوڑ دینے میں بہت سی احادیث آئی ہیں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر ایسا نہ فرمایا جاتا تو عمل کی گرانی آخر کار اس کے ترک پر منتج ہوتی۔ ہاں آہستہ آہستہ نفس کو عبادات اور نیکیوں کا خوگر بنانا چاہیئے۔ ریاضت و تمرین سے دھیرے دھیرے وہ رام ہوتا چلا جائے گا اور آخر کار مطیع ہو جائے گا لیکن یکلخت اس پر اتنا بوجھ ڈال دینا کہ وہ جوا ہی گردن سے نکال پھینکے حکمت و عقلمندی کے بھی خلاف ہے۔ اس حدیث سے بطور اقتضاء النص یہ مسئلہ بھی نکلتا ہے کہ عبادت میں مزید لگن اور حضوری حاصل کرنے کی نیت سے سو جانا یا آرام کرنا بھی عبادت شمار ہوتا ہے اگرچہ سونا امور

---

[1] قسطلانی ج ۲ ص ۳۷۱ ، [2] مظاہر حق ج ۱ ص ۴۳۰

عادیہ میں سے ہے لیکن اس نیت سے وہ بھی عبادت بن جائے گا اور اسی لیے کہا گیا ہے کہ نَوْمُ الْعَالِمِ عِبَادَۃٌ اور اسی قبیل سے حضورؐ کا وہ ارشاد بھی ہے جو ام المومنین عائشہ سلام اللہ علیہا سے فرمایا تھا کلمینی یا حمیراء اے حمیرا مجھ سے بات چیت کرو۔

حدیث ۵ : وعن عائشۃ رضؓ قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا نعس احدکم وھو یصلی فلیرقد حتی یذھب عنہ النوم فان احدکم اذا صلی وھو ناعس لا یدری لعلہ یستغفر فیسب نفسہ ۔ متفق علیہ

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں کوئی آدمی نماز میں اونگھنے لگے تو اُسے سو رہنا چاہیے تاکہ نیند کا غلبہ اور اس کے اثرات جاتے رہیں کیونکہ اونگھنے کی حالت میں جب تم میں سے کوئی شخص نماز پڑھے گا تو اسے نہیں معلوم ہوگا کہ شاید استغفار کی بجائے اپنے آپ کو گالیاں دے رہا ہو۔ بخاری و مسلم۔

شرح :[1] اس حدیث کا امر استحباب کے لیے ہے اور دلیل اس کی اس کا ایسے مقام میں واقع ہونا ہے جہاں اسے وجوب کے لیے لینا ممکن نہیں ہے۔ ابن الملکؒ نے یسب نفسہ کی مثال یوں دی ہے کہ مثلاً اللّٰھم اغفر لی کی بجائے اللّٰھم اعفر لی عین کے ساتھ کہہ ڈالے جس کا معنی ہے کہ اے اللہ مجھے خاک آلود اور ذلیل کر دے (معاذ اللہ)

حدیث ۶ : وعن ابی ھریرۃ رضؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اِنَّ الدِّیْنَ یُسْرٌ ولن یشادّ الدِّیْنَ اَحَدٌ الا غلبہ فسددوا وقاربوا وابشروا واستعینوا بالغدوۃ والروحۃ وشیءٍ من الدلجۃ ۔ رواہ البخاری

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بلاشبہ دین آسان ہے اور کوئی شخص دین پر ہرگز شدت سے غالب آنے کی کوشش نہیں کرے گا مگر یہ کہ دین اس پر غالب آجائے گا پس تم سیدھی طرح میانہ روی اختیار کرو اور کام میں لگے رہو اور خوش ہو جاؤ اور صبح و شام اور کچھ

---

[1] مظاہر حق ج ۲ ص ۴۳۰ ، مرقات ج ۳ ص ۱۵۴، ۱۵۵

اخیر رات سے مدد پاؤ۔ بخاری

شرح: اسلام دینِ فطرت ہے وہ بندوں پر سختی کو پسند نہیں کرتا، اس کے احکام انسانی فطرتوں کے مطابق ہیں اور پھر معذوروں، کمزوروں، بیماروں اور ضعیفوں کے لیے استثنائی احکام بھی اس میں موجود ہیں ترکِ دنیا یا اپنے آپ کو عذاب دینے اور جسم و جان کو فنا کر دینے کی تعلیم اسلام میں نہیں ہے۔ حضورؐ نے رہبانیت سے منع فرمایا ہے۔ آخرت کا راستہ لازماً دنیا کے اندر سے ہو کر گزرتا ہے حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد کی پابندیاں بھی موجود ہیں اور حقوق العباد کو دوسری اہمیت حاصل ہے۔ پس ترکِ دنیا کا یہاں تصور تک موجود نہیں ہے اور حقوق اللہ کی بنیاد بھی آسانی اور رعایات پر رکھی گئی ہے یہی معنی ہے اس ارشاد کا کہ دین آسان ہے یعنی اس پر عمل کرنا ہرگز مشکل نہیں ہے اور کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے تکلیف مالایطاق دی گئی ہے۔

اپنے[1] آپ پر بیجا سختی کرنا، دین کو سخت بنانے کی کوشش کرنا، خود ساختہ پابندیاں برداشت کرنا یا دین میں اپنی طرف سے کوئی ترمیم و اضافہ کر لینا حرام قرار دیا گیا ہے۔ اور جوں جوں کوئی اپنے اوپر زیادہ سختی کرتا جائے گا توں توں خود ساختہ پابندیوں کی ادائیگی میں اپنے آپ کو عاجز پائے گا قرآن نے بنی اسرائیل کے ذکر میں فرمایا ہے: وَرَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا۔ الآیۃ۔ انہوں نے ترکِ دنیا خود ایجاد کر لی تھی ہم نے ان پر اسے فرض نہیں ٹھہرایا تھا پھر وہ اس کا حق بھی ادا نہ کر سکے"۔ پس اس راہ سے بھی جو شخص دین پر غالب آنے کی کوشش کرے گا وہ خائب و خاسر اور ناکام و نامراد ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ۔ الآیۃ۔ یہ آیت احکامِ صیام کے ضمن میں وارد ہوئی ہے کہ بیمار، معذور اور مسافر کو جو رخصتیں دی گئی ہیں یہ اس لیے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تم پر آسانی کرنا چاہتا ہے تمہیں تنگی میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا۔ اور ایک جگہ ارشاد ہے: وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ۔ اللہ تعالیٰ نے تم پر دین کے بارے میں کوئی تنگی نہیں کی"۔ حضورؐ کا ارشاد ہے: "اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے کہ اس کی رخصتوں پر بھی عمل کیا جائے جس طرح وہ یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے واجبات و احکام پر عمل کیا جائے"۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ پر شدت کا راستہ اختیار کرنے والوں کو سختی سے روک دیا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نفوسِ انسانی کی فطرت کا خالق ہے وہی جانتا ہے کہ کس قسم کے اور کون سے احکام ان کے لیے مناسب ہیں۔ پس جو کوئی ان احکام میں از خود شدت کا رنگ

---

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۱۳۱، مرقات ج ۳ ص ۱۵۵

بھرے گا وہ لازماً عاجز آئے گا اور اپنے خود ساختہ دین پر عمل نہیں کر سکے گا۔

سَدِّدُوا وقاربوا یعنی طریق سداد (اقتصاد و توازن، میانہ روی) اور صراطِ مستقیم کو اختیار کئے رہو۔ اور سہولت کے قریب رہو اور کلفت و صعوبت کی راہوں کو اختیار مت کرو۔ وَاَبْشِرُوْا اور جنت، صراطِ مستقیم پر گامزن ہونے اور سلامت روی و میانہ روی اور اعتدال کی راہ کو اختیار کرنے پر خوش ہو جاؤ۔

"وَاسْتَعِیْنُوْا بالغدوۃ والروحۃ وشیٔ من الدلجۃ": اور پہلے اور پچھلے پہر اور آخری رات میں کچھ حصے کے ساتھ خدا کی مدد چاہو"۔ غدوہ سے مراد نمازِ فجر سے لے کر طلوعِ آفتاب تک کا وقت ہے۔ اور روحہ سے مراد نمازِ عصر کے بعد غروبِ آفتاب تک کا وقت۔ ان دو اوقات کی کتاب وسنت میں بڑی اہمیت وارد ہے اسی لیے اربابِ سلوک ان اوقات کو غنیمت جان کر عبادت میں کوشش کرتے ہیں اور رات کا آخری حصہ قبولیتِ دعا اور وصالِ محبوبِ حقیقی کا وقت ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے: اقم الصلوٰۃ طرفی النھار وزلفا من اللیل۔ الآیۃ۔ دراصل عربوں کے محاوروں میں غدوہ، روحہ اور دلجہ مسافروں کے چلنے اور منزلِ مقصود پر پہنچنے کی جدوجہد کے مناسب اوقات تھے یہاں بطور استعارہ انہیں ذکر و عبادت اور نماز کے لیے استعمال فرمایا گیا ہے اور اس محاورے کی چاشنی سے وہی لطف اندوز ہوگا جسے عربی زبان کا ذوق عطا ہوا ہو۔

حدیث ۷: وعن عمرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من نام عن حزبہ اوشیءٍ منہ فقرأہ فیما بین صلوٰۃ الفجر وصلوٰۃ الظھر کتب لہ کانما قرأہ من اللیل۔ رواہ مسلم

ترجمہ: جناب عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص اپنے وظیفہ یا ورد، پورے یا کچھ حصے، کو نیند کے باعث نہ پڑھ سکا۔ پھر اس نے اسے نمازِ فجر سے نمازِ ظہر تک کے درمیانی وقت میں پڑھ لیا تو اس کے حق میں یہی لکھا جاتا ہے کہ گویا اس نے وہ ورد رات ہی کو پڑھا تھا۔ مسلم

شرح: [1] حزب سے مراد وظیفہ، ورد، تلاوتِ کلامِ پاک اور ذکر اللہ کی تمام صورتیں ہو سکتی ہیں۔ آسانی اور باقاعدگی کے لیے بعض دفعہ اوراد و اذکار کو پڑھنے والا ان کے لیے وقت بھی مقرر کر لیتا ہے اور ان کا مناسب ترین وقت اس حدیث پاک کی رو سے رات کا آخری

---

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۴۳۱

حصّہ ہے دوسری احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں دن کے وظیفے کا بھی یہی حکم ہے کہ پابندی سے پڑھنے والا اگر کسی عذر سے چھوڑ دے تو اسے رات کو پورا کرے اجر و ثواب میں کمی نہیں ہو گی اللہ تعالیٰ خلوص نیت کو پسند کرتا ہے ۔ نمازِ تہجد کو حضورؐ نے چونکہ پابندی سے عمر بھر پڑھا ہے لہٰذا کبھی اگر کسی عذر سے فوت ہو جاتی تو احادیث سے ثابت ہے کہ حضورؐ اسے اس حدیث میں بیان کردہ اوقات میں قضا فرمایا کرتے تھے ۔ گویا دینِ فطرت کی یہ بھی ایک آسانی ہے ۔

علامہ علی القاریؒ[1] فرماتے ہیں کہ اس حدیث نے قرآن کی اس آیت کی طرف اشارہ فرمایا ہے جس میں دن رات کو ایک دوسرے کا قائم مقام ، نائب اور جانشین فرمایا گیا ہے :

وھو الذی جعل اللیل والنھار خلفۃ لمن اراد ان یذکر او اراد شکورا ۔

حدیث ۸ : وعن عمران بن حُصَین قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صَلِّ قائما فان لم تستطع فقاعدا فان لم تستطع فعلیٰ جنب ۔ رواہ البخاری ۔

ترجمہ : حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا : کھڑے ہو کر نماز پڑھو پس اگر اس کی طاقت نہ ہو تو بیٹھ کر پڑھ لو ، پھر اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو پہلو پر لیٹ کر پڑھ لو ۔ بخاری

شرح : حدیث پاک سے جہاں ایک طرف نماز کی اہمیت و ضرورت ثابت ہوئی کہ یہ اتنا اہم فریضہ ہے جو زندگی میں حتی الوسع کسی حال میں بھی معاف نہیں ہو سکتا وہاں یہ بھی پتہ چل گیا کہ اسلام کتنا آسان دین ہے جو اپنے ماننے والوں کے لیے ہر قسم کی آسانیاں اور سہولتیں بہم پہنچاتا ہے تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ میں دین کے فلاں حکم پر عمل نہیں کر سکتا ہوں ۔ ہر حال کے مناسب احکام موجود ہیں اور ہر سوال کا جواب حاضر ہے ۔

فعلیٰ جنبٍ[2] یعنی شدید عذر میں کروٹ پر لیٹ کر قبلہ رخ ہو جائے اور اشارے سے نماز ادا کرے ۔ لیکن اگر ایسا نہ کر سکے تو جدھر منہ ہو اسی طرف پڑھ لے فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ کا ارشاد ایسے ہی مواقع کے لیے ہے ۔ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کو بواسیر کی شکایت تھی چنانچہ امام ابن الہمامؒ فرماتے ہیں کہ مسلم کے سوا تمام اربابِ صحاح نے ان سے یہ روایت کی ہے « مجھے بواسیر کی شکایت

---

[1] مرقات ج ۳ ص ۱۵۶ [2] مظاہر حق ج ا ص ۱۴۳ ، مرقات ایضاً

تھی پس میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز کے متعلق دریافت کیا تو حضورؐ نے یہ جواب ارشاد فرمایا۔ نسائی کی روایت میں اتنی زیادتی اور ہے کہ فان لم تستطع فمستلقیا لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا "اگر پہلو پر بھی لیٹنے کی استطاعت نہ ہو تو چت لیٹ کر پڑھ لو اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی استطاعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا"۔ اس حدیث سے استلقاء کا حکم بھی ثابت ہوا اور اس کی صورت یہ ہے کہ تکیہ وغیرہ رکھ کر کندھے قبلہ کی طرف منہ کر کے اونچے کر لے اور اشارے سے نماز پڑھ لے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

یہ حدیث فرض کے بارے میں ہے اور نفل بطریق اولیٰ اس میں داخل ہیں۔

حدیث ۹: وعنہ انہ سأل النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن صلٰوۃ الرجل قاعدًا قال ان صلی قائمًا فھو افضل ومن صلی قاعدا فلہ نصف اجر القائم ومن صلی نائما فلہ نصف اجر القاعد۔ رواہ البخاری۔

ترجمہ: اور حضرت عمرانؓ بن حصین ہی سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے آدمی کے بیٹھ کر نماز پڑھنے کے متعلق پوچھا تو حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ اگر وہ کھڑا ہو کر پڑھے تو افضل ہے اور جو شخص بیٹھ کر پڑھے گا اسے کھڑا ہونے والے کی نسبت نصف ثواب ہوگا اور جو شخص لیٹ کر پڑھے گا تو اسے بیٹھنے والے سے بھی نصف اجر ملے گا۔ بخاری۔

شرح: اس حدیث کے احکام فرض نماز کے لیے نہیں بلکہ نفل کے لیے ہیں اور دوسری صحیح احادیث اس کی مزید وضاحت کرتی ہیں۔ کیونکہ فرض نماز میں بلا عذر قیام کو چھوڑنا جائز نہیں قرآن کی آیت وَقُوْمُوْا لِلّٰہِ قَانِتِیْنَ میں صاف قیام کا حکم موجود ہے۔ حافظ الدنیا علامہ ابن حجرؒ عسقلانی فرماتے ہیں کہ فرائض نماز میں قیام کا حکم دلائل شرع سے ثابت ہو چکا ہے اس لیے اسے بلا عذر بیٹھ کر پڑھنے والے کی نماز بالاجماع باطل ہے بلکہ جو شخص فرضیت قیام کا منکر ہو وہ کافر ہے کیونکہ یہ حکم دین سے ضروری طور پر ثابت ہے یعنی ضروریاتِ دین میں شامل ہے۔[1]

ومن صلی نائمًا۔ نائمًا سے یہاں چت لیٹ کر یا قبلہ رخ پہلو پر لیٹ کر پڑھنا مراد ہے۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ کیا قدرت علی القیام یا قعود کے باوجود نفل لیٹ

---

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۴۳۱، مرقات ج ۳ ص ۱۵۷۔

پڑھنا جائز ہے یا نہیں ؟ اس میں اختلاف ہوا ہے کچھ لوگ اس کے جواز کے قائل ہیں اور یہ حدیث ان کی دلیل ہے اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ایسا جائز نہیں پس ان کے نزدیک یہ حدیث عمرانؓ بن حصین سے روایت ہے اور ان کا معذور ہونا صحیح احادیث سے ثابت ہے لہٰذا یہ ایسے مرض والے کے متعلق ہے جو قیام یا قعود پر قادر تو ہے مگر بڑی شدت کے ساتھ اور اس سے زیادتِ مرض کا اندیشہ ہے۔ امام صاحبؒ کے اس قول سے معلوم ہوا کہ حدیث مفترض معذور کے لیے ہے اور امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کے دیگر دلائل بھی موجود ہیں مگر ان کے بیان کی ضرورت نہیں تفصیلات فقہ میں دیکھی جائیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اور نفل نماز کے بارے میں اختلاف کی وہ نوعیت نہیں جو فرض کے متعلق ہو سکتی ہے لہٰذا حنفیہ نے اس پر ضد بھی نہیں کی۔

بابُ الوِتر

سید المحدثین علامہ محمد انور شاہ الکشمیریؒ[1] فرماتے ہیں کہ وتر پر کئی طرح سے کلام کیا گیا ہے۔

ا۔ وتر میں اور صلوٰۃ اللیل میں کیا فرق ہے ؟ ب۔ کیا وتر واجب ہیں یا سنت ؟

ج۔ وتر کی رکعات کتنی ہیں ؟ د۔ کیا وتر کی نماز میں ایک ہی سلام ہے یا دو ؟

ہم کہتے ہیں کہ تمام محدثین کے طرزِ تبویب سے معلوم ہوتا ہے کہ وتر اور صلوٰۃ اللیل دو الگ الگ نمازیں ہیں۔ کیونکہ وہ ان دونوں کے لیے الگ الگ باب مقرر کرتے ہیں پھر صلوٰۃ اللیل کو وتر کے ابواب میں اور وتر کو صلوٰۃ اللیل کے ابواب میں بیان کرتے ہیں کیونکہ ان دونوں میں بہت ربط ہے اور حنفیہ کی نظر بھی اس باب میں یہی ہے کیونکہ ان کے نزدیک وتر بھی صلوٰۃ اللیل ہی کا ایک قطعہ ہے جو اپنی قراءت، صفت اور رکعات کے لحاظ سے ایک مستقل نماز بن گئی ہے۔ لیکن حضراتِ شافعیہؒ کے ہاں وتر اور صلوٰۃ اللیل میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن ان کے نزدیک وتر کی کم از کم مقدار ایک رکعت ہے اور زیادہ سے زیادہ گیارہ پر متفق ہوئے ہیں اور تیرہ میں اختلاف کیا ہے۔ لیکن صلوٰۃ اللیل ہونے کی حیثیت سے ان کے نزدیک ایک ہزار رکعت بھی ایک سلام سے جائز ہے۔ پس صلوٰۃ وتر میں اختلاف کا اصل باعث یہی ہے شافعیہ نے چونکہ وتر اور صلوٰۃ اللیل میں فرق نہیں کیا۔ لہٰذا وہ وتر کو واجب نہیں کہہ سکتے۔ اور حنفیہ کے نزدیک چونکہ ان دونوں نمازوں

---

[1] فیض الباری ج ۲ ص ۳۶۵

میں کچھ فرق ہے لہٰذا انہوں نے وتر کو واجب اور صلوٰۃ اللیل کو سنت یا مستحب کہا۔ لیکن حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے گھر والوں کو نمازِ وتر کے لیے جگانا اور صلاۃ اللیل کے لیے ایسا نہ کرنا، اور جو شخص رات کو پچھلے پہر اٹھنے پر اعتماد نہ رکھتا ہو اُسے اوّل شب میں ہی وتر پڑھ لینے کا حکم دینا، اور جس کی نماز وتر فوت ہو جائے اسے قضا کا حکم دینا اور اس کے لیے الگ قرارت کا معیار مقرر کرنا اور اس کا وقت اور رکعات مقرر کرنا یہ سب دلائل اس کے وجوب کے لیے کافی ہیں۔ اور سب علماء وتر کے ترک کے جائز نہ ہونے پر متفق ہوئے ہیں اس نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو حنفیہ اور دیگر حضرات میں اختلاف باقی نہیں رہتا صرف لفظِ وجوب کے اطلاق پہ بات آکر رک جاتی ہے۔ اور یہ کوئی ایسی چیز نہیں جس پر نزاع کی جائے۔ حنفیہ کے ہاں وجوب کا لفظ فرضیت سے مختلف ہے اور یہ ان کی اپنی اصطلاح ہے وہ وجوب کا درجہ فرضیت و سنیت کے درمیان ٹھہراتے ہیں جبکہ شافعیہ کے ہاں وجوب بمعنیٰ فرضیت ہے۔

امام مالکؒ سے بہ تصریح ثابت ہے کہ وہ تارکِ وتر کی شہادت کو قبول کرنے کے خلاف ہیں اور اسی طرح کی تشدید حضرات شافعیہ سے بھی ثابت ہے۔ پس اختلاف صرف وجوب کے نام میں باقی رہ جاتا ہے۔ حنفیہ نے وجوب کے جو دلائل دیئے ہیں ان میں سے ایک تو وہ روایت ہے جسے ابن السکن نے صحیح کہا ہے۔ اِنَّ اللہَ تعالیٰ اَمَدَّکُم بصلوٰۃ الخ اور زیادتی صرف مزید علیہ کی جنس سے ہی ہوتی ہے اور وہ یہاں فرائض ہیں نہ کہ نوافل۔ کیونکہ نوافل کی حد بندی ممکن نہیں پس فرائض ہی پر زیادتی ثابت ہوئی اور حدیث کا مقتضیٰ تو یہی ہے کہ وتر فرض ہو لیکن چونکہ حدیث ظنی ہے لہٰذا ہم نے فرضیت کی بجائے وجوب کا حکم دیا۔ اور میرے نزدیک یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ وتر نماز پنجگانہ پر بھی متقدم ہے اور اس وقت سے ہے جبکہ سوائے فجر اور عصر کے کوئی نماز فرض نہ تھی اسی لیے کئی آیات میں وتر کو صبح و عصر کے ساتھ ملا کر بیان کیا گیا ہے۔ ہاں وتر کی ہیئت کی صفت اور کچھ تغیر اس میں بعد میں واقع ہوا ہے اس سے اس کی پہلے موجودگی کی نفی لازم نہیں آتی۔ اس کی نظیر مسلم کی وہ حدیث ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ نماز پہلے دو دو رکعات ہوتی تھی پھر اس پر زیادتی کی گئی اور فجر و مغرب کے سوا باقی نماز کو چار چار کر دیا گیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ نماز پہلے فرض نہ تھی بلکہ اس میں کچھ تبدیلیاں بعد میں حادث ہوئیں۔ اسی طرح صلاۃ اللیل پوری کی پوری منسوخ نہیں ہوئی نہ سورۂ مزمل کا ایک حرف اس نسخ پر دلالت کرتا ہے ہاں اس میں کچھ آسانیاں ضرور پیدا کر دی گئی ہیں۔ اور صلاۃ اللیل میں سے جو حصہ پہلے حکم وجوب پر باقی ہے وہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک وتر ہے لیکن چونکہ اس کے دلائلِ ثبوت ظنی ہیں لہٰذا ہم نے اسے فرض نہیں کہا بلکہ واجب کہا ہے۔ ابوداؤد کی روایت کے

الفاظ بھی اس کے وجوب پر دلالت کرتے ہیں۔ الوتر حق فمن لم یوتر فلیس منا۔ اسی طرح ایک حدیث ہے فَاَوْتِرُوْا یا اھلَ القرآنِ۔ حافظ سخاویؒ نے ایک مستقل رسالہ وتر کے وجوب پر لکھا ہے بلکہ وہ تو اسے فرض قرار دیتے ہیں۔

رہی رکعاتِ وتر کی بحث تو شافعیہ کے نزدیک تین رکعت دو سلام سے افضل ہیں اور اگر ایک سلام سے پڑھے جائیں تو افضل یہ ہے کہ صرف ایک آخری قعدہ سے پڑھے جائیں تین وتر دو قعدوں اور ایک سلام سے ان کے نزدیک مفضول یا غیر صحیح ہیں۔ پانچ وتر دو قعدوں یا ایک قعدے سے (دو یا ایک سلام کے ساتھ) بھی ان کے نزدیک جائز ہے۔ اسی طرح گیارہ تک ان کے ہاں ساری صلاۃ اللیل وتر ہوگی۔ اسی طرح ان کے ہاں صرف ایک وتر بھی جائز ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک تین وتر دو سلام سے وجوباً پڑھنے چاہئیں اور ایک رکعت جائز نہیں۔ اور اسی کے قریب قریب امام احمدؒ کا مسلک بھی ہے۔ لیکن حنفیہ کے نزدیک تین وتر دو قعدوں اور ایک تسلیم کے ساتھ ہیں کیونکہ ایک اکیلی رکعت جس سے پہلے یا بعد میں کچھ اور نہ ہو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے جیسا کہ شیخ عمروؒ بن الصلاحؒ نے اقرار کیا ہے۔ اور رکعاتِ وتر کے درمیان فصل کے دلائل محض مبہم ہیں لیکن وتر کے تین رکعت ایک تسلیم کے ساتھ ہونے کے دلائل صریح اور واضح نصوص کی صورت میں موجود ہیں۔ امام بخاریؒ نے وتر کو صلاۃ اللیل سے الگ مستقل نماز ماننے، اس کی تین رکعات اور واجب ہونے میں حنفیہ کی موافقت کی ہے۔ صرف ایک سلام میں وہ حنفیہ سے اختلاف کرتے ہیں اور دو سلام کے قائل ہیں لیکن اس کی دلیل سوائے ابن عمرؓ کے اثر کے انہوں نے کوئی پیش نہیں کی اور حنفیہ کے دلائل میں حضرت عمرؓ، علیؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، عمر بن عبدالعزیزؒ، سعید بن المسیبؒ، عروہ بن الزبیرؒ، قاسم بن محمدؒ، ابوبکرؒ بن عبدالرحمٰن، خارجہ بن زیدؒ، عبیداللہ بن عبداللہ، سلیمانؒ بن یسار اور دیگر فقہائے مدینہ کے آثار و اقوال موجود ہیں کہ وتر تین رکعات دو قعدوں اور ایک سلام کے ساتھ ہیں طحاویؒ نے اس آخری دلیل کو وضاحت سے لکھا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

الفصل الاوّل

حدیث ۱: عن ابن عمرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلاۃ اللیل مثنی مثنیٰ فاذا خشی احدکم الصبح صلی رکعۃً واحدۃً توتر لہ ما قد صلّی۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: رات کی نماز دو دو، دو دو رکعتیں ہیں۔ پھر جب تم میں سے کسی کو صبح چڑھ آنے کا خوف ہو تو ایک رکعت پڑھ لے وہ اس کی پہلے پڑھی ہوئی نماز کو وتر بنا دیگی۔
بخاری و مسلم

شرح: صلٰوۃ اللیل مثنیٰ مثنیٰ[1] - ابن الملک فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے امام ابویوسف، محمد اور شافعی نے استدلال کیا ہے کہ رات کی نماز میں دو دو رکعتوں پر سلام کہنا افضل ہے۔

فاذا خشی احدکم الصبح الخ معلوم ہوا کہ یہ حکم اس وقت کا ہے جب تہجد پڑھتے پڑھتے طلوعِ فجر کا خوف ہو عام حالات کا حکم نہیں ہے کیونکہ عام حالات میں حضور سے تین رکعات وتر ثابت ہیں جن کی قرارت بھی ثابت ہے کہ پہلی رکعت میں سورہ اعلیٰ، دوسری میں الکافرون اور تیسری میں الاخلاص پڑھتے تھے۔ علاوہ ازیں حدیث میں رکعت بُتَیراء (ایک ہی الگ تھلگ رکعت) سے نہی وارد ہے یہ حدیث گو مرسل ہے لیکن جمہور کے نزدیک مرسل حجت ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے ما اجزأت رکعۃ قط "ایک ہی اکیلی رکعت جائز نہیں"! اور یہ اگرچہ موقوف ہے لیکن مرفوع کے حکم میں ہے۔ اور کوئی حدیث صحیح ایک مفرد رکعت کے ثبوت میں کسی کے پاس موجود نہیں ہے۔ بلکہ کوئی ضعیف روایت بھی اس باب میں موجود نہیں۔ پس اس قسم کی مجمل روایات جن میں ایک رکعت کا ثبوت ملتا کہا جاتا ہے انہیں دوسری صحیح اور صریح احادیث کے ساتھ جمع کرنے کے لیے ان کی تاویل ضروری ہے۔ حافظ ابن الصلاح نے ان لوگوں کا قول رد کردیا ہے جو کہتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فقط اکیلی رکعتِ وتر پڑھنا ثابت ہے۔ اسی لیے امام شافعیؒ کے اصحاب میں سے ایک جماعت نے ایک رکعتِ وتر کو مکروہ کہا ہے۔

علامہ ابن الہمامؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں کوئی دلیل اس امر پر نہیں ہے کہ وتر کی ایک الگ رکعت کو الگ تکبیر تحریمہ کے ساتھ پڑھنا چاہیئے بلکہ اس میں صرف یہ دلیل ہے کہ جب صبح ہو جانے کا خوف ہو تو آخری دو رکعتوں کے ساتھ ایک تیسری رکعت ملا کر اس شفع کو وتر بنا لیا جائے جیساکہ امام طحاوی نے اس کا یہی معنی لکھا ہے۔ امام ابن الہمامؒ فرماتے ہیں کہ اگر ہم اس حدیث سے اکیلی رکعت کا ثبوت تسلیم کرلیں تو یہ اس وقت پر محمول ہوگا جبکہ ابھی نماز وتر کی رکعات کا معاملہ تین رکعت پر مستقر نہیں ہوا تھا۔ وجہ یہ ہے کہ یہ معنی

---

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۴۳۴، مرقات ج ۳ ص ۱۶۱، ۱۶۱

دوسری صریح احادیث کے خلاف پڑتا ہے۔ امام طحاویؒ یہ بھی فرماتے ہیں کہ وتر دو حال سے خالی نہیں یا فرض ہے یا سنت۔ اگر فرض کہو تو فرض کی یا دو رکعتیں ہیں یا تین یا چار۔ وتر کے دو یا چار ہونے کا کوئی بھی قائل نہیں پس تین ہی رکعات متعین ہوئیں۔ اور اگر وتر کو سنت کہو تو کوئی سنت ایسی نہیں جس کی نظیر فرض میں موجود نہ ہو۔ پس بہر صورت ایک اکیلی رکعت ثابت نہیں ہوتی۔

اس حدیث سے امام شافعیؒ نے وتر کے ایک رکعت ہونے کے جواز پر استدلال کیا ہے[1] واللہ اعلم۔

حدیث ۲: وعنه قال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلّم الوتر رکعة من آخر اللیل۔ رواہ مسلم

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: وتر آخرِ شب میں ایک رکعت ہے۔ مسلم

شرح[2]: الوتر رکعة من اخر اللیل۔ اور اس کی کیفیت اوپر کی حدیث میں گزری کہ جب صبح کا خوف ہو تو آخری دوگانہ کے ساتھ ایک تیسری رکعت ملا کر اسے وتر بنا لیں بعض صحیح احادیث میں اولِ شب میں بھی وتر پڑھنے کے احکام موجود ہیں پس اس حدیث سے اس کا مستحب وقت ثابت ہوا لیکن اگر کسی نے پہلے بھی پڑھ لی ہو تو جائز ہے۔ اس حدیث سے بھی امام شافعیؒ نے وتر کے ایک رکعت کے جواز پر استدلال فرمایا ہے اور حنفیہ تمام احادیث کو جمع کرنے کے لیے اس کا وہ معنی بیان کرتے ہیں جو اوپر مذکور ہُوا۔

حدیث ۳: وعن عائشة قالت کان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یُصلّی من اللیل ثلاث عشرة رکعة یوتر من ذٰلك بخمس لا یجلس فی شیئ الا فی آخرها۔ متفق علیه

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو تیرہ رکعات پڑھا کرتے تھے اور ان میں سے پانچ رکعتوں کے ساتھ ایتار فرماتے تھے اس میں صرف آخری رکعت میں بیٹھتے تھے۔ بخاری و مسلم

شرح[3]: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صلاۃ اللیل کی تعداد اور مقدار میں کئی احادیث آئی

---

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۴۳۴، مرقات ج ۳ ص ۱۶۱ [2] وایضاً

ہیں جن میں سے ایک یہ حدیث بھی ہے کہ آٹھ رکعات پڑھ کر پھر پانچ رکعات ایک ہی سلام سے پڑھتے تھے۔ اس حدیث کی ایک روایت میں لا یجلس کی بجائے لا یسلم کا لفظ ہے اور چار رکعات سے زیادہ کا وصل ایک سلام سے بالاتفاق جائز ہے۔ لا یجلس سے مراد اس حدیث میں حنفیہ کے نزدیک جلسۃ الفراغ ہے یعنی وہ تشہد جس کے بعد سلام ہوتا ہے وہ صرف آخری رکعت میں ہوتا تھا۔ یہ حدیث اگر ایک جہت سے حنفیہ کے مسلک کے خلاف ہے تو دوسری جہت سے شافعیہ کے بھی خلاف ہے کیونکہ وہ وتر کی اکیلی رکعت کے لیے الگ جلسہ تجویز فرماتے ہیں لا یجلس کا معنی یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ حضور کھڑے ہو کر نماز پڑھا کرتے تھے اور آخری رکعت کو بیٹھ کر ادا فرماتے تھے۔

امام ابن الہمامؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ وتر پہلے پانچ رکعات نماز تھی اور اس کے بعد آخری استقرار تین پر ہوا جیسا کہ دوسری روایات میں تین کا لفظ موجود ہے۔ اور ہر دو رکعات پر تشہد کا ثبوت بھی صحیح احادیث میں موجود ہے۔

حضرت ام سلمہؓ کی حدیث میں یوتر بسبع او خمس لا یفصل بینھن بتسلیم کے الفاظ ہیں۔ اسی طرح نسائی کی ایک روایت میں حضرت ام سلمہؓ کا بیان ہے کہ یوتر بخمس وسبع لا یفصل بینھن بسلام ولا کلام۔ ان احادیث سے وتر کے پانچ اور سات ہونے کا ثبوت ملتا ہے چنانچہ شافعیہ نے کہا ہے وتر ایک، تین، پانچ، سات، نو، گیارہ تک پڑھنا جائز ہے۔ اور حنفیہ نے ان صریح احادیث سے استدلال کیا ہے جن میں وتر کو ایک الگ مستقل نماز کی حیثیت سے تین رکعات بیان کیا گیا ہے چنانچہ صحاح میں حضرت عائشہ اور عبداللہ بن عباسؓ کی احادیث میں تین کے لفظ موجود ہیں۔ اس لیے جمع بین الاحادیث کے لیے حنفیہ دوسری احادیث میں تاویل کرتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر گزرا ہے۔

حدیث ۴: وعن سعد بن ہشام قال انطلقت الی عائشۃ فقلت یا ام المؤمنین انبئینی عن خلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قالت الست تقرأ القرآن قلت بلی قالت فان خلق نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان القران قلت یا ام المؤمنین انبئینی عن وتر رسول اللہ صلی اللہ

لہ فیض الباری حاشیہ ج ۲ ص ۲۷۲

عليه وسلم فقالت كنا نعد له سواكه وطهوره فيبعثه الله ما شاء ان يبعثه من الليل فيتسوك ويتوضأ ويصلى تسع ركعات لا يجلس فيها الا في الثامنة فيذكر الله و يحمده ويدعوه ثم ينهض ولا يسلم ثم يصلى التاسعة ثم يقعد فيذكر الله ويحمده ويدعوه ثم يسلم تسليما يسمعنا ثم يصلى ركعتين بعد ما يسلم وهو قاعد فتلك احدى عشرة ركعة يا بنى فلما اسن رسول الله صلى الله عليه وسلم واخذ اللحم اوتر بسبع وصنع فى الركعتين مثل صنيعه فى الاولى فتلك تسع يا بنى وكان نبى الله صلى الله عليه وسلم اذا صلى صلوة احب ان يداوم عليها وكان اذا غلبه النوم او وجع عن قيام الليل صلى من النهار ثنتى عشرة ركعة ولا اعلم نبى الله صلى الله عليه و سلم قرأ القرآن كله فى ليلة ولا صلى ليلة الى الصبح ولا صام شهرا كاملا غير رمضان - رواه مسلم

ترجمہ: سعدؒ بن ہشام تابعی فرماتے ہیں کہ میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا اے مومنوں کی ماں! مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے متعلق بتائیے۔ انہوں نے فرمایا کیا تو قرآن نہیں پڑھتا؟ میں نے عرض کیا، کیوں نہیں؟ تو فرمایا کہ پس اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا خلق قرآن تھا۔ میں نے کہا اے مومنوں کی ماں! مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وتر کے متعلق خبر دیجئے! تو فرمایا کہ ہم حضورؐ کے لیے مسواک اور پانی تیار رکھتے تھے پس اللہ تعالیٰ جب چاہتا تو آپؐ کو رات کو جگاتا تو آپؐ مسواک فرماتے اور وضو کرتے اور نو رکعات پڑھتے۔ ان میں سے آٹھویں رکعت کے سوا آپؐ نہ بیٹھتے۔ پس اللہ کا ذکر اور حمد کرتے اور دعا کرتے پھر اٹھ کھڑے ہوتے اور سلام نہ کہتے پس نویں رکعت پڑھتے پھر بیٹھ جاتے تو اللہ کا ذکر و حمد اور دعا کرتے پھر باآواز بلند سلام کہتے جو ہمیں بھی سناتے۔ پھر اس سلام کے بعد دو رکعتیں بیٹھ کر پڑھتے۔ پس اے میرے پیارے بیٹے یہ گیارہ رکعات ہوئیں۔ پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر زیادہ ہوگئی اور جسم بھاری ہوگیا تو آپؐ نے سات رکعات کے ساتھ اپنا رکھا اور دو رکعتیں اسی پہلی طرح پڑھیں۔ پس اے میرے

پیارے بیٹے یہ نو رکعات ہوئیں۔ اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی نماز پڑھتے تھے تو اس پر ہمیشگی کو پسند فرماتے تھے اور جب آپؐ پر نیند غالب آجاتی یا رات کو کوئی تکلیف ہوتی اور رات کو نماز نہ پڑھ سکتے تو دن کو بارہ رکعت پڑھتے اور مجھے علم نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سارا قرآن ایک رات میں ختم کیا ہو۔ اور نہ آپؐ نے کبھی رات بھر صبح تک نماز پڑھی اور نہ رمضان کے سوا کسی پورے مہینے کا روزہ رکھا۔ مسلم۔

شرح[1]: فان خلق نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان القرآن یعنی اس پر عمل کرنا، اس کی مقرر کردہ حدود کی پابندی، اس کے بیان کردہ آداب کو اختیار کرنا، اس کی امثال و قصص سے عبرت پانا، اس میں تدبر کرنا اور اسے اچھی طرح پڑھنا۔ یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق تھے۔

فتلک احدیٰ عشرۃ رکعۃ یا بنیّ۔ حضرت اُم المومنینؓ نے توسّعاً ساری صلوٰۃ اللیل کو وتر سے موسوم فرمایا کیونکہ یہ دونوں نمازیں باہم مربوط و متعلق ہیں قاضی عیاضؒ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث میں حضورؐ کا قیام اللیل نو رکعت آیا ہے اور عروہ عن عائشہؓ کی روایت میں وتر سمیت گیارہ رکعت ہے ہر دو رکعت پر سلام کہتے تھے اور جب مؤذن حضورؐ کو نمازِ فجر کی اطلاع دینے آتا تو فجر کی دو رکعات پڑھتے تھے۔ اور عروہ عن عائشہؓ کی ایک اور روایت ہے فجر کی دو رکعات سمیت تیرہ رکعات ہے اور حضرت عائشہؓ سے ہی روایت ہے کہ حضورؐ تہجد کی نماز رمضان و غیر رمضان میں ۴ + ۴ + ۳ کے حساب سے پڑھا کرتے تھے۔ اور انہی سے روایت ہے کہ آپؐ تیرہ رکعت پڑھتے تھے ۸ + ۳ + ۲ اور آخری دو رکعتیں بیٹھ کر پڑھتے تھے اور پھر فجر کی دو سنت پڑھتے تھے۔ اور بخاری میں حضرت عائشہؓ سے آپؐ کی نماز سات اور نو آئی ہے اور متفق علیہ حدیث میں ابن عباسؓ سے آپؐ کی صلاۃ اللیل وتر سمیت تیرہ رکعات آئی ہے اور پھر فجر کی دو سنت۔ زیدؓ ابن خالد الجہنی کی حدیث میں دو خفیف پھر دو طویل رکعات کا ذکر ہے اور آخر میں ہے کہ کل تیرہ رکعات تھیں۔ اہل علم نے کہا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ، زیدؓ اور ام المومنین عائشہؓ کی روایات میں رکعات کا اختلاف ہر شخص کے اپنے مشاہدے اور علم پر ہے جو دیکھا بیان کیا۔ اور حضرت عائشہؓ کی اپنی روایات کا اختلاف خود ان کی طرف سے ہے یا ان سے روایت کرنے والوں کی طرف سے۔ اگر ان کی طرف سے ہے تو اختلاف احوال و اوقات پر مبنی ہے اغلب تو گیارہ رکعات تھیں اور کبھی کبھی زیادہ۔ اور فجر کی سنت سمیت حضرت عائشہؓ سے زیادہ سے زیادہ صلاۃ اللیل

---

[1] السراج الوہاج ج ا ص ۲۴۶

پندرہ رکعات ثابت ہے اور کم از کم سات رکعات۔ پھر کبھی تو وہ پہلی دو خفیف رکعات کو گنتی ہیں شامل کر لیتی ہیں کبھی حذف فرما دیتی ہیں۔ اسی طرح کبھی سنتِ فجر کو شامل کرتی ہیں کبھی حذف فرماتی ہیں۔ پس صلاۃ اللیل میں کمی بیشی، طول وقصر وغیرہ کی کافی گنجائش ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں، اختلاف صرف حضورؐ کے فعل کے بیان میں ہے۔ واللہ اعلم۔ اس حدیث کے آخری الفاظ میں عبادات میں شدت ومبالغے اور رہبانیت کی نفی کی گئی ہے۔

لا یجلس فیھا الا فی الثامنۃ[1] حضرت شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحؒ فرماتے ہیں کہ ام المومنینؓ سے سوال چونکہ وتر کے بارے میں تھا لہٰذا انہوں نے وتر کے جلوس اور سلام پر اختصار فرمایا کیونکہ سائل نے صرف وتر کی حقیقت پوچھی تھی اور کچھ نہیں پوچھا تھا۔ پس ام المومنینؓ نے واضح طور پر فرمایا کہ وتر کی دوسری رکعت پر جلوس بلا سلام اور تیسری پر جلوس مع سلام ہے اور یہی بعینہٖ حنفیہ کا مسلک ہے۔ اور حضرت ام المومنین پہلی رکعات کے جلوس سے خاموش رہیں اور نہ ان کے سلام کا ذکر فرمایا کیونکہ ان کے متعلق سوال ہی نہ تھا پس ان کا جواب سوال کے مطابق تھا لیکن ام المومنینؓ نے تمام نماز پر وتر کا اطلاق فرمایا ہے۔

اس[2] حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضورؐ کے تمام احوال کو بغور دیکھتی اور خوب جانتی تھیں۔ دن رات کے اعمال وافعال کو اچھی طرح سمجھتی تھیں اسی لیے فرماتی ہیں لا اعلم نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرأ القرآن کلہ فی لیلۃ الخ ان کا مطلب یہ ہے کہ اگر حضورؐ سے ایسا ثابت ہوتا تو مجھے معلوم ہوتا کیونکہ خلوت وجلوت، دن رات، حضور وغیبت کی رمز شناس اور عالم احوال ہوں!

حضرت[3] ام المومنین عائشہ سلام اللہ علیہا سے ایک روایت میں حضورؐ کا تمام شعبان کے روزے رکھنا معلوم ہوتا ہے لیکن اس کی وضاحت انہوں نے خود ایک اور حدیث میں فرمادی ہے کہ اس سے مراد اکثر شعبان ہے۔ اس حدیث سے اور دوسری اکثر احادیث سے وتر کے بعد دو رکعتوں کا ثبوت ملتا ہے بظاہر یہ حدیثیں حضورؐ کے اس ارشاد کے خلاف ہیں جس میں فرمایا ہے اجعلوا آخر صلوٰتکم باللیل وترًا۔ اس تعارض کو اٹھانا مشکل معلوم ہوا ہے۔ امام مالکؒ نے اس حدیث کی بنا پر ان دو رکعتوں کا انکار کر دیا ہے گویا ان کے نزدیک حدیث میں یہ بیان درست نہ ٹھہرا۔ امام احمدؒ نے فرمایا ہے کہ میں نہ یہ دو رکعتیں پڑھتا ہوں نہ ان سے روکتا ہوں۔ لیکن جمہور علماء ان کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک اس حدیث کا معنی یہ ہے

---

[1] فتح الملہم ج ۲ ص ۳۰۴، [2] مرقات ج ۳ ص ۱۶۳، [3] مظاہر حق ج ۱ ص ۴۳۵

کہ صلاۃ اللیل کے دیگر نوافل سوائے ان دو رکعتوں کے وتر کے بعد مت پڑھا کرو۔ یا تطابق یوں ہوگا کہ کبھی یہ دو رکعت پڑھ لیں اور کبھی نہ پڑھیں تاکہ دونوں قسم کی احادیث پر عمل ہو جائے۔ پس اس حدیث اجعلوا اخر صلاتکم وترا کا امر استحباب پر مبنی ہے نہ کہ وجوب پر۔ پھر ان دونوں رکعات کا ثبوت بعض روایات میں اول شب میں بھی ملتا ہے جیسا کہ حضرت ثوبانؓ کی حدیث میں ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک یہ دو رکعتیں وتر سے ملحق ہیں یعنی یہ وتر کی سنت ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۵: وعن ابن عمرؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اجعلوا اخر صلاتکم باللیل وِتْرًا۔ رواہ مسلم

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ اپنی رات کی نماز کا آخری حصہ وتر کو بناؤ۔ مسلم۔

شرح: شرح حدیث تو اوپر گزری کہ اس میں امر استحباب کے لیے ہے اور یہ اسی طرح کی حدیث ہے جیسا کہ بعض صحیح احادیث میں ہے کہ جب صبح کا خوف ہو تو آخری شفع سے ایک اور رکعت ملا کر وتر بنا لو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ اس وقت ہے جب وقت میں گنجائش نہ ہو۔ ورنہ اُوپر کی حدیث میں خود حضورؐ کا وتر کے بعد دو رکعت بیٹھ کر پڑھنا آیا ہے۔ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ کی حدیث مسلم میں موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کے پہلے، درمیانی اور آخری حصے میں وتر ادا فرمائے ہیں لیکن آخر میں آپؐ آخرِ شب ہی ادا فرمایا کرتے تھے اس سے وتر کا استحباب آخر شب میں ثابت ہوا۔ اور مسلم میں ایک اور حدیث ہے کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا: اوتروا قبل ان تصبحوا[1] "صبح سے پہلے پہلے وتر پڑھ لیا کرو"۔

حدیث ۶: وعنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال بادروا الصبح بالوتر۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ صبح ہونے سے پہلے پہلے وتر کو ادا کرنے میں جلدی کرو۔ مسلم

شرح: اس حدیث میں امر حنفیہ کے ہاں وجوب کے لیے ہے شرح السنۃ میں ہے

---

[1] مرقات ج ۳ ص ۱۶۴، مظاہر حق ج ۱ ص ۴۳۶۔

کہ صبح کے بعد وتر نہیں۔ امام احمدؒ، مالکؒ اور عطاءؒ کا یہی قول ہے اور دوسرے حضرات نے وتر کی قضا کا حکم دیا ہے۔ سفیان ثوریؒ، امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ (فی اظہر قولیہ) سے یہی ثابت ہے کہ وتر کی قضا واجب ہے[1]۔

حدیث ۷: وعن جابرؓ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من خاف ان لا یقوم من آخر اللیل فلیوتر اوّلہ ومن طمع ان یقوم آخرہ فلیوتر آخر اللیل فان صلوٰۃ آخر اللیل مشھودۃ وذلک افضل۔ رواہ مسلم

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص کو یہ خوف ہو کہ آخر شب میں نہ اٹھ سکے گا تو وہ اوّل وقت میں وتر پڑھ لے۔ اور جو شخص آخر شب اٹھنے کی طمع و رغبت رکھتا ہو وہ آخر شب میں ہی وتر پڑھے کیونکہ آخر شب کی نماز میں رحمت کے فرشتے گواہ ہوتے ہیں۔ مسلم

شرح: اس حدیث پاک نے وتر کی اہمیت و عظمت کو واضح کر دیا ہے۔ یہ تاکیدی احکام کہ اگر آخر شب میں نہ اٹھنے کا خوف ہو تو وتر کو اوّل شب ہی ادا کر لو وجوب پر دلالت کرتے ہیں اسی لیے حنفیہ وتر کو واجب مانتے ہیں۔ پھر اس کی قضا وغیرہ سے بھی یہی حیثیت معلوم ہوتی ہے۔

صلوٰۃ آخر اللیل مشھودۃ۔ یعنی ملائکہ رحمت و برکت اس میں موجود ہوتے ہیں۔ نیز یہ ملائکۃ اللیل والنہار کی ڈیوٹی کے تبدیل ہونے کا وقت ہوتا ہے چنانچہ صحیح باحادیث سے ثابت ہے کہ فجر اور عصر کو دن اور رات کے فرشتوں کی ڈیوٹی تبدیل ہوتی ہے۔ ویسے بھی عادۃً فجر کی نماز (جو وتر کے کچھ دیر بعد طلوع فجر سے شروع ہوتی ہے) میں نمازیوں کی جماعت میں حاضری کثیر ہوتی ہے اور یہ بھی باعثِ برکت ہے۔

حدیث ۸: وعن عائشۃؓ قالت من کل اللیل اوتر رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من اوّل اللیل واوسطہ وآخرہ وانتھی وترہ الی السحر۔ متفق علیہ

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

---

[1] مظاہر حق ایضاً، مرقات ایضاً

وسلم نے رات کے پہلے حصے، نصفِ شب اور آخر شب ان تمام اوقات میں وتر پڑھے ہیں اور آخر کار آپؐ کا وتر وقتِ سحر تک آپہنچا تھا۔ بخاری و مسلم

شرح[1]: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بعد از عشاء ساری رات ہی وتر کا وقت ہے اور حضورؐ سے سب طرح ثابت ہے۔ گو افضل یہی ہے کہ آخر شب پڑھا جائے کیونکہ یہ حضورؐ کا آخری پیمانۂ عمل ٹھہر گیا تھا۔ اور اسی پر بہت سی صحیح احادیث کا اتفاق ہے۔

حدیث ۹: وعن ابی ھریرۃ قال اوصانی خلیلی بثلاثٍ، صیام ثلاثۃ ایام من کل شھر و رکعتی الضحیٰ وان اوتر قبل ان انام۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ میرے دوست (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مجھے تین باتوں کی وصیت فرمائی: ہر ماہ میں تین دن کے روزے رکھنا، نمازِ چاشت کی دو رکعتیں اور تیسری یہ کہ سونے سے پہلے وتر پڑھ لیا کرو۔ بخاری و مسلم

شرح[2]: ہر ماہ کے تین روزے کئی طرح آئے ہیں: (الف) ایامِ بیض یعنی ۱۳، ۱۴ اور ۱۵۔ (ب) مہینے کے اوّل، وسط اور آخر کے ایام کے روزے (ج) ہر عشرہ کے اوّل میں ایک دن۔ (د) مہینے بھر میں جب چاہے تین دن کے روزے رکھ لے۔ صلوٰۃ الضحیٰ (یعنی نمازِ چاشت) سورج کے بلند ہونے کے بعد پڑھی جاتی ہے۔ اس کی کم از کم دو رکعات ہیں اور اشراق کی کم از کم دو اور زیادہ سے زیادہ چھ رکعات ہیں لیکن نمازِ چاشت کی زیادہ سے زیادہ بارہ رکعات ہیں۔ اور حضورؐ نے حضرت ابوہریرہ کو بالخصوص اوّل شب میں وتر پڑھنے کا حکم فرمایا کیونکہ ان کے حالات سے حضورؐ کو معلوم تھا کہ پچھلے پہر آنکھ کھلنا دشوار ہوگا کیونکہ وہ کافی رات گئے تک حصولِ علم میں مصروف رہا کرتے تھے اسی لیے انہیں صلوٰۃ الضحیٰ کی بھی دو ہی رکعتیں فرمائیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ علمِ دین میں مشغولیت عبادت سے بھی افضل عبادت ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

باب القنوت

قنوت[3] کا لغوی معنی ہے عاجزی کرنا، اطاعت و فرماں برداری اور حکم ماننا۔ لیکن اصطلاحِ نماز میں اس سے ایک خاص دعا مراد ہے جو نمازِ وتر میں مانگی جاتی ہے۔

---

[1] السراج الوہاج ج ۱ ص ۲۴۷، [2] مظاہر حق ج ۱ ص ۳۴۶ - مرقات ج ۳ ص ۱۶۴، ۱۶۵ - [3] مرقات ج ۳ ص ۱۷۸

قنوت کی تین قسمیں ہیں[1]

الف - قنوتِ نازلہ : جو کسی حادثے، مصیبت وغیرہ اور بالخصوص دشمنوں کے شر سے پناہ لینے کے لیے مانگی جاتی ہے - یہ سال بھر میں جب بھی ضرورت پڑے مانگی جا سکتی ہے - اور بالعموم جہری نمازوں میں مانگی جاتی ہے - مقتدیوں کو حکم ہے کہ امام کی دعا کے وقفوں میں بآوازِ بلند آمین کہیں - اس میں کسی کا اختلاف نہیں -

ب - قنوتِ وتر - یہ دعا حنفیہ کے نزدیک ہر نمازِ وتر کی تیسری رکعت میں مانگی جاتی ہے - اور امام اور مقتدی سب آہستہ آہستہ مانگتے ہیں - اگر احادیث میں کہیں بالجہر آئی ہے تو حنفیہ کے نزدیک وہ تعلیم پر محمول ہے جیسا کہ حضورؐ سرّی نمازوں میں بھی کبھی کبھی بعض آیات بآوازِ بلند پڑھ جاتے تھے تاکہ مقتدیوں کو تعلیم و تلقین فرمائیں - اور امام شافعیؒ کے نزدیک قنوتِ وتر صرف رمضان کے آخر میں مشروع ہے -

ج - قنوتِ فجر : امام شافعیؒ کے نزدیک سارا سال نمازِ فجر میں قنوت مشروع ہے اور حنفیہ کے نزدیک فجر میں کوئی قنوت نہیں - ہاں قنوتِ نازلہ ہو تو وہ ضرور مشروع ہے حنفیہ کے ہاں قنوتِ فجر دراصل اسی قنوتِ نازلہ کا نام ہے جو اگرچہ فجر سے مخصوص نہیں اور دیگر نمازوں بالخصوص جہری نمازوں میں بھی ثابت ہے لیکن نمازِ فجر کی تخصیص غالباً بعض راویوں کے بیان کی وجہ سے ہے کہ انہوں نے فجر میں یہ دعا پڑھتے سنا یا دیکھا -

قنوتِ نازلہ کا محل بعد الرکوع ہے اور قنوتِ وتر کا محل قبل از رکوع ہے لیکن یہاں بھی شافعیہ کا اختلاف ہے وہ قنوتِ راتبہ (فجر والی اور رمضان کے اواخر میں وتر والی) کو بھی بعد از رکوع بتاتے ہیں -

[2] وتر کی قبل از رکوع قنوت میں اُبیّ بن کعبؓ، عبد اللہ بن مسعودؓ، ابن عباسؓ اور عبد اللہ بن عمرؓ سے احادیث موجود ہیں - حضرت اُبیؓ کی روایت نسائی اور ابن ماجہ نے کی ہے - ابن مسعودؓ کی روایت مصنف ابن ابی شیبہ اور سنن دارقطنی میں موجود ہے اور اسے خطیب بغدادیؒ نے بھی کتاب القنوت میں روایت کیا ہے - ابن عباسؓ کی حدیث کو ابو نعیمؒ نے حلیہ میں روایت کیا ہے اور ابن عمرؓ کی حدیث دارقطنی کی معجم اوسط میں موجود ہے - علاوہ ازیں طبرانی اور مصنف ابن ابی شیبہ میں عبد اللہ بن مسعودؓ کے آثار بھی اس کی تائید میں موجود ہیں -

---

[1] فیض الباری ج ۲ ص ۳۷۶ بہ ترمیم و اضافہ - [2] نصب الرایہ جلد ۲ ص ۱۲۳

الفصل الاوّل

حدیث ۱: عن ابی ھریرۃؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا اراد ان یدعو علی احد او یدعو لاحد قنت بعد الرکوع فربما قال اذا قال سمع اللہ لمن حمدہٗ ربّنا لک الحمد اللّٰھم انج الولیدؓ بن الولید وسلمۃؓ ابن ھشام وعیاشؓ بن ابی ربیعۃ اللھم اشدد وطأتک علی مُضروا جعلھا سنین کسنی یوسف یجھر بذالک وکان یقول فی بعض صلاتہ اللھم العن فلانا وفلانا لاحیاء من العرب حتی انزل اللہ تعالیٰ لیس لک من الامر شیٔ الآیۃ۔ متفق علیہ

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی کے لیے بد دعا یا دعائے خیر فرمانا چاہتے تو رکوع کے بعد قنوت (دعا) پڑھا کرتے تھے بس بار ہا ایسا ہوا کہ آپؐ نے جب سمع اللہ لمن حمدہٗ ربنا لک الحمد کہہ لیا تو یوں فرمایا: اے اللہ ولیدؓ بن الولید کو نجات عطا کر۔ اور سلمہؓ بن ہشام اور عیاشؓ بن ابی ربیعہ کو نجات دے۔ اے اللہ کفار مضر پر اپنی شدید لتاڑ یعنی عذاب نازل فرما اور انہیں کئی سال کے قحط میں مبتلا کر جیسا کہ یوسف علیہ السلام کے زمانے کا قحط تھا۔" آپؐ اس دعا کو بالجہر مانگا کرتے تھے اور بعض نمازوں میں یوں کہا کرتے تھے اے اللہ فلاں اور فلاں عرب قبائل پر لعنت فرما۔ حتّٰی کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی لیس لک من الامر شیٔ الآیۃ "کہ اس معاملے میں آپؐ کو کچھ اختیار نہیں دیا گیا ہے۔" بخاری ومسلم۔

شرح: [1] ولیدؓ بن الولید خالدؓ بن الولید کے بھائی تھے جنگ بدر میں قید ہو کر آئے فدیہ دے کر چھوٹے تو مکہ میں جا کر اسلام کا اعلان کر دیا اور لوگوں کے پوچھنے پر بتایا کہ فدیہ دے کر آزاد ہونے سے پہلے اس لیے اسلام نہ لایا کہ لوگ کہیں گے قید پر صبر نہ کر سکا اور

---

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۴۴۳۔

ڈر کر مسلم ہو گیا۔ پس کفار نے اسے مکہ میں قید کر دیا پھر یہ بھاگ کر مدینہ چلے آئے۔ سلمہ بن ہشام ابو جہل کے بھائی تھے اور قدیم الاسلام تھے لیکن کفار نے انہیں عذاب میں مبتلا کر رکھا تھا اور ہجرت نہ کرنے دیتے تھے بعد میں یہ بھی بھاگ کر مدینہ آپہنچے۔ عیاش بن ابی ربیعہ بھی ابو جہل کے ماں شریک بھائی تھے۔ قدیم الاسلام تھے۔ پہلے حبشہ کو ہجرت کی اور پھر مدینہ کو۔ ابو جہل مدینہ میں آکر ان کی ماں کی دردناک حالت کی فرضی کہانیاں سنا کر انہیں مکہ لے گیا اور لے جا کر قید کر دیا۔ یہ بھی قید سے بھاگ نکلے اور غزوہ تبوک میں شہادت پائی رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔

اس حدیث کی قنوت وتر کی نہیں بلکہ قنوتِ نازلہ ہے جو متنازعہ فیہ نہیں ہے اور اب بھی مشروع ہے اور اس کا محل حنفیہ کے نزدیک بھی بعد الرکوع ہے۔

علامہ علی القاری لکھتے ہیں کہ علمائے حنفیہ قنوتِ نازلہ پر متفق ہیں اور جہاں تک قنوتِ وتر کا تعلق ہے امام بیہقی فرماتے ہیں کہ صحیح طور پر ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قبل الرکوع قنوت پڑھی تھی اور اس کے لیے بعد الرکوع کے دلائل دیئے ہیں حنفیہ وتر میں قبل الرکوع کے قائل ہیں اور قنوت نازلہ میں بعد الرکوع کے۔ اس طرح پر سب روایات جمع ہو جاتی ہیں اور کوئی تعارض نہیں رہتا۔

اور اس حدیث میں یہ جو فرمایا ہے کہ حتیٰ انزل اللہ تعالیٰ لیس لك من الامر شیئ اس کا مطلب کیا ہے؟ کیا یہ قنوتِ نازلہ منسوخ ہو گئی ہے؟ سو اس کا بھی کوئی قائل نہیں ہے۔ یا کیا یہ کہ قنوت تو مشروع ہے لیکن بد دعا مشروع نہیں، سو اس کا بھی کوئی قائل نہیں۔ ہاں غالباً اس کا مطلب یہ ہے کہ نام بنام لعنت نہ کی جائے کیونکہ ہو سکتا ہے جس پر لعنت کی جا رہی ہے اسے آئندہ کو اسلام کی توفیق مل جائے۔ یا اس کا مطلب کیا یہ ہے کہ آیت نے کسی چیز کو بھی منسوخ نہیں کیا صرف حضورؐ کی تسلی کی ہے اور بتایا ہے کہ ہدایت وضلالت پر اللہ کے سوا کسی کو اختیار نہیں ہے پس اس بارے میں آپؐ کو غمگین نہ ہونا چاہیئے۔ ابو داؤد کی روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آیت نے نام بنام لعنت کرنے سے روک دیا تھا باقی دعا و بد دعا اب بھی مشروع ہے اور شاید حضورؐ کے رحمۃ للعالمین ہونے کی وجہ سے آپؐ کے مقام رفیع کے پیشِ نظر آپؐ کو محض استحباباً روکا گیا ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

۱؎ مرقات ج ۳ ص ۱۷۸ ، ۲؎ مظاہر حق ج ۱ ص ۴۴۲۔

امامؒ نوویؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت نے نام بنام بد دعا کو منسوخ کیا ہے پس حضورؐ اس سے رک گئے تھے ورنہ اصل قنوت (یعنی نازلہ وراتبہ دونوں) قائم ہیں۔ نواب صدیق حسن خانؒ فرماتے ہیں کہ قنوت فی الفجر پر کوئی دلیل قائم نہیں اور اس بارے میں وارد ہونے والی احادیث میں صراحت موجود ہے کہ یہ قنوت نازلہ تھی اور حضورؐ مصائب کے وقت بد دعا مانگا کرتے تھے جو حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے حدیث میں آئی ہے اللّٰھم اھدنی فیمن ھدیت الخ اور یہی دعا وتر میں بھی ہے اور فجر کی قنوت کا کوئی ثبوت نہیں ہے اور قنوتِ نازلہ قبل از رکوع اور بعد از رکوع دونوں طرح ثابت ہے۔ واللہ اعلم بالصواب[1]

حدیث ۲: وعن عاصمؒ الاحول قال سألت انسؓ بن مالك عن القنوت فی الصلوٰة كان قبل الركوع او بعده قال قبله انما قنت رسول الله صلی الله علیه وسلم بعد الركوع شهرًا انه كان بعث اُناسًا يقال لهم القراء سبعون رجلا فاصيبوا فقنت رسول الله صلی الله علیه وسلم بعد الركوع شهرًا يدعوا عليهم متفق عليه

ترجمہ: حضرت عاصمؒ الاحول تابعی فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے نماز کی دعائے قنوت کے بارے میں دریافت کیا کہ وہ قبل از رکوع تھی یا بعد از رکوع؟ انہوں نے فرمایا کہ وہ قبل از رکوع تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو صرف ایک ماہ بعد از رکوع قنوت پڑھی تھی اور بات یہ تھی کہ آپؐ نے کچھ لوگ بھیجے تھے جنہیں قاری کہا جاتا تھا اور یہ تبلیغ اسلام کے لیے بھیجے تھے، جو ستر آدمی تھے اور انہیں مصیبت پہنچی تھی (سوائے کعب بن زید انصاری کے کوئی نہ بچا، انہیں بھی کفار مردہ سمجھ کر چھوڑ گئے تھے) پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکوع کے بعد ایک ماہ تک قنوت پڑھی، اس میں ان کفار پر بد دعا فرمایا کرتے تھے۔ بخاری ومسلم

شرح: یہ حدیث از اول تا آخر مسلکِ حنفیہ کی مؤید ہے اور اس پر تفصیلی کلام کی ضرورت بھی نہیں کیونکہ خود واضح ہے۔ یہ ستر[2] اصحاب بڑے بڑے حافظ و مبلغ قرآن تھے۔ اور اہلِ صفہ میں سے تھے جو تحصیلِ علم کے لیے دن کو محنت کرتے اور فارغ اوقات میں علم حاصل کیا کرتے تھے۔ حضورؐ نے انہیں اہلِ نجد کی طرف تعلیم قرآن و احکامِ اسلام

---

[1] السراج الوہاج ج ۱ ص ۲۲۳ ۔ [2] مرقات ج ۳ ص ۱۸۰

کے لیے بھیجا تھا۔ جب یہ لوگ بئر معونہ کے مقام پر پہنچے تو عامر بن الطفیل بنی سلیم کے کچھ قبائل یعنی عُصَیَّہ، رعل، ذکوان اور قارہ کو لے کر آ پہنچا اور ان صحابہؓ کو گھیر کر شہید کر ڈالا۔ ان میں حضرت عامر بن فہیرہؓ بھی تھے لیکن ان کی لاش نہیں ملی۔ کہا جاتا تھا کہ انہیں فرشتوں نے دفن کیا تھا۔ یہ واقعہ ۴ھ کا ہے۔ حضورؐ کو اس کا بہت صدمہ ہوا۔ حضورؐ کو اس قدر غمگین کبھی نہیں دیکھا گیا جتنا اس موقع پر۔

انہی دنوں ایک اور واقعہ بھی اسی قسم کا پیش آیا تھا اور دونوں کی خبر تقریباً ایک ہی وقت میں حضورؐ کو ملی۔ وہ یہ تھا کہ عضل اور قارہ کے قبائل نے حضورؐ سے کچھ مبلغین اسلام طلب کیے تاکہ انہیں احکام اسلام سکھائیں۔ حضورؐ نے چھ صحابہؓ عاصمؓ بن ثابت کی امارت میں روانہ فرمائے۔ جب یہ حضرات بنو ہذیل کے مشہور چشمے رجیع پر پہنچے تو بنو لحیان جو ہذیل میں سے تھے آ گئے اور ان حضرات کو دھوکے سے گرفتار کرنا چاہا۔ حضرت عاصمؓ نے مقابلہ کیا اور شہید ہوئے۔ باقی حضرات میں سے خبیبؓ اور زیدؓ بن الدثنہ کو کفار نے قید کر کے مکہ میں بیچ ڈالا اور کفار مکہ نے انہیں شہید کر دیا۔ اور ان کی شہادت کے دردناک واقعات مشہور ہیں۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

باب قیام شہر رمضان

اس سے مراد نماز تراویح ہے جو رمضان کے ساتھ خاص ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قیام رمضان کی بہت ترغیب وارد ہوئی ہے۔ خود آپؐ کا عمل مبارک احادیث سے ثابت ہے کہ رمضان میں عام دنوں کی نسبت زیادہ تر عبادت و ریاضت فرماتے تھے۔ حدیث میں ہے: یجتھد فی رمضان مالا یجتھد فی غیرہ۔ اور بعض احادیث میں ہے کہ جب رمضان آتا تو آپؐ کمر ہمت باندھ لیتے تھے اور گھر والوں کو بھی جگاتے تاکہ وہ بھی ان دنوں میں عبادت کریں۔ ایک حدیث میں ہے: من قام رمضان ایمانا و احتسابا غفرله ما تقدم من ذنبه۔ اور قیام رمضان عام صلوٰۃ اللیل سے الگ ایک مستقل نماز ہے کیونکہ قیام اللیل کے متعلق تو حدیث میں ہے کہ وہ رمضان و غیر رمضان میں عموماً گیارہ رکعت ہوتی تھی۔ تمام احادیث کو جمع کرنے سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ قیام رمضان صرف رمضان کے ساتھ خاص ہے اور قیام اللیل ہمیشہ کے لیے ہے۔ حضرت عمرؓ نے جب لوگوں کو تراویح باجماعت پر جمع فرمایا تھا تو انہیں قیام رمضان میں دیکھ کر فرمایا تھا کہ یہ نماز بہت اچھی ہے۔ لیکن جس سے تم سو رہتے ہو (یعنی تہجد) وہ اس سے بھی بہتر ہے۔

تراویح باجماعت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عمر بھر میں صرف تین مرتبہ آخر رمضان میں ثابت ہے۔ پھر آپؐ نے اسے فرضیت کے خوف سے باجماعت ترک فرما دیا تھا لیکن صحابہؓ کو انفرادًا پڑھنے کی ترغیب دی تھی۔ لیکن کسی صحیح حدیث میں ان تین راتوں کی تعداد رکعات نہیں آئی ہاں طول صلاۃ کا ذکر ضرور آیا ہے۔ پھر اسے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت میں اجماعِ صحابہؓ سے قائم کیا گیا تھا کیونکہ اس کی فضیلت و ترغیب تو موجود تھی صرف ایک مصلحت (خوفِ فرضیت) سے باجماعت ترک کی گئی تھی۔

[1] حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ شافعیہ و حنفیہ کا مسلک یہی ہے کہ رمضان میں بیس رکعت تراویح اور تین وتر پڑھے جائیں جیسا کہ ابن حزمؒ نے محلّی میں امام بیہقیؒ سے نقل کیا ہے۔ اور امام احمدؒ کے نزدیک گیارہ اور تیئیس رکعات میں سے ہر ایک میں پڑھنے والے کو اختیار دیا گیا ہے۔ امام مالکؒ بھی غالبًا تخییر کے قائل ہیں لیکن اہل مدینہ کا عمل انتالیس رکعات پر ہے اور امام ترمذیؒ نے سنن میں صحابہؓ و تابعین اور ائمہ فقہ و حدیث کا یہی مسلک بیان کیا ہے۔

[2] نواب سید صدیق حسن خانؒ علامہ شوکانیؒ سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ کے تراویح کی ایک جماعت قائم کرنے سے پہلے بھی صحابہؓ اکیلے اکیلے یا چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں یہ نماز پڑھا کرتے تھے۔ پس یہ سنّت ہے جو حضورؐ کے زمانے سے چلی آرہی تھی بدعت نہیں ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صرف ایک جماعت پر لوگوں کو جمع کیا تھا اور اسے بدعت کیسے کہا جا سکتا ہے جبکہ حضورؐ نے خود باجماعت پڑھی تھی لیکن صرف فرضیت کے خوف سے ترک کر دی تھی۔

نماز تراویح بالاتفاق سنّت ہے لیکن اس میں رکعات کا اختلاف محض فرعی ہے۔ اسے اتنی اہمیت نہیں دی جانی چاہیئے بالخصوص اس زمانے میں جبکہ فرائض و واجبات اور بنیادی عقائد تک سے انحراف ہو رہا ہے۔

الفصل الاوّل

حدیث ۱: عن زید بن ثابتؓ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اتخذ حجرۃ فی المسجد من حصیر فصلی فیھا لیالی حتی اجتمع علیہ ناس ثم فقدوا صوتہ لیلۃ وظنّوا

---

[1] مصفّٰی و مسوّٰی ج ۱ ص ۱۷۷ ، [2] السراج الوہاج ج ۱ ص ۲۵۰

اَنَّہٗ قد نام فجعل بعضهم يتنحنح ليخرج اليهم فقال ما ذال بكم الذى رأيت من صنيعكم حتى خشيت ان يكتب عليكم ولو كتب عليكم ما قمتم به فصلوا ايها الناس فى بيوتكم فان افضل صلٰوة المرأ فى بيته الا الصلوٰة المكتوبة ۔ متفق علیہ ۔

ترجمہ: حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں چٹائی کا ایک حجرہ بنایا اور کئی راتیں اس میں نماز پڑھی یہاں تک کہ لوگ آپ پر جمع ہو گئے۔ پھر ایک رات انہیں حضورؐ کی آواز مبارک سنائی نہ دی اور وہ سمجھے کہ آپ سو گئے ہیں پس ان میں سے بعض کھانسنے لگے تاکہ حضورؐ ان کے پاس باہر تشریف لائیں۔ پس حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے تمہارا جو طریقہ دیکھا ہے یعنی شدتِ حرص علی العبادۃ یہ تمہارا طریقہ برابر رہا ہے حتیٰ کہ مجھے خوف ہوا کہ یہ تم پر فرض نہ ہو جائے اور اگر فرض کر دی گئی تو تم اسے قائم نہ کر سکو گے۔ پس اے لوگو! اپنے گھروں میں نماز پڑھو کیونکہ فرض نماز کے علاوہ آدمی کی افضل نماز گھر پر ہی ہے۔ بخاری ومسلم۔

شرح: حضورؐ نے یہ جو ارشاد فرمایا کہ مجھے خطرہ ہوا کہ یہ نماز تم پر فرض نہ کر دی جائے۔ اس میں ایک اشکال ہے کہ فرائض کے پانچ ہونے کا من جانب اللہ اعلان ہو چکا تھا۔ پھر حضورؐ کو تراویح کی فرضیت کا کیسے خطرہ پیدا ہوا؟ حالانکہ فرائض میں کمی بیشی نہ ہو سکتی تھی! اس کا جواب یہ ہے کہ عمر بھر کا فریضہ فرائض خمسہ میں منحصر کر دینے کا مطلب یہ نہ تھا کہ خاص طور پر رمضان المبارک میں بھی اب کوئی اور نماز فرض نہیں ہو سکتی تھی۔ حضرت سیّد انور شاہ کشمیری[1] فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک زیادہ راجح یہ ہے کہ حضورؐ کا یہ خطرہ جماعت کے ساتھ متعلق تھا، یعنی اس بات کا خدشہ تھا کہ رمضان المبارک میں تراویح کی جماعت فرض نہ ہو جائے کیونکہ جماعت کو فرضیت میں دخل حاصل تھا۔ اور حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی رحمہ کا ارشاد ہے کہ کسی چیز کی ہمیشگی سے پابندی کرنے کو بھی فرضیت یا تحریم میں دخل ہے۔ اور یہ زمانہ چونکہ نزولِ وحی کا تھا لہٰذا حضورؐ کا یہ خطرہ بجا تھا اور اس کا منشا امت پر شفقت و رحمت تھا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رمضان کی نماز اس بات کی صلاحیت رکھتی تھی کہ اسے فرض ٹھہرایا جا سکے اور اسے فرض گو ٹھہرایا نہیں گیا لیکن وہ بھی ایک مصلحت پر مبنی تھا۔

---

[1] فیض الباری ج ۲ ص ۲۳۹۔

فصلّوا ایھا الناس فی بیوتکم الخ امام طحاویؒ نے یہ مسلک اختیار فرمایا ہے جو شخص حافظِ قرآن ہو اس کے لیے تراویح گھر میں پڑھنا افضل ہے ورنہ مسجد میں۔ لیکن حضورؐ نے یہ صحابہؓ کی دلجوئی کے لیے فرمایا تھا ورنہ جب حضورؐ نے باجماعت تراویح پڑھی تو وہ تو مسجد ہی میں تھی اور چونکہ وہ اب مصلحۃً موقوف کی گئی تھی اس لیے حضورؐ نے یہ ارشاد فرمایا کہ آدمی کے فرائض کے علاوہ افضل نماز گھر ہی میں ہے پھر جب صحابہؓ نے صلوٰۃ التراویح کو قائم فرمایا تو حضورؐ کا یہ جماعت والا عمل مسجد میں ہونا ان کے سامنے تھا لہٰذا اسے مسجد ہی میں قائم کیا گیا۔ اور وہ[1] نوافل جو شعارِ اسلام ہیں مثلاً نمازِ تراویح وکسوف، استسقاء اور عید (بحالتِ عذر) وغیرہ انہیں مسجد ہی میں قائم کرنا افضل ہے اور مسافر و دل کے لیے مسجد نبویؐ اور کعبہ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ ان کا تو وہاں گھر ہی نہیں ہوتا تو وہ بیچارے نوافل کے لیے کدھر جائیں گے؟

اس[2] حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اعتکاف کے لیے مسجد میں بوریے وغیرہ کا حجرہ بنانا جائز ہے لیکن دلائل شرع سے مسجد میں دوسروں کو تنگ کرنا اور ضرورت سے زائد جگہ بلا وجہ گھیرنا ناجائز ثابت ہوا ہے ہاں اگر دیگر نمازی تنگ نہیں ہوتے تو پھر ضرورت سے زائد جگہ بھی زیرِ استعمال آسکتی ہے۔

اس حدیث میں چٹائی کے حجرے میں حضورؐ کا نماز پڑھنا ملتا ہے لیکن دوسری روایات میں الفاظ کچھ مختلف ہیں مثلاً بخاری[3] میں ہے: کان یصلی من اللیل فی حجرته وجدار الحجرة قصیر۔ اس لیے شارحین[4] نے حجرہ کی تفسیر میں اختلاف کیا ہے ممکن ہے کہ واقعات متعدد ہوں اور غالباً اسی لیے امام بخاریؒ نے جس باب میں یہ مشکوٰۃ والی حدیث اور اسی مضمون کی ایک اور حدیث درج کی ہے اس کا عنوان رکھا ہے: باب[5] اذا کان بین الامام وبین القوم حائط او سترة۔ حافظ علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ یا تو ان دو حدیثوں کے واقعات الگ الگ ہیں یا ایک میں جدار الحجرة کا لفظ مجازی طور پر اس چٹائی والے حجرے کی آڑ کے لیے آیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۲: وعن ابی ھریرۃؓ قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یُرغّب فی قیام رمضان من غیر أن یأمرهم فیه بعزیمةٍ

---

[1] مظاہرِ حق ج ۱ ص ۴۴۶، قسطلانی ج ۲ ص ۷۹، [2] مرقات ج ۳ ص ۱۸۵
[3] قسطلانی ج ۲ ص ۷، [4] فتح الباری ج ۳ ص ۱۴۰، فیض الباری ج ۲ ص ۲۳۸۔

فیقول من قام رمضان ایمانا و احتسابا غفرله ما تقدم من ذنبه فتوفی رسول الله صلی الله علیه وسلم والامر علی ذالك ثم کان الامر علی ذالك فی خلافة ابی بکرؓ وصدرا من خلافة عمرؓ علی ذالك - رواہ مسلم -

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیام رمضان کی ترغیب دیا کرتے تھے لیکن لوگوں کو تاکید کے ساتھ حکم نہیں فرماتے تھے۔ سو آپؐ فرماتے تھے کہ جس نے رمضان کا قیام ایمان و اخلاص کے ساتھ کیا اس کے پہلے گناہ معاف ہو گئے۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی اور معاملہ اسی نہج پر تھا۔ پھر حضرت ابو بکرؓ کی خلافت میں بھی معاملہ یونہی تھا اور حضرت عمرؓ کی خلافت کی ابتداء میں بھی یونہی تھا۔ مسلم

شرح: [1] علامہ ابن حجرؒ عسقلانی فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مردوں کی جماعت حضرت ابی بن کعب کی امامت میں اور عورتوں کی جماعت حضرت سلیمان بن ابی حثمہ کی امامت میں قائم فرمائی اور ایک روایت میں حضرت تمیمؓ کی امامت کا ذکر بھی ہے۔ حضورؐ نے تراویح کی نماز باجماعت بوجہ خوف فرضیت ترک فرمائی تھی اور اب حضورؐ کے وصال کے بعد یہ خوف باقی نہ رہا تھا لہٰذا اصل سنیت باجماعۃ جو باقی تھی وہ لوٹ آئی تھی اور حضرت عمرؓ سے خود جو لفظ بدعت اس کے لیے آیا ہے یہ تصور بھی نہیں ہو سکتا کہ خلیفہ راشد صحابہؓ کے اجماع سے ایک بدعت قائم کر سکتے تھے۔ پس یہ محض لفظی بدعت تھی ورنہ حقیقت میں تو سنت تھی۔ امام نوویؒ نے تراویح کی جماعت سنت ہونے پر اجماع نقل کیا ہے۔ امام بیہقیؒ نے نوویؒ کی مخالفت کرتے ہوئے اصحاب شافعیؒ کا اجماع تو تسلیم نہیں کیا ہاں اکثریت ضرور مان لی ہے۔ جو شخص حافظ قرآن ہو اور نیند اور سستی کا اسے خوف بھی نہ ہو نیز اس کے شامل نہ ہونے سے مسجد کی جماعت میں خلل نہ آئے اس کے لیے اصحاب شافعی بھی گھر میں تراویح افضل قرار دیتے ہیں۔

فی خلافة ابی بکرؓ۔ خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کا سارا زمانہ اندرونی انتشار کو روکنے اور ارتداد کا مقابلہ کرنے میں گزرا لہٰذا اطمینان میسر نہ آسکا کہ دوسرے کم

---

[1] مرقات ج ۳ ص ۱۸۶

اہمیت والے مسائل کی طرف توجہ دیتے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۳: وعن جابرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم إذا قضیٰ أحدُکُمُ الصلوٰۃ فی مسجدہٖ فلیجعل لبیتہ نصیبا من صلوٰتہ فان اللہ جاعلٌ فی بیتہٖ من صلوٰتہ خیرًا۔ رواہ مسلم

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس وقت تم میں سے کوئی شخص اپنی مسجد میں نماز پڑھ چکے تو اپنی نماز میں سے کچھ حصہ اپنے گھر کے لیے بھی رکھے کیونکہ اس کی نماز کے باعث اللہ تعالیٰ اس کے گھر میں خیر و برکت اور بھلائی پیدا کرے گا۔ مسلم

شرح: اس حدیث کو اس باب میں لانے کا مطلب شاید یہ ہے کہ جماعت کی نمازوں کے سوا باقی تمام نمازوں کو گھر میں ادا کرنا چاہیے۔ ہاں جن نمازوں کا تعلق ہی مسجد سے ہے مثلاً تحیۃ المسجد اور طواف کی دو رکعات وہ مسجد ہی میں ادا ہوں گی کیونکہ ان کا تو محل ہی مسجد ہے۔ لیکن نماز تراویح بالاتفاق اس سے مستثنیٰ ہے اس کی جماعت حضورؐ سے ہی مسجد میں ثابت ہے اور خلافت راشدہ سے اب تک اسی پر عملدر آمد رہا ہے۔ اس حدیث کا امر استحباب کے لیے ہے پس اگر افضل نوافل و سنن کا گھر میں ادا کرنا ہے لیکن مسجد میں بھی اگر پڑھی جائیں تو جائز ہے۔ اور خیر سے مراد برکت، گھر والوں کو نیک راہ کی ہدایت، عمر اور رجان و مال میں اضافہ ہوگا۔ اور صاحب مشکوٰۃ کے نزدیک شاید رمضان میں بھی تراویح مسجد میں ادا کرکے کچھ نماز گھر میں پڑھنا چاہیے اس لیے انہوں نے اس حدیث کو قیام رمضان کے باب میں ذکر کیا۔ قیام رمضان سے گو عام طور پر مراد تراویح ہوتی ہے لیکن دیگر اوراد و ظائف، تلاوت قرآن اور استغفار وغیرہ سب اس میں داخل ہو سکتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

باب صلوٰۃ الضحیٰ

ضحو[2] اور ضحوہ کا معنی ہے ارتفاع النہار "دن کا بلند ہونا" اور ضحی کا معنی ہے شروق النہار "دن کا چڑھنا"۔ صلوٰۃ الضحیٰ سے مراد وہ نماز ہے جو چاشت کے وقت پڑھی جاتی ہے یعنی سورج کے بلند ہونے کے بعد سے لے کر زوال

---

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۴۴۶، مرقات ج ۳ ص ۱۸۷، [2] مظاہر حق ج ۱ ص ۴۵۲

سے پہلے پہلے تک۔ ضحیٰ کے وقت کا بالکل پہلا حصہ اشراق کہلاتا ہے اس وقت کی نماز اشراق کی نماز کہلاتی ہے۔ گو بعض علماء دونوں کو ایک ہی شمار کرتے ہیں لیکن لغت، عرف اور بعض شرعی دلائل سے ان میں وہی فرق ہے جو اوپر بیان ہوا کہ ضحیٰ کے وقت کا ابتدائی حصہ نماز اشراق کا اور اس کے بعد کا حصہ نماز چاشت کا وقت ہے۔ اشراق کو ضحوۂ صغریٰ اور ضحیٰ کو ضحوۂ کبریٰ کہا گیا ہے۔ نسائی کی حدیث میں اشراق اور چاشت کی دو الگ نمازیں آئی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ اشراق اس وقت پڑھتے جب سورج مشرق میں اتنا بلند ہوتا جتنا مغرب میں عصر کے وقت ہوتا ہے اور نمازِ چاشت اس وقت پڑھتے جب سورج مشرق میں اتنا اونچا ہوتا جتنا مغرب کی طرف ظہر کے وقت ہوتا ہے۔ پہلی نماز کی دو اور دوسری کی چار رکعات نسائی میں آئی ہیں۔ دیگر دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ اشراق کی کم از کم دو اور زیادہ سے زیادہ چھ رکعات ہیں اور صلاۃ الضحیٰ کی کم از کم دو اور زیادہ سے زیادہ بارہ ہیں۔ نماز اشراق اور چاشت کی بہت فضیلت احادیث سے ثابت ہے چنانچہ اسے آدمؑ، نوحؑ، ابراہیمؑ، داؤدؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کی نماز فرمایا گیا ہے۔ علامہ ابن جریر طبریؒ نے تو کہا ہے کہ صلاۃ الضحیٰ کی فضیلت کی احادیث تواترِ معنوی تک پہنچ گئی ہیں۔ اور اکثر علماءِ امت اس کے استحباب کے قائل ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔[1]

علامہ سید انور شاہ محدث کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ صلاۃ الضحیٰ کے فضائل میں قولی دلائل بہت سے ہیں گو حضورؐ سے فعلی طور پر بہت کم ثابت ہے جیسا کہ اذان کے قولی فضائل ثابت شدہ ہیں لیکن خود آپؐ سے اس کا ورود ثابت ہونا مشکل ہے۔ پس فضیلت صرف عمل پر ہی منحصر نہیں بعض اوقات کسی مصلحت یا رکاوٹ سے کوئی فعل ہو نہیں سکتا لیکن اس سے اس کے اصل فضائل پر کوئی حرف نہیں آتا۔ اسی طرح نمازوں کے بعد حضورؐ سے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا عملی طور پر کم ثابت ہے لیکن اس کی قولی فضیلتیں بہت آئی ہیں۔ پس جو شخص یہ سمجھے کہ کسی عمل کی فضیلت محض حضورؐ کے عمل سے ہی ثابت ہو سکتی ہے وہ راہِ حق سے ہٹا ہوا ہے۔ حضورؐ اپنے لیے ایسے امور کا انتخاب فرماتے تھے جو آپؐ کی شان کے زیادہ لائق ہوں اور منصبِ رسالت سے زیادہ متعلق ہوں اور کل فضائل کا چونکہ عملاً احاطہ کر لینا ممکن نہ تھا اس لیے بعض اعمال میں حضورؐ نے قولی ترغیبات ارشاد فرما دیں۔ اذان اس کی ایک واضح مثال ہے چونکہ مقتدا ہونے کی حیثیت سے آپؐ کا منصب دراصل امامت کا تھا لیکن اذان بھی ضروری اور بہت افضل عمل تھا۔ لہٰذا آپؐ نے خود امام رہتے ہوئے دوسروں کے لیے اذان کے قولی فضائل بہت ارشاد فرمائے۔

---

[1] فیض الباری ج ۲ ص ۴۱۳، ۴۱۱ ـ

اور یہ بات کہ آپؐ کا منصب دراصل امامت ہی کا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اس ارشاد سے بھی واضح ہے: ماکان لابن ابی قحافة ان یتقدم بین یدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم۔ الحدیث۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

الفصل الاوّل

حدیث ۱: عن ام ھانیٔ قالت ان النبی صلی اللہ علیہ وسلّم دخل بیتھا یوم فتح مکة فاغتسل وصلی ثمانی رکعات فلم اُر صلوٰة قط اخف منھا غیر انه یُتم الرکوع والسجو وقالت فی روایة اخری وذلك ضحیً۔ متفق علیه

ترجمہ: حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے دن ان کے گھر میں داخل ہوئے۔ پس آپؐ نے غسل فرمایا اور آٹھ رکعات پڑھیں۔ پس میں نے اس سے زیادہ ہلکی نماز کبھی نہ دیکھی تھی لیکن حضورؐ رکوع وسجود (اور دیگر ارکان) پورے کر رہے تھے اور دوسری روایت میں ہے کہ چاشت کا وقت اور چاشت کی نماز تھی۔ بخاری ومسلم

شرح: ابوداؤد ص ۱۹۰[1] کی روایت میں ہے کہ حضورؐ نے ہر دو رکعت پر سلام کہا تھا۔ اور ابوداؤد ہی میں یہ بھی ہے کہ راوی نے اسے صلاة الضحیٰ قرار دیا تھا۔ گو اس نماز کے متعلق یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ صلاة الشکر تھی جو فتح مکہ کے شکرانے میں حضورؐ نے ادا فرمائی تھی۔ لیکن[2] علامہ قسطلانیؒ فرماتے ہیں کہ ابوداؤد ومستدرک حاکم وغیرہ میں اس نماز کو سبحة الضحیٰ بیان کیا گیا ہے اور مسلم کتاب الطہارۃ میں بھی اسے سبحة الضحیٰ کہا گیا ہے۔ امام ابن عبدالبرؒ کی تمہید کی روایت میں ام ہانیؓ کا بیان ہے کہ انہوں نے حضورؐ سے اس نماز کے متعلق پوچھا تو حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ یہ صلوٰة الضحیٰ ہے۔ امام نوویؒ نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ صلاة الضحیٰ کی افضل تعداد آٹھ رکعت ہے اور اس میں ۲، ۴، ۶، ۸، ۱۰ اور بارہ تک رکعات وارد ہیں پس اکثر تو بارہ ہوئیں اور افضل آٹھ ہیں۔ اور کئی احادیث اس کی فضیلت میں موجود ہیں۔

حضرت امّ ہانیؓ حضورؐ کی چچازاد اور جناب علیؓ کی سگی بہن ہیں ان کا نام فاختہ تھا رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔

امام بخاریؒ کے سامنے عبداللہ بن عمرؓ کا صلاة الضحیٰ کی نفی کرنا موجود تھا لہٰذا انہوں نے

---

[1] فیض الباری ج ۲ ص ۴۳۰، [2] ارشاد الساری ج ۲ ص ۳۸۲، ۳۸۳

اس حدیث پر باب باندھا ہے : باب صلوٰۃ الضحیٰ فی السفر۔ اور ایک باب چھوڑ کر ایک باب رکھا ہے : باب صلاۃ الضحیٰ فی الحضر۔ اس سے سفر و حضر میں یہ نماز ثابت ہوئی۔ اور دونوں کے درمیان ایک باب ہے : باب من لم یصل الضحی ورآہ واسعا۔ اس سے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ نماز مستحب ہے۔ واللہ اعلم۔ امام ابن تیمیہ رح لکھتے ہیں کہ صلاۃ الضحیٰ سفر سے واپسی پر پڑھی جاتی ہے۔ لیکن جمہور علماء اس نماز کے قائل ہیں اور اس میں کسی فقہی مسلک کا اختلاف بھی نہیں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۲ : وعن معاذۃ رح قالت سألت عائشۃ کم کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصلی صلاۃ الضحی قالت اربع رکعات ویزید ما شاء اللہ۔ رواہ مسلم

ترجمہ : حضرت معاذہ بصریہ فرماتی ہیں کہ میں نے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز چاشت کس قدر پڑھتے تھے تو انہوں نے فرمایا چار رکعتیں اور جتنی اللہ چاہتا بڑھا دیتے تھے۔ مسلم۔

شرح : اس حدیث میں حضرت ام المومنین رض نے حضور ؐ کی نمازِ چاشت ثابت فرمائی ہے لیکن بخاری[1] میں ان سے روایت ہے کہ ما رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سبح سبحۃ الضحی وانی لاسبحھا "میں نے حضور ؐ کو نمازِ چاشت پڑھتے نہیں دیکھا اور میں خود یہ نماز پڑھتی ہوں"۔ پس مسلم کی روایت میں جو ثبوت ہے وہ یقیناً انہوں نے دوسروں سے سن کر بیان فرمایا ہے۔ بخاری کی روایت میں صرف رویت کی نفی ہے صلاۃ کی نہیں۔ دونوں میں فرق ظاہر ہے۔

علامہ قسطلانی[2] فرماتے ہیں کہ صلاۃ الضحیٰ ان صحابہ ؓ سے مروی یا ثابت ہے : انس رض، ابوہریرہ رض، ابوذر رض، ابو اسامہ رض، عقبہ رض بن عبد السلمی، ابن ابی اوفیٰ رض، ابو سعید، زید بن ارقم رض، ابن عباس رض، جابر رض بن عبد اللہ، جبیر رض بن مطعم، حذیفہ رض بن الیمان، ابن عمر رض، ابو موسیٰ رض، عتبان رض بن مالک، عقبہ رض بن عامر، علی رض بن ابی طالب، معاذ رض بن انس، النواس رض بن سمعان، ابو بکرۃ رض، ام ہانی رض اور ابو مرۃ الطائفی وغیرہم۔ اور اس حدیث سے چار رکعات اور اس سے زائد کا ثبوت ملا۔ بعض اور روایات میں چار سے کم یعنی دو بھی ثابت ہیں لیکن زیادہ سے زیادہ بارہ تک ان کی تعداد وارد ہے۔

---

[1] بخاری مع قسطلانی ج ۲ ص ۳۸۳۔ [2] ایضاً

حدیث ۳: وعن ابی ذرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصبح علی کل سلامی من احدکم صدقۃ فکل تسبیحۃ صدقۃ وکل تحمیدۃ صدقۃ وکل تہلیلۃ صدقۃ وکل تکبیرۃ صدقۃ وأمر بالمعروف صدقۃ ونہی عن المنکر صدقۃ ویجزئ من ذلک رکعتان یرکعھما من الضحی۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: تم میں سے ہر شخص کے ہر ہر جوڑ پر صدقہ ہوتا ہے۔ پس ہر تسبیح (سبحان اللہ کہنا) صدقہ ہے۔ ہر الحمد للہ کہنا صدقہ ہے۔ ہر لا الٰہ الا اللہ کہنا صدقہ ہے۔ ہر تکبیر (اللہ اکبر کہنا) صدقہ ہے۔ اور نیکی کا حکم دینا صدقہ ہے اور برائی سے روکنا صدقہ ہے اور انسانی جوڑوں پر جو صدقات ہیں ان کی طرف سے دو رکعتیں کافی ہو جاتی ہیں جنہیں کوئی آدمی چاشت کے وقت پڑھتا ہے۔ مسلم

شرح:[1] علی کل سلامی من احدکم صدقۃ۔ سُلامی کا لفظ واحد بھی آتا ہے اور جمع بھی۔ واحد ہوگا تو اس کی جمع سُلامیات ہوگی اور جمع ہوگا تو واحد سلامیۃ ہوگی۔ اور سُلامی کا معنی ہے وہ ہڈیاں جو جوڑوں کے درمیان ہوتی ہیں۔ پھر یہ لفظ جوڑوں کے لیے بھی اور ہڈیوں کے لیے بھی بولا جاتا ہے قاضی عیاضؒ نے فرمایا کہ انسان کا ہر ہر جوڑ محض فضلِ خداوندی سے صحیح وسالم اور آفاتِ ارضی وسماوی سے محفوظ رہتا ہے۔ اور وہ کام سر انجام دیتا ہے جس کی خاطر اسے پیدا فرمایا گیا ہے پس ان منافع کی وجہ سے ہر جوڑ کے خالق ومصور اور قائم و محفوظ رکھنے والے کا شکر واجب ہے۔ علامہ علی القاریؒ فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی اس معنی میں ہے کہ انسان میں تین سو ساٹھ جوڑ ہیں۔ پس کہیں حضورؐ نے مفصل کا لفظ بولا اور کبھی سُلامی کا۔ کیونکہ سُلامی (ہڈیوں) پر انسانی جسم کا قیام وصحت منحصر ہے اور جوڑوں کی وجہ سے جسم کے اعضاء کا پھیلانا، سکیڑنا اور ضروریات کے لیے اٹھنا بیٹھنا ہوتا ہے۔

[2] تسبیح وتحمید اور ہر قسم کا ذکر و ورد چونکہ خالق کی حمد وثنا، اور اس کا شکر

---

[1] مرقات ج ۳ ص ۱۹۹ ، [2] ایضاً

ہے اس لحاظ سے صدقہ ہے۔ صدقہ فقط مال سے ہی نہیں ہوتا بلکہ ہر نیکی صدقہ ہے بلکہ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ جو نیکی نہ کر سکے وہ بدی سے باز رہے یہ بھی اس کا صدقہ ہے۔ ذکر و عبادات خالق کے حق کی ادائگی کی وجہ سے صدقہ ہیں اور نیکی کا حکم دینا اور برائی سے منع کرنا اس میں خالق کے حق کے ساتھ ساتھ حقوق العباد کی ادائگی بھی ہے۔ اور ان کا نفع متعدی ہے اس لحاظ سے یہ بھی صدقہ ہیں۔ اور انہیں خالص عبادات کے ساتھ ذکر کرنے میں ان کی اہمیت کا راز پوشیدہ ہے۔

يجزئ من ذلك[1] - یہ اشارہ اوپر بیان کئے ہوئے صدقات کی طرف نہیں ہے بلکہ ہڈیوں اور جوڑوں پر جو صدقہ واجب ہے، اس کی طرف ہے۔ چونکہ نماز میں جسم کے تمام اعضاء کا عمل شامل ہوتا ہے اور اس میں تسبیح و تحمید اور تکبیر و تہلیل سبھی کچھ ہوتا ہے لہٰذا اُسے یہ اہمیت دی گئی کہ وہ تمام جوڑوں پر جو صدقہ واجب ہے، اس کی طرف سے کافی ہو جاتی ہے۔

اس حدیث پاک میں جو صدقہ فرمایا گیا ہے اس کا تعلق معنویات اور روحانیات سے ہے۔ اسے مادی پیمانوں سے نہیں ناپا جا سکتا۔ نیز صدقاتِ واجبہ و نافلہ جن کا اسلام نے حکم دیا ہے وہ اس سے الگ دوسری چیزیں ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اس ارشاد سے صلوٰۃ الضحیٰ کی فضیلت و عظمت ثابت ہوئی۔

حدیث ۴: وعن زيدٍ بن ارقم أنه رأى قومًا يصلّون من الضحى فقال لقد علموا ان الصلوٰة في غير هذه الساعة افضل ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال صلوٰة الاوابين حين ترمض الفصال۔ رواه مسلم

ترجمہ: حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کچھ لوگوں کو چاشت کے وقت نماز پڑھتے دیکھا تو فرمایا: یقیناً انہیں معلوم ہو چکا ہے کہ نماز اس وقت کے علاوہ دوسرے وقت میں زیادہ فضیلت والی ہے بلا شبہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا تعالیٰ کی طرف بہت رجوع کرنے والوں کی نماز اس وقت ہوتی ہے جبکہ اونٹوں کے بچے گرم ہو جائیں۔ مسلم

شرح: [1] حضرت زید رضی اللہ عنہ نے یہ جو فرمایا کہ لقد علموا الخ یہ بطور انکار

---

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۴۵۳، مرقات ج ۳ ص ۲۰۰، [2] مرقات ج ۳ ص ۲۰۰

فرمایا تھا۔ غرض ان کی یہ تھی کہ صلاۃ الضحیٰ کو یہ لوگ اس کے وقتِ مختار میں نہیں پڑھ رہے تھے بلکہ اس سے پہلے ہی ادا کر رہے تھے۔ اس معنی کے اعتبار سے من الضحیٰ میں من تبعیض کے لیے ہوگا۔ یعنی ابتدائے وقت ہی میں انہوں نے نماز پڑھ لی تھی۔ یا بقول علامہ طیبیؒ اس مِن کو زائد مانا جائے گا۔ علامہ علی القاریؒ فرماتے ہیں کہ اس مِن کو ابتداء کے لیے زیادہ بہتر ہے۔

صلٰوۃ الاوابین ۔اوابین اواب کی جمع ہے جس کا مادہ اوب ہے بمعنی رجوع۔ اور یہ اس لیے ارشاد فرمایا کہ جب اونٹ کے بچے گرم ہو جائیں یعنی ان کے پاؤں گرمی سے جلنے لگیں تو یہ استراحت اور آسودگی کا وقت ہوتا ہے، ایسے وقت میں نماز پڑھنے والے واقعی اللہ کی طرف رجوع کرنے والے ہی ہو سکتے ہیں۔

اس حدیث سے نماز چاشت کا وقت صحیح طور پر معلوم ہو گیا اسی لیے وہ نماز جو طلوع آفتاب سے کچھ بعد پڑھی جاتی ہے اُسے نماز اشراق کہا جاتا ہے گو اس پر بھی صلاۃ الضحیٰ کا لفظ توسعاً بولا گیا ہے لیکن اصل صلاۃ الضحیٰ یہی ہے جو دوپہر سے پہلے پڑھی جاتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

حضورؐ کا یہ ارشاد اہل قباء کے لیے تھا جب آپؐ وہاں تشریف لے گئے اور انہیں اس وقت نماز پڑھتے دیکھا تو ارشاد فرمایا: صلوٰۃ الاوابین اذا رمضت الفصال۔ مسلم

بابُ التطوّع

لفظ تطوّع کا مادہ طوع ہے جس کا معنی ہے خوشی اور رغبت۔ تطوّع کا اخلاصِ نیت کے معنی میں بھی آیا ہے۔ قرآن کہتا ہے: ومن تطوع خیرا فھو خیر لہ۔ (البقرہ) یہاں اس سے مراد عام نوافل ہیں مثلاً تحیۃ الوضو، نماز استخارہ، صلاۃ التوبہ اور صلاۃ التسبیح۔ ان کے علاوہ بھی اگر کوئی شخص ممنوع اوقات کے سوا کسی وقت نفل پڑھنا چاہے تو شرع اسے اجازت دیتی ہے لیکن یہ مذکور تطوعات خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں۔

لہ مظاہر حق ج ۱ ص ۴۵۴ ۔ ۲ السراج الوہاج ج ۱ ص ۲۳۷، مرقات ایضاً

الفصل الاوّل

حدیث ۱: عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لبلالٍ عند صلاۃ الفجر یا بلال حدثنی بارجی عمل عملتہ فی الاسلام فانی سمعت دف نعلیک بین یدی فی الجنۃ قال ما عملت عملا ارجی عندی انی لم اتطھر طھورًا فی ساعۃ من لیل ولا نھار الا صلیت بذلک الطھور ما کتب لی أن اصلی۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال رضؓ سے نماز فجر کے وقت فرمایا: اے بلال رضؓ! مجھے تم اپنا وہ عمل بتاؤ جسے تم نے حالتِ اسلام میں سرانجام دیا ہے اور اس کے اجر کی اللہ تعالیٰ سے بہت امید ہے۔ کیونکہ میں نے جنت میں تمہاری جوتیوں کی آواز اپنے آگے سنی ہے۔ بلال نے کہا۔ میں نے اس سے بڑھ کر کوئی ثواب کی زیادہ امید والا عمل نہیں کیا کہ دن رات میں جس وقت میں بھی میں نے طہارت (وضو) کی اُس کے ساتھ خدا کی طرف سے جو نماز میرے لیے مقدر ہو چکی ہے وہ پڑھی ہے۔ بخاری و مسلم

شرح:[۱] اس حدیث میں اس نماز کی فضیلت کا ذکر ہے جسے تحیۃ الوضو یا شکر الوضو کہتے ہیں۔ اور طہارت سے مراد وضو، غسل اور تیمم بھی ہو سکتے ہیں۔ اور حضورؐ کا یہ ارشاد کہ میں نے تیری جوتیوں کی آواز جنت میں سنی ہے اس کے متعلق ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ یا تو حضورؐ کو بذریعہ کشف خواب میں ایسا نظر آیا یا عالم بیداری میں۔ یا بیداری اور نیند کی درمیانی حالت میں دکھایا گیا یا حضورؐ نے ایسا شب معراج میں دیکھا ہوگا۔ اور بلال رضؓ کا حضورؐ کے آگے آگے چلنا اُسی طرح ہے جس طرح خادم اپنے مخدوم کے آگے آگے چلتا ہے۔ اور حضورؐ کے خدمت گزار تو کئی صحابہؓ تھے لیکن یہ بلال کی خصوصیت تھی اسی لیے حضورؐ نے ان کے سامنے اس کا بیان فرمایا تاکہ انہیں نیکیوں میں اور ترغیب ہو اور سننے

---

[۱] مظاہر حق ج ا صـ ۷۵۶، مرقات ج ۳ صـ ۲۰۵

والوں کو بھی رغبت پیدا ہو نیز اس سے ان کا دل خوش ہو اور بشیر ازپیش نگی کریں
ماکتب لی ان اُصلی کے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ اس سے مراد فرائض نہیں بلکہ کتب بمعنی قدر ہے اور اس سے مراد وہ خالص نماز ہے جس کی وجہ سے بلال رضؓ کو یہ درجہ نصیب ہوا اور اسے شکر الوضو کی نماز کہا جاتا ہے۔ کیونکہ فرائض تو سبھی صحابہؓ ادا کیا کرتے تھے لیکن حضورؐ کا سوال اس خاص عمل کے متعلق تھا جو اور دل میں نہیں تھا اور جس سے حضرت بلالؓ کو ثواب خداوندی کی زیادہ تر امید تھی۔ اور اس سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ اوقات مکروہہ میں نماز جائز ہے کیونکہ ان اوقات میں نہی کی احادیث واضح اور مشہور ہیں پس انہیں بہر حال مقدم رکھا جائے گا نیز صلیت بذلک الطہور سے نماز کا فوری طور پر پڑھا جانا لازم نہیں آتا پس اگر انہوں نے کبھی ان اوقات میں وضو فرمایا ہوگا تو یقیناً وقت مکروہ کے نکل جانے پر ہی یہ نماز ادا کی ہوگی۔ بہر حال یہ حدیث صلاۃ شکر الوضو کی فضیلت کو ثابت کر رہی ہے۔

حدیث ۲: وعن جابرؓ قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعلمنا الاستخارۃ فی الامور کما یعلمنا السورۃ من القرآن یقول اذا ھمّ احدکم بالامر فلیرکع رکعتین من غیر الفریضۃ ثم لیقل اللھم انی استخیرک بعلمک واستقدرک بقدرتک واسئلک بفضلک العظیم فانک تقدر ولا اقدر وتعلم ولا اعلم وانت علام الغیوب اللھم ان کنت تعلم ان ھذا الامر خیر لی فی دینی ومعاشی وعاقبۃ امری أو قال فی عاجل امری وآجلہ فاقدرہ لی ویسرہ لی ثم بارک لی فیہ وان کنت تعلم ان ھذا الامر شر لی فی دینی و معاشی وعاقبۃ أمری أو قال فی عاجل امری وآجلہ فاصرفہ عنی واصرفنی عنہ واقدر لی الخیر حیث کان ثم أرضنی بہ قال ویسمی حاجتہ
(رواہ البخاری)

ل مرقات ج ۳ ص ۲۰۵

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں سب کاموں میں استخارہ کرنا اس طرح سکھاتے تھے جس طرح قرآن کی سورت سکھاتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ جب تم میں سے کوئی کسی کام کا ارادہ کرے تو دو نفل رکعتیں پڑھے پھر یوں کہہ کر دعا کرے: اے اللہ میں تیرے علم کے ساتھ تجھ سے طلب خیر کرتا ہوں اور تیری قدرت کے ساتھ تجھ سے طاقت طلب کرتا ہوں اور تیرے فضل عظیم کا تجھ سے سوال کرتا ہوں کیونکہ تو ہی قادر ہے اور مجھے قدرت نہیں اور تو ہی جانتا ہے میں نہیں جانتا اور تو سب پوشیدگیوں کا خوب جاننے والا ہے۔ اے اللہ! اگر تو جانتا ہے کہ یہ کام میرے لیے، میرے دین، معاش اور انجام کے لحاظ سے بہتر ہے، یا آپؐ نے یہ لفظ بولا کہ میرے فوری معاملے اور مستقبل کے لیے بہتر ہے تو اسے میرے لیے مقدر فرمادے اور اسے میرے لیے آسان فرمادے پھر میرے لیے برکت عطا فرمادے۔ اور اگر تو جانتا ہے کہ یہ کام میرے لیے، میرے دین، معاش اور انجام کار کے لحاظ سے بُرا ہے، یا آپؐ نے یہ لفظ فرمایا کہ میرے فوری معاملے اور مستقبل کے معاملے کے لیے بُرا ہے تو اس کو مجھ سے پھیر دے اور مجھے اس سے پھیر دے اور میرے لیے بھلائی کو وہ جہاں بھی ہو مقدر فرمادے پھر مجھے اس کے ساتھ راضی کر دے۔" فرمایا اور اپنی حاجت کا نام لے۔ بخاری

شرح:[1] استخارہ مباح امور میں ہے ناجائز میں بالکل نہیں۔ اور یہ اس وقت ہوتا ہے کہ کسی جائز امر کا قصد ہو لیکن تردد ہو کہ خدا جانے اس کا انجام کیا ہوگا مثلاً سفر، کاروبار، تجارت اور نکاح وغیرہ۔ پس معلوم ہوا کہ روزمرہ کے مقرر اعمال و مشاغل مثلاً کھانا پینا وغیرہ ان میں استخارہ نہیں ہے۔ اور اگر کوئی کام خیر محض ہو تو اس میں استخارہ اس جہت سے ہوگا کہ اس کا فلاں وقت یا فلاں مخصوص حالت مقرر کی جائے یا نہ کی جائے۔ فرائض و واجبات کی ادائگی اور حرام و مکروہ کو ترک کرنے میں کوئی استخارہ نہیں۔ ع درکار خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست! کیونکہ ان امور میں پہلے ہی صراحت و وضاحت موجود ہے تردد کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ اور استخارہ سے قبل دو رکعت پڑھنے کا جو حکم ہوا ہے یہ نماز بہ نیت استخارہ ہے گو سنن رواتب اور عام نفل مثلاً تحیۃ الوضو، تحیۃ المسجد وغیرہ پڑھ کر بھی یہ دعا ہوسکتی ہے لیکن اولیٰ یہی ہے کہ الگ نماز اسی نیت استخارہ سے پڑھی جائے اور اوقات مکروہ

---

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۴۵۷، مرقات ج ۳ ص ۲۰۶، ۲۰۸۔

کے سوا جب چاہے پڑھ سکتا ہے۔ بعض روایات میں ان کی قرارت سورۂ الکافرون اور الاخلاص بھی وارد ہوئی ہے لیکن جو سورت چاہے پڑھ لے۔ نماز استخارہ کے بعد علم الٰہی میں جو بات بہتر ہوتی ہے وہ پڑھنے والے کے دل میں قرار پکڑ جاتی ہے اور تردد جاتا رہتا ہے اگر ایک دفعہ سے تردد رفع نہ ہو تو متعدد مرتبہ بھی جائز ہے۔

اَوْ قَالَ یہ شک راوی کی طرف سے ہے کہ حضورؐ نے فی دینی و معاشی وعاقبۃ امری کا لفظ بولا تھا یا کہ فی عاجل امری و آجلہ ارشاد فرمایا تھا۔ مطلب مآل دونوں کا ایک ہی ہے، اور بہتر یہی ہے کہ یہ سب الفاظ پڑھ لیے جائیں۔

وَیُسَمِّی حَاجَتَہٗ۔ یعنی اس دعا میں ھذا الامر کی جگہ اپنی حاجت کا نام لے مثلاً ھذا السفر یا ھذہ التجارۃ یا ھذا النکاح وغیرہ۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ پہلے ھذا الامر کا لفظ بولے اور پھر اپنی حاجت کا نام لے مثلاً ھذا الامر ای ھذا السفر وغیرہ۔

بعض روایات میں ایک مختصر استخارہ بھی منقول ہے کہ اگر جلدی ہو تو صرف یہ دعا پڑھ لے۔ اَللّٰھُمَّ خِرْ لِیْ وَاخْتَرْ لِیْ وَلَا تَکِلْنِیْ اِلٰی اخْتِیَارِیْ "اے اللہ میرے لیے خود پسند فرما اور اختیار کر اور مجھے میرے اختیار اور پسندیدگی کے سپرد نہ فرما"۔

حضرت انسؓ کی روایت میں حضورؐ کا یہ ارشاد منقول ہے کہ استخارہ سات بار کرنا چاہیے پھر جو بات دل میں جم جائے اس پر دلیری سے عمل پیرا ہو جانا چاہیے۔ سات کی مقدار غالباً زیادہ سے زیادہ کے لیے ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

صلوٰۃ التسبیح

صاحب مشکوٰۃ نے اس نماز کے لیے عنوان تو الگ رکھ دیا ہے، لیکن باب الگ نہیں باندھا بلکہ اُسی باب التطوع کے باب میں یہ ایک الگ عنوان رکھ دیا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ صلاۃ التسبیح کے گو فضائل بھی بہت سے آئے ہیں اور[2] ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، بیہقی، صحیح ابن خزیمہ، ابن حبان اور مستدرک حاکم میں اس کی حدیث کی روایات ابن عباسؓ اور ابورافعؓ سے موجود ہیں۔ علاوہ ازیں طبرانی نے معجم میں اور آجری، ابوسعید سمعانی اور ابوموسیٰ مدینی نے بھی اس نماز کی حدیث بیان کی ہے۔ ترمذی نے ابورافعؓ کی حدیث

---

[1] مرقات ج ۳ ص ۲۰۷، ۲۰۸، مظاہر حق ج ۱ ص ۴۵۷ [2] مرقات ج ۳ ص ۲۱۶

کو حسن کہا ہے۔ ابن خزیمہ اور حاکم نے ابن عباسؓ کی حدیث کو صحیح کہا ہے علامہ ابن حجرؒ اس حدیث کو حسن کہتے ہیں اور ان کے علاوہ محدثین کی ایک جماعت بھی اسے حسن کہتی ہے۔ بہر حال صلاۃ التسبیح کو اتنی احادیث کی بنا پر مرغوب فیہ کہا گیا ہے اور اس پر عمل کرنا بہت پسندیدہ اور افضل عمل ہے مگر چونکہ مشہور صحاح میں یہ حدیث موجود نہ تھی، نہ کسی اور صحابیؓ سے اس باب میں بخاری و مسلم میں کوئی روایت تھی لہٰذا صاحب مشکوٰۃ نے اسے فصل ثانی میں تو رکھا لیکن عنوان اس پر الگ قائم کر دیا۔ اور اسی الگ عنوان کی وجہ سے ہم اس حدیث کی شرح بھی لکھ رہے ہیں ورنہ قاعدہ کے مطابق اغلباً یہ حدیث ایم۔ اے کے نصاب میں داخل نہیں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث: عن ابن عباسؓ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال للعباس ابن عبد المطلب یا عباس! یا عمّاہ! الا اعطیك الا امنحك الا اخبرك الا افعل بك عشر خصال اذا انت فعلت غفر اللہ لك ذنبك اوّلہٗ و آخرہٗ، قدیمہٗ و حدیثہٗ، خطأہٗ و عمدہٗ، صغیرہٗ و کبیرہٗ، سرّہٗ وعلانیتہٗ۔ ان تصلی اربع رکعات تقرأ فی کل رکعۃ فاتحۃ الکتاب وسورۃ فاذا فرغت من القراءۃ فی اوّل رکعۃ وأنت قائم قلت سبحان اللہ والحمد للہ ولا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر خمس عشرۃ مرّۃ ثم ترکع فتقولها وأنت راکع عشراً ثم ترفع رأسك من الرکوع فتقولها عشراً ثم تهوی ساجداً فتقولها وأنت ساجد عشرا ثم ترفع رأسك من السجود فتقولها عشرا ثم تسجد فتقولها عشراً ثم ترفع رأسك فتقولها عشراً فذلك خمس وسبعون فی کل رکعۃ تفعل ذلك اربع رکعات ان استطعت ان تصلیها فی کل یوم مرّۃ فافعل فان لم تفعل ففی کل جمعۃ مرّۃ فان لم تفعل ففی کل سنۃ مرّۃ فان لم تفعل ففی عمرك مرّۃ۔ رواہ ابوداؤد وابن ماجہ والبیهقی فی الدعوات الکبیر وروی الترمذی عن ابی رافع نحوہٗ۔

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباسؓ بن عبد المطلب سے فرمایا: اے عباس! اے میرے

چچا! کیا میں آپ کو عطا نہ کروں؟ کیا میں آپ کو ایک تحفہ نہ بخشوں؟ کیا میں آپ کو خبر نہ دوں؟ کیا میں آپ کے ساتھ دس نیکیاں نہ کروں؟ جب آپ وہ کام کریں گے تو اللہ تعالیٰ آپ کے اگلے پچھلے، پرانے اور نئے، بے جانے بوجھے اور جان کر کیے ہوئے، چھوٹے اور بڑے، پوشیدہ اور ظاہر گناہ بخش دے گا وہ یہ چیز ہے کہ آپ چار رکعات پڑھیں ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ اور ایک سورت پڑھیں۔ پس جب پہلی رکعت میں قرارت سے فارغ ہو جائیں تو کھڑے کھڑے پندرہ مرتبہ یوں کہیں:
سبحان اللہ والحمد للہ ولا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر۔ پھر رکوع کریں تو رکوع کی حالت میں دس مرتبہ یہی کہیں۔ پھر رکوع سے سر اٹھائیں تو دس مرتبہ کہیں۔ پھر سجدے کے لیے جھکیں تو حالت سجدہ میں دس مرتبہ پڑھیں پھر سجدے سے سر اٹھائیں تو دس مرتبہ کہیں۔ پھر سجدہ کریں تو دس مرتبہ کہیں۔ پھر سجدے سے سر اٹھائیں تو دس مرتبہ کہیں۔ پس یہ ہر رکعت میں پچھتر مرتبہ ہوا اسی طرح چاروں رکعتوں میں کریں۔ اگر ہو سکے کہ ہر روز ایک مرتبہ یہ نماز پڑھیں تو ایسا کرلیں۔ پھر اگر ایسا نہ کر سکیں تو ہر جمعہ میں ایک مرتبہ۔ اگر ایسا نہ کر سکیں تو ہر سال میں ایک مرتبہ۔ پس اگر ایسا بھی نہ کر سکیں تو عمر بھر میں ایک مرتبہ پڑھ لیں۔ ابوداؤد، ابن ماجہ، بیہقی (دعوات میں) اور ترمذی نے اسے ابورافع سے روایت کیا ہے۔

شرح[۱]: الا افعل بک عشر خصال "کیا میں آپ کو دس خصلتوں کا مالک نہ بنادوں؟" یعنی ایسا کرنے سے دس قسم کے گناہ جو حدیث میں بیان ہوئے بخش دیئے جائیں گے۔ اور بعض نے کہا کہ اس سے مراد ہے قیام کے علاوہ ہر جگہ دس مرتبہ یہ تسبیح کہنا اس صورت میں دس قسم کے گناہوں کی بخشش کا بیان بطور جزاء ہوگا۔ مشکوٰۃ میں علانیتہ کے بعد عشر خصال کا لفظ نہیں آیا لیکن اصول میں موجود ہے چنانچہ حصن حصین میں بھی یہ لفظ موجود ہے۔ شارح طیبیؒ فرماتے ہیں کہ حدیث کے سیاق کے پیش نظر زیادہ مناسب یہ ہے کہ دس خصلتوں سے یہ مراد لیا جائے: اول چار رکعات پڑھنا، دوسرے فاتحہ پڑھنا، تیسرے سورت ملانا، چوتھے قیام میں پندرہ مرتبہ تسبیح کہنا، پانچویں دس بار رکوع میں تسبیح کہنا، چھٹے

---

[۱] مظاہر حق ج ۱ ص ۴۶۰، مرقات ج ۳ ص ۲۱۳ تا ۲۱۷

قومہ میں دس بار تسبیح کہنا، ساتویں دس بار پہلے سجدہ میں تسبیح پڑھنا، آٹھویں دس بار جلسہ میں تسبیح کہنا، نویں دس بار دوسرے سجدہ میں تسبیح کہنا، دسویں دس بار جلسہ استراحت میں تسبیح پڑھنا اور حضرت ابن عباسؓ سے صلاۃ التسبیح میں ان سورتوں کا پڑھنا منقول ہے التکاثر اور العصر، الکافرون اور الاخلاص۔ بعض روایات میں سورۂ زلزال اور العٰدیٰت، سورۂ نصر اور اخلاص بھی آئی ہیں۔ اور دوسری رکعتوں میں یہ تسبیحات التحیات سے قبل پڑھی جائیں اور دوسرے ارکان میں تسبیحات راتبہ کے بعد۔ اور علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے امام احمدؒ سے نقل کیا ہے کہ صلاۃ التسبیح میں سلام سے پہلے یہ دعا پڑھی جائے۔ اللّٰھم انی اسألك توفیق اھل الھدیٰ واعمال اھل الیقین و مناصحۃ اھل التوبۃ و عزم اھل الصبر وجد اھل الخشیۃِ وطلب اھل الرغبۃ وتعبد اھل الورع و عرفان اھل العلم حتّٰی اخافك۔ اللّٰھم انی اسألك مخافۃ تحجزنی عن معاصیك وحتّٰی اعمل بطاعتك عملا استحق به رضاك وحتّٰی اناصحك بالتوبۃ خوفا منك حتّٰی اخلص لك النصیحۃ حیاءً منك وحتی اتوکّل علیك فی الامورِ کلھا وحسن ظنٍ بك سبحان خالقِ النورِ۔

بہت سے ائمہ اور بزرگان دین سے صلاۃ التسبیح کا عمل اور فضائل کا بیان منقول ہے اور جمعہ کے دن زوال آفتاب کے بعد اس کا پڑھنا مستحب ہے۔ اگر صلاۃ التسبیح میں سہو ہو جائے تو سجدۂ سہو حسب معمول ادا کرے۔ ان میں تسبیحات نہ پڑھے ورنہ تین صد سے بڑھ جائے گی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

باب صلوٰۃ السفر

حالتِ سفر میں قصر کے مشروع ہونے پر سب ائمہ کا اتفاق ہے[۱]۔ لیکن اس قصر کی حیثیت میں اختلاف ہوا ہے حنفیہ اسے واجب کہتے ہیں اور مسافر کے لیے چار فرض ان کے ہاں دو پڑھنا ہی اس کا فرضِ وقت ہے۔ امام شافعیؒ کے ہاں قصر اولیٰ وافضل ہے واجب نہیں۔

۱؎ مظاہر حق ج ۱ صـ ۶۶۱ ۲؎ مرقات ج ۳ صـ ۲۱۹، مسوی مصفّیٰ ج ۱ صـ ۱۴۲، ۱۴۳، فیض الباری ج ۲ صـ ۳۹۷

سفر کا معنی[1] لغت میں قطع مسافت ہے لیکن ہر قطع مسافت سے شرعی احکام متغیر نہیں ہوتے مثلاً جواز افطار اور قصر صلاۃ۔ پس اس کی مقدار میں اختلاف ہوا ہے کہ سفر کی کتنی مقدار میں احکام بدلیں گے؟ امام ابوحنیفہ رح کے نزدیک یہ مقدار اوسط رفتار سے تین دن رات کا سفر ہے کیونکہ صحیح احادیث میں حضورؐ نے مسح خفین کی حالت سفر میں بھی مقدار (تین دن رات) متعین فرمائی ہے۔ امام مالک رح، شافعی رح اور احمد رح کے نزدیک دو مرحلوں کی مقدار ہے یعنی دو دن یا ایک دن اور ایک رات مع سازوسامان اور بوجھ وغیرہ۔ دوسرے الفاظ میں ۱۶ فرسنگ یا چار برید۔ امام اوزاعی ایک دن کی مسافت میں قصر کے قائل ہیں اور امام داؤد ظاہری ہر سفر میں چاہے طویل ہو یا قصیر (جسے عرفاً سفر کہا جائے) قصر کے قائل ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی[1] فرماتے ہیں کہ چار برید یا سولہ فرسنگ کی مقدار تقریباً حنفیہ کے قول کے مطابق ہے (وہ یوں کہ فرسنگ ۳ میل کا ہوتا ہے اس لحاظ سے ۴۸ میل کا سفر ہوا۔ اور چار برید کی مقدار بھی یہی ہے)۔

علامہ سید انور شاہ[2] فرماتے ہیں کہ قصر صلاۃ کی مسافت حنفیہ کے نزدیک تین دن رات کا سفر ہے پھر اس کا اندازہ ۱۶ فرسنگ سے کیا گیا ہے کہ ہر فرسخ تین میل کا ہے پس یہ کل ۴۸ میل ہوئے جیسا کہ حدیث میں آتا ہے۔ اور بعض احادیث میں جن کا حوالہ امام بخاری رح نے دیا ہے جو حضورؐ کا ایک دن رات کی مسافت کو سفر کا نام دینا وارد ہے، اس سے مراد یہ نہیں کہ حضورؐ نے اس مقدار پر قصر کیا تھا بلکہ یہ اطلاق اس لیے ہوا کہ یہ مسافت بھی جزئیاتِ سفر میں سے ہے۔

پھر مسائل سفر میں ایک اور فقہی اختلاف بھی ہے وہ یہ کہ مدتِ قصر کی حد بندی کیا ہے؟ یعنی اگر مسافر کسی مقام پر اقامت کا ارادہ کرلے تو کتنی مدت کے ارادے سے وہ مقیم شمار ہوگا اور کتنی مدت کے ارادے سے مسافر ہی رہے گا؟ حنفیہ نے اس کے لیے کم از کم پندرہ دن کی مقدار بتائی ہے لیکن اگر نیتِ اقامت کے بغیر کوئی شخص کہیں ٹھہرے تو وہ مسافر ہی ہوگا چاہے کتنی مدت ٹھہر جائے علیٰ ہذا القیاس اگر مدتِ اقامت غیر یقینی ہو یا ہنگامی حالات ہوں مثلاً جہاد وغیرہ تو بھی وہ مسافر ہی رہے گا اور اُسے نماز قصر کرنا ہوگی۔ مدتِ قصر کی تحدید میں کوئی حدیثِ مرفوع صحت

---

[1] مصفی و مسوی ج ۱ ص ۱۴۳۔ [2] فیض الباری ج ۲ ص ۳۹۷

کے مرتبہ تک نہیں پہنچی۔ عبد اللہ بن عباس کی حدیث فتح مکہ کی اقامت کے بارے میں ہے لیکن اسُی کی روایات میں مختلف مدتیں آئی ہیں مثلاً ۱۹ دن، ۱۸ دن، ۱۵ دن اور ۱۷ دن۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ امام بیہقیؒ نے ان روایات کو جمع کرنے اور تطبیق دینے کی کوشش کی ہے۔ لیکن فتح مکہ میں قیام بوجوہ یقینی نہ تھا نہ فتح مکہ سے قبل نہ اس کے بعد۔ اور حجۃ الوداع میں قیام یقینی تھا اور حضورؐ اور آپؐ کے صحابہؓ نے عزم وارادہ سے قیام فرمایا تھا لہٰذا عبد اللہ بن عباسؓ کی حدیث میں باوجود اقامتِ مکہ کے قصر کا بیان ہوا اور انسؓ کی حدیث حجۃ الوداع کے باب میں ہے جس میں دس دن کی اقامت کے باوجود قصر کا ذکر آیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

۱؎ مسافر اگر چار رکعات پڑھ لے (یعنی ظہر، عصر یا عشاء) لیکن دو رکعت پر اس نے قعدہ کر لیا ہو تو حنفیہ کہتے ہیں کہ اس کی پہلی دو رکعات فرض اور دوسری دو نفل ہو جائیں گی۔

۲؎ علامہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں کہ ابن المنذرؒ وغیرہ نے اس مسئلہ پر اجماع نقل کیا ہے کہ نمازِ صبح اور مغرب میں قصر نہیں ہے۔ امام نوویؒ کہتے ہیں جمہور کا یہ مسلک ہے کہ ہر مباح سفر میں قصر جائز ہے اور بعض سلف اس طرف گئے ہیں کہ قصر کے لیے سفر میں خوف کی شرط بھی ہے اور بعض نے اس کے ساتھ یہ شرط لگائی ہے کہ یہ سفر حج، عمرہ یا جہاد کا ہو تو قصر ہوگا ورنہ نہیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ سفر کے لیے سفرِ اطاعت کا ہونا شرط ہے۔ امام ابو حنیفہؒ اور سفیان ثوریؒ کے نزدیک ہر سفر میں جب مسافت قصر موجود ہو قصر ہونا چاہیئے چاہے سفرِ طاعت ہو یا سفرِ معصیت کیونکہ سفر تو وہ ہر حال ہے اور شرع نے سفرِ طاعت یا مباح کی شرط نہیں لگائی۔

۳؎ حضرت الامام شاہ ولی اللہ الدہلوی فرماتے ہیں کہ سفر میں قصر کے جواز پر امت متفق ہے لیکن مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں اختلاف کیا ہے: واذا ضربتم فی الارض فلیس علیکم جناح ان تقصروا من الصلوٰۃ ان خفتم الآیۃ۔ آیا یہ آیت سفر کے بارے میں اتری ہے اور خوف کی قید اتفاقی ہے یا کہ خوف کے بارے میں اتری ہے اور سفر کی قید اتفاقی ہے اور اس صورت میں قصر سے مراد رکوع سجود میں اشارے سے نماز پڑھنا ہے۔ پس پہلے معنی کی طرف بھی مفسرین کی کئی جماعتیں گئی ہیں اور عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا قول دوسرے معنی کی طرف اشارہ کرتا ہے

۱؎ فیض الباری ج ۲ ص ۳۹۶، مسوی ج ۱ ص ۱۴۱۔ ۲؎ فتح الباری ج ۲ ص ۵۷۴۔ ۳؎ مسوی ایضاً

اور اللہ تعالیٰ کا یہ قول واذا کنت فیھم آیۃ القصر پر مبنی ہے۔ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ آیت سفر کے بارے میں ہے کیونکہ اس میں دوبارہ خوف کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ پھر اکثر علماء کا مذہب یہ ہے کہ قصر واجب ہے اور امام شافعیؒ کے نزدیک قصر جائز ہے، اور خدا تعالیٰ کا انعام ہے اگر چاہے تو قصر کرلے چاہے تو اتمام کرلے۔

حضرت شاہؒ ولی اللہ کی مذکورہ بالا بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ جن علماء کے نزدیک یہ آیت سفر کے بارے میں ہے ان کے نزدیک صلاۃ الخوف کا ثبوت سنت سے ہوگا اور جن کے نزدیک یہ آیت صلاۃ الخوف کے بارے میں اتری ہے ان کے نزدیک قصر سفر کا حکم سنت سے ثابت ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب

الفصل الاوّل

حدیث ۱: وعن انسؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلی الظھر بالمدینۃ اربعا وصلی العصر بذی الحلیفۃ رکعتین۔ متفق علیہ

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی نماز مدینہ منورہ میں چار رکعات پڑھی اور عصر کی نماز ذوالحلیفہ کے مقام پر دو رکعات پڑھی۔ بخاری ومسلم

تشریح: علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ذوالحلیفہ حضورؐ کے اس سفر میں منتہائے سفر نہ تھا بلکہ آپؐ مکہ کے قصد سے مدینہ سے نکلے تھے تو نماز عصر کا وقت اس مقام پر آگیا اور یہ اس سفر میں حضورؐ کی پہلی نماز تھی جسے قصر فرمایا۔[۱] ذوالحلیفہ مدینہ منورہ سے تین میل پر واقع ہے اور یہ اہل مدینہ کی مشہور میقات ہے۔ یعنی یہاں سے وہ دخول حرم کے لیے احرام باندھتے ہیں۔

حضورؐ کا یہ سفر حج یا عمرہ کے لیے تھا۔ یہاں سے یہ مسئلہ نکلا کہ مسافر شرعی جب اپنے شہر یا آبادی کے مکانات سے باہر نکل جائے تو قصر کا حکم شروع ہو جاتا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور شافعیؒ کا مسلک یہی ہے۔ امام احمدؒ کا بھی یہی قول ہے اور امام مالکؒ سے بھی ایک روایت یہی ہے اور دوسری روایت یہ ہے کہ اپنے مقام سے تین میل باہر جو نماز پڑھے گا وہ قصر ہوگی۔[۲]

---

[۱] فتح الباری ج ۲ ص ۵۷۹ ۔ [۲] مظاہر حق ج ا ص ۴۶۱ ، مرقات ج ۳ ص ۲۱۹ ۔

حافظ ابن حجرؒ نے اس حدیث سے ظاہریہ کا یہ استدلال کہ معمولی سے سفر میں قصر جائز ہے اسی دلیل سے رد کیا ہے کہ حضورؐ کا سفر طویل تھا صرف پہلی نماز ذوالحلیفہ میں قصر پڑھی تھی۔

حدیث ۲: وعن حارثة بن وهب الخزاعی قال صلی بنا رسول الله صلی الله علیه وسلم ونحن اکثر ما کنا قط و آمنه بمنی رکعتین متفق علیه

ترجمہ: حضرت حارثہ بن وہب خزاعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں منیٰ کے مقام پر دوگانہ نماز پڑھائی حالانکہ ہم بہت بڑی تعداد میں تھے اور نہایت پُرامن تھے۔ بخاری و مسلم

شرح: [1] حدیث کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کی آیت میں جو خوف کا ذکر ہے یہ محض ایک اتفاقی قید ہے ہر سفر شرعی میں قصر ہونا چاہیے خوف ہو یا نہ ہو صحابیؓ نے اس حدیث میں حجۃ الوداع کا ذکر فرمایا ہے جس میں صحابہؓ کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی اور خوف بھی کوئی نہ تھا مگر حضورؐ نے پھر بھی قصر نماز پڑھائی۔

[2] علامہ علی القاریؒ فرماتے ہیں کہ سفر میں قصر کے جواز پر علمائے امت کا اتفاق ہے لیکن اس امر میں اختلاف ہے کہ یہ رخصت ہے یا عزیمت۔ ابوحنیفہؒ دوسری طرف گئے ہیں اور دیگر علماء کے ہاں رخصت ہے۔ امام داؤد ظاہریؒ کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ ان کے نزدیک قصر صرف واجب سفر میں ہے اور ان سے یہ بھی روایت ہے کہ قصر خوف سے مخصوص ہے (یعنی ایک تو سفر حج یا جہاد کا ہو اور دوسرے خوف بھی ہو تب قصر ہوگا ورنہ نہیں) اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک سفر معصیت میں رخصتیں نہیں ہوا کرتیں لیکن امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک سفر طاعت ہو یا سفر معصیت قصر ضرور ہوگا۔ سفر کا معصیت یا طاعت کے لیے ہونا ایک وصف زائد ہے جو اصل حکم میں تبدیلی نہیں کرتا۔ اور آیت میں جو خوف کفار کا ذکر ہے یہ اس لیے ہے کہ اس کے نزول کے وقت یہ خوف موجود تھا لہٰذا اس کا مفہوم مخالف معتبر نہیں ہوگا۔

حدیث ۳: وعن یعلی بن اُمیة قال قلت لعمرؓ بن الخطاب انه قال الله تعالیٰ ان تقصروا من الصلوٰة ان خفتم ان یفتنکم الذین کفروا فقد امن الناس قال عمرؓ عجبتُ منه فسألت رسول الله صلی الله علیه وسلم فقال صدقة تصدق الله

---

[1] مظاہر حق ایضاً، مرقات ج ۳ ص ۲۲۰ [2] مرقات ج ۳ ص ۲۲۰

بہا علیکم فاقبلوا صدقتہ ۔ رواہ مسلم

ترجمہ : حضرت یعلی بن امیہ صحابی فرماتے ہیں کہ میں نے جناب عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : ان تقصروا من الصلوٰۃ الخ کہ تم نماز قصر کرو اگر تم کو اس بات کا خوف ہو کہ کافر تمہیں فتنہ میں ڈال دیں گے" اور اب تو لوگوں کو امن نصیب ہو چکا ہے (لہٰذا قصر نہیں ہونا چاہیئے) تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ مجھے بھی اس آیت سے حیرانی ہوئی تھی اور میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تھا تو آپؐ نے ارشاد فرمایا تھا کہ یہ صدقہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے تم پر کیا ہے پس تم اللہ کے صدقے کو قبول کرو ۔ مسلم

شرح : حضرت یعلی بن امیہ کے سوال کا منشاء یہ تھا کہ آیت میں خوف کی قید لگی ہوئی ہے اور اب جبکہ امن قائم ہو چکا ہے تو قصر نہیں ہونا چاہیئے ۔ جناب عمرؓ نے حضورؐ کا جو ارشاد نقل کیا اس سے معلوم ہوا کہ آیت میں خوف کی شرط محض اتفاقی ہے کیونکہ سفر میں بالعموم خوف ہوتا ہی ہے بالخصوص اُس زمانے میں جبکہ کفار مسلمانوں کے ہر وقت درپئے آزار تھے ۔ چونکہ خوف بالفعل موجود تھا اس لیے یہ قید لگائی گئی ورنہ قصر کے لیے خوف کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہے ۔ اور حضورؐ کے اس ارشاد سے کہ فاقبلوا صدقتہ ابو حنیفہؒ کے مسلک کی تائید نکلتی ہے کیونکہ امر اصل میں وجوب کے لیے ہے جب تک اس کے خلاف پر دلیل قائم نہ ہو جائے ۔

علامہ ابن حجر عسقلانیؒ نے صدقہ کے لفظ سے استدلال کرتے ہوئے فرمایا ہے ۔ کہ قصر رخصت ہے ورنہ اسے صدقہ نہ کہا جاتا ۔ علامہ علی القاریؒ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ صدقہ اس حدیث میں رخصت کے لیے نہیں جیسا کہ آیت قرآنیہ انما الصدقات للفقراء الخ میں بھی عام معنوں میں آیا ہے یعنی زکوٰۃ و دیگر صدقات واجبہ و نافلہ ۔ امام بغویؒ نے فرمایا ہے کہ اکثر علماء کا مذہب یہی ہے کہ قصر صلوٰۃ واجب ہے رخصت نہیں ۔

حدیث ۴ : وعن انسؓ قال خرجنا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من المدینۃ الی مکۃ فکان یصلی رکعتین رکعتین حتی رجعنا الی المدینۃ قیل لہٗ اقمتم بمکۃ

لہ مظاہر حق ج ۱ ص ۶۶۲ ۔ ۲ہ مرقات ج ۳ ص ۲۲۱

شیئًا قال أقمنا بها عشرًا۔ متفق علیہ

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ سے مکہ کو نکلے۔ پس آپ دو دو رکعت ہی پڑھتے رہے حتی کہ ہم واپس مدینہ پہنچ گئے۔ انس رضی سے سوال کیا گیا کہ آپ لوگ مکہ میں کچھ دیر ٹھہرے تھے؟ انہوں نے فرمایا کہ ہم وہاں دس دن ٹھہرے رہے۔ بخاری و مسلم

شرح: [۱] یہ حضور کے آخری حج کا واقعہ ہے۔ حضور اس میں ۴ ذی الحجہ کو مکہ پہنچے اور ۱۴ کو واپس مدینہ روانہ ہو گئے۔ اور اس مدت میں قصر ہی پڑھا کئے۔ معلوم ہوا کہ دس دن کی اقامت سے مسافر مقیم نہیں ہوتا۔ امام شافعی رح کے نزدیک چار دن کی اقامت کی نیت سے مسافر مقیم ہو جاتا ہے اور اسے پوری نماز پڑھنی چاہیئے۔

[۲] امام ابو حنیفہ رح کے نزدیک مسافر جب تک کم از کم پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت نہ کر لے دوگانہ ہی پڑھے گا۔ اگر اقامت غیر یقینی یا متردد ہو تب بھی دوگانہ ہی پڑھے گا۔ ہدایہ میں ہے کہ ابن عباس رض اور ابن عمر رض سے یہی ماثور ہے جیسا کہ امام ابن الہمام رح نے طحاوی میں ان دونوں کا بیان نقل فرمایا ہے۔ اور اس جیسے شرعی معاملات میں اثر بھی خبر (حدیث) کی مانند ہے کیونکہ شرعی تقدیرات میں رائے کو دخل نہیں ہے۔ مصنف عبدالرزاق میں عبداللہ بن عمر رض سے منقول ہے کہ وہ دوسرے صحابہ رض سمیت آذربائجان کے علاقہ میں برف باری کی وجہ سے چھ ماہ رک گئے تھے چونکہ قیام غیر یقینی تھا لہٰذا سب لوگ دوگانہ پڑھتے رہے۔ عبدالرزاق نے حسن سے روایت کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ عبدالرحمٰن بن سمرہ کے ساتھ فارس کے بعض علاقوں میں کئی سال رہے اس عرصہ میں وہ نہ جمعہ پڑھتے تھے نہ نماز پوری پڑھتے تھے کیونکہ قیام غیر یقینی تھا۔ عبدالرزاق نے حضرت انس بن مالک سے روایت کیا ہے کہ وہ عبدالملک بن مروان کے ساتھ شام میں دو ماہ رہے لیکن (بوجہ قیام متردد) قصر کرتے رہے۔

حدیث ۵: وعن ابن عباس قال سافر النبی صلی اللہ علیہ وسلم سفرًا فاقام تسعة عشر یومًا یصلی رکعتین قال ابن عباس فنحن نصلی فیما بیننا وبین مکة تسعة عشر رکعتین رکعتین فاذا اقمنا اکثر من ذلک صلینا اربعًا۔ رواہ البخاری۔

---

[۱] زجاجہ ج ا ص ۱۶۲ / [۲] مرقات ج ۳ ص ۲۲۱

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سفر فرمایا پس آپؐ انیس دن مقیم رہے اور دو دو رکعت نماز پڑھتے رہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اگر ہم مکہ اور مدینہ کے درمیان کسی منزل میں انیس دن قیام کریں تو دوگانہ پڑھتے ہیں اور اگر اس سے زیادہ ٹھہریں تو چار رکعت پڑھتے ہیں۔ بخاری۔

شرح: اس حدیث میں بیان ہونے والا سفر فتح مکہ کا تھا۔ علامہ[1] ابن حجرؒ عسقلانی فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن عباسؓ کی حدیث میں جس سفر کا ذکر ہے یہ فتح مکہ کا زمانہ تھا اور اس میں حضورؐ نے اقامت کی نیت نہیں فرمائی تھی بلکہ متردد تھے کہ جب مقصد پورا ہو جائے گا تو کوچ کریں گے۔ ایسی حالت میں جو قیام ہو وہ سفر ہی میں شمار ہوتا ہے اسے حالت اقامت نہیں کہتے۔ اور[2] اس حدیث کی مختلف روایات میں مدتِ اقامت مختلف آئی ہے۔ بعض لوگوں نے آنے اور رخصت کے دن کو حذف کیا، بعض نے ایک کو حذف کیا اور بعض نے دونوں کو شامل کر لیا، بہرحال اس سے کوئی استدلال نہیں ہو سکتا۔ اور ابن عباسؓ نے اس واقعہ سے استدلال کر کے مدتِ اقامت انیس دن ٹھہرائی لیکن اور کسی کا یہ مسلک نہیں ہے کیونکہ یہ واقعہ ہنگامی حالات کا تھا جیسا کہ اوپر گزرا۔ واللہ اعلم بالصواب

حدیث ۱۰: وعن حفص بن عاصم قال صحبت ابن عمرؓ فی طریق مکۃ فصلی لنا الظھر رکعتین ثم جاء رحلہ وجلس فرأی ناسا قیاما فقال ما یصنع ھؤلاء قلت یسبحون قال لو کنت مسبحا اتممت صلوٰتی صحبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فکان لا یزید فی السفر علی رکعتین وابا بکر وعمرؓ وعثمانؓ کذالک۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حفص بن عاصمؒ فرماتے ہیں کہ مکہ کے راستے میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ تھا۔ پس آپ نے ظہر کی نماز ہمیں دو رکعت پڑھائی۔ پھر اپنے ڈیرے پر واپس تشریف لائے اور بیٹھ گئے۔ پس آپ نے کچھ لوگوں کو کھڑے دیکھا تو پوچھا کہ یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟ میں نے کہا کہ نفل پڑھ رہے ہیں۔ عبداللہؓ نے فرمایا کہ اگر مجھے نفل پڑھنا ہوتے تو اپنی فرض پوری کر لیتا! میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] فتح الباری ج ۲ ص ۵۷۵، [2] مرقات ج ۳ ص ۲۲۲، مظاہر حق ج ۱ ص ۴۶۲۔

کے ساتھ رہا ہوں پس آپ سفر میں دو رکعتوں پر کچھ زائد نہیں کرتے تھے اور میں نے ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ کے ساتھ رہ کر بھی یہی دیکھا ہے۔ بخاری و مسلم

شرح: یہ واقعہ[1] حالتِ سفر کا ہے ایسی حالت میں سنن رواتب نہیں پڑھے جاتے لیکن جب منزل پر ٹھہرا ہوا ہو تو ان سنتوں کا ثبوت ترمذی کی روایت میں موجود ہے اور حنفیہ کا مسلک یہی ہے کہ حالتِ سفر میں سنن و نوافل نہیں ہیں اور منزل پر اگر پڑھ لیں تو افضل ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے سفر میں فرائض میں تخفیف سے استدلال کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر نفل ہی پڑھنے ہیں تو پھر فرض ہی کیوں نہ پورے پڑھ لئے جائیں، اور بعض صحیح احادیث میں سفر میں حضورؐ کا سواری پر ہی نفل پڑھنا ثابت ہے ایسی احادیث کو اس پر محمول کرنا تو مشکل ہے کہ یہ سفر مقدارِ قصر سے کم ہوتے تھے کیونکہ اس پر کوئی دلیل قائم نہیں ہے۔ ہاں یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ عام نوافل تھے اور بطور بیانِ جواز یا استحباب حضورؐ نے پڑھے تھے۔ بہر حال اگر کوئی شخص سفر میں بھی سنن و نوافل پڑھ لیتا ہے تو وہ کسی دلیل سے ناجائز نہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ارشاد کا مطلب پھر یہ ہوگا کہ لوگوں کو ان نوافل کی اصل حیثیت بتا دی جائے کہ جب فرائض میں تخفیف ہے تو نوافل کے ترک کے جواز پر تو کسی دلیل کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے ترک کے جواز پر اجماع ہے ہاں بعض واجبات اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔

علامہ قسطلانی[2] نے اس حدیث کو دوسری روایات سے جمع کرنے کا ایک اور طریقہ نکالا ہے کہ حضورؐ سفر میں نوافل زمین پر ادا نہ فرماتے تھے بلکہ سواری پر ہی پڑھ لیتے تھے اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے علاوہ اور لوگوں نے حضورؐ کو نمازِ تہجد سفر میں ادا فرماتے دیکھا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۷: وعن ابن عباسؓ قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یجمع بین صلوٰۃ الظہر والعصر اذا کان علی ظہر سیرہ ویجمع بین المغرب والعشاء۔ رواہ البخاری

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر میں ہوتے تو نمازِ ظہر اور عصر کے درمیان جمع فرماتے اور مغرب و عشاء کے درمیان جمع فرماتے تھے۔ بخاری۔

---

[1] مرقات ج ۳ ص ۲۲۲، ۲۲۴، فیض الباری ج ۲ ص ۳۹۹۔

[2] قسطلانی ج ۲ ص ۳۴۰۔

شرح: ۱؎ جمع بین الصلوٰتین کی دو قسمیں ہیں :۔ الف۔ جمع حقیقی : کہ ایک نماز کے وقت میں دوسری کو بھی پڑھا جائے مثلاً ظہر کے وقت میں عصر بھی ادا کر لی جائے یا عصر کے وقت میں ظہر کو پھر عصر کو پڑھا جائے۔ علی ہذا القیاس مغرب کے وقت میں عشاء بھی پڑھ لی جائے یا عشاء کے وقت میں مغرب و عشاء دونوں پڑھ لی جائیں ۔ ب۔ جمع صوری : یعنی پہلی نماز کو مؤخر کر کے آخر وقت میں پڑھا جائے اور دوسری کو اوّل وقت میں پڑھا جائے مثلاً ظہر یا مغرب کو ان کے آخر وقت میں ادا کریں اور پھر عصر یا عشاء کو ان کے اوّل وقت میں پڑھ لیں شافعیہ پہلی قسم کی جمع کے قائل ہیں اور ان کا استدلال اس حدیث کے ظاہری الفاظ سے ہے لیکن حنفیہ دوسری قسم کی جمع کو مانتے ہیں اور اس حدیث کو بھی اسی پر محمول جانتے ہیں۔ مؤطا مع شرح ج ۱ ص ۱۴۵ میں حضرت معاذ بن جبل کی حدیث اسی پر دلالت کرتی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں فأخر الصلوٰۃ یومًا ثم خرج فصلی الظھر والعصر جمیعًا ۲؎ حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ حاجیوں کا جمع بین الصلوٰتین متفق علیہ ہے اور وہ محلِ بحث سے خارج ہے۔

۳؎ علامہ سید انور شاہ الکشمیری فرماتے ہیں کہ حنفیہ جمع بین الصلوٰتین کو جمع صوری یا جمع فعلی کہتے ہیں یعنی جمع تاخیر و تقدیم۔ اور میرے نزدیک جمع بین الصلوٰتین اشتراک وقت پر محمول ہے کیونکہ ظہر کا مثلِ اوّل تو وقت خالص ظہر کے لیے ہے اور مثلِ ثالث کا وقت عصر کے لیے خاص ہے اور مثلِ ثانی مشترک ہے جس میں دونوں نمازوں کی صلاحیت موجود ہے لیکن دونوں کے اندر فصل شرعًا مطلوب ہے اور وہ سفر یا مرض سے اٹھ جاتا ہے۔ مرض کی مثال حضرت حمنہؓ کی حدیث ہے جو معذور تھیں اور حضورؐ نے انہیں ایک غسل سے دو نمازوں کے جمع صوری کا حکم دیا تھا۔ امام بخاریؒ کے ترجمۃ الباب باب یؤخر الظھر الی العصر اذا ارتحل الخ سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ بھی غالبًا جمع صوری کے قائل تھے۔ حضرت معاذؓ کی حدیث جو ترمذی میں ہے وہ بھی صراحۃً جمع صوری کو ہی ثابت کرتی ہے۔ اس سے جمع تقدیم کو ثابت کرنا یعنی ظہر کے وقت میں عصر کو جمع کرنے کا ثبوت نکالنا محض فرطِ وہم ہے۔ اور حافظ ابن حجرؒ نے بیہقی سے جو نقل کیا ہے کہ حضورؐ حالتِ سفر میں جب کسی منزل میں ٹھہرتے تو ظہر و عصر کو جمع فرماتے تھے اور پھر کوچ کرتے تھے اور جب کوئی منزل نہ ملتی تو سفر جاری رکھتے یہاں تک کہ منزل پر اتر کر ظہر و عصر کو جمع فرمایا کرتے تھے۔ اس حدیث کے الفاظ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ جمع تاخیر و تقدیم یا جمع صوری و فعلی تھا ورنہ انتظار

۱؎ مظاہر حق ج ۱ ص ۴۶۳، مرقات ج ۳ ص ۲۲۲، ۲۲۴، مسوی ج ۱ ص ۱۴۵۔ ۲؎ مسوی ج ۱ ص ۱۴۸۔ ۳؎ فیض الباری ج ۲ ص ۱۰۱، ۱۰۴

کی ضرورت نہ تھی جب چاہتے دو نمازوں کو جمع فرما لیا کرتے۔ واللہ اعلم

حدیث ۸: وعن ابن عمرؓ قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یصلی فی السفر علی راحلتہ حیث توجھت بہ یومی ایماء صلاۃ اللیل الا الفرائض ویوتر علی راحلتہ۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں صلاۃ اللیل اپنی سواری پر اشارے سے پڑھتے تھے چاہے سواری کا رخ کسی طرف بھی ہو۔ لیکن فرائض کو سواری پر ادا نہ فرماتے تھے اور وتر بھی سواری پر پڑھتے تھے۔ بخاری ومسلم

شرح: سفر میں جس طرف بھی آپ کی سواری کا رخ ہوتا اسی طرف نماز پڑھتے تھے۔ لیکن جیسا کہ حضرت انسؓ کی حدیث میں آیا ہے کہ تکبیر تحریمہ کے وقت منہ قبلہ کی طرف ہوتا تھا اور رکوع وسجود اشارے سے بجالاتے لیکن سجدے کا اشارہ رکوع کی نسبت پست ہوتا تھا۔ اس حدیث سے دو حکم ثابت ہوئے، ایک تو یہ کہ نفل سواری پر جائز ہیں فرض نہیں۔ اگرچہ اس حدیث میں صلاۃ اللیل کا ذکر ہے لیکن دوسری احادیث میں عام نوافل کا بھی یہی حکم آیا ہے جو سنن مؤکدہ اور دوسرے نوافل کو شامل ہے اور فرض کے لیے بھی بعض استثنائی صورتیں موجود ہیں جو حالتِ عذر پر مبنی ہیں مثلاً جان و مال کی ہلاکت کا خوف ہو، چور یا درندہ کا خوف، راستہ بھول جانے یا قافلہ سے بچھڑ جانے کا خوف ہو، جانور کا سرکش ہونا کہ سوار ہونے کے بعد اترنا یا اترنے کے بعد سوار ہونا مشکل ہو، سوار کا ضعیف یا بوڑھا ہونا درانحالیکہ کوئی اتارنے چڑھانے والا بھی نہ ہو، یا بارش اور کیچڑ وغیرہ کا عذر ہو کہیں نماز کی جگہ ہی نہ ملے۔ ان صورتوں میں فرض بھی سواری پر جائز ہیں کیونکہ یہ صورتیں عذر کی ہیں اور عام قواعدِ شرع سے مستثنیٰ ہیں۔ اور امام طحاویؒ نے فرمایا ہے کہ وتر کو سواری پر پڑھنے کا زمانہ غالباً وہ ہے جبکہ ان کی اتنی تاکید نہ کی گئی تھی پھر جب تاکید کی گئی تو وہ نوافل کی حد سے خارج ہو گئے۔ چنانچہ خود ابن عمرؓ سے عام نوافل سواری پر اور وتر نیچے اتر کر زمین پر پڑھنا ثابت ہے اور انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ حضورؐ ایسا ہی کرتے تھے۔ امام محمدؒ نے موطا میں صحابہؓ و تابعینؒ کے بہت سے آثار نقل کئے ہیں کہ وہ وتر سواری سے نیچے اتر کر پڑھتے تھے۔ شمنی نے کہا ہے کہ نمازِ جنازہ، نذر مانی ہوئی نماز اور وہ سجدۂ تلاوت جو زمین پر واجب ہوا ہو سواری پر پڑھنا

لہ مظاہر حق ج ۱ ص ۴۶۳، مرقات ج ۳ ص ۲۲۳۔

جائز نہیں ہے۔

دوسرا حکم اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ نماز کا سواری پر ادا کرنا شرطِ سفر کے ساتھ مشروط ہے چنانچہ جمہور ائمہ کا یہی مذہب ہے اور امام ابو حنیفہؒ اور ابو یوسفؒ سے بھی ایک روایت یہی ہے۔ حنفیہ کے ہاں صحیح تر روایت یہ ہے کہ اس سفر سے مراد یہ ہے کہ مصلی شہر سے باہر ہو چاہے مسافر شرعی ہو یا نہ ہو۔ اور شہر کے اندر مسافر شرعی کو بھی سواری پر نماز پڑھنا جائز نہیں ہے لیکن امام محمدؒ اسے بھی جائز رکھتے ہیں۔ اور شہر سے باہر ہونے سے مراد یہ ہے کہ شہر کی آخری آبادیوں سے نکل چکا ہو جیسا کہ قصر نماز میں بھی یہی حکم ہے۔

سواری پر نفل پڑھنے کی صورت میں تکبیر تحریمہ کے وقت قبلہ رخ ہونا امام شافعیؒ کے نزدیک شرط ہے اور حنفیہ کے ہاں مستحب ہے اور ابو داؤد ص ۱۷۳ کی حدیث اس استقبال پر صریحًا دلالت کرتی ہے۔[۱]

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک فجر کی سنت کی تاکید و تشدید کے پیش نظر اس کا حکم بھی عام نوافل سے جداگانہ ہے۔ پس اسے بھی سواری پر ادا نہیں کیا جائے گا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

بابُ الجُمُعۃ

جُمُعہ[۳] کا لفظ فصیح لغت کے مطابق ج اور م کے ضمہ کے ساتھ ہے اور کبھی کبھی م کو ساکن کر دیتے ہیں۔ اس کا معنی ہے الیوم المجموع۔ کیونکہ فُعْلَہ کا وزن مفعول کے لیے ہے جیسے ھُزْأَۃٌ یعنی وہ شخص جسے ٹھٹھے اور مزاح کا نشانہ بنایا جائے۔ اور فُعَلَہ کا وزن فاعل کے لیے ہے پس اگر جُمَعَہ م کی فتح سے پڑھا جائے تو اس کا معنی ہوگا الیوم الجامع۔ اور ۃ اس میں مبالغہ کے لیے ہے جیسے ضُحَکَۃٌ "وہ ہنسوڑ آدمی"۔ اس دن کا نام جمعہ اس لیے رکھا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں آدمؑ کی پیدائش مکمل (جمع) فرمائی تھی۔ یا اس لیے کہ زمین پر وہ حضرت حوّاؑ سے اس دن ملاقی ہوئے تھے۔ اور یہ نام اس لیے بھی مناسب ہوا کہ اس میں خیر و برکت کو جمع کر دیا گیا ہے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں جمعہ کا نام عروبہ تھا۔

نمازِ جمعہ[۴] باجماعِ امت چند شرطوں کی وجہ سے تمام دوسری نمازوں سے ممتاز ہے۔

---

[۱] فیض الباری ج ۲ ص ۲۹۸۔ [۲] مظاہرِ حق ج ۱ ص ۴۶۳، [۳] مرقات ج ۳ ص ۲۲۹، مظاہر حق ج ۱ ص ۴۶۸۔ [۴] فیض الباری ج ۲ ص ۳۲۳۔

اور امت میں سے کسی نے بھی اسے عام نمازوں کی مانند قرار نہیں دیا۔ یہ شرائط خود کتاب و سنت سے ماخوذ ہیں اور جمعہ کا نام بھی اجتماع کو چاہتا ہے پس اس کی حیثیت دوسری نمازوں جیسی نہیں۔ امام ابو حنیفہؒ نے جمعہ کے لیے مصر کو شرط قرار دیا ہے اور دیگر ائمہ نے عدد کی شرط لگائی ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک چالیس مردوں کی شرط ہے۔ امام احمدؒ کے نزدیک پچاس آدمی ضروری ہیں اور یہی روایت امام شافعیؒ سے بھی آئی ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک تیس اور ایک روایت میں بیس کی شرط ہے۔ پس اگر کسی بستی میں (قریہ نہ کہ مصر) بیس سے بھی کم آدمی ہوں تو ائمہ میں سے کسی کے نزدیک بھی وہاں جمعہ فرض نہیں ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس لیے کہ مصر کی شرط مفقود ہے اور باقی حضرات کے نزدیک عدد کے فقدان کے باعث۔ اور جن لوگوں نے جمعہ کو مطلقاً واجب کہا ہے انہوں نے اجماعِ امت کے خلاف کیا ہے کیونکہ اس سے اجتماعیت باطل ہو جاتی ہے۔ امام خطابیؒ نے امام شافعیؒ سے نقل کیا ہے کہ نمازِ جمعہ فرض علی الکفایہ ہے۔ لیکن دوسرے حضرات کا دعویٰ ہے کہ جمعہ فرضِ عین ہے۔ میں کہتا ہوں کہ امام شافعیؒ سے فرض کفایہ والی روایت بھی ثابت ہے اور فرض عین والی بھی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر تم جمعہ کی شرائط کو دیکھتے ہوئے اس پر حکم لگاؤ تو فرض عین ہے اور اگر اس سے قطع نظر کر کے اس پر حکم لگاؤ تو کہہ سکتے ہو کہ عملاً یہ فرضِ کفایہ ہی ہے کیونکہ بعض پر تو فرض ہے اور بعض (مثلاً مسافر، مریض، قیدی، عورت وغیرہم) پر فرض نہیں ہے کیونکہ ان کے حق میں شرائطِ فرضیت مفقود ہیں۔ اور یہ مسئلہ بھی بعینہٖ جماعت کی مانند ہے کہ اگر تم اس کے تارک پر جو وعیدیں وارد ہوئی ہیں انہیں دیکھو گے تو اس کی فرضیت کا حکم کرو گے اور اگر ان معذوروں کو پیش نظر رکھو گے جن کی وجہ سے کچھ لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں تو اس کے سنت ہونے کا حکم لگاؤ گے۔ امام ابن الہمامؒ فرماتے ہیں کہ جمعہ بہت ہی مؤکد فریضہ ہے۔ پھر یہ بھی یاد رکھو کہ جمعہ مکہ میں فرض ہو چکا تھا لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی اقامت نہ فرما سکے یہاں تک کہ مدینہ میں تشریف لائے اور چودہ دن قبا میں ٹھہرے وہاں بھی آپ نے جمعہ قائم نہیں فرمایا اور پہلا جمعہ جو حضورؐ نے قائم فرمایا تو مدینہ میں داخل ہو کر بنی سالم کے محلہ میں پڑھا تھا۔ حافظ ابن حجرؒ نے نقل کیا ہے کہ جمعہ مکہ میں فرض ہوا تھا لیکن انہوں نے اس کی سند نقل نہیں کی اور میرے پاس وہ سند موجود ہے لیکن اس سے ایک راوی ساقط ہے۔

حافظ ابن حجرؒ[1] فرماتے ہیں کہ اکثر لوگوں کی رائے ہے جمعہ مدینہ میں فرض ہوا تھا کیونکہ اس کی فرضیت سورۂ جمعہ کی آیت اذا نودی للصلوٰۃ الخ سے ہوئی تھی اور وہ مدنی آیت ہے۔

---

[1] فتح الباری ج ۲ ص ۲۷۲

زین بن المنیرؒ نے اس آیت سے جمعہ کی فرضیت کی وجہ دلالت یہ بیان فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے اذان (نداء) مشروع فرمائی ہے اور یہ فرائض کے خواص میں سے ہے۔ اسی طرح کاروبار سے منع فرمانا بھی فرضیت کی دلیل ہے کیونکہ مباح سے صرف اس وقت روکا جاتا ہے جب اس سے ترک فرض لازم آئے۔ اور اسی طرح نماز توڑ کر چلے جانے پر جو توبیخ آئی ہے وہ بھی فرضیت کو چاہتی ہے۔ اسی طرح حدیث کے دلائل بھی اس کے فرض عین ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ علامہ ابن القیمؒ نے الہدیٰ میں جمعہ کے دن کی ۳۲ خصوصیات بیان فرمائی ہیں جن میں حذف و اضافہ کی گنجائش موجود ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

الفصل الاوّل

حدیث ۱: عن ابی هریرةؓ قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلّم نحن الآخرون السابقون یَوْمَ القیامة بَیْدَ انّهم اُوتوا الکتاب من قبلنا واُوتیناه مِن بَعْدِهم ثم هٰذا یومهم الذی فرض علیهم یعنی یوم الجمعة فاختلفوا فیه فهدانا الله له والناس لنا فیه تبعٌ الیهود غَدًا والنصاریٰ بعد غدٍ. متفق علیه. وفی روایة لمسلم قال نحن الآخرون الاولون یومَ القیامة ونحن اوّل من یدخل الجنّة بَیْدَ انّهم وذکر نحوه الی آخره - وفی اُخریٰ له عنه وعن حذیفةؓ قالا قال رسول الله صلی الله علیه وسلم فی آخر الحدیث نحن الآخرون من اهل الدنیا والاوّلون یوم القیامة المقضی لهم قبل الخلائق -

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہم دنیا میں سب سے پیچھے آنے والے ہیں قیامت میں سب پر شرف و منزلت میں سبقت لے جانے والے ہیں صرف اتنی بات ہے کہ انہیں ہم سے پہلے کتاب ملی اور ہمیں ان کے بعد دی گئی۔ پھر یہ ان کا وہ دن ہے جو ان پر فرض کیا گیا تھا یعنی جمعہ کا دن۔ پس انہوں نے اس میں اختلاف کیا اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کی طرف ہدایت دی۔ اور سب لوگ اس میں ہمارے تابع ہیں۔ یہود کا مقدس دن جمعہ کے بعد ہفتہ ہے اور نصاریٰ کا اتوار ہے۔ بخاری و مسلم۔ اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ ہم دنیا میں سب کے بعد آنے والے اور قیامت میں سب سے اوّل ہوں گے۔ اور ہم ہی جنت میں داخل ہونے والوں میں سے

اوّل ہوں گے۔ بات صرف اتنی ہے کہ..... پھر اوپر کی حدیث آخر تک بیان کی۔ اور مسلم کی ایک اور روایت میں جو ابوہریرہؓ اور حذیفہؓ سے منقول ہے اس میں ہے کہ ان دونوں نے کہا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث کے آخر میں ارشاد فرمایا: ہم دنیا والوں میں سے آخری ہیں اور قیامت کے دن سب سے اوّل ہیں۔ تمام مخلوقات سے پہلے ہمارا ہی فیصلہ کیا جائے گا۔

شرح: نحن الآخرون دنیا میں بھیجے جانے کے لحاظ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخری رسول ہیں، قرآن آخری منزل من اللہ کتاب ہے، اسلام آخری دین ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت آخری شریعت ہے اور آپؐ کی امت آخری امت ہے۔ یعنی چونکہ حضورؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا لہٰذا یہ امت آخری امت ہے۔ یہ تو معاملہ ہوا اس دنیا کا، جہاں تک دوسری دنیا کا تعلق ہے وہاں حضورؐ اور آپؐ کی امت درجہ و فضیلت اور شرف و منزلت میں سب سے اوّل نمبر پر ہیں۔ اور آپؐ کو[2] کتاب کا سب سے آخر میں دیا جانا بھی موجبِ فضیلت ہے کیونکہ آخری کتاب پہلی کتابوں کو منسوخ کرنے والی ہے اور اس کے بعد اس کے احکام کو منسوخ کرنے والی اور کوئی کتاب نہیں آسکتی۔

[3] فھٰذا یومھم الذی فُرِضَ علیھم اس کی شرح میں اختلاف ہے بعض شارحین کا بیان ہے کہ بعینہٖ روزِ جمعہ کا تقدس اور اسے عبادت کے لیے خاص کرنا ان پر فرض ہوا تھا لیکن انہوں نے اپنی قدیم عادت کے مطابق اس حکم میں اپنی رائے سے کمی بیشی کی پس یہود نے ہفتہ کو اور نصاریٰ نے اتوار کو اختیار کر لیا اور جمعہ سے یہ دونوں فریق منحرف ہو گئے۔ اور اکثر شارحین کا خیال ہے کہ فُرِضَ علیھم کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی رائے اور اجتہاد سے ایک دن عبادت کے لیے مخصوص کر لینے کا حکم دیا تھا۔ یہ دن علم الٰہی میں جمعہ تھا اور انہیں یہ اختیار دینا امتحان کے لیے تھا۔ یہود نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کائنات کی تخلیق سے ہفتہ کو فارغ ہوا لہٰذا ہمیں بھی اس دن فارغ رہنا اور صرف عبادت کرنا لازم ہے پس انہوں نے ہفتہ مقرر کر لیا۔ نصاریٰ نے کہا چونکہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کی تخلیق کا سلسلہ اتوار کو شروع فرمایا تھا لہٰذا یہی دن منبع فیض اور مبدأ کی مدت ہے لہٰذا اس دن میں عبادت و ریاضت کرنی چاہیے اور دوسرے سب کام چھوڑ دینا چاہیے۔ فھدانا اللہ لہ، اس میں بھی اوپر کی بیان کردہ دونوں وجہیں ہو سکتی ہیں لیکن ظاہر تو اوّل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جمعہ کو فضیلت بخشی ہے اور اس میں ایک خاص نماز کے

---

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۴۶۸، مرقات ج ۳ ص ۲۲۹، ۲۳۱ [2] ایضاً ، [3] ایضاً

لیے اہتمام کرنے اور کاروبار بند کرنے کا حکم دیا ہے یٰایھا الذین آمنوا اذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الی ذکر اللہ وذروا البیع سو اللہ تعالیٰ نے اس امت کو حکم خداوندی کے بجالانے کی توفیق بخشی اور امتِ محمدیہؐ نے یہود ونصاریٰ کی مانند حجت بازی اور سرکشی سے اس دن کو ضائع نہیں کر ڈالا۔ اور جمعہ کا دن پہلے انسان آدمؑ کی پیدائش کا سبب تھا اسی لیے اس دن میں عبادت و شکر واجب کیا گیا۔ اور یہود ہم سے ایک دن پیچھے اور نصاریٰ دو دن پیچھے جا پڑے اس حدیث پاک سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہفتہ کے دنوں میں سے پہلا دن جمعہ ہے لیکن عرفِ عام میں اس کے خلاف مشہور ہو گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے جمعہ کی فرضیت کے علاوہ بھی جمعہ کی فضیلت وشرف کی طرف محض فضل الٰہی سے اس امت کی راہ یابی کے دلائل موجود ہیں۔ حضرت ابن سیرینؒ تابعی فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ تشریف لانے سے پہلے ہی انصارِ مدینہ نے باہم مشورے سے جمعہ کا دن عبادت کے لیے مقرر کر رکھا تھا، حضرت سعد بن زرارہ انہیں دو رکعت نماز پڑھاتے اور وعظ فرماتے تھے، پہلے اس دن کا نام عروبہ تھا اس اجتماع کی وجہ سے اب اس کا نام جمعہ رکھا گیا۔ یہ روایت مرسل ہے اور حجت ہے اور ایک حسن بلکہ بقول ابن خزیمہ صحیح روایت اس کی شاہد موجود ہے کہ صحابہؓ فرماتے ہیں ہجرت سے قبل ہی سعدؓ بن زرارہ نے ہمیں مدینہ میں جمعہ پڑھایا تھا۔[1]

علامہ سید انور شاہ فرماتے ہیں کہ عبرانی زبان میں سبت تعطیل کو کہتے ہیں اور میرے نزدیک تورات سے یہ بات ثابت ہے کہ سبت جمعہ کا نام تھا اور میں نہیں جانتا کہ اس میں کب تحریف واقع ہو گئی۔ بیت المقدس اور بابل میں تورات کی جو شروح لکھی گئیں انہیں تمادی کہا جاتا ہے ان میں لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو جمعہ کے دن وعظ فرمایا کرتے تھے۔ اور انجیل میں ہے کہ یہودیوں نے ایک آدمی کو سولی پر لٹکایا اور اسے صلیب جلدی دینے کا اہتمام کیا تاکہ یوم سبت نہ آجائے۔ ان دلائل سے پتہ چلتا ہے کہ تورات میں سبت سے مراد جمعہ کا دن تھا۔ یہ بھی معلوم رہے کہ کائنات کی تکوین ہفتہ کو شروع ہوئی اور جمعرات کے دن ختم ہو گئی تھی اور اس کے بعد آنے والے جمعہ کو کچھ بھی پیدا نہیں کیا گیا تھا بلکہ اللہ تعالیٰ عرش پر متوجہ و مستوی ہوا کما یلیق بشانہ اور اس واقعہ کے بہت عرصہ بعد (جس کا علم اللہ ہی کو ہے) خداوند تعالیٰ نے آدمؑ کو جمعہ کے دن آخری گھڑی میں تخلیق فرمایا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کی آیات میں کائنات کی پیدائش کے بعد استوا علی العرش کا ذکر آتا ہے۔ کیونکہ آدمؑ کی پیدائش کائنات

---

[1] فتح الباری ج ۲ صفحہ ۲۷۴۔ [2] فیض الباری ج ۲ صفحہ ۳۲۴

کی پیدائش کے بعد متصلاً نہیں ہوئی تھی۔

المقضی لھم یوم القیامۃ حضرت سید انور شاہ[1] فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک محشر میں ایام اور جہات الٹ ہو جائیں گے پس دنیا کے ایام میں پہلا دن ہفتہ ہے اور آخری جمعہ ہے لیکن محشر میں پہلا دن جمعہ اور آخری دن ہفتہ ہو جائے گا اور اس طرح پچھلے پہلے بنا دیئے جائیں کیونکہ ہمارا حساب سب سے اول ہوگا۔

حافظ ابن حجر[2] عسقلانی فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے کئی مسائل نکلتے ہیں:۔

الف۔ فرضیت جمعہ کی دلیل جو فھدانا اللہ لہ سے نکلتی ہے
ب۔ ہدایت و ضلالت اللہ کی طرف سے ہے جیسا کہ اہل سنت کا مسلک ہے۔
ج۔ اس امت کا اجماع خطا سے محفوظ ہے اور یہ اس امت کی خصوصیت ہے۔
د۔ شرع کی اصل دلیل سے ایسا معنیٰ نکالنا جو اصل کو باطل کر دے باطل و مردود ہے۔
ھ۔ نص کی موجودگی میں قیاس فاسد ہے۔
و۔ نزول وحی کے زمانے میں بھی اجتہاد جائز تھا۔
ز۔ امت محمدیہ کی فضیلت کا واضح ثبوت۔
ح۔ شرعی طور پر ہفتہ کے دنوں میں سے پہلا دن جمعہ ہے محض عرف عام کی وجہ سے اس کے خلاف ہو گیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۲: وعن ابی ھریرۃؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیر یوم طلعت علیہ الشمس یوم الجمعۃ فیہ خلق آدمؑ وفیہ ادخل الجنۃ وفیہ اخرج منھا ولا تقوم الساعۃ الا فی یوم الجمعۃ۔ رواہ مسلم

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ بہترین دن جس پر سورج طلوع ہوا وہ جمعہ کا دن ہے اسی میں آدم علیہ السلام کو پیدا کیا گیا اور اسی میں انہیں جنت میں داخل کیا گیا اور اسی میں انہیں جنت سے نکالا گیا اور قیامت بھی جمعہ ہی کے دن قائم ہو گی۔ مسلم

شرح: قاضی عیاض[3] فرماتے ہیں کہ بظاہر یہ شمار کئے گئے فضائل جمعہ کے دن کی فضیلت کے بیان کے لیے نہیں ہیں کیونکہ آدمؑ کا جنت سے نکالا جانا اور قیامت

---

[1] فیض الباری ج ۲ ص ۳۲۶۔ [2] فتح الباری ج ۴ ص ۴۰۷۔ [3] السراج الوہاج ج ۱ ص ۲۵۱، مرقات ج ۲ ص ۲۳۲، مظاہر حق ج ۱ ص ۴۶۹۔

کا قائم ہونا فضیلت شمار نہیں کیا جا سکتا۔ پس ان واقعات کو محض اس لیے گنوایا گیا ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ جمعہ کے دن کتنے بڑے بڑے امور پیش آچکے ہیں یا آئندہ پیش آئیں گے۔ تاکہ بندہ اس دن میں اعمال صالحہ کے لیے تیاری کرے اور خدا کی رحمت کو پانے اور ناراضگی سے بچنے کی کوشش کرے۔ لیکن قاضی ابوبکر ابن العربی نے ترمذی کی شرح الاحوذی میں فرمایا ہے کہ یہ تمام فضائل ہی ہیں کیونکہ آدم کا جنت سے نکالا جانا ان کی نسل کی پیدائش کا سبب، بے شمار اولاد کے دنیا میں پھیلنے کا باعث اور رسولوں، نبیوں، نیکو کاروں اور اولیاء اللہ کے وجود میں آنے کا باعث ہے اور آدم کو جنت سے بطور سزا نہیں نکالا گیا تھا بلکہ چند مقاصد کو پورا کرنے کے لیے تھا اور وہ پھر اس میں واپس جانے والے تھے۔ رہا قیامت کا آنا سو وہ بھی انبیاء، صدیقین، اولیاء اور دوسرے نیکوکاروں کی جزا کا باعث اور ان کی بزرگی اور شرف کے اظہار کا سبب ہے۔ اور اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جمعہ باقی تمام ایام سے افضل ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ صحیح تر یہ ہے کہ سب سے افضل دن ذی الحجہ کی نویں تاریخ اور اس کے بعد جمعہ ہے۔ اور ذی الحجہ کی نویں کی فضیلت کے دلائل اپنی جگہ مذکور ہیں۔ دونوں قسم کی احادیث جمع کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سال بھر کے دنوں میں افضل ترین عرفہ کا دن ہے اور ہفتہ بھر کے دنوں میں سے جمعہ کا دن سب سے بہتر ہے۔

حضرت سعید بن المسیب نے فرمایا ہے کہ جمعہ اللہ تعالیٰ کو نفلی حج سے زیادہ محبوب ہے، الجامع الصغیر میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ایک مرفوع روایت ہے کہ جمعہ مساکین کا حج ہے اور ایک روایت میں ہے کہ فقراء کا حج ہے۔

حدیث ۳: وعنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان فی الجمعۃ لساعۃ لا یوافقہا عبد مسلم یسال اللہ فیہا خیرا الا اعطاہ ایاہ۔ متفق علیہ۔ وزاد مسلم قال وھی ساعۃ خفیفۃ وفی روایۃ لہما قال ان فی الجمعۃ لساعۃ لا یوافقہا مسلم قائم یصلی یسال اللہ خیرا الا اعطاہ ایاہ۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یقیناً جمعہ کے دن ضرور ایک گھڑی ایسی ہے جس میں کوئی مسلم بندہ جو اچھی چیز بھی اللہ تعالیٰ سے مانگے وہ اسے عطا کر دیتا ہے۔ بخاری و مسلم۔ اور مسلم نے یہ لفظ

لے مرقات ایضاً، مظاہر حق ایضاً۔

زیادہ کیا ہے کہ وہ گھڑی خفیف سی ہے۔ اور بخاری و مسلم کی ایک روایت میں یہ لفظ ہیں کہ بلاشبہ جمعہ کے دن میں ایک گھڑی ایسی ہے کہ جو مسلم بندہ اُسے کھڑا ہُوا نماز پڑھتا پائے اللہ سے بھلائی کا سوال کرے تو اللہ ضرور اُسے وہ بھلائی دے دیتا ہے۔

شرح: مسلم کی ایک روایت میں ساعۃ خفیفۃ کی بجائے یہ الفاظ آئے ہیں: وقال بیدہ یقللھا یزھدھا یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس گھڑی کی قلت وخفت کو ہاتھ کے اشارے سے بیان فرمایا تھا۔ شارحین حدیث فرماتے ہیں کہ اوپر کی حدیث میں یصلی کے لفظ کا معنی یدعو ہے جیسا کہ دوسری حدیث میں آچکا ہے اور قائم کا معنی ہے ملازم وھو اخلب یعنی وہ اس گھڑی میں برابر دعا میں مشغول رہے۔ جیسا کہ قرآن کی اس آیت میں قائما کا لفظ اسی معنی میں آیا ہے ما دمت علیہ قائما۔ اس گھڑی کے وقت میں بھی اختلاف ہُوا ہے بعض نے کہا ہے کہ یہ عصر کے بعد سے مغرب تک ہے۔ بعض کے نزدیک امام کے خطبہ کے لیے نکلنے سے لے کر نماز سے فارغ ہونے تک ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ نماز کی اقامت سے لے کر نماز سے فارغ ہونے تک ہے اور اس معنی کے لحاظ سے یصلی اور قائما کا لفظ اپنے ظاہر پر ہے یعنی اس سے مراد نماز ہی ہے محض دعا نہیں۔ اور بعض کے نزدیک امام کے منبر پر بیٹھنے سے لے کر نماز سے فارغ ہونے تک ہے اور کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ جمعہ کے دن کی آخری گھڑی مراد ہے۔ قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان تمام معانی کی تفسیر کرنے والے اقوال و آثار روایت کئے گئے ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ گھڑی زوال آفتاب کے وقت ہوتی ہے اور بعض کے نزدیک زوال سے لے کر سامنے کے ایک ہاتھ لمبا ہو جانے تک ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ یہ گھڑی بھی لیلۃ القدر کی مانند چھپا دی گئی ہے۔ اور بعض کا یہ بھی کہنا ہے کہ طلوع فجر سے لے کر طلوع آفتاب تک وہ گھڑی ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ ان تمام اقوال میں سے درست یہ ہے کہ وہ گھڑی امام کے منبر پر بیٹھنے سے لے کر فراغت نماز تک ہے۔ کیونکہ یہ ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث میں آچکا ہے (یہ حدیث ابھی آرہی ہے)

موطا امام مالک میں اس گھڑی کی تعیین میں حضرت ابوہریرہ اور عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہما کا مناظرہ منقول ہے جس کے آخر میں ان دونوں حضرات کا اس بات پر اتفاق لکھا ہے کہ وہ گھڑی جمعہ کے دن کی آخری گھڑی ہے اور یصلی سے مراد یدعو ثابت کیا گیا ہے۔ حضرت

---

[1] السراج الوہاج ج ۱ ص ۲۵۱۔ [2] مؤطا مع شرح ج ۱ ص ۱۶۳

شاہ ولی اللہؒ نے علامہ ابن حزمؒ کی المحلیٰ سے نقل کیا ہے کہ: جمعہ کے دن کثرت سے دعا کرنی چاہیئے اس امید میں کہ شاید اجابت کی گھڑی مل جائے۔ اس سے ان دونوں حضرات کا رجحان اس طرف ثابت ہوا کہ وہ گھڑی سارے دن میں مخفی ہے۔

علامہ علی القاریؒ بھی اس گھڑی کے پوشیدہ ہونے کے قائل معلوم ہوتے ہیں اور حکمت اخفاء یہی بیان فرماتے ہیں کہ لوگ اس دن عبادت اور دعا میں زیادہ جد وجہد کریں۔ الا اعطاہ ایاہ کا معنی یہ ہے کہ یا تو جو کچھ بندہ مانگے اسے اللہ تعالیٰ ادے دیتا ہے یا اس کی دعا کو ذخیرہ کے طور پر جمع فرما لیتا ہے تاکہ قیامت میں کام آئے۔ بہرحال دعا قبول ضرور ہوتی ہے۔ اور قبولیت کی یہ صورتیں حدیث سے ثابت ہیں

حدیث ۴: وعن ابی بردۃ بن ابی موسیٰؓ قال سمعت ابی یقول سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول فی شان ساعۃ الجمعۃ ھی ما بین ان یجلس الامام الی ان تقضی الصلوٰۃ رواہ مسلم

ترجمہ: حضرت ابو بردہ بن ابی موسیٰ اشعریؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے باپ کو یہ فرماتے سنا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جمعہ کی اس گھڑی کی شان میں فرماتے سنا کہ وہ امام کے منبر پر بیٹھنے سے لے کر نماز کے ختم کئے جانے تک ہے۔ مسلم

شرح ۱: امام نوویؒ اور جزریؒ نے اس حدیث کی بناء پر قبولیت دعا کی گھڑی امام کے منبر پر بیٹھنے سے لے کر نماز ختم ہونے تک اختیار کی ہے لیکن پھر مشکل یہ آ پڑی کہ یہ وقت تو خاموشی کا ہوتا ہے کیونکہ امام خطبہ میں ہوتا ہے اور اس وقت انصات کا حکم دیا گیا ہے تو اس وقت میں دعا کیسے ہوگی؟ اس کا جواب امام بلقینیؒ نے یہ دیا کہ دعا کی شرط یہ نہیں کہ زبان سے اس کا تلفظ بھی ہو صرف اس کا دل میں استحضار ہی کافی ہے۔ امام جزریؒ نے فرمایا ہے: مجھے یقین ہے کہ وہ گھڑی امام کے سورۂ فاتحہ کی تلاوت کی ابتداء سے آمین تک ہے۔ تاکہ صحیح احادیث جمع ہو جائیں۔ علامہ علی القاریؒ فرماتے ہیں کہ امام نوویؒ اور جزریؒ کا مختار بھی اس گھڑی کی تعیین میں مفید نہیں کیونکہ خطبے کے اوقات اور نماز کے اوقات اہلِ اسلام کی مسجدوں میں مختلف ہوتے ہیں۔ پس جو کچھ انہوں نے فرمایا ہے وہ بھی اجابت کے احوال میں سے ہے اوقات میں سے نہیں اور ابو موسیٰ کی اوپر والی حدیث کا مفاد بھی یہی ہے۔ اور بہترین قول یہی ہے کہ اسے لیلۃ القدر کی مانند

---

۱ مرقات ج ۳ ص ۲۳۳، مظاہر حق ج ۱ ص ۴۷۰ ۲ مرقات ج ۳ ص ۲۳۴، مظاہر حق ج ۱ ص ۴۷۰

پوشیدہ مانا جائے اور جو اوقات بعض روایات میں آئے ہیں ان کے متعلق کہا جائے کہ کبھی وہ گھڑی کسی وقت میں ہوتی ہے کبھی کسی وقت میں اور ہر جمعہ کو مختلف اوقات میں گھومتی رہتی ہے۔ اور اس گھڑی کے متعلق دلائل کی بناء پر تقریباً پچاس قول نقل کئے گئے ہیں جن میں سے پینتیس کا ذکر مولانا قطب الدین[ؒ] نے مظاہر حق میں بھی کیا ہے۔ امام شافعیؒ تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ شب جمعہ کو بھی دعا قبول ہونے کی روایات موجود ہیں۔

امام دار قطنیؒ نے ابو موسیٰؓ کی حدیث کے بارے میں کہا ہے کہ یہ مرفوع حدیث نہیں بلکہ راجح یہی ہے کہ یہ حضرت ابو بردہؒ کا قول ہے اور اس کے رفع کی وجہ سے انہوں نے امام مسلمؒ پر اعتراض کیا ہے لیکن امام مسلمؒ اس رفع پر مُصر ہیں۔ اگر یہ حدیث مرفوع ہے تو حضورؐ کے قول کے سامنے کسی قول کی ضرورت نہیں اور جمعہ کی مستجاب الدعاء گھڑی وہی ہے جو اس میں وارد ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

علامہ ابن حجر عسقلانیؒ نے اس گھڑی کی تعیین میں تینتالیس[۲] اقوال بیان کرنے کے بعد مسلم کی ابو موسیٰؓ والی حدیث کو منقطع اور مضطرب ثابت کیا ہے منقطع اس لیے کہ اس کے ایک راوی مخرمہ نے اپنے باپ سے سماع نہ کرنے کی خود تصریح کی ہے اور اس روایت میں وہ باپ ہی سے روایت کر رہے ہیں۔ مضطرب اس طرح کہ ابو بردہؒ کوفی ہیں اور ان کے کوفی شاگردوں نے ان سے اس روایت کو مرفوع نہیں کیا بلکہ ان کا قول قرار دیا ہے اور صرف بکیر المدنی نے اسے مرفوع کیا ہے لیکن کوفہ والے اپنے استاد کی حدیث کو زیادہ جانتے ہیں۔ اگر یہ حدیث مرفوع ہوتی تو ابو بردہؒ جمعہ کی ساعتِ مستجابہ کے بارے میں اپنی رائے سے فتویٰ نہ دیتے اور دار قطنی نے جزم و یقین سے اس روایت کو ابو بردہؒ پر موقوف قرار دیا ہے اور یہی درست ہے۔ پس اب اس حدیث کی حیثیت تقریباً عبد اللہ بن سلام کے اس قول جیسی ہوگئی کہ وہ گھڑی جمعہ کی آخری گھڑی ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے انہی دونوں وقتوں کو صحیح ترین مانا ہے اور امام احمدؒ سے بھی یہی نقل کیا ہے۔ واللہ اعلم

امام احمدؒ نے مسلم[۳] کی اس حدیث کو معلول قرار دیا ہے اور امام بخاریؒ نے بھی اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ سید انور شاہؒ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک وہ گھڑی بعد العصر ہے جیسا کہ عبد اللہ بن سلام سے مؤطا میں منقول ہے۔

علامہ[۴] قسطلانیؒ نے شرح بخاری میں اس گھڑی کی تعیین میں بالکل حافظ ابن حجرؒ کی موافقت کی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

۱؎ السراج الوہاج ج ۱ ص ۲۵۲ ۔ ۲؎ فتح الباری ج ۲ ص ۵۰۴ تا ۵۰۷ ، ۳؎ فیض الباری ج ۲ ص ۳۴۶ ، ۳۴۷۔ ۴؎ قسطلانی ج ۲ ص ۲۱۶

باب وجوبھا

لفظِ وجوب سے یہاں مراد فرضیت ہے، وہ وجوب مراد نہیں جو حنفیہ کی ایک خاص اصطلاح ہے اور اس سے مراد فرضیت و سنیت کے درمیان ایک خاص درجہ ہے۔ یعنی وہ احادیث جو جمعہ کی فرضیت پر دلالت کرتی ہیں۔ علامہ ابنؒ الہمام فرماتے ہیں کہ جمعہ کتاب سنت اور اجماع امت سے فرض محکم ثابت ہو چکا ہے اور ہمارے اصحاب حنفیہ نے اس کے ظہر سے مؤکد تر فریضہ ہونے کی صراحت کی ہے۔ آیت فاسعوا الی ذکر اللہ میں ذکر سے مراد نماز جمعہ اور خطبۂ جمعہ ہے۔ اور جمعہ کا فرض عین ہونا علماء کے درمیان متفق علیہ ہے۔ اگر کسی نے اسے فرض علی الکفایہ کہا ہے تو علماء نے اس کی تغلیط کی ہے۔ سید انور شاہؒ کی گزشتہ باب میں بیان کردہ توفیق کو دوبارہ پڑھ لیجئے کہ انہوں نے فرض علی الکفایہ کہنے والوں کا مطلب کیا بیان کیا ہے۔ یعنی اس سے مراد یہ ہے کہ مسافر، معذور اور عورت پر جمعہ فرض نہیں ہے لیکن جن پر فرض ہے ان پر فرضِ عین ہی ہے یہ نہیں کہ بعض کے ادا کر لینے سے سب سبکدوش ہو سکیں۔ واللہ اعلم بالصواب

الفصل الاوّل

حدیث ۱: عن ابن عمر وابی ھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنھما قالا سمعنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم یقول علی اعواد منبرہ لینتھین اقوام عن ودعھم الجمعات او لیختمن اللہ علی قلوبھم ثم لیکونن من الغافلین۔ رواہ مسلم

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے منبر کی سیڑھیوں پر یہ فرماتے سنا کہ لوگ جمعہ ترک کرنے سے باز رہیں ورنہ اللہ تعالیٰ ضرور ان کے دلوں پر مہر لگا دے گا پھر وہ بالضرور غافلوں میں سے ہو جائیں گے۔ مسلم۔

شرح[1]: دلوں پر مہر کرنا غفلت پیدا کرنے سے کنایہ ہے۔ یعنی ایسے لوگوں کے دلوں کو سخت غافل کر دیا جائے گا اور پھر وہ نصیحت کو قبول کرنے سے باز رہیں گے۔ شارح طیبی[2] فرماتے ہیں کہ ترکِ جمعہ کی عادت بنا لینے سے دلوں پر زنگ چڑھ جاتا ہے اور یہ چیز نفوس انسانیہ کو خدا کی اطاعت سے ہٹاتی ہے اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایسے لوگ آہستہ آہستہ بالکل غافل ہو جاتے ہیں۔

خَتَمَ[3] کا معنی ہے ٹھپہ لگانا، ڈھانپ دینا اور اسی طرح رَین کا لفظ بھی ہے اس سے مراد لطف اور اسباب خیر کو معدوم کر دینا ہے یا ان کے دلوں میں کفر کو پیدا کر دینا ہے یا ان کے خلاف شہادت دینا اور یا ان کے دلوں میں کوئی ایسی علامت مقرر کر دینا ہے جس سے انہیں دوسرے لوگوں سے ممتاز کیا جا سکے۔ علامہ شوکانی رح السیل الجرار میں فرماتے ہیں کہ وہ تصریح کرنے والے دلائل جو ثابت کرتے ہیں کہ جمعہ حق ہے اور ہر مکلف پر فرض ہے اور ہر بالغ پر فرض ہے۔ اور وہ سخت وعید جو اس کے ترک پر وارد ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس میں شامل نہ ہونے والوں کو جلا ڈالنے کا ارادہ فرمانا یہ سب چیزیں تقاضا کرتی ہیں کہ جمعہ فرض عین ہے اور قرآن پاک کی آیت یٰاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ کے بعد کونسی دلیل کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ اس آیت کا حکم ہر فرد مومن کو شامل ہے اور ابوداؤد کی حدیث صحیح نے اس حکم میں سے کچھ لوگ مستثنیٰ کیے ہیں۔ حضورؐ کا ارشاد ہے: الجمعۃ حق واجبٌ علی کُلّ مسلم الا اربعۃ عبد مملوکٌ أو امرأۃ أو صبیٌّ أو مریض۔ جمعہ ہر مسلم پر ثابت شدہ فریضہ ہے سوائے چار شخصوں کے یعنی مملوک غلام، عورت، بچہ اور بیمار۔ لیکن ان لوگوں کو جمعہ نہ پڑھنے کی رخصت دی گئی ہے۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اگر یہ لوگ جمعہ پڑھیں تو ادا نہ ہوگا کیونکہ رخصت کی تعریف یہ ہے کہ فرضیت یا تحریم کے سبب کی موجودگی کے باوجود مکلف کو اس کے کرنے نہ کرنے کا اختیار دے دیا گیا ہو۔

حضرت[4] شاہ ولی اللہ الدہلوی فرماتے ہیں کہ نمازِ جمعہ ایک ایسا لفظ ہے جو شریعت سے قبل کسی اور معنی کے لیے موضوع نہ تھا صرف صاحبِ شرع اور ان کے اصحاب رض و اتباع کے استعمالات سے یہ لفظ اور اس کا یہ مخصوص معنی سمجھا گیا ہے کہ وہ ایک مخصوص نماز ہے جو خاص کیفیت کے ساتھ مخصوص ہے اور اس کے بغیر چارہ نہیں کہ ان خصوصیات کا ملاحظہ کیا جائے جو جمعہ کے افراد میں پائی جاتی ہیں۔ اور اس کی صفاتِ نفسیہ کو جانا جائے۔

---

۱ مظاہر حق ج ۱ ص ۴۷۶ ۲ مرقات ج ۳ ص ۲۴۵ ۳ السراج الوہاج ج ۱ ص ۳۶۶

۴ مسوّی و مصفّی ج ۱ ص ۱۵۳

پس نمازِ جمعہ دو رکعت ہے جو ظہر کے وقت میں مسلمانوں کی عظیم جماعت کے ساتھ کسی بڑی آبادی یا شہر میں ادا کیا جاتا ہے اور شہر میں کسی جگہ بھی ادا ہو سکتا ہے۔ اور حاکم شہر یا اس کا نائب امام ہوتا ہے اور اس سے قبل خطبہ پڑھا جاتا ہے اور دو رکعت اس کی نفسی صفت ہیں بلاشبہ۔ اور ظہر کا وقت جمعہ کی شرط ہے کیونکہ بارہا ایسا ہوتا تھا کہ نماز جمعہ فوت ہو جاتی تو اسے صورتِ ظہر میں قضا کرتے تھے نہ کہ صورتِ جمعہ میں اور اس مسئلہ پر ساری امت یا جمہور کا اتفاق نظر آتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

باب التنظیف والتبکیر

[۱] یعنی کپڑوں اور بدن کو میل کچیل سے پاک صاف کرنا اور کمالِ پاکیزگی یہ ہے کہ تیل اور خوشبو کا استعمال کیا جائے۔ پس جمعہ کے لیے خط بنوانا، جسم کے تمام فالتو بال زائل کرنا، ناخن اتروانا اور دھلے ہوئے یا نئے کپڑے پہننا اور خوشبو لگانا سنت ہے۔ یہ تو ہوا تنظیف کا معنی۔ اور تبکیر سے مراد ہے سویرے جانا یعنی اول وقت میں مسجد میں حاضر ہو جانا اور اگر دن کے پہلے پہر ہی چلا جائے تو افضل ہے بشرطیکہ مسجد میں جا کر ذکر و دعا وغیرہ میں مشغول رہے سوئے نہیں نہ کسی کو ایذا دے اور نہ خواہ مخواہ زیادہ جگہ روکنے کی کوشش کرے۔ اور حدیث میں جو مَنْ بَكَّرَ وَابْتَكَرَ کا لفظ آیا ہے یا تو دونوں الفاظ کا معنی ایک ہے اور تکرار مبالغے کے لیے ہے اور یا ابتکر کا معنی ہے کہ اس نے خطبہ کا بالکل ابتدائی حصہ پایا۔ اور بکّر کا معنی ہے کہ جلدی اور سویرے پہنچ گیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

الفصل الاوّل

حدیث ۱: وعن سلمانؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
لا يغتسل رجلٌ يومَ الجمعة ويتطهّر ما استطاع
من طهرٍ ويدّهن من دهنه أو يمسّ من طيب بيته
ثمّ يخرج فلا يفرّق بين اثنين ثمّ يصلّي ما كتب
له ثمّ ينصت اذا تكلّم الامام الّا غفر له ما بينه و
بين الجمعة الأخرى. رواه البخاري۔

ترجمہ: حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص جمعہ کے دن غسل کرے اور جس قدر ہو سکے خوب پاک صاف

---

[۱] مظاہر حق ج ۱ ص ۴۷۴، مرقات ج ۳ ص ۲۴۸۔

ہو جائے اور جو تیل میسر ہو اس کا استعمال کرے یا اپنے گھر سے خوشبو لگائے پھر گھر سے نکلے تو دو شخصوں کے درمیان تفریق نہ کرے (یعنی ان میں گھس کر نہ بیٹھ جائے کہ اس سے انہیں اذیت ہو) پھر جو اس کے مقدر میں ہو نماز پڑھے۔ پھر جب امام بولے تو خاموش رہے۔ ایسے شخص کے گناہ ایک جمعہ سے دوسرے تک بخش دیئے جاتے ہیں۔ بخاری۔

شرح: [1] یتطہر اس سے مراد ہے جسم کے پوشیدہ بال زائل کرنا، خط کرانا، ناخن اتروانا اور کپڑوں کو پاک صاف کرنا۔ لایفرق بین اثنین جب دو شخصوں کے درمیان جگہ نہ ہو تو ان میں گھس کر بیٹھنا ان کی اذیت کا باعث ہوگا۔ اسی طرح کسی شخص کو اس کی جگہ سے اٹھا کر بیٹھنا بھی تفریق ہی میں آتا ہے۔ اگر جگہ موجود ہو تو بیٹھنے میں حرج نہیں۔ اسی طرح اگر اگلی صفوں میں جگہ خالی ہو تو وہاں پہنچ جانا، یا لوگ اگر بخوشی جگہ دے دیں تو لے لینا اس میں نہیں آتا۔ مقصد صرف یہ ہے کہ نظم وضبط اور اتحاد و اتفاق قائم رہے اور بدتہذیبی کا مظاہرہ نہ ہو۔

خوشبو کے استعمال کو اہمیت دی گئی ہے تاکہ مجمعوں میں ایک دوسرے سے نفرت وحقارت کے جذبات پیدا ہونے پائیں اور ظاہری و باطنی فضا درست رہے حدیث کے الفاظ چاہتے ہیں کہ اس مقصد کے لیے ہر شخص کے پاس کچھ نہ کچھ خوشبو ضرور ہونی چاہیئے اور اگر کسی کو نہ مل سکے تو عام پاکیزگی وطہارت کے ساتھ تیل کے استعمال سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے تاکہ بال سنورے ہوئے ہوں اور وضع قطع شریفانہ ہو۔ اور خوشبو کا استعمال ہمیشہ مستحب ہے لیکن بالخصوص جمعہ اور عیدین وغیرہا میں اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

[2] یصلی ما کتب لہ، سے مراد جمعہ کی چار سنت اور دوسرے نوافل یا قضا نماز بھی ہو سکتی ہے۔ اور ثم ینصت الخ سے خطبہ کو غور سے سننے اور خاموش رہنے کی تاکید معلوم ہوئی۔ امام ابن الہمام فرماتے ہیں کہ خطبہ میں کلام حرام ہے چاہے کسی کو نیکی کا حکم یا تسبیح ہی کیوں نہ ہو اور کھانا پینا اور لکھنا بھی ناجائز ہے۔ چھینک مارنے والے کے لیے یرحمک اللہ کہنا اور سلام کا جواب دینا بھی مکروہ ہے۔ خود چھینک مار کر دل میں الحمد للہ کہہ لیا جائے۔ اشارے سے کسی کو کوئی اچھی بات بتانا بوقت ضرورت

---

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۷۸۴، مرقات ج ۳ ص ۲۴۹، [2] مرقات ج ۳ ص ۲۵۰

مکروہ نہیں ہے۔ الجمعۃ الاخرٰی[1] سے گزشتہ یا آئندہ جمعہ مراد ہے لیکن گزشتہ مراد لینا اَولیٰ ہے لیکن بخشش اسی کے لیے مناسب ہے اور بعض احادیث سے بھی یہی ثابت ہے جو کہ ابن خزیمہ اور ابوداؤد نے روایت کی ہیں۔ اور ان پر علامہ ابن حجرؒ نے شرح بخاری میں بحث فرمائی ہے۔

غفر لہٗ سے مراد گناہ صغیرہ ہیں جیسا کہ کتاب الصلوٰۃ کی ابتدائی احادیث میں مفصلاً گزر چکا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ[2] نے فرمایا کہ مغفرتِ ذنوب مشروط ہے غسل، پاکیزگی و طہارت، خوشبو لگانے، اچھے کپڑے پہننے، سکون و وقار سے چل کر آنے، لوگوں کی گردنوں کے اوپر سے نہ گزرنے، کسی کو اٹھا کر یا دو شخصوں کے درمیان گھس کر نہ بیٹھنے، کسی کو اذیت نہ دینے، نفل پڑھنے، خاموش رہنے اور لغو کو ترک کرنے کی شرطوں کے ساتھ۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۲: وعن ابی ھریرۃ رضؓ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم قال من اغتسل ثم أتی الجمعۃ فصلّی ماقُدِّرَ لہٗ ثُمَّ انصت حتّٰی یفرغ من خطبتہٖ ثم یُصلّی معہ غفر لہ ما بینہ وبین الجمعۃ الاخری وفضل ثلاثۃ ایام۔ رواہ مسلم

ترجمہ: حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی کہ حضورؐ نے فرمایا: جس شخص نے غسل کیا پھر جمعہ کے لیے آیا تو جو نماز اس کے لیے مقدر تھی پڑھی۔ پھر خاموش رہا۔ حتیٰ کہ امام اپنے خطبہ سے فارغ ہو جائے۔ پھر اس کے ساتھ نماز پڑھے تو اس کے گناہ اب سے لے کر دوسرے جمعہ تک بخش دیئے جائیں گے اور تین دن کا اور بھی فاضل ثواب ملے گا۔ مسلم

شرح: امام خطابیؒ[3] فرماتے ہیں کہ جمعہ سے لے کر جمعہ تک سات دن ہوئے اور تین دن اور زیادہ ہو گئے تو دس کا عدد پورا ہو گیا تاکہ نیکی کا اجر دس گنا ہو جائے۔ علامہ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث پہلی حدیث کے منافی نہیں ہے بلکہ حضورؐ کو پہلے سات دن کی مغفرت کی خبر دی گئی پھر خدا تعالیٰ نے اپنے فضل سے تین دن اور بڑھا دیئے۔ کوئی شخص نہ

---

۱ فتح الباری ج ۴ ص ۴۸۲، ۲ فتح الباری ایضاً ۳ مرقات ج ۳ ص ۲۵ ا مظاہر حق ج ا ص ۴۷۸۔

کہے کہ اخبار میں تو نسخ جائز نہیں پھر یہ کیسے ہوگیا؟ کیونکہ یہ اخبار میں سے نہیں بلکہ انفصال الٰہی میں سے ہے نیز اسے نسخ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۳: وعنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من توضّأ فاحسن الوضوء ثم أتى الجمعۃ فاستمع وأنصت غفر لہ ما بینہ وبین الجمعۃ و زیادۃ ثلاثۃ ایام ومن مسّ الحصٰی فقد لغا۔ رواہ مسلم

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے خوب اچھی طرح وضو کیا پھر جمعہ میں آیا تو غور سے سنا اور خاموش رہا تو اس وقت سے لے کر جمعہ تک کے اس کے گناہ بخش دیئے گئے اور تین دن کی مزید بخشش بھی ملے گی۔ اور جس شخص نے کنکریوں کو چھوا تو اس نے ایک لغو کام کیا۔ مسلم۔

شرح:[1] فاستمع وانصت یعنی اگر وہ خطیب کے قریب تھا تو خطبہ کو غور سے سُنا اور اگر بعید تھا تو سنائی نہ دینے کے باوجود خاموش رہا۔ جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے واذا قرئ القراٰن فاستمعوا لہٗ وانصتوا الاٰیۃ۔ ومن مس الحصٰی یعنی خطبہ کے وقت بجائے غور سے سننے اور خاموش رہنے کے لہو ولعب میں مشغول رہا۔ مثلاً کنکریوں سے کھیلتا رہا اور اِدھر اُدھر یونہی ہاتھ چلاتا رہا۔ خطبہ کے وقت تسبیح گردانی بھی اسی ضمن میں آتی ہے اور اس قسم کی تسبیح کا رواج حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نہ تھا۔ کنکریاں چھونے سے مراد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سجدہ کرنے کے لیے کنکریوں کو درست کرتا رہا لیکن ایک آدھ مرتبہ کی اجازت ضرورت کے وقت خود حدیث صحیح سے ثابت ہے پس اس سے مراد یہ ہوگا کہ بلا ضرورت کنکریوں کو الٹ پلٹ کرتا رہا۔ یا ضرورت کے وقت ایک مرتبہ سے زیادہ ان پر ہاتھ پھیرتا رہا۔

فقد لغا اس نے لغو اور بیہودہ کام کیا اور ان لوگوں کے مشابہ ہوگیا جن کی مذمت قرآن میں ان الفاظ میں وارد ہوئی ہے: وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِھٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِیْہِ لَعَلَّکُمْ تَغْلِبُوْنَ۔

---

[1] مرقات ج ۳ ص ۲۵۱، مظاہر حق ج ۱ ص ۴۷۹

حدیث ۴ : وعنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا کان یوم الجمعة وقفت الملائکة علی باب المسجد یکتبون الاول فالاول و مثل المهجر کمثل الذی یهدی بدنة ثم کالذی یهدی بقرة ثم کبشا ثم دجاجة ثم بیضة فاذا خرج الامام طووا صحفهم ویستمعون الذکر۔ متفق علیه

ترجمہ : اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے انہوں نے کہا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب جمعہ کا دن ہوتا ہے تو فرشتے مسجد کے دروازے پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور پہلے پہل اور پھر اس کے بعد آنے والوں کو لکھتے جاتے ہیں اور دقت میں جانے والے کی مثال اُس شخص جیسی ہے جو قربانی کے لیے اونٹ بھیجتا ہے۔ پھر اُس شخص کی مانند جو گائے بھیجتا ہے پھر مینڈھا بھیجنے والے کی مانند۔ پھر مرغی بھیجنے والے کی مانند پھر انڈا بھیجنے والے کی طرح۔ پھر جب امام نکلتا ہے تو وہ اپنے دفتر لپیٹ لیتے ہیں اور خطبہ کو غور سے سنتے ہیں۔ مسلم

شرح : وقفت الملائکة[1] یعنی صبح سے یا طلوعِ آفتاب سے کھڑے رہتے ہیں اور زیادہ بہتر یہ ہے کہ کہا جائے کہ وہ زوال کے وقت سے آ کھڑے ہوتے ہیں۔ اور یہ فرشتے محافظین اور کراماً کاتبین کے علاوہ ہیں جو صرف جمعہ کی تشریف اور استماعِ ذکر کے لیے حاضر ہوتے ہیں۔ اور حدیث کا لفظ المهجر اسی پر دلالت کرتا ہے کہ مراد وقتِ زوال ہے کیونکہ تھجیر کا معنی ہے السیر فی الهاجرة "دوپہر کا چلنا"۔

یُهدی بدنة : بدنہ کا معنی ہے اونٹ۔ اور اس حدیث میں اشارہ ہے اس ارشادِ نبوی کی طرف جس میں یوں آیا ہے۔ الجمعة حج المساکین اور ایک روایت میں مرغی کے بعد چڑیا کا ذکر بھی ہے اور اس کے بعد انڈے کا ذکر ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و فضل کی طرف اشارہ ہے کہ حج تو اغنیاء پر فرض ہے لیکن جمعہ میں آنے والے زیادہ تر فقراء ہوتے ہیں تو انہیں اسی سے حج کی فضیلت مل جاتی ہے

واذا خرج الامام یعنی امام خطبہ کے لیے حجرہ سے برآمد ہو یا منبر کی طرف آتا ہوا نظر آئے چاہے وہ پہلے سے ہی مسجد میں موجود ہو۔ حدیث کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ خطیب

---

[1] مرقات ج ۳ ص ۲۵۱، مظاہر حق ج ۱ ص ۴۷۹۔

کے لیے مناسب یہی ہے کہ خطبہ کے لیے آنے سے قبل ایک الگ جگہ - مثلاً مسجد سے ملحقہ حجرہ وغیرہ - میں ہو اور عین خطبہ کے وقت برآمد ہو کیونکہ اس میں بھی اسلامی شان و شوکت کا اظہار اور خطیب کے مقام کا اظہار ہوتا ہے۔

اس حدیث میں جمعہ کے لیے جلدی حاضر ہونے کی فضیلت کو ظاہر کرنے کے لیے بطور تمثیل محاوراتی کلام میں مرغی اور انڈا وغیرہ کا ذکر آیا ہے۔ اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ ان چیزوں کی قربانی بھی عید الاضحٰی میں جائز ہے۔ کیونکہ قربانی کے جانوروں کی تفصیل خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مسائل کے مناسب مقام میں ارشاد فرما دی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۵ : وعنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا قلت لصاحبك یوم الجمعة انصت والامام یخطب فقد لغوت - متفق علیه

ترجمہ : حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تو نے جمعہ کے دن اپنے ساتھی سے کہا "خاموش رہ" درانحالیکہ امام خطبہ دے رہا تھا تو تو نے لغو کام کیا۔ بخاری و مسلم

شرح : اس حدیث پاک سے معلوم ہوا کہ خطبہ کے وقت کلام کرنا، اگرچہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہی کے ضمن میں ہو، ممنوع ہے۔ ایسے موقع پر اشارہ کر دینا کافی ہے خطبہ کے وقت خاموش رہنا اکثر علماء کے نزدیک واجب ہے، اور امام ابوحنیفہؒ بھی انہی میں سے ہیں اور بعض کے نزدیک مستحب ہے اور امام شافعیؒ بھی انہی میں سے ہیں۔ امام شافعیؒ کے اس مسئلہ میں دو قول ہیں، ایک کے مطابق واجب اور دوسرے کے مطابق انصات مستحب ہے۔ حنفیہ کے نزدیک امام کے منبر پر آنے سے لے کر نماز شروع ہونے تک نماز اور کلام ہر دو حرام ہیں اگر کوئی شخص اس وقت نماز میں ہو تو امام کے خطبہ شروع کرنے پر دو رکعت پر نماز چھوڑ دے۔ امام ابویوسفؒ اور محمدؒ (صاحبین) فرماتے ہیں کہ امام برآمد ہو چکا ہو لیکن ابھی خطبہ شروع نہ کیا ہو۔ اور جب وہ منبر سے اترے تو تکبیر تحریمہ تک۔ ان دو وقتوں میں کلام میں مضائقہ نہیں کیونکہ اس وقت کلام کے ممنوع ہونے کا باعث دراصل خطبہ ہے اور ان دو مقامات میں خطبہ کا سوال نہیں پیدا ہوتا لیکن امام ابوحنیفہؒ نے حدیث اذا خرج الامام فلا صلوٰۃ ولا کلام سے استدلال کیا ہے اور اس مسئلہ پر بہت سے صحابہؓ کے

۱؎ مظاہر حق ایضاً، مرقات ج ۳ ص ۲۵۲، ۲۵۳

اقوال بھی شاہد ہیں اور قولِ صحابی ہمارے لیے حجّت ہے۔ اور جو شخص امام سے دُور ہو اور آواز کو نہ سُن رہا ہو کیا اُسے بھی انصات واجب ہے یا نہیں؟ قولِ مختار یہی ہے کہ اُسے بھی چپ رہنا واجب ہے۔ اور خطبہ کے وقت کھانا پینا اور لکھنا سب حرام ہے اور چھینک کا جواب دینا اور سلام کا جواب دینا مکروہ ہے۔ درِ مختار میں لکھا ہے: کُلّ ما حرم فی الصلاۃ حُرم فی الخطبۃ۔ اور حضورؐ پر صلوٰۃ و سلام دل میں بھیجے۔ چھینک مارے تو الحمد للہ دل میں کہے۔ خلافِ شرع کام سے روکنا ہو تو ہاتھ یا آنکھ کے اشارے سے روکے۔ اور بظاہر یہ حدیث باب کے عنوان سے مناسبت نہیں رکھتی لیکن صاحبِ مشکوٰۃ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ جس شخص نے لغو کام یا حرکت کی اس کا سویرے جانے کا ثواب بھی غارت ہوا۔ پس دونوں کام ضروری ہیں: سویرے حاضر ہونا اور لغو کام سے پرہیز کرنا۔

خطبے کو غور سے سننا قوم پر واجب ہے اور امام ضرورت کے وقت امر بالمعروف و نہی عن المنکر کر سکتا ہے امام کے سوا اگر کوئی کسی کو روکنا چاہے تو اشارے سے روکے۔ اس مسئلہ میں ابو حنیفہؒ، احمدؒ اور مالکؒ کا اتفاق ہے اور امام شافعیؒ کا قولِ قدیم بھی یہی ہے۔ قولِ جدید میں اس کے نزدیک استماعِ خطبہ مستحب ہے۔[1]

حدیث ۶: وعن جابرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یُقیمنّ احدکم اخاہ یوم الجمعۃ ثمّ یخالف فی مقعدہٖ فیقعد فیہ ولکن یقول افسحوا۔ رواہ مسلم

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص جمعہ کے دن ہرگز اپنے بھائی کو اس کی جگہ سے نہ اٹھائے تا کہ پھر اُس کی جگہ کا ارادہ کرے اور وہاں جا بیٹھے بلکہ اُسے لوگوں سے کہنا چاہیے کہ جگہ کشادہ کر دو۔ مسلم

شرح:[2] کسی شخص کو اٹھا کر اس کی جگہ پر بیٹھنا ویسے تو ہر مجلس میں ناجائز ہے لیکن جمعہ کے دن علی الخصوص حرام ہے کیونکہ وہ عبادت اور اجتماع کا دن ہے اور خانۂ خدا پر ہر ایک کا حق برابر ہے جو پہلے آگیا اس کی جگہ سے اُسے کوئی بھی اٹھا نہیں سکتا۔ مسجد میں نہ کسی کی جگہ مقرر کی جاسکتی ہے اور نہ کسی آدمی کو اپنے آنے سے پہلے بھیج کر کوئی جگہ مخصوص کی جاسکتی ہے۔ مسجدیں عیدگاہیں اور کعبۃ اللہ ان پر سب کا حق مساوی ہے۔ اگر کوئی شخص از خود رضامندی سے

---

[1] فیض الباری ج ۲ ص ۳۳۸، ۳۳۷، [2] مظاہر حق ج ۱ ص ۴۸۰، مرقات ج ۳ ص ۲۵۴

کسی کو جگہ خالی کر دے تو وہاں بیٹھنا جائز ہے بشرطیکہ دلی رضامندی ہو از راہِ خوف وحیا نہ ہو اور یہ صریحاً ظلم و گناہ ہے کہ کسی حاکم یا بڑے آدمی کے لیے عوام کو اٹھا دیا جائے اور نہ بردستی جگہ خالی کرائی جائے۔ اور یہ جو ارشاد فرمایا کہ وہ یوں کہے افسحوا اس کا مطلب یہ ہے کہ جب جگہ میں فراخی کی گنجائش موجود ہو ورنہ کسی کو تنگ کرنا جائز نہیں ہے اور چاہے مسجد کے دروازے پر یا جوتوں میں جگہ پائے وہیں نماز ادا کرے۔

اس حدیث سے اسلام کی دینی اور معاشرتی مساوات کا روشن ثبوت ملتا ہے۔ اور اس حدیث سے جمعہ کے لیے جلدی جانے کی ترغیب نکلتی ہے ترجمۃ الباب سے اسے یہی مناسبت ہے[۱]۔

بابُ الخطبۃ والصلوٰۃ

اس باب میں خطبہ اور نماز جمعہ کے احکام اور صفات و کمالات کا بیان کیا جائے گا۔ نیز ان کے اوقات بتائے جائیں گے۔ خطبہ کا لفظی معنی ہے خطاب کرنا۔ اور شرعی معنی ایسا کلام ہے جس میں شہادتین ذکر و وعظ، نصیحت و تلقین اور درود پڑھا جائے۔ خطبہ نماز جمعہ کی شرط ہے اور فرض ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک فرض کی ادنیٰ مقدار سبحان اللہ یا الحمد للہ یا لا الٰہ الا اللہ کہنا ہے اور طویل خطبہ واجب یا سنت ہے کیونکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لمبی مقدار کا خطبہ ثابت ہے لیکن صاحبین رح کے نزدیک ایک لمبی مقدار کا خطبہ ضروری ہے جسے عرفِ عام میں خطبہ کہا جا سکے کیونکہ تسبیح تحمید یا تہلیل کو کوئی بھی خطبہ نہیں کہتا۔ امام شافعیؒ کے نزدیک دو خطبے واجب ہیں ان کے بغیر فرض کی ادائگی نہیں ہوتی۔ ان مسائل کی تفصیل کتبِ فقہ سے معلوم ہو سکتی ہے۔ حنفیہؒ کے نزدیک دو خطبوں کے درمیان بیٹھنا سنت ہے

الفصل الاوّل

حدیث ۱: عن أنسؓ ان النبی صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم کان یصلّی الجمعۃ حین تمیل الشمس۔ رواہ البخاری

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز جمعہ اس وقت ادا فرمایا کرتے تھے جبکہ سورج ڈھل جاتا تھا۔ بخاری۔

---

[۱] مظاہر حق ج ا ص ۴۸۳، مرقات ج ۳ ص ۲۶۲ ۔ [۲] فیض الباری ج ۲ ص ۳۳۷

شرح: [۱] حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں یہ دلیل ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم زوال آفتاب کے وقت ہمیشہ جمعہ کی نماز کی ادائگی فرمایا کرتے تھے اور دوسری روایت انس رضؓ جو آگے آتی ہے اور جس میں کنا نبکر کا لفظ آیا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ صحابہ رضؓ اول وقت میں جمعہ کے لیے آیا کرتے تھے اور جمعہ کی نماز پڑھ کر قیلولہ کیا کرتے تھے اور نماز ظہر میں ان کی عادت موسم گرما میں یہ تھی کہ پہلے قیلولہ کرتے اور پھر اٹھ کر نماز پڑھا کرتے تھے کیونکہ گرمیوں میں نماز ظہر کو ٹھنڈا کر کے پڑھنے کا حکم ہے۔ پس ان دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں ہے اور امام بخاری رحؒ نے اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرنے کے لیے باب وقت الجمعة اذا زالت الشمس الخ میں درج فرمایا ہے۔

[۲] اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضورؐ زوال آفتاب کے بعد نماز جمعہ کی ادائیگی میں جلدی فرمایا کرتے تھے۔ امام احمدؒ کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے انہوں نے انس رضؓ کی دوسری حدیث کے لفظ تبکیر سے استدلال فرما کر طلوع آفتاب کے بعد سے وقت جمعہ کے داخل ہو جانے کا فتوٰی دیا ہے لیکن یہ جمہور کے خلاف ہے۔ تمام احادیث کو جمع کرنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ کا وقت زوال آفتاب کے بعد ہے نہ کہ اس سے قبل۔ صحیحین کی ایک روایت میں آیا ہے کہ صحابہ رضؓ نماز جمعہ پڑھ کر لوٹتے تھے تو دیواروں کا سایہ بہت تھوڑا ہوتا تھا اور اس کے نیچے پناہ لے کر چلنا ممکن نہ ہوتا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۲: وعن سهل بن سعد رضؓ قال ما كنا نقيل ولا نتغدى الا بعد الجمعة۔ متفق عليه۔

ترجمہ: حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم دوپہر کا آرام اور کھانا جمعہ کے بعد کیا اور کھایا کرتے تھے۔ بخاری و مسلم

شرح: [۳] حافظ طیبی رحؒ فرماتے ہیں کہ یہ دونوں لفظ ما كنا نقيل ولا نتغدى دراصل تبکیر سے کنایہ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ حضرات جمعہ کے دن نماز کا بڑا اہتمام کرتے تھے اور دوپہر کی استراحت اور کھانا وغیرہ اس کے بعد کھاتے تھے یعنی نماز جمعہ سے قبل کسی اہم کام میں مشغول نہیں ہوتے تھے۔

جمعہ [۴] کا وقت جمہور امت کے نزدیک ظہر ہی کا وقت ہے اور امام احمدؒ سے روایت ہے کہ جمعہ عیدین کے وقت میں بھی جائز ہے کیونکہ یہ بھی اہل اسلام کی عیدوں میں سے ہے

---

۱ فتح الباری ج ۴ ص ۴۹ ، ۲ مرقات ج ۳ ص ۲۶۳ ، ۳ مرقات ج ۳ ص ۲۶۴
مظاہر حق ج ۱ ص ۴۸۴ - ۴ فیض الباری ج ۲ ص ۳۳۴ -

پس بوقت چاشت جائز ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن الزبیرؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ کی طرف بھی منسوب ہے کہ وہ جمعہ کو قبل الزوال جائز رکھتے تھے۔ حافظ ابن تیمیہؒ نے فرمایا ہے کہ ابن الزبیرؓ بہت سی باتوں میں متفرد تھے اور دونوں حضرات کی طرف یہ نسبت درست نہیں ہے میں نے خوب تحقیق کر کے دیکھا ہے کہ یہ نسبت غلط ہے اور رواح کے لفظ میں کوئی دلیل نہیں کیونکہ مسائل کا انحصار لغت پر نہیں ہوتا جب تک کہ عمل (سنت) اس کی شہادت نہ دے۔ جمعہ کے بعد قیلولہ کرنے کا مطلب جمہور کے نزدیک یہ ہے کہ وہ حضرات نماز فجر کے بعد اپنے گھروں کو واپس نہیں آتے تھے بلکہ جمعہ کے انتظار میں بیٹھے رہتے تھے اور بعد از جمعہ واپس گھر آ کر کھانا کھاتے اور استراحت کرتے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۳: وعن أنسؓ قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا اشتد البرد بکّر بالصلوٰۃ واذا اشتد الحرّ أبرد بالصلوٰۃ یعنی الجمعۃ - رواہ البخاری -

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب سردی شدید ہوتی تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز جلدی پڑھاتے اور جب گرمی سخت ہوتی تو نماز یعنی جمعہ کی نماز کو ٹھنڈا کر کے پڑھتے۔ بخاری۔

شرح: [1] حافظ تورپشتیؒ فرماتے ہیں کہ انسؓ کی دوسری حدیث جس میں حین تمیل الشمس کا لفظ ہے اُسے اس حدیث کے ساتھ جمع کرنا چاہیئے تاکہ دونوں متفق ہو جائیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جمعہ میں بھی ظہر کی مانند موسم گرما میں دیر ہونی چاہیئے لیکن شافعی حضرات نے اسے بیان جواز پر محمول فرمایا ہے۔ حالانکہ کان کا لفظ استمرار پر دلالت کرتا ہے۔

[2] حنفیہ میں سے علامہ عینیؒ نے جمعہ میں ابراد کو نہیں مانا اور وہ اس میں شافعیہ کے موافق ہیں۔ سید انور شاہؒ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک عینیؒ کا مسلک ہی راجح ہے اگرچہ تحریر میں لکھا ہے کہ جمعہ میں بھی ابراد ہے۔ دراصل یہ حدیث نماز ظہر کے متعلق ہے اور اس میں یعنی الجمعۃ کا لفظ راوی کی طرف سے ہے صاحب شرع کی طرف سے نہیں ہے پس یہ لفظ قیاس کے ساتھ الحاق ہے۔

حدیث ۴: وعن السائبؓ بن یزید قال کان النداء یوم الجمعۃ أوّله اذا جلس الامام علی المنبر علی عهد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وابی بکرؓ وعمرؓ فلمّا

---

[1] مرقات ج ۳ ص ۲۶۳ - [2] فیض الباری ج ۲ ص ۳۳۴

کان عثمان و کثر الناس زاد النداء الثالث علی الزوراء

رواہ البخاری -

ترجمہ: حضرت سائب بن یزید رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جمعہ کی پہلی اذان اس وقت ہوتی تھی جب کہ امام منبر پر بیٹھتا - اور حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں بھی ایسا ہی ہوتا تھا - پھر جب حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے تیسری ندا زائد کردی جو مقام زوراء پر کہی جاتی تھی - بخاری -

شرح:[1] تیسری ندا اس لیے کہا گیا ہے کہ اس سے پہلے ایک اذان اور ایک اقامت یعنی دو ندائیں تھیں اب دو اذانیں اور ایک اقامت کل تین ندا ہو گئیں - حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جو اذان مقرر فرمائی تھی وہ وہی ہے جسے اوّل وقت میں خطبہ سے پہلے پکارا جاتا ہے اور اصلی اذان وہی ہے جو امام کے منبر پر بیٹھنے کے وقت ہوتی ہے - اور یہ زوراء نامی مقام مدینہ کے بازار میں ایک گھر تھا جو دوسری عمارتوں کی نسبت ذرا ٹیڑھا تھا اسی لیے اس کا نام زوراء پڑ گیا - اس کا لفظی معنی ہے کج ٹیڑھا - حافظ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ اذان اس لیے مقرر فرمائی تھی کہ لوگ بہت زیادہ ہو گئے تھے اس لیے انہوں نے مؤذن کو حکم دیا کہ خطبہ کے وقت سے پہلے ہی اذان دیا کرے تاکہ آواز مدینہ کے اطراف میں پہنچ جائے اور لوگ خطبہ شروع ہونے سے قبل ہی مسجد میں آ جائیں - اور حدیث میں جو آیا ہے کہ حضور کے زمانے میں اور حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے دور میں دو اذانیں تھیں تو اس سے مراد اذان اور اقامت ہے کیونکہ اقامت میں بھی اذان ہی کو دہرایا جاتا ہے صرف ایک جملہ قد قامت الصلوٰۃ زائد ہے - اور روایات میں آیا ہے کہ حضرت عثمانؓ اس اذان کے موجد نہیں بلکہ حضرت عمرؓ کے زمانے سے یہ اذان چلی آ رہی تھی یہ روایات منقطع ہیں - حضرت عطاؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے کوئی نئی اذان نہیں نکالی تھی بلکہ محض اعلام کا حکم دیا تھا سب روایات کو یوں جمع کرنا ممکن ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں اعلام ہوتا تھا جو حضرت عثمانؓ کے دور میں بھی جاری رہا - پھر انہوں نے اسے ایک بلند مقام پر اذان کی صورت میں بدل دیا اور یہ خلیفہ راشد کا فعل ہونے کی وجہ سے سنت ہے اس پر اجماع ہو چکا ہے اور آج تک عمل چلا آ رہا ہے لہٰذا اسے بدعت نہیں کہا جا سکتا -

علمائے[2] حنفیہ نے کہا ہے کہ کاروبار پہلی اذان پر چھوڑ دینا چاہیے اور جمعہ کی طرف

---

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۴۸۴ ، مرقات ج ۳ ص ۲۶۳، ۲۶۴ ، فتح الباری ج ۲ ص ۳۹۳ . [2] مرقات ج ۳ ص ۲۶۴ -

سعی کرنی چاہیے۔ گو اس میں اختلاف ہے کہ سعی کا واجب ہونا اور کاروبار کا حرام ہونا کونسی اذان پر ہوتا ہے۔ علمائے حنفیہ میں سے امام طحاویؒ اس کے قائل ہیں کہ وہ دوسری اذان ہے لیکن حنفیہ کا مختار پہلا قول ہی ہے اور اس پر اجماع سکوتی منعقد ہو چکا ہے کہ اسی اذان سے سعی واجب سمجھی جائے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سید المحدثین حضرت سید انور شاہ فرماتے ہیں کہ حضورؐ اور آپؐ کے دو ساتھیوں رضؓ کے زمانے میں جمعہ کی ایک ہی اذان تھی اور وہ غالباً مسجد سے باہر ہوتی تھی۔ پھر جب لوگ زیادہ ہو گئے تو انہیں جمعہ میں بلانے اور کاروبار چھڑوانے کے لیے حضرت عثمانؓ کے زمانے میں ایک اور اذان کا اضافہ ہوا جو زوراء نامی بلند مکان پر ہوتی تھی۔ اور دوسری اذان جو حقیقت میں پہلی تھی وہ مسجد میں منتقل ہو گئی اور امت نے ہر دور میں حضرت عثمانؓ کے اس فعل کی تائید و تقلید کی ہے اور اجتماعی اذان مؤطا امام مالکؒ ص ۳۶ کی روایت کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی موجود تھی: فاذا خرج عمرؓ وجلس علی المنبر واذن المؤذنون الخ المؤذنون بصیغہ جمع اس اذان جوق (اجتماعی اذان) کی تائید کے لیے کافی ہے۔[1]

حدیث ۵: وعن جابرؓ بن سمرۃ قال کانت للنبی صلی اللہ علیہ وسلم خطبتان یجلس بینھما یقرأ القرآن ویذکر الناس فکانت صلوتہ قصدًا وخطبتہ قصدًا۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ: حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو خطبے دیا کرتے تھے جن کے درمیان بیٹھ جاتے تھے۔ ان خطبوں میں آپؐ قرآن پڑھا کرتے اور لوگوں کو نصیحت فرمایا کرتے تھے۔ اور آپؐ کی نماز بھی معتدل ہوتی تھی اور خطبہ بھی معتدل ہوا کرتا تھا۔

شرح:[2] اس حدیث سے ثابت ہوا کہ حضور کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرماتے تھے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک خطبہ میں قیام شرط ہے حنفیہ کے نزدیک سنت ہے اور امام مالکؒ کے ہاں فرض ہے۔ علامہ ابن حجر فرماتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ کا بیٹھ کر خطبہ دینا بوجہ عذر کے تھا کہ ان سے جسم بوجھل ہونے کی وجہ سے کھڑا نہیں ہوا جاتا تھا۔ اور امام شافعیؒ نے دونوں خطبوں کے فصل کو (یعنی بیٹھ کر) واجب کہا ہے لیکن ائمہ ثلاثہ اور جمہور کے نزدیک یہ سنت ہے۔

---

[1] فیض الباری ج ۲ ص ۳۳۵/۳۳۶۔ [2] مرقات ج ۳ ص ۲۶۵۔

واجب (یعنی فرض) نہیں۔ امام طحاویؒ اور ابن عبدالبرؒ فرماتے ہیں کہ اس وجوب کی مجھے کوئی دلیل نہیں ملی۔ اور امام شافعیؒ بھی اگرچہ حضورؐ کے فعل کی وجہ سے جلوس کی فرضیت کے قائل ہیں لیکن اگر اسے کوئی ترک کر دے تو ان کے نزدیک بھی جمعہ باطل نہیں ہوتا۔ اور اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خطبہ میں قرآن کی قراءت کرنا اور وعظ و نصیحت بھی ضروری ہے کیونکہ خطبہ کا بڑا مقصد یہی ہے۔ اور حضورؐ کی نماز اور خطبے کا معتدل اور افراط و تفریط سے پاک ہونا اس حدیث سے معلوم ہوا ہے کہ وہ اس کا تقاضا نہیں کرتا کہ ان دونوں کے مساوی ہونے کا حکم لگایا جائے۔ خطبہ اپنی جگہ معتدل ہے اور نماز کا اعتدال اپنی جگہ پر ہے۔ اور اس کی مزید وضاحت حضرت عمارؓ کی آئندہ روایت میں آرہی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۶: وعن عمارؓ قال سمعتُ رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول ان صلاة الرجل وقِصَرَ خطبته مَئِنَّةٌ من فقهه فاطيلوا الصلوٰة وَاَقْصِرُوا الخطبة وان مِن البيان لسحرًا - رواه مسلم

ترجمہ: حضرت عمار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ آدمی کی نماز کا لمبا ہونا اور اس کے خطبے کا مختصر ہونا اس کے فقیہ (سمجھدار) ہونے کی نشانی ہے۔ پس تم نماز کو طویل اور خطبہ کو مختصر کیا کرو۔ اور یقیناً بعض بیان جادو ہوتے ہیں مسلم

شرح: خطبہ کی حالت میں خلق کی طرف توجہ ہوتی ہے اور نماز کی حالت میں نمازی خالق کی طرف متوجہ ہوتا ہے[1]۔ اس لیے حدیث میں دانائی کی علامت اس چیز کو ٹھہرایا گیا ہے کہ جس چیز میں خلق کی طرف توجہ ہے اسے کوتاہ کرے اور جس چیز میں خالق کی طرف توجہ ہے اسے طول دے۔ اور طول سے مراد سنت کے مطابق طول دینا ہے نہ کہ مطلق طول۔ یعنی ایسا طول جس میں افراط و تفریط نہ ہو بلکہ اعتدال ہو تاکہ یہ حدیث اوپر گزری ہوئی حدیث کے موافق ہو جائے۔ اور لفظ ان من البیان لسحرًا گویا خطبہ کی کوتاہی کی دلیل ہے۔ یعنی خطبہ مختصر الفاظ کثیر معانی کے ساتھ ہونا چاہیے کیونکہ بیان کو تاثیر میں بہت زیادہ دخل ہے وہ قلوب کو مسخر اور ایک جانب مائل کر دیتا ہے۔ جیسا کہ جادو میں بہت تاثیر ہے۔ اس جملہ میں اچھے بیان کی تعریف اور برے بیان کی مذمت کے دونوں پہلو موجود ہیں۔ اگر حق کی طرف

---

[1] مظاہر حق ج ا ص ۴۸۵، مرقات ج ۳ ص ۲۶۶

مائل کرے تو بیان قابل تعریف ہے اور اگر باطل کی طرف پھیرے تو لائق مذمت ہے۔

خطبہ[1] کو مختصر کرنے کا یہ حکم عام اور متعارف خطبات میں ہے ورنہ مسلم میں ایک حدیث میں حضورؐ کا نمازوں کے اوقات کے سوا دن بھر خطبہ دینا ثابت ہے۔ یہ خطبہ شاذ و نادر اور تقاضائے وقت کے مطابق تھا اور اس میں تطویل کا حسب ضرورت بیان جواز موجود ہے اور وہ خطبہ بطور وعظ تھا اس لیے طویل کیا گیا۔ مَئِنَّۃٌ کا لفظ اِنَّ حرف تحقیق سے مَفْعِلَۃٌ کے وزن پر بمعنی مظنّہ و علامت ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۷: وعن جابرؓ قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا خطب احمرت عیناہ وعلا صوتہ واشتد غضبہ حتّٰی کانّہ منذرُ جیش یقول صبّحکم و مساکم ویقول بعثت انا والساعۃ کھاتین ویقرن بین اصبعیہ السبابۃ والوسطٰی۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب خطبہ دیتے تو آپؐ کی آنکھیں سرخ ہو جائیں اور آواز بلند ہو جاتی تھی اور آپؐ کا غضب شدید ہو جاتا تھا گویا کہ آپؐ ایک لشکر سے ڈرا رہے ہوتے جس سے ڈرانے والا کہتا ہے کہ وہ لشکر صبح کو تم پر ٹوٹ پڑے گا اور شام کو تم پر آ پڑے گا۔ اور خطبہ میں فرماتے تھے کہ میں اور قیامت ان دو انگلیوں کی مانند بھیجے گئے ہیں اور حضورؐ اپنی انگشتِ شہادت اور درمیانی انگلی کو باہم ملا دیتے تھے۔ مسلم۔

شرح[2]: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خطیب کو خطبہ کے معاملے کو بہت اہمیت و عظمت دینی چاہیئے اور آواز کو بلند کرنا اور کلام کو مختصر کرنا چاہیئے اور اس کا خطبہ ترغیب و ترہیب میں سے جس کے بارے میں بھی وہ زور دینا چاہتا ہے اس کے عین مطابق ہونا چاہیئے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ حضورؐ کا اس حدیث میں جو سخت غضبناک ہونا بیان ہوا ہے یہ شاید اس وقت ہوتا تھا جبکہ آپؐ کسی بہت بڑی چیز سے ڈراتے اور کسی اہم معاملے سے دھمکاتے تھے۔ اور اذا خطب کا لفظ جمعہ کے خطبہ اور دوسرے خطبات سب کو مشتمل ہے۔

۱؎ مرقات ج ۳ ص ۲۶۶ ۲؎ السراج الوہاج ج ۱ ص ۲۵۸۔

اور یہ جو ارشاد فرمایا کہ بعثت انا والساعۃ کھاتین اس کا مطلب یہ ہے کہ حضورؐ قرب قیامت سے ڈراتے ہوتے تھے اور اس سے مراد یہ ہے کہ میں آخری رسولؐ ہوں اب میرے بعد کسی اور رسول کی بعثت نہ ہوگی اور میرے بعد بس قیامت ہی آئے گی۔ عیسیٰ علیہ السلام چونکہ پہلے مبعوث ہو چکے ہیں نیز ان کا آنا بطور ایک پیشگوئی اور وعدہ کے ہے لہٰذا وہ اس ارشاد کے خلاف نہیں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حضورؐ کا خطبہ کے وقت آواز کو بلند کرنا اس لیے ہوتا تھا کہ آپؐ کا غم دور ہو جائے یا اس لیے کہ آواز لوگوں کے کانوں تک پہنچ جائے اور دلوں میں اثر کرے۔ اور حضورؐ کی آنکھوں کا سرخ ہونا تجلیاتِ الٰہیہ کے انوار کی وجہ سے ہوتا تھا یا لوگوں کی تقصیرات دیکھ کر اظہار ناراضگی کے طور پر ایسا ہوتا تھا۔ اور شدتِ غضب لوگوں کے افعال و اعمال کے باعث تھا۔ الحاصل جس طرح کسی شدید خطرے سے ڈرانے والا آنکھیں سرخ اور آواز کو بلند کر لیتا ہے اور اس پر آثار غضب ظاہر ہوتے ہیں اسی طرح حضورؐ کا حال بھی ہوتا تھا۔

حدیث ۸ : وعن یعلی بن اُمیۃ قال سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقرأ علی المنبر ونادوا یا مالک لیقض علینا ربک۔ متفق علیہ۔

ترجمہ : حضرت یعلیٰ بن امیہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پر یہ آیت پڑھتے سُنا : وَنَادَوْا یَا مَالِکُ الخ "اور اہل جہنم داروغہ جہنم کو باوازِ بلند پکاریں گے اور کہیں گے اے مالک! اپنے پروردگار سے عرض کر کہ وہ ہمیں ختم کر ڈالے"۔ بخاری و مسلم

شرح : اس آیتِ قرآنیہ میں اہل جہنم کا دوزخ کے داروغہ مالک سے سوال و جواب مذکور ہے کہ وہ عذاب کی شدت سے تنگ آکر داروغہ سے فریاد کریں گے کہ اگر چھٹکارا نہیں تو اللہ تعالیٰ سے کہو موت ہی آجائے تاکہ ہم خلاصی پائیں۔ داروغہ جہنم کہے گا : انکم ماکثون o تمہیں تو ہمیشہ یہیں اسی حالت میں رہنا ہے۔ یہ تمنائیں خام اور یہ آرزوئیں باطل ہیں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت کو انذار کی غرض سے

۱؎ مظاہر حق ج ۱ ص ۴۸۵، مرقات ج ۳ ص ۲۶۶ ۲؎ مظاہر حق ایضاً، مرقات ج ۳ ص ۲۶۷

برسرِ منبر پڑھتے تھے۔ واللہ اعلم۔

[1] اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا ہے: وان من امۃ الا خلا فیھا نذیر ٥ اور ایک جگہ ہے اِن انتَ الا نذیر ٥ اور ایک جگہ حضورؐ کے لیے ہے لیکون للعالمین نذیراً ٥ یہ آیات اس حدیث سمیت اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ لوگوں کو تخویف و انذار کی حاجت تبشیر کی نسبت زیادہ ہے کیونکہ لوگ غفلتوں میں سرشار ہوتے ہیں اور شہوات میں منہمک رہتے ہیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خطبہ میں وعظ و تخویف کی آیات کا پڑھنا سنت ہے۔

حدیث ۹: وعن اُمِّ ہِشَامٍ بنتِ حارثۃ بن النعمان قالت مَا اَخَذْتُ قٓ وَالقرآنِ المجید ٥ الَّا عن لِسانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقرأھا کل جمعۃ علی المنبر اذا خطب الناس۔ رواہ مسلم

ترجمہ: حارثہ بن النعمان کی بیٹی اُم ہشام رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے سورۂ قٓ والقرآن المجید ٥ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے سن کر یاد کی تھی۔ آپؐ اسے ہر جمعہ میں منبر پر پڑھتے تھے جب کہ لوگوں کو خطبہ دیتے تھے۔ مسلم

شرح: [2] شارح طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ اس سے مراد سورہ قٓ کا ابتدائی حصہ ہے نہ کہ پوری سورت۔ کیونکہ پوری سورت حضورؐ نے ایک بار بھی خطبہ میں نہیں پڑھی۔ اور سورت کا ابتدائی حصہ بھی ہمیشہ پڑھنے کا التزام نہ تھا ورنہ اس کی قراءت خطبہ میں واجب یا سنتِ مؤکدہ ٹھہرتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نے اس سورت کے متعدد حصے کئی خطبوں میں پڑھے تھے اور حضورؐ کی زبان مبارک سے سُن کر اس صحابیہؓ نے یاد کر لیے تھے۔ [3] اہلِ علم کہتے ہیں کہ سورۂ قاف کے اختیار فرمانے کا باعث یہ تھا کہ یہ سورۃ بعث و حشر و نشر، موت اور بہت سے دوسرے شدید مواعظ اور زواجر پر مشتمل ہے۔ پس سورہ قٓ کا کچھ حصہ یا ساری سورت کو خطبہ میں پڑھنا مستحب ٹھہرا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۱۰: وعن عمرو بن حُرَیثٍ اَنَّ النبی صلی اللہ علیہ وسلم خطب وعلیہ عمامۃ سوداء قد ارخیٰ طرفیھا

---

[1] مرقات ج ۳ ص ۲۶۷، [2] مظاہر حق ج ۱ ص ۴۸۵، ایضاً مرقات۔ [3] السراج الوہاج ج ۱ ص ۲۶۱

بین کتفیها یوم الجمعۃ۔ رواہ مسلم

ترجمہ: حضرت عمرو بن حریث رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کے دن خطبہ ارشاد فرمایا اور آپؐ کے سر مبارک پر ایک سیاہ عمامہ تھا جس کے دونوں سرے آپؐ نے دونوں کندھوں کے درمیان لٹکار کھے تھے۔ مسلم

شرح: [1] بعض احادیث میں عمامۃ کی بجائے عصابۃ اور سوداء کی بجائے دسماء کا لفظ ہے۔ یعنی تیل کے کثرتِ استعمال سے اُس پر تیل کے اثرات نظر آتے تھے کیونکہ حضورؐ تیل کا بہت استعمال فرمایا کرتے تھے۔ شمائلِ ترمذی کے حاشیے میں حضرت میرکؒ فرماتے ہیں کہ یہ خطبہ حضورؐ کے مرض الوفات کا تھا۔ ایک ضعیف حدیث میں آیا ہے کہ عمامہ کے ساتھ نماز کا ثواب بغیر عمامہ کی نسبت ستر گنا زیادہ ہے۔ شارح طیبیؒ نے اس حدیث سے سیاہ عمامہ، زینت اور جمعہ کے دن بالخصوص اچھے کپڑوں کے استعمال پر استدلال کیا ہے۔ حافظ زیلعیؒ فرماتے ہیں کہ سیاہ عمامہ حدیث کی وجہ سے مسنون ہے۔ صاحب مدخل نے لکھا ہے کہ حضورؐ کا عمامہ شریف سات ہاتھ لمبا تھا۔ امام سیوطیؒ نے بہت سے صحابہؓ اور تابعینؒ سے سیاہ عمامے کا استعمال نقل کیا ہے مثلاً انسؓ بن مالکؓ، عمارؓ بن یاسر، معاویہؓ، ابوالدرداءؓ، البراءؓ بن عازب، عبدالرحمٰنؓ بن عوف، واثلہؓ، سعید بن المسیبؒ، الحسنؒ البصری، سعیدؒ بن جبیر وغیرہم۔ ان کے علاوہ حضرت علیؓ، حسنؓ بن علی، عبداللہ بن الزبیرؓ سے بھی بیہقیؒ، ابن سعد اور ابن ابی شیبہ نے سیاہ عمامہ پہننا نقل کیا ہے۔ امام نوویؒ نے فرمایا ہے کہ عمامہ کو لٹکانا اور نہ لٹکانا دونوں طرح ثابت و جائز ہے۔ حضورؐ اور خلفائے راشدینؓ سے اکثر سفید رنگ کا لباس ہی ثابت ہے کبھی کبھی اور رنگ بھی نقل ہوا ہے لیکن بطورِ شعار کے سیاہ لباس بنو عباس نے نکالا تھا اور امام غزالیؒ، ابوطالبؒ مکی اور ابن عبدالسلامؒ نے سیاہ لباس کو بطورِ شعار و عادت استعمال کرنے کی کراہت اور اس کے بدعت ہونے کا فتویٰ دیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۱۱: وعن جابرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھو یخطب اذا جاء احدکم یوم الجمعۃ والامام یخطب فلیرکع رکعتین ولتجوز فیھما۔ مسلم

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ ارشاد فرمایا: جب کوئی شخص تم میں سے جمعہ کے دن آئے اور امام خطبہ

---

[1] مرقات ج ۳ ص ۲۶۸، مظاہر حق ج ۱ ص ۴۸۶

دے رہا ہو تو اسے دو رکعت پڑھ لینی چاہئیں اور انہیں مختصر پڑھے۔ مسلم۔[1]

شرح: شافعیہ کے ہاں ان دو رکعتوں سے مراد تحیۃ المسجد ہے اور وہ ان کے نزدیک واجب ہے کہ اگرچہ خطبہ ہو رہا ہو پھر بھی انہیں نہ چھوڑا جائے۔ اور امام احمدؒ کا مسلک بھی یہی ہے۔ ان حضرات نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے۔ لیکن امام مالکؒ، ابو حنیفہؒ، سفیان ثوریؒ اور جمہور صحابہؓ و تابعین کا مسلک (بقول امام نوویؒ) یہ ہے کہ تحیۃ المسجد عام حالات میں بھی واجب نہیں چہ جائیکہ جمعہ کے دن عین خطبہ کی حالت میں ہو۔ اور ان حضرات کے نزدیک حدیث کا مطلب یہ ہے کہ خطبہ سے مراد ارادہ خطبہ ہے یعنی امام خطبہ کے لیے تیار ہو اور بس پڑھا ہی چاہتا ہو۔ اور یہ تاویل بوجہ ان قرائن اور احادیث صحیحہ کے ہے جو حالتِ خطبہ میں نماز کی حرمت پر دلالت کرتی ہیں۔

چنانچہ حدیث میں ہے کہ جب امام نکلے تو نہ کلام جائز ہے نہ نماز۔ اور حضرت علیؓ اور ابن عمرؓ نماز اور کلام کو امام کے برآمد ہونے کے بعد مکروہ (تحریمی) سمجھتے تھے اور ہمارے نزدیک قولِ صحابی جبکہ سنت کے منافی نہ ہو حجت ہے۔ اور صحیحین کی وہ روایت جس میں ایک شخص کے آنے اور حضورؐ کے اُسے دو رکعت پڑھنے کا حکم دینے کا امر مذکور ہے بر منع ہونے سے پہلے کی ہے۔ یا اُسی خاص شخص کے ساتھ مخصوص تھی۔ اور بعض کے نزدیک ابھی خطبہ بالفعل شروع نہیں ہُوا تھا بلکہ اس کی صرف تیاری تھی۔ دارقطنی کی روایت میں ہے کہ حضورؐ اس شخص کے دو رکعت پڑھنے تک خطبہ سے خاموش رہے اور پھر خطبہ پڑھنا شروع فرمایا۔ امام ابن الہمامؒ نے بھی فرمایا ہے کہ اگر امام خطبہ موقوف کر کے کسی مصلحت سے خاموش ہو رہے تو اس عرصہ میں مختصراً دو رکعت ادا کرنے میں حرج نہیں۔[2]

نسائی کی روایت میں ہے کہ یہ شخص نہایت خستہ حال تھا، اس پر کپڑے تک نہ تھے، حضورؐ نے عام مجمع کو اس کی حالت کی طرف متوجہ کرنے کے لیے خطبہ چھوڑ کر دو رکعت پڑھنے کا حکم دیا تھا۔ مسند، صحیح ابن حبان اور طحاوی میں بھی ایسا ہی ہے اور امام نسائی نے اس پر باب رکھا ہے الحث علی الصدقۃ۔ پس یہ بات درست ہوئی کہ یہ قضیہ اُسی شخص تک محدود تھا۔ واللہ اعلم۔

نیز حدیث میں کوئی دلیل اس پر موجود نہیں کہ نماز سے مراد یہاں تحیۃ المسجد تھی بلکہ ابن ماجہ میں قوی سند سے یہ الفاظ ہیں أصلیت الرکعتین قبل ان تجيء؟ اور ظاہر ہے کہ تحیۃ المسجد قبل المجیء نہیں ہوتی بلکہ بعد المجیء ہوتی ہے۔ پس اس سے مراد جمعہ کی پہلی رکعات ہیں نہ کہ تحیۃ المسجد۔ واللہ اعلم بالصواب۔

---

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۴۸۶، مرقات ج ۳ ص ۲۶۹۔ [2] فیض الباری ج ۲ ص ۳۴۱

حدیث ۱۲: وعن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من ادرک رکعۃ من الصلوۃ مع الامام فقد ادرک الصلوۃ - متفق علیہ

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص نماز میں سے امام کے ساتھ ایک رکعت پالے تو اس نے نماز پالی۔ بخاری و مسلم

شرح:[1] یہ حدیث مطلق ہے جمعہ کی نماز کے ساتھ مخصوص نہیں چنانچہ اس سے پہلے باب علی الماموم میں اس کی شرح گزر چکی۔ لیکن شافعی حضرات نے اسے نماز جمعہ کے ساتھ ایک اور حدیث کی بناء پر مقید کرلیا ہے۔ ہدایہ میں ہے کہ جمعہ کے دن جس شخص کو امام کے ساتھ نماز مل جائے جتنی نماز ملے امام کے ساتھ پڑھ لے اور باقی نماز جمعہ اس پر بنا کرے بدلیل حدیث ما ادرکتم فصلوا وما فاتکم فاقضوا - پس اگر امام کو التحیات میں یا سجود سہو میں بھی پائے تو امام ابو حنیفہؒ وابویوسفؒ کے نزدیک اس پر جمعہ کی بنا کرے اور امام محمدؒ کہتے ہیں کہ اگر وہ شخص دوسری رکعت کا اکثر حصہ امام کے ساتھ پالے تو اس پر نماز جمعہ کی بنا کرے ورنہ ظہر کی بنا کرے کیونکہ جمعہ کا خلیفہ ظہر موجود ہے جو معذوروں، بیماروں، مسافروں اور عورتوں کے لیے بھی ظہر ہی ہے نہ کہ جمعہ۔ اور اکثر رکعت سے مراد رکوع میں امام کو جا لینا ہے۔ امام نے اگر رکوع سے سر اٹھا لیا تو اکثر نہ رہا۔ امام ابن الہمامؒ فرماتے ہیں کہ شیخینؒ کی دلیل بھی حدیث مطلق ہی ہے اور امام محمدؒ نے ظاہر حدیث سے استدلال کیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

باب صلوٰۃ الخوف

[2] یعنی جب کفار کی طرف سے حملے کا خوف ہو تو نماز کے احکام کیا ہیں؟ علمائے امت اس پر متفق ہیں کہ صلاۃ الخوف کا حکم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی ثابت ہے۔ امام مزنی شافعیؒ کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے اسے منسوخ کہا ہے۔ اور امام ابو یوسف حنفیؒ اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ...

---

[1] مظاہر حق ج ا ص ۴۸۶، ۴۸۷ مرقات ج ۳ ص ۲۶۹، ۲۷۰ - [2] مرقات ج ۳ ص ۲۷۴ -

مانتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ۔ الآیۃ۔ اور اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ قید واقعہ کے لحاظ سے ہے جیسا کہ مسافر کی نماز میں ارشاد ہے۔ اِنْ خِفْتُمْ (کیونکہ اس حالت میں عموماً خوف ہوتا تھا) علمائے امت اس امر پر بھی متفق ہیں کہ صلاۃ الخوف کی جتنی صورتیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں سب جائز ہیں۔ اختلاف صرف ترجیح میں ہے۔ کہا گیا ہے کہ نمازِ خوف احادیث میں ۱۶ طرح پر ثابت ہوئی ہے۔ بعض نے اس سے کم وبیش بھی تعداد بتائی ہے۔ ان صورتوں میں سے ہر صورت کو علماء کے ایک گروہ نے اختیار کیا ہے اس بارے میں امام احمدؒ کا قول بہت اچھا ہے کہ حضورؐ سے ثابت شدہ صورتوں میں سے جس طرح بھی چاہو پڑھ لو جائز ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صلاۃ الخوف دو رکعت سے کم نہیں پڑھی۔ ابن عباسؓ نے جو ایک رکعت اختیار کی ہے اس سے مراد یہ ہے کہ مقتدیوں کا ہر گروہ امام کے ساتھ ایک رکعت پڑھتا ہے۔

[1] صلوٰۃ الخوف کا حکم امام مالکؒ کے نزدیک حالتِ سفر کے ساتھ مخصوص ہے لیکن حنفیہ نے اسے سفر وحضر دونوں حالتوں میں جائز کہا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے صلاۃ الخوف میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت کو اختیار کیا ہے کیونکہ وہ صحاح ستہ میں ثابت ہے شمنیؒ نے کہا ہے کہ حضورؐ نے چار جگہ صلاۃ الخوف ادا فرمائی ہے۔ غزوہ ذات الرقاع میں، بطن نخلہ میں، عُسفان میں اور ذی قرد میں اور یہ چاروں واقعات سفر کے تھے غالباً اسی لیے امام مالکؒ نے اس نماز کو سفر سے مخصوص فرمایا ہے لیکن دوسرے فقہاء نے حضر کو بھی اسی پر قیاس کیا ہے۔

[2] امام مسلمؒ نے صلواۃ الخوف کی چھ صورتیں بیان کی ہیں جو جابر بن عبداللہ، ابن عمرؓ، ابن ابی حثمہؒ اور ابن عباسؓ کی احادیث میں آئی ہیں اور ابن مسعودؓ اور ابو ہریرہؓ نے ایک ساتویں صورت بھی بیان کی ہے اور ابو داؤد وغیرہ نے کئی اور صورتیں بیان کی ہیں جن کا مجموعہ ۱۶ تک پہنچتا ہے۔ ابن القصارؒ مالکی نے کہا ہے کہ حضورؐ نے صلوٰۃ الخوف دس بار ادا فرمائی ہے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ یہ سب صورتیں مکان وزمان کے تقاضے کے مطابق جائز ہیں اور ان کی تفصیل کتب فقہ میں ہے۔ امام خطابیؒ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صلوٰۃ الخوف مختلف اوقات

---

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۴۸۹ [2] السراج الوہاج ج ۱ ص ۲۸۳

ہیں مختلف جگہوں پر مختلف طریقوں سے ادا فرمائی ہے اور ہر جگہ احوال ومقامات کے مناسب صورت اختیار فرمائی ہے۔ پس صلوٰۃ الخوف صورتوں کے اختلاف کے باوجود معنی کے لحاظ سے ایک ہی ہے۔ اور صلاۃ الخوف کی مشروعیت ہر خوفناک چیز کے وقت ثابت ہے اور حضورؐ کا اسے کفار کے خوف کے وقت اور سفر ہی میں ادا کرنا یہ نہیں ثابت کرتا کہ صرف کفار کے خوف کے وقت مشروع ہے یا صرف سفر میں ہے حضر میں نہیں۔ کیونکہ وہ علت جس کی وجہ سے یہ نماز مشروع ہوئی ہے وہ ان سب میں موجود ہے اور جنگ احزاب میں چونکہ جنگ بالفعل جاری تھی اس لیے صلاۃ الخوف کا موقع ہی نہیں آیا ایسی حالت میں نماز کو ملتوی کر دیا جاتا ہے۔

علامہ سید محمد انور شاہ الکشمیریؒ[1] فرماتے ہیں کہ ابوداؤد اور نسائی نے صلاۃ الخوف کی کئی صورتیں بیان فرمائی ہیں اور یہ سب سمٹ کر چھ رہ جاتی ہیں جیسا کہ ابن القیمؒ نے زاد المعاد میں تنقیح کی ہے اور فرمایا ہے کہ لوگوں نے ان احادیث کو مستقل صفات پر محمول کیا ہے حالانکہ اکثر اختلاف راویوں کی طرف سے پیدا ہوا ہے اور حافظ ابن القیم نے امام احمدؒ سے نقل کیا ہے کہ یہ چھ احادیث سب کی سب صحیح ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ امام قدوری حنفی نے تجرید میں فرمایا ہے کہ احادیث میں آنے والی سب صفات جائز ہیں۔ اسی طرح علامہ علی القاریؒ اور صاحب کنز نے مستصفی میں اور امام کرخیؒ اور صاحب مراقی الفلاح نے بھی لکھا ہے۔ ہاں ترجیح میں کلام کیا گیا ہے جو حنفیہ نے متون شروح میں دو صورتوں کو ترجیح دی ہے۔ ان میں سے مشہور صورت یہ ہے کہ امام پہلے گروہ کے ساتھ ایک رکعت پڑھے اور یہ گروہ دشمن کے سامنے جا کھڑا ہو اور دوسرا گروہ جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی وہ امام کے پیچھے آ جائے اور ایک رکعت پڑھے امام سلام پھیر دے (کہ اس کی دو رکعتیں ہو گئیں) اور یہ گروہ پھر دشمن کے سامنے جا کھڑا ہو اور پہلا گروہ آ کر ایک رکعت مسبوق کی مانند پڑھے اور سلام پھیر کر چلا جائے۔ پھر دوسرا گروہ آئے اور لاحق کی مانند اپنی نماز دو رکعت پوری کرے یعنی ایک رکعت پڑھ کر سلام پھیر دے۔ یہ صورت نماز کی ترتیب قائم رہنے کے لحاظ سے احسن ترین ہے۔ کیونکہ اس میں امام مقتدیوں سے پہلے، پھر پہلا گروہ اور پھر دوسرا گروہ ترتیب وار نماز سے فارغ ہوتا ہے لیکن اس میں آمد و رفت کی بہت کثرت ہے لیکن یہ مشی فی الصلوٰۃ ہے نہ کہ الصلاۃ ماشیاً کہ وہ جائز نہیں ہے۔

---

[1] فیض الباری ج ۲ ص ۳۴۹۔

دوسری صورت شروح کی ہے جس میں کثرت آمدورفت نہیں ہے اور وہ یہ کہ دوسرا گروہ امام کے ساتھ ایک رکعت پڑھ کر اپنی نماز مکمل کر لے اور سلام کے بعد چلا جائے پھر پہلا گروہ آکر نماز مکمل کرے۔ اس میں آمدورفت تو کم ہے لیکن ترتیب خراب ہو گئی کہ پہلا گروہ بعد میں اور دوسرا پہلے فارغ ہو گیا۔ شافعیہ نے یہ صورت پسند کی ہے کہ امام پہلے گروہ کے ساتھ ایک رکعت پڑھ کر کھڑا رہے اور یہ گروہ نماز مکمل کر کے چلا جائے، پھر دوسرا گروہ آئے تو امام اسے بھی ایک رکعت پڑھا کر سلام پھیرے اور یہ گروہ اپنی نماز مکمل کر لے۔ مالکیہ فرماتے ہیں کہ امام دوسری رکعت کے بعد قعدہ میں قوم کا انتظار کرے، جب وہ لوگ قعدہ میں اس کے ساتھ آملیں تو ان کے ساتھ سلام پھیرے۔ یہ صورت اگرچہ اس لحاظ سے احسن ہے کہ اس میں آمد و رفت کی قلت ہے مگر اس میں امام مقتدیوں کا پابند ہو گیا ہے اور امامت کا قلب موضوع ہو گیا ہے کیونکہ پہلا گروہ امام سے بھی پہلے فارغ ہو گیا ہے اور امام نے دوسرے گروہ کا انتظار کیا ہے۔

؎ قرآن کریم کی آیت صلاۃ الخوف نے اجمال کا مسلک اختیار کیا ہے اور تفصیل نہیں بتائی گو آیت کی تفسیر میں امام بیضاوی شافعی، صاحب مدارک حنفی اور علامہ آلوسی حنفی نے کلام کر کے اسے اپنے اپنے مسلک پر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے لیکن انصاف یہی ہے کہ قرآن کا بیان مجمل و مختصر ہے۔ اور میرے خیال میں قرآن نے آسانی اور توسع پیدا کرنے کے لیے جان کر اختصار کی روش اختیار فرمائی ہے اسی لیے امام ابو یوسف رح نے آیت کے الفاظ وَإِذَا كُنْتَ فِيهِمْ سے استدلال کر کے کہا ہے کہ یہ نماز حضورؐ کے ساتھ مخصوص تھی۔ بعد والے الگ الگ امام بنا کر نماز پڑھ سکتے ہیں۔ کیونکہ صحابہؓ میں سے ہر شخص حضورؐ کے ہی نماز پڑھنے کا آرزومند تھا اور بعد میں کسی کا یہ مقام و مرتبہ نہیں۔ لیکن میرے نزدیک اس پر کوئی دلیل قائم نہیں ہے۔

پھر قرآن سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ امام کی دو رکعت اور ہر دو گروہ میں سے ہر ایک کی ایک ایک رکعت ہو گی بعض سلف اس طرف بھی گئے ہیں لیکن ائمہ اربعہ میں سے کسی نے یہ نہیں کہا۔ جمہور سلف کا مسلک بھی یہی ہے کہ ہر دو گروہ چونکہ امام کے ساتھ ایک ایک رکعت پڑھتے ہیں لہٰذا ایک ایک رکعت کا ذکر قرآن میں آیا، اور یہ بات تو دلائل شرع سے ثابت ہی ہے کہ ہر گروہ دوسری رکعت خود پڑھ لے گا۔

؎ فیض الباری ج ۲ ص ۳۵۱

یہ بھی معلوم رہے کہ قرآن نے صلاۃ الخوف کے علاوہ کسی نماز کی صفت نہیں بیان کی ہے صرف اجزار بیان کئے ہیں مثلاً قُومُوا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ (قیام) وَارْكَعُوا وَاسْجُدُوا (رکوع وسجدہ) فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ (تسبیح) وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا (قراءت قرآن) اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا (قراءت فجر)۔ پس ان آیات میں قیام، رکوع وسجود اور قراءت وتسبیح کا ذکر تو آیا لیکن نماز کی صفت اور ان اجزار کا محل نہیں بتایا گیا صرف یہ تنبیہ کی گئی کہ نماز کے اہم اجزار یہ ہیں۔

صلاۃ الخوف کی آیت میں کلام کیا گیا ہے کہ یہ قصرِ رکعات کے لئے نازل ہوئی ہے یا قصرِ صفتِ صلاۃ کے لئے؟ اگر اسے قصرِ عدد کے لیے ماننا چاہیئے تو شافعیہ کا مسلک کہ سفر میں قصرِ رکعات جائز ہے واجب نہیں ثابت ہوگا۔ اور اگر یہ قصرِ صفت و ہیئت کے لیے تسلیم کی جائے تو اس کا تعلق سفر سے نہیں رہے گا اور خالصۃً صلاۃ الخوف ہو جائے گی اور ربطِ قرآنی کے یہی مطابق ہے ورنہ قولِ خداوندی وَاِنْ خِفْتُمْ کا کوئی مطلب نہیں رہتا۔ کیونکہ سفر میں قصرِ صلاۃ بدونِ خوف اجماعاً جائز ہے۔

حاصل یہ ہے کہ یہاں چار صورتیں ہیں:

الف۔ اقامت مع الامن: اس میں بالاجماع اتمامِ صلاۃ ہے۔

ب۔ سفر مع الخوف: اس میں اجماعاً قصر ہے عددِ رکعات میں بھی اور صفتِ صلاۃ میں بھی۔

ج۔ سفر مع الامن: اس میں حنفیہ کے نزدیک قصر واجب ہے، اور شافعیہ کے ہاں جائز ہے واجب نہیں۔

د۔ اقامت مع الخوف: اس میں اجماعاً قصرِ صفت ہے قصرِ عدد نہیں۔

اور صلاۃ الخوف کا حکم سفر میں نازل ہوا تھا جبکہ صحابہؓ دشمن کے سامنے کھڑے تھے لہٰذا اس سے مقصود قصرِ صفت کا بیان تھا لیکن چونکہ وہ حضرات اس وقت مسافر تھے لہٰذا قصرِ عدد کا بیان بھی کر دیا گیا اور صلاۃ الخوف عموماً حالتِ سفر میں ہی ہوتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

الفصل الاوّل

حدیث ۱: عن سالمؒ بن عبد اللہ بن عمرؓ عن ابیہ قال غزوتُ

مع رسول الله صلى الله عليه وسلم قِبَلَ نَجدٍ فوازينا الْعَدُوَّ فصاففنا لَهُمْ فقام رسولُ الله صلى الله عليه وسلم يُصَلِّي لنا فقامت طائفة معه واقبلت طائفة على الْعَدُوِّ وركع رسول الله صلى الله عليه وسلم بمن معه وَسجد سجدتين ثم انصرفوا مكان الطائفة التي لم تصل فَجَاءُوا فركع رسول الله صلى الله عليه وسلم بهم ركعة وسجد سجدتين ثم سلّم فقام كل واحد منهم فركع لنفسه ركعة و سجد سجدتين - ورواه نافع نحوه وزاد فان كان خوف هو اشد من ذلك صلوا رجالا قياما على اقدامهم او ركبانا مستقبلي القبلة او غير مستقبليها قال نافع لا اُرى ابن عمرؓ ذكر ذلك الا عن رسول الله صلى الله عليه وسلّم - رواه البخاري -

ترجمہ: حضرت سالم بن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم نے اپنے باپ عبداللہؓ سے روایت کی۔ انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نجد کی طرف جہاد کیا۔ پس ہم دشمن کے سامنے ہوئے اور ان کے مقابلے کے لیے ہم نے صف بندی کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں کھڑے ہو کر نماز پڑھائی۔ پس ایک گروہ تو آپؐ کے ساتھ نماز میں کھڑا ہو گیا اور دوسرا دشمن کے سامنے چلا گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھ والے لوگوں کے ساتھ رکوع اور دو سجدے کئے۔ پھر یہ لوگ اس گروہ کی جگہ پر چلے گئے جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی تھی۔ پس وہ دوسرے لوگ آ گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ رکوع اور دو سجدے کیے۔ پھر آپؐ نے سلام پھیر دیا تو ان میں سے ہر شخص نے اٹھ کر اپنے طور پر ایک رکعت پڑھی اور دو سجدے کئے۔ اور نافعؒ نے بھی اسی طرح روایت کی ہے اور اتنی عبارت زیادہ کی ہے کہ اگر خوف اس سے بھی زیادہ ہو جائے تو لوگ کھڑے ہو کر، اپنے پاؤں پر، پیادہ یا سوار ہو کر، قبلہ رُخ ہو کر یا قبلہ کی طرف منہ نہ کر کے (جیسے بھی ممکن ہو) نماز پڑھیں۔ نافع

فرماتے ہیں کہ میرا گمان ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ نے یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے روایت کر کے فرمائی تھی۔ بخاری۔

شرح ؎: نجد کا معنی ہے بلند زمین۔ اور یہاں اس سے مراد حجاز کا نجد ہے نہ کہ یمن کا۔ اس حدیث میں اس امر پر دلالت موجود ہے کہ جماعتوں کا تعدد مکروہ ہے بالخصوص جبکہ مقتدی سب موجود ہوں۔ اور اس پر بھی یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ فرض نماز نفل والے کے پیچھے جائز نہیں ورنہ امام دونوں فریقوں کو الگ الگ نماز پڑھانے پر مامور ہوتا اور اتنی آمد و رفت اور الجھن وغیرہ نہ رہتی۔ اور یہ حدیث اس امر کی قوی حجت ہے کہ جماعت واجب ہے جسے ایسی خوفناک حالت میں بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ امام ابن الہمام فرماتے ہیں کہ صلاۃ الخوف اوپر مذکورہ شدہ صورت کے مطابق تب لازم ہوتی ہے جب کہ سب لوگ ایک امام کے پیچھے ہی نماز پڑھنا چاہیں ورنہ افضل یہی ہے کہ الگ الگ گروہوں کو الگ الگ امام نماز پڑھائیں۔ امام ابن الہمامؒ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ یہ حدیث اگرچہ پہلے گروہ کی تکمیل نماز سے خاموش ہے مگر باقی تمام حدیث عین اختیارِ ابی حنیفہؒ کے مطابق ہے۔ اور امام محمدؒ نے کتاب الآثار میں حسب روایت امام ابوحنیفہؒ ایک حدیث جو ابن عباسؓ پر موقوف ہے بیان کی ہے جو بالکل مسلکِ مختار حنفیہ کے مطابق ہے اور چونکہ اس معاملے میں عقل کو دخل نہیں لہٰذا یہ موقوف بھی مرفوع کی مانند ہے۔ پہلی جماعت کے متعلق حنفیہ کہتے ہیں کہ لاحق کی مانند بلا قرارت اپنی نماز مکمل کریں گے اور دوسرا فریق مسبوق کی مانند قرارت کے ساتھ اپنی ایک رکعت پڑھے گا۔ یہ جو کچھ بیان ہوا ہے حالتِ سفر میں ہے اگر امام مقیم ہو تو ہر فریق کو دو رکعت پڑھائے گا اور وہ حسب معمول اپنی چار رکعات تمام کریں گے۔ نمازِ مغرب سفر یا حضر میں پہلے فریق کے ساتھ دو رکعات اور دوسرے کے ساتھ ایک رکعت پڑھے گا۔ اور شدتِ خوف کی حالت میں (جبکہ لڑائی بالفعل شروع نہ ہو) اشارے سے نماز ادا کریں گے۔ اور حالتِ قتال میں نماز ملتوی کی جائے گی جیسا کہ جنگِ احزاب میں ہوا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۲: وعن یزید بن رومان عن صالح بن خوات عمن صلی مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوم

؎ مظاہر حق ج ۱ ص ۴۹۰، مرقات ج ۳ ص ۲۷۵

ذات الرقاع صلوٰۃ الخوف ان طائفۃ صفت معہ و طائفۃ وِجاہَ العَدُوِّ فصلی بالتی معہ رکعۃ ثم ثبت قائمًا و اتمّوا لانفسھم ثم انصرفوا فصفّوا وِجاہَ العَدُوِّ وَجاءتِ الطائفۃ الاخری فصلّی بھم الرکعۃ التی بقیت من صلوٰتہٖ ثم ثبت جالسًا و اتمّوا لانفسھم ثم سلّم بھم۔ متفق علیہ۔ داخرج البخاری بطریقٍ اخر عن القاسم عن صالح بن خوات عن سھل بن ابی حثمۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلّم۔

ترجمہ: یزید بن رومان جناب صالح بن خوّات سے اور وہ ایک ایسے شخص سے روایت کرتے ہیں جس نے غزوۂ ذات الرقاع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صلوٰۃ الخوف پڑھی تھی۔ انہوں نے کہا کہ ایک گروہ نے حضورؐ کے ساتھ نماز میں صف بنائی اور دوسرے نے دشمن کے بالمقابل صف بندی کی۔ پس حضورؐ نے اپنے ساتھ والے فریق کے ساتھ ایک رکعت پڑھی پھر حضورؐ سیدھے کھڑے رہے اور اس فریق نے اپنی نماز مکمل کر لی۔ پھر یہ لوگ چلے گئے اور دشمن کے سامنے جا کر صف بستہ ہو گئے اور دوسرا گروہ آگیا تو حضورؐ نے ان کے ساتھ وہ رکعت پڑھی جو آپؐ کی نماز سے باقی تھی پھر آپؐ سیدھے بیٹھ گئے اور ان لوگوں نے اپنے طور پر اپنی نماز مکمل کر لی تو حضورؐ نے ان کے ساتھ سلام پھیرا۔ بخاری و مسلم۔ اور بخاری نے اس روایت کو ایک اور سند سے روایت کیا ہے یعنی قاسم سے انہوں نے صالح بن خوّات سے انہوں نے سہل بن ابی حثمہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے۔

شرح:[1] صلوٰۃ الخوف کی یہ دوسری صورت ہے اس میں ہر گروہ نے حضورؐ کی نماز کے دوران میں اپنے طور پر ایک ایک رکعت پوری کی لیکن پہلی صورت میں ہر فریق نے اپنی ایک ایک رکعت حضورؐ سے الگ قضا کی تھی۔ اس حدیث کو امام شافعیؒ اور امام مالکؒ نے اختیار فرمایا ہے گو دونوں حضرات میں کچھ اختلاف

---

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۴۹۱، مرقات ج ۳ ص ۲۷۷، ۲۷۸۔

بھی ہے جو پہلے بیان ہو چکا ہے۔

غزوۂ ذات الرقاع ۴ھ میں پیش آیا تھا۔ اور اس کی وجہ تسمیہ کئی طرح سے آئی ہے۔ ایک تو یہ کہ صحابہؓ کے پاؤں زخمی ہو گئے تھے اور انہوں نے ان پر چیتھڑے لپیٹ لئے تھے۔ رقاع رقعۃ کی جمع ہے جس کا معنی ہے دھجیاں یا چیتھڑے۔ دوسری وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ اس مقام کی زمین کئی رنگ کی تھی جیسا کہ گودڑی کے اجزاء کئی رنگ کے ہوتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سرزمین میں ایک پہاڑ تھا جس کا کچھ حصہ سُرخ، کچھ سیاہ اور کچھ سفید تھا۔ اور آئندہ حدیثِ جابرؓ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بعینہٖ ایک مقام کا نام بھی تھا۔ ممکن ہے بعد میں یہ نام پڑ گیا ہو یا حضرت جابرؓ نے حال کا نام محل کو دے دیا ہو۔ پہلی وجہ سب سے معتبر ہے کیونکہ بخاری و مسلم میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے منقول ہے۔

حدیث کی پہلی روایت میں میں حضرت سہل بن ابی حثمہ کا نام نہیں تھا لیکن بخاری کی دوسری روایت سے معلوم ہو گیا کہ وہ حضرت سہلؓ ہیں۔ علامہ علی القاریؒ نے فرمایا ہے کہ بیہقی اور ابن مندہ کی روایت میں صالح بن خوات نے اپنے باپ سے (جو صحابی تھے) روایت کی ہے پس اس مبہم شخص کا نام سہل نہیں بلکہ خواتؓ ہے اور ممکن ہے صالح نے یہ حدیث اپنے باپ سے بھی اور سہلؓ سے بھی سنی ہو پس کبھی سہل کا نام لے کر بیان کی اور کبھی مبہم بیان کر دی۔ اور چونکہ صالح کی دونوں سے روایت ثابت ہے لہٰذا اس ابہام سے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ اور صحابہ سب کے سب عدول ہیں لہٰذا جس سے بھی روایت ہوئی مقبول ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

حدیث ۳: وعن جابرؓ قال اقبلنا مع رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم حتّٰی اذا کنّا بذات الرقاع قال کنا اذا اتینا علی شجرۃ ظلیۃ ترکناھا لرسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال فجآء رجل من المشرکین وسیفُ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم مُعلّقٌ بشجرۃٍ فاخذ سیفَ نبیّ اللّٰہِ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فاخترطہ فقال لرسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اَتخافُنی قال لا قال فمن یمنعک مِنّی قال اللّٰہ یمنعنی منک قال فتھددہ اصحاب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم

فغمد السيف وعلقه قال فنودي بالصلوٰة فصلى بطائفة ركعتين ثم تاخروا وصلى بالطائفة الاخرى ركعتين قال فكانت لرسول الله صلى الله عليه وسلم اربع ركعات وللقوم ركعتان ۔ متفق علیہ ۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے ۔ انہوں نے کہا کہ ہم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ آئے یہاں تک کہ ہم جب ذات الرقاع میں پہنچے حضرت جابر رضؓ نے فرمایا کہ ہم سفر میں جب کسی سایہ دار درخت پر پہنچتے تو اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے چھوڑ دیتے تھے ۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم استراحت کے لیے اترے تو حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ مشرکوں میں سے ایک شخص آگیا درانحالیکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار ایک درخت سے لٹک رہی تھی ۔ پس اس مشرک نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار پکڑلی اور اسے میان سے نکال لیا (اور حضورؐ اس وقت سو رہے تھے) یا اس نے یہ سب کچھ نہایت ہی پھرتی سے کیا کہ کچھ وقت نہ لگا) پھر اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کیا آپؐ مجھ سے ڈرتے ہیں ؟ حضورؐ نے فرمایا: "نہیں"۔ اس نے کہا کہ مجھ سے آپکو کون بچا سکتا ہے ؟ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ تجھ سے مجھے اللہ بچائے گا ۔ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ اس شخص کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں نے ڈرایا دھمکایا تو اس نے تلوار کو نیام میں ڈالا اور درخت سے لٹکا دیا ۔ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ پھر نماز کی اذان دی گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک گروہ کے ساتھ دو رکعتیں پڑھیں پھر وہ لوگ ہٹ گئے اور حضورؐ نے دوسرے فریق کے ساتھ دو رکعات پڑھیں ۔ حضرت جابرؓ نے فرمایا پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز چار رکعتیں اور لوگوں کی دو رکعتیں ہوئی ۔ بخاری و مسلم ۔

شرح: حدیث میں بیان کیا گیا پہلا واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شجاعت، ثابت قدمی اور توکل علی اللہ پر دلالت کرتا ہے اس سے حضورؐ کے اخلاقِ فاضلہ اور شدید دشمنوں کو بھی معاف کر دینے کی عادت ثابت ہوتی ہے بعض روایات میں اس مشرک کا اسی وقت

لہ مظاہر حق ج ۱ ص ۴۹۱، مرقات ج ۳ ص ۲۷۹ ۔

مسلمان ہوجانا بھی آیا ہے۔ بعض دوسری روایات میں ہے کہ مسلمان تو نہ ہوا لیکن حضورؐ کے عفو و اخلاق کو دیکھ کر وعدہ کیا کہ حضورؐ کے خلاف کبھی نہیں لڑے گا اور حضورؐ نے اُسے تالیفِ قلب کی خاطر منزا نہ دی۔ ہو سکتا ہے کہ اس قسم کے واقعات کئی مرتبہ ہوئے ہوں۔ کیونکہ حضورؐ کے دشمن اور عام کفار ہر وقت موقع کی تلاش میں رہتے۔ اور پیچھے لگے رہتے تھے۔

دوسرے[۲] حصے میں صلاۃ الخوف کا جو بیان آیا ہے یہ پچھلی حدیث کے صریحاً خلاف ہے حالاں کہ جگہ ایک ہے (یعنی ذات الرقاع) پس ممکن ہے کہ اسی جگہ پر صلاۃ الخوف حضورؐ نے دو واقعات میں ادا فرمائی ہو ورنہ دو احادیث بظاہر متعارض ہیں۔ پھر ممکن ہے کہ اوپر والی حدیث میں نمازِ فجر کا ذکر ہو اور اس میں ظہر یا عصر کا۔ یا دو غزوات میں یہ واقعہ ہوا ہو گا۔ اور اس حدیث کے مطابق حضورؐ نے چار رکعات ادا فرمائیں اور دونوں گروہوں کی دو دو رکعات ہوئیں۔ اس کی علماء نے کئی وجوہ بیان کی ہیں جن میں سے صحیح تو یہ ہے کہ یہ واقعہ حکمِ قصر کے اترنے سے قبل کا ہے یا حکمِ قصر کے بعد ہو تو مسافتِ قصر کے اندر کا واقعہ ہو گا۔ اور قوم کی دو دو رکعتیں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ دونوں گروہوں نے امام کے ساتھ صرف دو دو رکعات ادا کی تھیں یہ نہیں کہ صرف دو ہی دو رکعات پڑھی تھی۔ واللہ اعلم۔

حدیث میں بیان ہونے والے دو واقعات الگ الگ اوقات میں پیش آئے تھے۔ صحابی نے محض بیان میں انہیں جمع کر دیا ہے کیونکہ صلاۃ الخوف تو دشمن کے سامنے ہونے اور خوف کی حالت میں ہوتی ہے اور پہلے واقعہ کے وقوع تک ایسا خوف نہیں تھا ورنہ حضورؐ یوں اکیلے آرام نہ فرما رہے ہوتے اور صحابہؓ حضورؐ کو آرام کے لیے الگ چھوڑ کر خود اِدھر اُدھر استراحت کے لیے بکھرے ہوئے نہ ہوتے۔ واللہ اعلم۔

۲۔ مرقات ایضاً، مظاہر حق ج ۱ ص ۴۹۲

حدیث ۴:

وعنہ قال صلی بنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلوٰۃ الخوف فصففنا خلفہ صفین والعدو بیننا وبین القبلۃ فکبر النبی صلی اللہ علیہ وسلم وکبرنا جمیعًا ثم رکع ورکعنا جمیعًا ثم رفع رأسہ من الرکوع ورفعنا جمیعًا ثم انحدر بالسجود والصف الذی یلیہ وقام الصف المؤخر فی نحر العدو فلما قضی النبی صلی اللہ علیہ وسلم السجود وقام الصف الذی یلیہ انحدر الصف المؤخر بالسجود ثم قاموا ثم تقدم الصف المؤخر وتاخر المقدم ثم رکع النبی صلی اللہ علیہ وسلم ورکعنا جمیعًا ثم رفع رأسہ من الرکوع ورفعنا جمیعًا ثم انحدر بالسجود والصف الذی یلیہ الذی کان مؤخرًا فی الرکعۃ الاولیٰ وقام الصف المؤخر فی نحو العدو فلما قضیٰ النبی صلی اللہ علیہ وسلم السجود والصف الذی یلیہ انحدر الصف المؤخر بالسجود فسجدوا ثم سلم النبی صلی اللہ علیہ وسلم وسلمنا جمیعًا۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ: اور حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں صلوٰۃ الخوف پڑھائی۔ پس ہم نے آپؐ کے پیچھے دو صفیں باندھ لیں اور دشمن ہمارے اور قبلہ کے درمیان تھا۔ پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تکبیر تحریمہ کہی اور ہم سب نے بھی تکبیر کہی پھر حضورؐ نے رکوع فرمایا تو ہم سب نے بھی رکوع کیا پھر حضورؐ نے رکوع سے سر اٹھایا تو ہم سب نے بھی سر اٹھائے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھ والی صف سجدہ کے لیے جھکے اور پچھلی صف دشمن کے سامنے کھڑی رہی۔ پس جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ مکمل کر لیا اور آپؐ کے ساتھ والی صف بھی سجدہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تو پچھلی صف سجدہ میں جھک گئی پھر وہ سجدہ کر کے اٹھے۔ پھر پچھلی صف آگے ہو گئی اور اگلی صف پیچھے ہو گئی۔ پھر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری رکعت کے لیے رکوع فرمایا اور ہم

سب نے رکوع کیا۔ پھر آپؐ اپنے ساتھ والی صف سمیت، جو پہلے پچھلی صف تھی اور اب اگلی تھی، سجدہ میں جھک گئے اور پیچھے والی صف دشمن کے سامنے کھڑی رہی پس جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ کر چکے اور آپؐ کے ساتھ والی صف بھی سجدہ مکمل کر چکی تو پچھلی صف سجدہ میں گر پڑی اور انہوں نے بھی سجدہ کر لیا پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کہا تو ہم سب نے بھی سلام کہا۔ مسلم۔

شرح: پہلی تین حدیثوں میں صلوٰۃ الخوف کی تین کیفیتیں بیان ہو چکی ہیں اس حدیث میں یہ چوتھی کیفیت بیان ہوئی ہے۔ اوپر گزر چکا ہے کہ حضورؐ نے صلوٰۃ الخوف موقع ومحل کے مطابق مختلف طور پر ادا فرمائی ہے وقت اور جگہ اور واقعات کا جیسا تقاضا ہوتا اس کے مطابق پڑھ لیتے۔ اس مسئلہ میں امت کا کوئی اختلاف نہیں کہ صلوٰۃ الخوف کی ہر ثابت شدہ کیفیت جائز ومشروع ہے اور اختلاف صرف افضلیت میں ہے۔ اس حدیث میں پوری جماعت دو صفوں کی صورت میں حضورؐ کے پیچھے تھی اور وقتاً فوقتاً ان کے فرائض بدلتے رہے اور جگہ تبدیل ہوئی۔ علماء فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ عسفان کے مقام پر پیش آیا جیسا کہ حافظ ابن حجرؒ نے صراحت فرمائی ہے۔ واللہ اعلم۔

بابُ صلوٰۃ العیدینؑ

اس باب[1] میں عید الفطر اور عید الاضحی کا بیان ہوگا۔ عید کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ وُہ ہر سال لوٹ کر آتی ہے اور عید کا لفظ عود سے نکلا ہے۔ الازہار میں لکھا ہے کہ اہل عرب کے نزدیک خوشی کا ہر اجتماع عید کہلاتا ہے کیونکہ اس کے آنے سے خوشی لوٹ آتی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ عید کو عید اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں اللہ تعالیٰ بندوں پر رحمت ومغفرت کے ساتھ عود کرتا ہے اسی لیے کہا گیا ہے کہ لیس العید لمن لبس الجدید انما العید لمن أمن الوعید۔ "عید اس کی نہیں جو نئے کپڑے پہن لے عید تو اس کی ہے جو قہر الٰہی کی دھمکی سے محفوظ رہے" اور اس کی جمع اعیاد ہے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ نمازِ عید امام شافعیؒ اور جمہور علماء کے نزدیک سنتِ مؤکدہ ہے اور شافعیہ میں سے ابو سعید اصطخریؒ نے کہا ہے کہ نمازِ عید فرضِ کفایہ ہے اور حسبِ بیان ابہریؒ ابو حنیفہؒ کے نزدیک واجب ہے اور اس کے وجوب کا باعث حضورؐ کا اس پر ہمیشگی فرمانا اور کبھی ترک نہ کرنا ہے اور اس کی تائید ابن حبانؒ کے بیان سے ہوتی ہے کہ پہلی نماز عید الفطر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے

---

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۴۹۲، مرقات ج ۳ ص ۲۸۱ [2] مرقات ج ۳ ص ۲۸۴۔ مظاہر حق ر

دوسرے سال پڑھی تھی اور یہی وہ سال تھا جس کے شعبان میں رمضان کے روزے فرض ہوئے تھے پھر حضورؐ نے آخر تک اس پر دوام فرمایا۔ واللہ اعلم۔

[1] حنفیہ کے نزدیک عیدین کی شرائط بھی جمعہ کی مانند ہیں اور اسی طرح تکبیرات تشریق کی شرائط بھی وہی ہیں (یعنی امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک) اور صاحبینؒ کے نزدیک تکبیراتِ تشریق گاؤں میں بھی کہی جائیں۔

الفصل الاوّل

حدیث ۱: عن ابی سعید الخدریؓ قال کان النبی صلی اللہ علیہ و سلم یخرج یوم الفطر والاضحیٰ الی المصلیٰ[1] فاول شیئ یبدأ به الصلوٰة ثم ینصرف فیقوم مقابل الناس والناس جلوس علیٰ صفوفهم فیعظهم ویوصیهم ویامرهم وان کان یرید ان یقطع بعثاً قطعه او یامر بشیئ امر به ثم ینصرف۔ متفق علیه۔

ترجمہ: حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جنابِ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن عیدگاہ کی طرف شہر سے باہر نکلتے تھے پس سب پہلی چیز جسے شروع فرماتے تھے وہ نماز ہوتی پھر لوگوں کی طرف پھرتے اور ان کے سامنے کھڑے ہو جاتے اور لوگ اپنی صفوں میں بیٹھے ہوتے تھے۔ پس آپؐ انہیں وعظ و نصیحت فرمایا کرتے تھے اور حکم دیا کرتے تھے۔ اور اگر یہ ارادہ ہوتا کسی لشکر کو جہاد و قتال کے لیے بھیجیں تو اسے روانہ فرماتے یا اگر ارادہ ہوتا کہ لوگوں کو کوئی اور حکم دیں تو وہ حکم ارشاد فرماتے پھر واپس تشریف لاتے۔ بخاری و مسلم۔

شرح: مدینہ[1] منورہ کی عیدگاہ شہر سے باہر ہے۔ کہتے ہیں کہ حضورؐ کے گھر مبارک سے اس کی مسافت ایک ہزار قدم ہے۔ وہ جگہ بہت بابرکت ہے اور اب اس کے گرد چار دیواری بھی بنا دی گئی ہے۔ شرح السنہ میں لکھا ہے کہ امام عید کے لیے شہر سے باہر نکلے لیکن عذر کے باعث نمازِ عید جامع مسجد میں پڑھائے۔ علامہ ابن الہمامؒ فرماتے ہیں کہ سنت یہ ہے کہ امام خود تو لوگوں سمیت عیدگاہ کی طرف جائے لیکن ہر شہر میں کمزوروں اور معذوروں[2] کو نماز پڑھانے کے لیے کسی اور کو اپنا نائب مقرر کر جائے۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ یہ کلام مسجدِ حرام اور مسجد بیت المقدس کے علاوہ میں ہے کیونکہ ان دونوں جگہوں میں سب نمازیں پڑھنا افضل ہے بسبب اتباعِ صحابہؓ و تابعینؒ کے اور بسبب ان دونوں مسجدوں کی عظمت و[3] بزرگی کے۔ حضورؐ کے زمانے میں عیدگاہ میں منبر نہ تھا اس لیے آپؐ زمین پر ہی کھڑے ہو کر

---

[1] فیض الباری ج ۲ ص ۴۵۹ [2] مظاہر حق ج ۱ ص ۴۹۴ ، مرقات ج ۳ ص ۲۸۴

عید کا خطبہ ارشاد فرماتے تھے بعد میں جب لوگ زیادہ ہو گئے تو آواز کو دور تک پہنچانے کے لیے منبر بنائے گئے اور عید میں حضورؐ کا وعظ دنیا کی بے ثباتی اور زہد پر ہوتا تھا اور آخرت کی ترغیب و ترہیب بیان فرماتے تھے تاکہ لوگوں کو غفلت نہ گھیر لے۔ اور وہ اطاعت سے منہ موڑ کر گناہوں میں مصروف نہ ہو جائیں جیسا کہ اس زمانے کے لوگوں کا حال ہے اور حضورؐ انہیں تقویٰ اختیار کرنے، شرک و کفر سے بچنے، فرمانبرداری اختیار کرنے اور ماسوی اللہ سے تعلق توڑ کر اللہ معبودِ حقیقی سے جوڑنے کی وصیت فرمایا کرتے تھے۔ اور خطبہ کے دوران میں واجبات و احکامِ اسلام بیان فرماتے تھے۔

حدیث ۲: وعن جابرؓ بن سمرۃ قال صلیت مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم العیدین غیر مرۃ ولا مرتین بغیر اذان ولا اقامۃ۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ: حضرت جابر بن سمرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عیدین کی نماز کئی بار پڑھی ہے اذان اور اقامت کے بغیر۔ مسلم۔

شرح: عیدین کی نماز کے لیے اذان و اقامت نہیں ہے۔ امت کا عمل اسی پر رہا ہے۔ حضورؐ کے زمانے سے لے کر اب تک یہ سلسلہ اسی طرح قائم چلا آرہا ہے۔ شرح السنۃ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کا اور ان کے بعد والوں کا اسی پر عمل رہا ہے۔ الازہار میں لکھا ہے کہ عیدین کے لیے اذان و اقامت مکروہ ہے اور عام نوافل کا بھی یہی حکم ہے۔ نمازِ عید کے لیے الصلوٰۃ جامعۃ کی آواز لگانا تاکہ لوگ اسے سن کر نمازِ عید کے لیے نکل آئیں، مستحب ہے۔[1]

اس مضمون کی احادیث جابرؓ بن سمرۃ کے علاوہ صحاح میں عبداللہؓ بن عباس، سعد ابن ابی وقاصؓ، براءؓ بن عازب اور ابورافعؓ سے مروی ہیں اور یہ احادیث عیدین کی نماز میں اذان و اقامت کے مشروع نہ ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ علامہ عراقیؒ نے کہا ہے کہ اس مسئلہ پر علماءِ امت کا اجماع ہے۔ ابن قدامہؒ نے المغنی میں لکھا ہے کہ اس باب میں ہمیں کسی معتد بہ شخصیت کا اختلاف معلوم نہیں ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلا شخص جس نے عید کے لیے اذان دلوائی وہ زیاد تھا۔ علامہ ابن العربیؒ فرماتے ہیں کہ مصنف ابن ابی شیبہ میں سب سے پہلے اس بدعت کے ایجاد کرنے کی نسبت جو امیر معاویہؓ کی طرف کی گئی ہے، یہ نسبت غلط ہے اور اس کے بیان کرنے والے کا کوئی اعتبار ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔[2]

---

[1] مرقات ج ۳ ص ۲۸۵، مظاہر حق ج ۱ ص ۴۹۴۔ [2] نیل الاوطار ج ۳ ص ۱۸۰۔

حدیث ۳ : وعن ابن عمرؓ قال کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم وابوبکرؓ وعمرؓ یصلون العیدین قبل الخطبۃ ۔ متفق علیہ ۔

ترجمہ : حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور حضراتِ ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما نمازِ عیدین خطبہ سے پہلے پڑھا کرتے تھے ! بخاری ومسلم ۔

شرح : ابنؓ منذرؒ فرماتے ہیں کہ عیدین کا خطبہ نماز کے بعد ہونے پر تمام فقہاء کا اجماع ہو چکا ہے اور اس کے خلاف کرنا جائز نہیں ہے گو نماز اس صورت میں بھی سب کے نزدیک ہو جائے گی ۔ اور اس بدعت کا موجد مروان ابن الحکم تھا جب وُہ حاکمِ مدینہ تھا تو نمازِ عید سے پہلے ہی خطبہ شروع کر دیتا ہے کیونکہ لوگ دلی نفرت کی بناء پر بعد میں خطبہ نہیں سنتے تھے ۔ صحابہؓ نے اس پر بُرا مانا اور ابو سعید الخدریؓ نے برسرِ عام اسے ٹوک دیا ۔ خطبۂ جمعہ چونکہ صحتِ نماز کے لیے شرط تھا اس لیے نماز پر مقدم کیا گیا اور قرآن کی اِس آیت سے خطبۂ جمعہ کی تقدیم نکلتی ہے ۔ فاذا قضیت الصلٰوۃ فانتشروا فی الارض الخ ۔ اور نمازِ عید چونکہ فرض نہیں لہٰذا اس کا خطبہ نماز سے مؤخر کیا گیا ۔ نیز اس نماز کا وقت بھی جمعہ کی نسبت زیادہ وسیع ہے اس لیے بھی نماز پہلے رکھی گئی ہے اور خطبہ بعد میں ۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شیخینؓ کا ذکر اس لیے کیا گیا تاکہ ثابت کیا جائے کہ یہ سنت معمول بہا رہی ہے اور اس میں کوئی تغیر یا نسخ واقعہ نہیں ہوا ۔ نہ اس لیے کہ معاذ اللہ وہ حضرات تشریع کے معاملے میں حضورؐ کے ساتھ شریک ہیں ۔ نیز حضورؐ نے ان دونوں حضرات کے اتباع کا حکم دے رکھا تھا ۔ جیسا کہ بہت سی صحیح احادیث میں واضح وثابت ہے ۔

علامہ[۲] شوکانیؒ فرماتے ہیں کہ ساری امت اس مسئلہ پر متفق ہے کہ عید کا خطبہ نماز کے بعد ہے اور یہی حضورؐ اور ان کے خلفاءِ راشدینؓ کی سنتِ ثابتہ ہے اور حضرت عمر، عثمان، اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم کے متعلق جن لوگوں نے اس کے خلاف نقل کیا ہے وہ ثابت نہیں ہے ۔ اس باب میں بنی امیہ کے سوائے ساری امت متفق ہے اور بنی امیہ کی اس بدعت پر صحابہؓ وتابعینؒ نے نکیر فرمایا تھا اور صحیحین کی روایت میں صاف موجود ہے کہ اس بدعت کو ایجاد کرنے والا مروان تھا ۔ اسی زمانے میں بصرہ میں زیاد نے بھی ایسا ہی کیا تھا ۔ واللہ

---

[۱] مظاہر حق ج ۱ صـ ۴۶۴ ، مرقات ج ۳ صـ ۲۸۵ ، ۲۸۶ ۔ [۲] نیل الاوطار ج ۳ صـ ۱۷۸ ۔

اعلم بالصواب۔

حدیث ۴: وسُئل ابن عباسؓ أشهدت مع رسول الله صلى الله عليه وسلم العيد قال نعم خرج رسول الله صلى الله عليه وسلم فصلى ثم خطب ولم يذكر اذانا ولا اقامة ثم اتى النساء فوعظهن وذكرهن وامرهن بالصدقة فرأيتهن يهوين الى آذانهن وحلوقهن يدفعن الى بلالؓ ثم ارتفع هو وبلالؓ الى بيته۔ متفق عليه۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا گیا کہ کیا آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عید میں حاضر ہوئے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ ہاں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عیدگاہ کو نکلے پس لوگوں کو نماز پڑھائی پھر خطبہ دیا — اور ابن عباسؓ نے اذان واقامت کا ذکر نہیں فرمایا۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ پھر حضورؐ عورتوں کی طرف تشریف لے گئے پس انہیں وعظ ونصیحت فرمائی اور انہیں صدقہ کرنے کا حکم دیا پس میں نے دیکھا کہ وہ اپنے ہاتھ اپنے کانوں اور گلوں کے زیور اتارنے کے لیے بڑھا رہی تھیں اور بلالؓ کو زیور دے رہی تھیں۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور بلالؓ واپس گھر کو تشریف لے آئے۔ بخاری ومسلم۔

شرح[1]: حضورؐ کے زمانے میں عورتیں بلکہ بچے بھی عیدگاہ میں عید کے لیے جایا کرتے تھے کیونکہ اس میں اسلام کی شانِ اجتماعیت اور شان وشوکت پائی جاتی ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عورتیں مردوں سے الگ اور ان سے دور ہوتی تھیں۔ اور حضورؐ نے انہیں، الگ وعظ فرمایا ایک تو اس لیے کہ شاید مردوں کی صفوں سے دور ہونے کے باعث ان تک خطبہ کی آواز پوری طرح نہ پہنچی تھی یا بعض خاص احکام دینے کے لیے حضورؐ ان کی طرف تشریف لے گئے۔ اور دوسری روایات میں موجود ہے کہ ابن عباسؓ اس وقت چھوٹے بچے ہی تھے اسی لیے عورتوں میں جانا اور ان کا زیور وغیرہ آتار کر بلالؓ کی طرف پھینکنا دیکھ سکے تھے اور دوسری حدیث میں ہے کہ بلالؓ اِن زیوروں کو ایک کپڑے میں سمیٹتے جاتے تھے تاکہ جمع کر کے حقداروں کو پہنچا دیں۔ اور بلالؓ چونکہ حضورؐ کے خادمِ خاص تھے۔ اور صدقہ کے قبض کے متولی تھے اس لیے وہ بھی حضورؐ کے ساتھ ہی عورتوں کے مجمع کی طرف گئے تھے اور اس صدقہ سے مراد صدقہ، فطر، عام صدقہ نفلی اور زکوٰۃ وغیرہ سبھی ہو سکتے ہیں۔

---

[1] فتح الباری ج ۴ ص ۵۲۸۔

حدیث ۵ : وعن ابن عباسؓ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم صلی یوم الفطر رکعتین لم یصل قبلھما ولا بعدھما. متفق علیہ۔

ترجمہ : حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عید الفطر کے دن دو رکعت نماز پڑھی نہ اس سے پہلے نہ اس نماز کے بعد کچھ پڑھا۔ بخاری و مسلم۔

شرح : [1] حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ امام بویطیؒ کی کتاب میں لکھا ہے کہ حضورؐ کی نماز کی نفی سے مراد عید گاہ میں نفی ہے۔ بالخصوص نمازِ عید سے پہلے۔ اور ابو سعیدؓ کی ایک حدیث اس کی تائید کرتی ہے کہ حضورؐ عید سے پہلے کچھ نہ پڑھتے تھے اور گھر آکر دو رکعتیں پڑھتے تھے یہ حدیث ابن ماجہؒ نے سندِ حسن سے روایت کی ہے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے۔ اور امام اسحاقؒ نے اسی کو اختیار فرمایا ہے اور امام ابو حنیفہؒ کا مذہب بھی یہی ہے۔ اور بعض مالکیہؒ نے عید گاہ میں نفل نہ پڑھنے پر اجماع نقل کیا ہے۔ امام ابن العربیؒ نے کہا ہے کہ عید گاہ میں اگر نفل حضورؐ پڑھتے تو انہیں کوئی نقل کرتا۔ اور جس نے اس کی اجازت دی ہے اس نے یہ دیکھا کہ مطلقاً یہ نماز کا وقت ہے اور جس نے ترک کیا اس نے حضورؐ کے فعل کی اقتداء کی اور یہی راہِ ہدایت ہے۔ حاصل یہ ہے کہ نمازِ عید کی کوئی سنت پہلے یا بعد میں ثابت نہیں ہوئی اور جنہوں نے اسے جمعہ پر قیاس کیا ہے وہ اس کے خلاف ہیں لیکن مطلقاً نفل میں کسی خاص دلیل سے نہی ثابت نہیں ہوئی۔ اور مکروہ اوقات میں ہر روز نفل مکروہ ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۶ : وعن ام عطیۃؓ قالت امرنا ان نخرج الحیّض یوم العیدین وذوات الخدور فیشھدن جماعۃ المسلمین ودعوتھم وتعتزل الحیّض عن مصلاھن قالت امرأۃ یارسول اللہ احدانا لیس لھا جلباب قال لتلبسھا صاحبتھا من جلبابھا۔ متفق علیہ۔

ترجمہ : حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہمیں حضورؐ کے زمانے میں حکم دیا گیا تھا کہ حائضہ عورتوں کو اور پردہ نشین عورتوں کو عیدین کے روز باہر نکالیں تاکہ وہ مسلمانوں کی جماعت اور دعا میں حاضر ہوں اور حیض والی عورتیں نماز گاہ سے الگ رہیں۔

---

[1] فتح الباری ج ۲ ص ۵۲۴، مظاہر حق ج ۱ ص ۴۹۵، مرقات ج ۲ ص ۲۸۷۔

ایک عورت نے کہا یا رسول اللہ! اگر ہم میں سے کسی کے پاس چادر نہ ہو تو کیا کرے؟
حضورؐ نے فرمایا کہ اس کی ساتھن اسے چادر اوڑھا دے۔ بخاری و مسلم۔

شرح: امام خطابیؒ[1] فرماتے ہیں کہ عیدگاہ میں حاضری کا حکم تو سب عورتوں کو دیا گیا لیکن نماز ان کے لیے ہی تھی جنہیں عذر نہیں اور عذر والیاں دعا و برکت میں شامل رہی۔ اسی طرح عورتوں کو دینی محفلوں میں لانے اور وعظ و نصیحت سنوانے کا حکم ہے۔ لیکن اس زمانے میں فتنہ کا زیادہ خدشہ ہے لہٰذا عورتیں عیدگاہ میں نہ لے جائی جائیں۔ امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ شروع اسلام میں مسلمانوں کی تعداد کم تھی حضورؐ نے ان کی شان و شوکت اور تعداد کو ظاہر کرنے کے لیے عورتوں اور بچوں کو بھی باہر عیدگاہ میں لے جانے کا حکم دیا لیکن اب یہ ضرورت باقی نہیں رہی۔ اور یہ جو فرمایا کہ اسے چادر والی اپنی چادر اڑھا دے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جس کے پاس زائد چادر ہو وہ دوسری کو دیدے یا یہ مطلب ہے کہ اسے اپنی چادر کے ایک طرف چھپا کر لے جائے۔ اور جلباب کا معنیٰ ہے ایک بڑی سی چادر جس میں سارا جسم چھپ جائے۔

علامہ ابن حجرؒ[2] فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ اگر فتنے کا خوف نہ ہو تو عورتیں مردوں کے مجمعوں میں شرعی پابندیوں کے ساتھ حاضر ہو سکتی ہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ شریف زادیوں، اور پردہ داروں کے لیے ضروری ہے کہ جب باہر نکلنا ہو تو ضروری پردے میں نکلیں۔ اور حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عورتوں کے لیے پردہ کے کپڑے تیار کرنا چاہئیں۔ اور اس حدیث سے نمازِ عید کے وجوب پر بھی استدلال کیا گیا ہے لیکن عورتوں کا باہر لے جانا شعارِ اسلام کے اظہار کے لیے تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۷: وعن عائشۃؓ قالت ان ابا بکرؓ دخل علیھا وعندھا جاریتان فی ایام منیً تدفعان و تضربان وفی روایۃٍ تغنیان بما تقاولت الانصار یوم بعاث والنبی صلی اللہ علیہ متغش بثوب فانتھرھما ابوبکرؓ فکشف النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن وجھہ فقال دعھما یا ابا بکرؓ فانھا ایام عید وفی روایۃ یا ابا بکرؓ ان لکل قوم عیدا وھذا عیدنا۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ سلام اللہ علیہا فرماتی ہیں کہ جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ

---

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۴۹۵، مرقات ج ۳ ص ۲۹۸۔ [2] فتح الباری ج ۲ ص ۵۳۰۔

میرے پاس تشریف لائے اور میرے پاس عید الاضحیٰ میں دو انصاری چھوکریاں تھیں جو دف بجاتی اور تالی پیٹتی تھیں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ وہ بُعاث کی لڑائی میں جو انصار نے شعر کہے تھے گا رہی تھی اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ایک کپڑا اوڑھے ہوئے تھے پس حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان دونوں بچیوں کو ڈانٹا تو جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا چہرہ مبارک کھولا اور فرمایا اے ابوبکرؓ! انہیں چھوڑ دو کیونکہ یہ عید کے دن ہیں۔ اور ایک روایت میں ہے اے ابوبکرؓ! ہر قوم کی ایک عید ہوتی ہے اور یہ ہماری عید ہے۔ بخاری و مسلم۔

شرح: اس حدیث کی شرح میں کافی طویل کلام کیا گیا ہے۔ مختصراً کچھ کلام سے پہلے ایک دو باتیں یاد رکھ لینی لازم ہیں:۔

الف۔ یہ بچیاں چھوٹی چھوٹی تھیں جوان لڑکیاں نہ تھیں۔

ب۔ پیشہ ور مُغنیہ نہ تھیں جیسا[1] کہ بخاری کی دوسری روایات میں ہے لیستا بِمُغنِّیتین " وہ گانے والی نہ تھیں۔

ج۔ وہ اہل عرب کے رواج کے مطابق جنگوں کے متعلق کہے گئے شعر پڑھتی تھیں اور اچھلتی کودتی تھیں۔

د۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عام دلائلِ شرع سے اس فعل کو ناجائز سمجھا تھا اور ان کا خیال تھا کہ حضورؐ سو رہے ہیں یا اس سے بالکل غافل ہیں لیکن حضورؐ نے یہ فرما کر دَعْهما الخ ظاہر فرما دیا کہ کبھی کبھی عید بقرعید کے موقع پر اگر اتنی شرطوں سے اس قسم کی چیز ہو جائے تو مباح ہے۔

ھ۔ بخاری میں اس سے پہلے باب میں بھی یہی حدیث آئی ہے اس میں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے ان چھوکریوں کو چونٹی بھری تو فوراً نکل گئیں اور معاملہ ختم ہو گیا۔

علامہ ابن حجرؒ[2] عسقلانی فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے بعض صوفیاء نے آلاتِ غناء کے ساتھ سماع کا جائز ہونا ثابت کرنا چاہا ہے حالاں کہ حدیث کے الفاظ ولیستا بمُغنِّیتین سے ان کی ساری تعمیر کردہ عمارت ایک لمحہ میں مسمار ہو جاتی ہے۔ اور ان اشعار میں کوئی حرام چیز، کوئی شہوانی قصہ وغیرہ بالکل نہ تھا اور گانے والیاں بالکل نوعمر بچیاں تھیں اور اتفاقاً دف پہ آواز نکال کر اور اچھل کود کر خوش ہو رہی تھیں۔ لہذا اتنی سی چیز کو کسی حرام یا مقدمہ حرام کی دلیل بنانا سفاہت یا الحاد ہی ہو سکتا ہے اور اصل میں لہو و لعب سے پرہیز

---

[1] بخاری مع فتح الباری ج ۴ صـ ۵۱۸۔ [2] ایضاً صـ ۵۱۷۔

کا حکم دلائلِ شرع سے ثابت ہے ۔ لہٰذا جتنا اس حدیث سے ثابت ہے اتنا ہی مباح کہا جائے گا نہ کہ اس سے زائد کچھ اور بھی ۔

علماء[1] نے خالی دف بجانا عید میں اور اعلانِ نکاح میں جائز رکھا ہے لیکن جھانجھ دار دف جو آلاتِ غناء اور اسبابِ لہو میں سے ہے ناجائز ٹھہرایا ہے اور اس حدیث میں جس دف کا ذکر ہے وہ مطلق دف تھی جھانجھ دار نہ تھی اور چھوٹی چھوٹی بچیوں کا شجاعت انگیز اشعار پڑھنا اور جہاد پر آمادہ کرنا جائز ہے لیکن جوان لڑکیوں سے پڑھوانا اور سننا جائز نہیں ۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس حدیث کی دوسری روایت کے مطابق حضرت عائشہ رضؓ کو ڈانٹا تھا ۔ حدیث کے الفاظ ہیں فانتھرنی وقال مزمارۃ الشیطان عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۔ اس حدیث سے کہ صرف عید اور اعلانِ نکاح کے موقع پر دف کا استثناء ہے ورنہ ناجائز ہے ۔ حضورؐ نے آلاتِ غناء کے استعمال اور ان کے سننے سے منع فرمایا ہے ، حدیث میں ہے ۔ استماع الملاهی معصیة والجلوس علیها فسق والتلذذ بها من الکفر ۔

علامہ سید[2] انور شاہ الکشمیری فرماتے ہیں کہ ایک چیز بعض دفعہ اباحت کے آخری مرتبہ پر ہوتی ہے اس سے اگر تجاوز کرے تو حرمت کا مقام آجاتا ہے چنانچہ یہ موقع بھی ایسا ہی تھا ۔ لیکن باوجود اباحت کے حضورؐ کے منہ پھیر کر اور کپڑا اوڑھ کر سو جانے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ قصداً اسے تلذذ کے لیے نہیں سن رہے ہیں لیکن منع اس لیے نہ فرماتے تھے کہ اباحت باقی رہے ۔ دراصل تشریع کا معاملہ نہایت نازک ہے اگر حضورؐ بھی منع فرما دیتے تو اتنی ذرا سی گنجائش بھی باقی نہ رہتی ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

آلاتِ[3] موسیقی کے ناجائز ہونے پر سب کا اتفاق ہے اور غناء کو بھی اکثر فقہاء نے مکروہ اور بعض نے حرام تک کہا ہے ائمہ اربعہ اسی کے قائل ہیں کہ مکروہ ہے لیکن اگر غناء میں مذموم اشعار ، شہوت انگیز اشارے کنائے اور دوسری ناجائز چیزیں شامل ہوں تو اس کے حرام ہونے پر اتفاق ہے ۔ لیکن جو محرمات سے خالی ہو اور اس میں فتنہ و فساد کا بالکل اندیشہ نہ ہو تو تھوڑا سا شادیوں میں اور عیدوں اور خوشیوں کے مواقع پر جائز ہے ۔ اور صوفیاء میں جو سماع مختلف فیہ ہے وہ وہی ہے جو آلاتِ موسیقی سے بالکل خالی ہو ۔ آلات سمیت کسی صاحبِ دین و تقویٰ نے اجازت نہیں دی ۔ اور ایسے غیر کا قول و فعل شرع میں حجت نہیں ۔ واللہ اعلم بالصواب

حدیث ۸ : وعن انسؓ قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] مظاہر حق ص ۴۹۶ ج ۱ ، مرقات ص ۲۸۹ ج ۳ ، ص ۲۹۰ ۔ [2] فیض الباری ص ۳۵۷ ج ۲ ۔ [3] مظاہر حق ص ۴۹۷ ج ۱ ۔

لا یغدو یوم الفطر حتی یأکل تمرات ویأکلهن وترًا۔

رواہ البخاری۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر کے دن چند کھجوریں کھائے بغیر عید گاہ کو تشریف نہیں لے جاتے تھے اور کھجوریں طاق عدد میں کھاتے تھے۔ بخاری۔

شرح: علامہ قسطلانی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ شروع اسلام میں نماز عید الفطر سے پہلے کھانا جائز نہ تھا لیکن بعد میں یہ حکم منسوخ ہو گیا تھا اس لیے حضور اس میں بڑا اہتمام کرتے تاکہ یہ نسخ سب کو معلوم ہو جائے اور یہ حکم استحبابی ہے۔ اور کھجور کی خصوصیت یہ ہے کہ روزے سے جو نظر میں ضعف پیدا ہوتا ہے یہ نظر کو تقویت پہنچاتی ہے بلکہ مطلقاً میٹھی چیز میں بھی یہ تاثیر موجود ہے مثلاً شہد وغیرہ میں۔

[1] عید الفطر کے دن جلدی افطار کرنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ رمضان اور غیر رمضان میں فرق ہو جائے کیونکہ اس سے قبل روزہ فرض تھا اور عید کے دن افطار فرض ہے۔ اور حضور کو ہر معاملے میں طاق کی رعایت مرغوب تھی چنانچہ ارشاد ہے ان اللہ وتر یحب الوتر۔ شیرینی ایمان کے موافق ہے اور دل کو نرم کرتی ہے اس لیے حضور کو مرغوب تھی۔

حدیث ۹: وعن جابرؓ قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا کان یوم عید خالف الطریق۔ رواہ البخاری۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب عید کا دن ہوتا تو جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم آمد و رفت کے راستے میں تبدیلی فرمایا کرتے تھے۔ بخاری۔

شرح [3]: یعنی ایک راستے سے عید گاہ کو تشریف لے جاتے تھے اور دوسرے سے واپس تشریف لایا کرتے تھے۔ اس میں بہت سی حکمتیں تھیں مثلاً دونوں راستوں کے ایمانداروں کو برکت شامل ہو جائے۔ لوگ زیادہ سے زیادہ مل لیں اور مسائل دریافت کر لیں۔ ذکر اللہ کی اشاعت مد نظر تھی۔ بعض کفار گھات میں ہوتے تھے ان کے مکر سے بچنا بھی مد نظر تھا۔ جاتے وقت لمبا راستہ اختیار فرمانا تاکہ عبادت کے لیے طویل راہ سے جانے کا زیادہ ثواب ہو اور آتے وقت مختصر راستہ اختیار فرمانا تاکہ گھر جلدی پہنچ جائیں۔ دونوں راستوں کے محتاجوں کو صدقہ دینا بھی مد نظر ہوتا تھا علاوہ ازیں دونوں راستوں کا گواہ

---

[1] ارشاد الساری ج ۲ ص ۲۳۵۔ [2] مظاہر حق ج ۱ ص ۴۹۹، مرقات ج ۳ ص ۲۹۰۔ [3] ایضاً ص ۲۹۱۔

بنانا، اپنے اقارب کے قبور کی زیارت، اور اسلامی شان وشوکت کا اظہار بھی مدنظر ہوتا تھا۔ نیز ازدحام سے بچنا اور تفائل کے طور پر تغیر حال بھی محبوب تھا۔

واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۱۰: وعن البراءؓ قال خطبنا النبی صلی اللہ علیہ وسلم یوم النحر فقال اول مانبدأ بہ فی یومنا ھذا ان نصلی ثم نرجع فننحر فمن فعل ذلک اصاب سنتنا ومن ذبح قبل ان نصلی فانما ھو شاۃ لحم عجّلہ لاھلہ لیس من النسک فی شیئ۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں قربانیوں کے دن خطبہ دیا تو فرمایا کہ اپنے اس دن میں ہم سب سے پہلی چیز جو شروع کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ نماز پڑھیں اور پھر واپس لوٹیں تو قربانی کریں۔ پس جس نے ایسا ہی کیا اس نے ہماری سنت کو لیا اور جس نے ہمارے نماز پڑھنے سے پہلے ہی جانور ذبح کر لیا تو وہ گوشت کی بکری تھی جو اس نے گھر والوں کے لیے جلدی سے ذبح کر لی ہے قربانی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ بخاری ومسلم۔

شرح: علماء[1] اسلام کا اس امر پر اجماع ہے کہ عیدالاضحیٰ کے قربانی طلوع فجر سے قبل ہرگز جائز نہیں ہے۔ پھر شافعیہ کے نزدیک سورج جب ایک نیزہ کے بقدر بلند ہو جائے اور اس کے بعد دو رکعات اور خطبہ کا وقت بھی گزر جائے تو قربانی جائز ہے چاہے ابھی امام نے نماز پڑھی ہو یا نہ پڑھی ہو۔ اور شہری ہو یا دیہاتی ہو اور قربانی کا آخری وقت تیرھویں ذی الحجہ کے غروب آفتاب تک ہے اور قربانی ان کے نزدیک سنت ہے۔ حنفیہ کے نزدیک قربانی واجب ہے یعنی صاحب نصاب پر۔ اگرچہ اس کا نصاب نامی نہ ہو اور قربانی کا وقت امام کی نماز کے بعد ہے شہر والوں کے لیے۔ دیہات والے طلوع فجر کے بعد کسی وقت بھی کر سکتے ہیں اور اس کا آخری وقت ذی الحجہ کی بارھویں کے غروب آفتاب تک ہے۔

علامہ[2] علی القاریؒ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث کا ظاہر امام ابو حنیفہؒ، مالکؒ اور احمدؒ کی حجت ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قربانی کا وقت امام کی نماز اور خطبہ سے فراغت کے بعد ہوتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

---

[1] مظاہر حق ج ۱ ص۵۰۰۔ [2] مرقات ج ۳ ص ۲۹۱، ۲۹۲۔

حدیث ۱۱: وعن جندب بن عبد اللہ البجلی قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من ذبح قبل الصلوٰۃ فلیذبح مکانہا اُخری ومن لم یذبح حتی صلینا فلیذبح علی اسم اللہ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت جندب بن عبد اللہ بجلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جنابِ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے نمازِ عید سے قبل قربانی ذبح کر دی تھی وہ اس کی جگہ اور جانور ذبح کرے اور جس نے ہمارے نماز پڑھنے تک ذبح نہیں کی تھی وہ اللہ کا نام لے کر اب ذبح کر ڈالے۔ بخاری و مسلم۔

شرح: یہ حدیث بھی جمہور علماء کے مسلک کے مطابق صریح ہے کیونکہ نماز سے قبل ذبح کی جانے والی قربانی کو حضورؐ نے قربانی ہی شمار نہیں فرمایا اور دوبارہ قربانی کرنے کا حکم دیا۔ فلیذبح علی اسم اللہ کے لفظ سے معلوم ہوا "ذبح" خدا کے نام پر ہی ہوتا ہے۔ اس سے دونوں چیزیں ذبح بھی اور علی اسم اللہ بھی ثابت ہوئیں۔

حدیث ۱۲: وعن البراءؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من ذبح قبل الصلوٰۃ فانما یذبح لنفسہ ومن ذبح بعد الصلوٰۃ فقد تم نسکہ واصاب سنۃ المسلمین۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت براء رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جنابِ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے نماز سے قبل قربانی ذبح کی تو اس نے اپنے لیے ذبح کی اور جس شخص نے نماز کے بعد ذبح کی تو اس کی قربانی کی پوری ہو گئی اور وہ اہلِ اسلام کے طریقے کو پہنچ گیا۔ بخاری و مسلم۔

شرح: فانما یذبح لنفسہ[1] یعنی یہ شخص محض گوشت کھانے کے لیے قربانی کا نام لے رہا ہے ورنہ اس نے ان احکام کو ملحوظ نہیں رکھا جو صاحب شریعت نے دیئے ہیں۔ علامہ علی القاریؒ فرماتے ہیں کہ امام شافعیؒ پر بڑا تعجب ہے اور ان سے یہ بات بڑی عجیب و غریب سرزد ہوئی ہے کہ ان احادیث کی واضح نصوص کے باوجود اور ان کی روایات کی صحت کے باوصف اور دلالت کے واضح ہونے کے باوجود انہوں نے کیونکر جمہور علماء کی مخالفت کی اور ان نصوص کو ان کے ظاہر سے پھیرا ہے اور ان کی حقیقت سے الگ کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

لہ مرقات ج ۳ ص ۲۹۱، ۲۹۲۔ لہ مظاہر حق ج ا ص ۵، مرقات ج ۳ ص ۲۹۲۔

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ہم نے قربانی کا وقت زمانۂ صلوٰۃ سے وابستہ کیا ہے نہ کہ فعلِ صلوٰۃ کے ساتھ، حالانکہ حدیث کا ظاہر فعلِ صلوٰۃ ہی ہے کیونکہ شہروں اور دیہات میں یہ چیز لوگوں کے لیے زیادہ ضبط و نظم پیدا کرنے والی ہے لیکن حافظ صاحبؒ کا یہ قول دیہات والوں کے لیے تو درست ہے کیونکہ ان پر تو قربانی واجب ہے نمازِ عید واجب نہیں لیکن شہر والوں کے حق میں کیسے درست ہو سکے گا؟ حالانکہ حدیثوں میں بار بار حضورؐ سے اس کے خلاف صراحت آئی ہے۔

حدیث ۱۳۱ : وعن ابن عمرؓ قال کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یذبح وینحر بالمُصلّٰی۔ رواہ البخاری۔

ترجمہ : حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم بھیڑ، بکری، گائے اور اونٹ عیدگاہ میں ذبح فرمایا کرتے تھے۔ بخاری۔

شرح : حضورؐ ایسا اس لیے فرماتے تھے کہ قربانی کا اظہار ہو اسے برسرِ عام ذبح کرنے سے لوگ آپؐ کی اقتداء کریں۔ بھیڑ، بکری، دنبہ، گائے، بھینس اور اونٹ نر و مادہ کے سوا کسی اور جانور کی قربانی ثابت نہیں ہے۔ اونٹ کے حلال کرنے کو نحر کہا جاتا ہے، وہ یوں کہ کھڑے کھڑے اس کے سینے پر نیزہ مارتے ہیں جس سے وُہ زمین پر گر پڑتا ہے تو پھر ذبح کر لیتے ہیں ویسے اونٹ کو ذبح کرنا بھی جائز ہے لیکن نحر افضل ہے اور عام طریقے پر جانور کو حلال کرنا ذبح کہلاتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

باب فی الاضحیۃ

ؔ اُضحیہ ہمزہ کے ضمہ اور یا کی شد سے ہے۔ اور بعض دفعہ بکسر ہمزہ اِضحیہ بھی کہتے ہیں، امام نوویؒ شرح مسلم میں فرماتے ہیں کہ اضحیہ کی چار لغات ہیں اور اضحیہ سے مراد اس جانور کا نام ہے جسے دس ذی الحجہ کو ذبح کیا جاتا ہے۔ پہلی لغت اُضحِیّہ، دوسری اِضحیہ اور دونوں کی جمع اضَاحی ہے یا کی شدت سے یا بغیر شد کے۔ تیسری لغت ضَحِیّہ ہے اور اس کی جمع ضحایا ہے اور چوتھی لغت اَضحاۃ ہے اس کی جمع اضحیٰ ہے اور اس کی آخری لغت کی بناء پر ذی الحجہ کو یوم الاضحیٰ کہتے ہیں۔

لہ مرقات ج ۳ صـ ۲۹۲، مظاہر حق ج ا صـ ۵۰۰۔ ؔ مرقات ج ۳ صـ ۳۰۲۔

سنت سے قربانی کا مشروع ہونا بالاجماع ثابت ہے اور اس کی اصل اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فصل لربك وانحر جس کا معنیٰ مفسرین کی ایک جماعت نے یہ کیا ہے کہ "نمازِ عید پڑھو اور قربانی کرو"۔ قربانی امام مالکؒ، شافعیؒ، احمدؒ ابو یوسفؒ اور محمدؒ کے نزدیک سنتِ مؤکدہ ہے اور امام ابو حنیفہؒ اسے واجب کہتے ہیں لیکن وجوب کو شہر والوں اور مقیموں سے خاص کرتے ہیں اور اس کے وجوب کے لیے نصاب کا اعتبار کیا گیا ہے۔ اور حضورؐ دس سال تک مدینہ منورہ میں قربانی کا التزام فرماتے رہے یہ اس کے وجوب کی دلیل ہے۔ اسی طرح اوپر گزری ہوئی ایک حدیث میں یہ لفظ فلیذبح اُخریٰ مکانہا۔ بھی وجوب کی دلیل ہے کیونکہ اعادے کا حکم صرف شریعت میں واجب ہی کے لیے آتا ہے۔ اور ابو ہریرہؓ کی حدیث من وجد سعة لان یضحی فلم یضح فلا یحضر مصلانا۔ بھی وجوب کی دلیل ہے۔ امام ابن حجرؒ کا یہ فرمانا کہ یہ حدیث موقوف ہے، مضر نہیں کیوں کہ اس قسم کے شرعی امور میں موقوف بھی مرفوع کے حکم میں ہوتی ہے۔

الفصلُ الاوّل

حدیث ۱: عن انسؓ قال ضحّٰی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بکبشین املحین اقرنین ذبحھما بیدہٖ وسمی وکبر قال رأیتہ واضعًا قدمہ علی صفاحہما ویقول بسم اللہ واللہ اکبر۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو ابلق (ڈبے، چتکبرے)، سینگ دار مینڈھے قربان کیے انہیں اپنے دستِ مبارک سے ذبح فرمایا اور بسم اللہ واللہ اکبر کہا۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضورؐ کو ان کے پہلوؤں (یا کلوں یا گردن کے ایک طرف) پر اپنا قدم مبارک رکھے ہوئے دیکھا اور آپؐ بسم اللہ واللہ اکبر کہہ رہے تھے۔ بخاری ومسلم۔

شرح: اپنی قربانی کو اپنے ہاتھ سے ذبح کرنا مستحب ہے بشرطیکہ قربانی کرنے والا ذبح کے آداب اور طریقے کو جانتا ہو۔ ورنہ بوقت ذبح وہ سامنے رہے اور اس کی

ا۔ مظاہر حق ج ا ص ۵۰۵۔

اجازت سے دوسرا کوئی ذبح کر دے۔ اور بوقتِ ذبح اللہ کا نام لینا حنفیہ کے نزدیک شرطِ ذبح ہے اور تکبیر کہنا مستحب ہے اور اس پر کتاب وسنت کے دلائل قائم ہیں قرآن کہتا ہے: وکلوا مما ذکر اسم اللہ علیہ۔ الآیۃ۔ ولا تأکلوا مما لم یذکر اسم اللہ علیہ وانہ لفسق۔ الآیۃ۔

وسمّٰی وکبّر: بسم اللہ واللہ اکبر کہنا سنت ہے یعنی واؤ کے ساتھ اور جمہور کے نزدیک بوقتِ ذبح درود پڑھنا مکروہ ہے۔ لیکن امام شافعیؒ اسے سنت فرماتے ہیں۔

علامہ علی القاریؒ فرماتے ہیں کہ بخاری کی وہ روایت جس میں صحابہؓ نے حضورؐ سے عرض کیا تھا کہ ہمیں معلوم نہیں بلکہ شک ہے کہ اس گوشت کو ذبح کرتے وقت بسم اللہ الخ کہا گیا ہے یا کہ نہیں۔ لیکن حضورؐ نے اس کے باوجود صحابہؓ کو اسے مباح سمجھنے کو فرمایا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضورؐ نے مسلم پر حسنِ ظن رکھا تھا کہ وہ بوقتِ ذبح ضرور نامِ خدا لیتا ہے۔ یہ مطلب نہ تھا کہ مسلمان ضروری ہی ذبح کے وقت تسمیہ کو چھوڑ دیا کریں۔ اور اصول کا مسلمہ قاعدہ ہے کہ یقین شک سے زائل نہیں ہوتا پس وہاں یہ یقین موجود تھا کہ مسلم کا ذبیحہ ہے ضرور اس پر تسمیہ کہا گیا ہے اور محض شک سے اسے زائل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ واللہ اعلم بالصّواب۔

حدیث ۲: وعن عائشۃؓ أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أمر بکبش اقرن یطأ فی سواد ویبرک فی سواد وینظر فی سواد فاتی بہ لیضحی بہ قال یا عائشۃ ھلمی المدیۃ ثم قال اشحذیھا بحجر ففعلت ثم اخذھا واخذ الکبش فاضجعہ ثم ذبحہ ثم قال بسم اللہ اللھم تقبل من محمدؐ وآل محمدؐ ومن امۃ محمدؐ ثم ضحی بہ رواہ مسلم۔

ترجمہ: حضرت ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جنابِ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سینگ دار مینڈھا لانے کا حکم دیا جس کے پاؤں سیاہ ہوں سینہ اور پیٹ سیاہ ہو اور آنکھیں بھی سیاہ ہوں پس وہ لایا گیا تاکہ حضورؐ اس کی قربانی کریں۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا اے عائشہ! چھری لے آنا۔ پھر فرمایا اسے

لہ مرقات ج ۲ ص ۳۰۳۔

پتھر سے تیز کر دو تو میں نے ایسا ہی کیا پھر حضورؐ نے چھری پکڑی اور مینڈھے کو پکڑ کر نیچے لٹایا۔ پھر اسے ذبح فرمایا پھر یہ دعا مانگی وہ اللہ کے نام سے ، اے اللہ! محمدؐ اور محمدؐ کے گھر والوں سے قبول فرما اور محمدؐ کی امت سے قبول فرما" پھر آپؐ نے قربانی کا گوشت لوگوں کو دیا۔ مسلم۔

شرح:[1] جانور کو ذبح کرنے سے قبل چھری کو تیز کر لینے کا حکم ہے اس حدیث کے علاوہ اور کئی احادیث میں قولی حکم بھی آیا ہے۔ اور چھری کو جانور کے سامنے تیز کرنا مکروہ ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایسا کرنے والے کو دُرّے سے سزا دی تھی اور بروئے حدیث ایک جانور کو دوسرے جانور کے سامنے ذبح کرنا بھی مکروہ ہے۔

اللھم تقبل من محمد الخ۔ شارح طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس دعا سے مراد ثواب میں شرکت ہے وجہ یہ ہے کہ ایک مینڈھا صرف ایک ہی کی طرف سے قربان ہو سکتا ہے اور اس کے دلائل موجود ہیں۔ علامہ علی القاریؒ فرماتے ہیں کہ یہ دعا حضورؐ نے اس لیے مانگی تھی کہ اے اللہ! میری قربانی اور میرے گھر والوں کی قربانی اور میری امت کی قربانیوں کو اور ان کی عبادت کو قبول فرما۔ پس اس حدیث میں اس امر کی کوئی دلیل موجود نہیں کہ ایک ہی مینڈھا سب لوگوں کی طرف سے قربان ہو سکتا لیکن شافعیؒ ، مالکی اور حنبلی فقہ میں ایک قربانی سارے گھر والوں کی طرف سے ادا ہو جاتی ہے اور اس حدیث سے انہوں نے استدلال فرمایا ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ استدلال تام نہیں کیونکہ حضورؐ کے گھر والوں کے علاوہ اس میں امت کے لیے بھی دعا موجود ہے اور یہ تو کسی نے بھی نہیں کہا کہ ایک ہی قربانی ساری امت کی طرف سے کافی ہو سکتی ہے واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۳: وعن جابرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم لا تذبحوا الا مسنۃ الا ان یعسر علیکم فتذبحوا جذعۃ من الضأن۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ صرف وہ جانور ذبح کرو جو مُسِنّہ ہو۔ ہاں اگر دنبہ یا بھیڑ نہ مل سکے تو جذعہ ہی کر لو۔ مسلم۔

شرح:[2] مُسِنّہ کا لفظ سِن سے نکلا ہے اس کا معنیٰ ہے بڑی عمر کا جانور، اونٹ میں مُسِنّہ وہ ہے جس کے پانچ برس پورے ہو چکے ہوں اور چھٹے میں قدم رکھ چکا ہو۔ گائے بیل کا

---

[1] مظاہر حق ج ا صفحہ ۵۰۶، مرقات ج ۳ صفحہ ۳۰۳، ۳۰۴۔ [2] مرقات ج ۳ صفحہ ۳۰۴، مظاہر حق ایضاً۔

مُسنہ وہ ہے جس کے دو برس پورے ہو چکے ہوں اور تیسرے میں قدم رکھ چکا ہو۔ بھیڑ بکریوں میں سے مُسنہ وہ ہے جس نے ایک سال پورا کر لیا ہو اور دوسرے میں داخل ہو گیا ہو۔

اور یہ جو فرمایا کہ الا ان یعسر علیکم الخ اس کا مطلب یہ ہے کہ عام حالات میں تو دنبہ اور مینڈھا بھی سال بھر کا ہی ہونا لازم ہے ہاں اگر اس عمر کا نہ مل سکے یا کوئی اسے خرید نہ سکے تو پھر جَذَعہ جائز ہے۔ جَذَعہ کا معنی ہے جس کا سال ابھی پورا نہ ہوا ہو لیکن چھ ماہ سے کم کا نہ ہو اور قربانی کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ ایسا جانور دیکھنے میں سال بھر کے جانور کی مانند نظر آئے یعنی خوب موٹا تازہ اور پلا ہوا ہو وجہ یہ ہے کہ عام احادیث میں بھیڑ بکری کی عمر ایک سال ہی بتائی گئی ہے اور یہ استثناء بوجہ مجبوری کیا گیا ہے، پس اس سے ناجائز فائدہ نہ اٹھایا جائے اور اسے صرف ایک مجبوری کی رخصت ہی سمجھا جائے۔

حدیث ۴: وعن عقبۃ رضؓ بن عامر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اعطاہ غنمًا یقسمہا علی صحابتہ ضحایا فبقی عتود فذکرہ لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال ضح بہ انت وفی روایۃ قلت یارسول اللہ اصابنی جذع قال ضح بہ۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بھیڑ بکریوں کا ایک ریوڑ دیا تاکہ اسے آپؐ کے اصحابؓ پر تقسیم کریں اور وہ ان کی قربانی کریں۔ پس ایک یک سالہ بکری کا بچہ تقسیم سے بچ گیا عقبہؓ نے اس کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ اسے قربانی کر دو۔ بخاری و مسلم۔

شرح: عَتود بکری کے اس بچے کو کہتے ہیں جو مضبوط ہو اور ایک سال کا ہو چکا ہو۔ اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ بھیڑ بکری ایک سال کی ہو چکی ہو تو اس کی قربانی جائز ہے اور یہی اس حدیث سے بھی ثابت ہوا۔ علی ہذا القیاس دوسری روایت کا لفظ جذع بھی بتا رہا ہے کہ اس استثناء کے عین مطابق تھا جو گزشتہ حدیث میں گزر چکا ہے۔ پس یہ کہنا کہ یہ بھیڑ کا بچہ چھ ماہ سے کم کا تھا اور حضورؐ نے بطور خاص اس صحابی کو قربانی کر دینے کی اجازت عطا فرما دی تھی اور یہ خصوصیت تھی کسی اور کے لیے جائز نہیں، اتنے طویل کلام کی ضرورت

---

[1] مرقات ج ۳ ص ۳۰۵، مظاہر حق ج ۱ ص ۵۰۶۔

نہیں ہے کیونکہ ظاہر حدیث سے یہ معلوم نہیں ہو رہا پس تاویل کی ضرورت نہیں۔ ہاں ایک حدیث میں ابن نیارؓ کو حضورؐ نے ایک ماہ سے بھی کم کا دنبہ بطورِ خاص ذبح کرنے کا حکم ضرور دیا تھا لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرمایا تھا کہ یجزئ عنك ولا یجزئ عن احد بعدك "وہ تیرے لیے تو جائز ہے لیکن تیرے بعد کسی اور کے لیے جائز نہیں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۵ : وعن ابن عمرؓ قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یذبح وینحر بالمصلیٰ۔ رواہ البخاری۔

ترجمہ : حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عیدگاہ میں ذبح اور نحر فرماتے تھے۔ بخاری۔

شرح : بعینہٖ[1] یہی حدیث اوپر کے باب کے آخر میں گزر چکی ہے وہاں وقتِ عید کے بیان میں کے لیے آئی تھی اور یہاں ذبح کی جگہ کے بیان کے لیے آئی ہے۔ عیدگاہ میں قربانی سے شعارِ اسلام کا اظہار ہوتا ہے اس لیے ایسا کرنا افضل ہے۔ ذبح اور نحر کا فرق پچھلے باب میں اس حدیث کی شرح میں گزر چکا ہے وہاں دیکھ لیا جائے۔

حدیث ۶ : وعن جابرؓ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال البقرۃ عن سبعۃ والجزور عن سبعۃ۔ رواہ مسلم۔ وابوداؤد واللفظ لہ۔

ترجمہ : حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ گائے سات آدمیوں کی طرف سے کافی ہے اور اونٹ بھی سات کی طرف سے کافی ہے۔ اسے مسلم اور ابوداؤد نے روایت کیا اور لفظ ابوداؤد کے ہیں۔

شرح : جزور[2] اونٹ کو کہتے ہیں خواہ مذکر ہو خواہ مؤنث۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ گائے اور اونٹ میں زیادہ سے زیادہ سات آدمی شریک ہو سکتے ہیں جمہور علماء کا یہی مذہب ہے۔ امام اسحٰقؒ بن راھویہ نے دس تک کی اجازت دی ہے اور ابنؓ عباس کی ایک موقوف روایت سے استدلال کیا ہے اور ساتوں حصہ داروں کی نیت قربانی کی ہونی چاہیے ورنہ کسی کی قربانی نہ ہو گی یہ تو امام ابوحنیفہؒ کا مسلک ہے لیکن امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی صرف گوشت کی نیت سے شامل ہوا ہو تو باقی کی قربانی صحیح ہے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ سات آدمی گائے اور اونٹ میں اس شرط کے ساتھ

---

[1] مرقات ج ۲ ص ۳۰۵۔

شامل ہو سکتے ہیں کہ وہ سب ایک ہی گھر کے ہوں لیکن دوسرے علماء نے ایک گھر اور کئی گھروں میں کوئی فرق نہیں کیا اور ظاہر ہے کہ حدیث مطلق ہے اس میں کوئی قید نہیں۔

واللفظ لہ اس حدیث کے الفاظ ابو داؤد کے ہیں لیکن اس معنیٰ کی حدیث مُسلم میں بھی موجود ہے اسی بناء پر اس حدیث کو پہلی فصل میں رکھا گیا جس میں صرف صحیحین کی احادیث آسکتی ہیں۔ صاحب مشکوٰۃ نے دراصل ایک غلط فہمی کو دور کیا ہے وہ یہ کہ امام بغوی رح نے یہ روایت پہلی فصل میں رکھی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ الفاظ صحیحین میں سے کسی کے ہوں گے۔ صاحب مشکوٰۃ نے بتا دیا کہ الفاظ تو ابو داؤد کے ہیں لیکن پہلی فصل میں رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ مسلم میں اس معنی کی حدیث موجود ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۷ : وعن ام سلمۃ رضؓ قالت قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اذا دخل العشر و اراد بعضکم ان یضحی فلا یمس من شعرہٖ وبشرہٖ شیئاً وفی روایۃ فلا یأخذن شعرًا ولا یقلمن ظفرًا وفی روایۃ من رأی ھلال ذی الحجۃ واراد ان یضحی فلا یأخذ من شعرہٖ ولا من اظفارہٖ۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ : حضرت ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب ذی الحجہ کا پہلا عشرہ داخل ہو جائے اور تم میں سے کوئی شخص قربانی کرنا چاہے تو اپنے بالوں اور ناخنوں میں سے کسی کو نہ چھوئے (نہ کٹوائے) اور ایک روایت ہیں کہ یہ لفظ ہیں وہ بال نہ کترائے اور ناخن نہ کٹوائے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ جس شخص نے ذی الحجہ کا چاند دیکھا اور قربانی کا ارادہ کیا تو اپنے بالوں اور ناخنوں میں سے کچھ نہ کٹوائے۔ مسلم۔

شرح : علماءِ امت نے اس حدیث کی نہی کو تنزیہ پر محمول کیا ہے اگر حرمت کے لیے ہو سکتی تھی تو ابو حنیفہ رح کے نزدیک ہو سکتی تھی کیونکہ ان کے ہاں قربانی واجب ہے۔ گو اس کا وجوب سنت سے ثابت ہوا ہے لیکن امامِ شافعی رح نے اس نہی کو کراہت پر محمول فرمایا ہے حالانکہ ایک طرف وہ قربانی کو محض سنت قرار دیتے ہیں اور دوسری طرف اس نہی کو کراہت پر محمول کرتے ہیں۔

اراد منکم ان یضحی الخ کے الفاظ سے علامہ ابن حجر رح عسقلانی اور صاحبِ شرح السنۃ نے استدلال فرمایا ہے کہ قربانی واجب نہیں ورنہ ارادہ کے الفاظ لہ لائے

لہ مظاہر حق ج ۱ ص ۵۰۷ ، مرقات ج ۳ ص ۳۰۶ ۔

جاتے۔ حنفیہ نے کہا ہے کہ اس کی مثال حدیث میں موجود ہے من اراد الحج فلیعجّل اور حج بالاتفاق فرض ہے۔ پس ارادَ کے لفظ سے وجوب کی نفی نہیں نکلتی ہے۔

فلا یمس[1] من شعرہٖ وبشرہٖ شیئاً۔ بشرہٖ سے مراد یہاں ناخن ہیں جیسا کہ ساتھ کی بعد والی دو روایات میں ناخن کا لفظ موجود ہے۔ حافظ تورپشتیؒ فرماتے ہیں کہ نہی اس لیے ہے تاکہ قربانی دینے والے کی مشابہت حاجیوں سے ہو جائے اور زیادہ بہتر یہ ہے کہ قربانی دینے والا دراصل اپنے نفس کی قربانی پیش کرتا ہے لیکن چونکہ اس کی شرع نے اجازت نہیں دی لہذا اس نے ایک جانور سے اپنے نفس کا فدیہ ادا کیا اور قربانی کے جانور کے جسم کا ہر حصہ اس کے جسم کے ہر حصے کا فدیہ بن گیا اس لیے بال کٹوانے اور ناخن اتروانے سے منع کر دیا گیا تاکہ جسم کے اجزاء کا کوئی جزو ناقص نہ ہو جائے۔ تاکہ اسے کامل فضیلت حاصل ہو سکے اور نورِ الٰہی کا فیضان اس پر جاری وساری ہو جائے۔ اور یہ جو کہا گیا ہے کہ یہ حجاج سے تشبیہ ہے تو تشبیہ من کل الوجوہ نہیں ہوا کرتی صرف کوئی وجہ تشبیہ ہونی کافی ہے۔

بعض ائمہ نے شعرہٖ وبشرہٖ کی ضمیر کو قربانی کے جانور کی طرف موڑا ہے کہ اس کے بال اور کھر وغیرہ نہ کاٹے جائیں امام شافعیؒ اور مالکؒ اسے مستحب جانتے ہیں۔ لیکن اس صورت میں عشرۂ ذی الحجہ کے داخل ہونے کی قید کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا اس سے پہلے قربانی کے جانور کے بال وغیرہ کاٹ لینا جائز ہو گا؟ اور عشرہ کے دوران ناجائز ہو گا؟

حدیث ۸ : وعن ابن عباسؓ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم مامن ایام العمل الصالح فیھن احب الی اللّٰہ من ھذہ الایام العشر قالوا یارسول اللّٰہ ولا الجہاد فی سبیل اللّٰہ؟ قال ولا الجہاد فی سبیل اللّٰہ، الا رجل خرج بنفسہٖ ومالہٖ فلم یرجع من ذلک بشیئ۔ رواہ البخاری۔

ترجمہ : حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ذی الحجہ کے پہلے دس دنوں سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کو نیک عمل کسی اور دن میں اتنا محبوب نہیں ہے۔ لوگوں نے پوچھا یارسولؐ اللہ کیا

---

[1] مرقات ج ۳ ص ۳۰۵۔

جہاد فی سبیل اللہ سے بھی ان دنوں کے اعمال افضل ہیں؟ حضورؐ نے فرمایا ہاں!
جہاد فی سبیل اللہ بھی اتنے درجے کو نہیں پہنچتا، ہاں مگر جو شخص اپنی جان کو اور
مال کو لے کر خدا کی راہ میں نکلا اور ان میں سے کچھ بھی واپس نہ لایا۔[۱]

شرح[۱]: اللہ تعالیٰ کے ہاں اعمال کا ثواب مشقت و محنت و ریاضت کے بقدر ملتا ہے۔ حج کے ایام میں اسلامی اعمال کی شان و شوکت، ریاضت اور جد و جہد، جان و مال اور وقت کی قربانی، ہر وقت کی بھاگ دوڑ اور نظم و ضبط، بہت سی پابندیوں کی قید، دور دراز کا سفر، غرض بہت سی چیزیں مل جاتی ہیں جن کی وجہ سے اِن دِنوں کے اعمال بہت ہی افضل و محبوب ہو گئے ہیں۔ ہاں جس شخص نے اپنی جان و مال کو اللہ کی راہ میں کھپا دیا اس کے درجے کو دوسرا کون پہنچ سکتا ہے؟ اس لیے اس کے مقام کو پھر بھی بلند ہی دکھایا گیا ہے کیونکہ اسلام نے شہادت کو حیاتِ جاوداں سے تعبیر فرمایا ہے۔ اور یہ موت کی اعلیٰ ترین قسم ہے جو پیغمبروں کو بھی محبوب و مرغوب رہی ہے اور رمضان کے اعمال کو افضلیت و محبوبیت ایک اور جہت سے ہے یعنی ماہِ مبارک کی وجہ سے روزہ کے باعث اور لیلۃ القدر کے باعث لیکن عشرۂ ذی الحجہ کے اعمال کی افضلیت دوسری جہت سے ہے پس ان دونوں میں کوئی تخالف و تعارض نہیں ہے۔ بعض علماء نے رمضان کے آخری عشرہ کی فضیلت کو راتوں میں مانا ہے کیونکہ لیلۃ القدر کا تعلق رات ہی کے وقت سے ہے اور عشرۂ ذی الحجہ کی فضیلت کو دنوں سے مخصوص کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عشرۂ رمضان کی فضیلت کے بیان میں لیالی کا لفظ آیا ہے اور یہاں ایام کا لفظ ہے اور یہ تطابق بہترین ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

بابُ العتیرۃ[۲]

عتیرہ اس بکری کو کہتے تھے جسے ماہِ رجب کے پہلے عشرہ میں ذبح کرتے تھے اور زمانۂ جاہلیت میں مشرکین رجب میں اپنے بتوں کے لیے جانور ذبح کرتے اور ان کا خون بتوں کے سر پر بہاتے تھے۔ اہلِ اسلام سے یہ توقع تو نہیں کی جاسکتی کہ وہ اسلام کے بعد بھی اس مذموم رسم کو باقی رکھتے لیکن رجب میں مسلمان اللہ کے لیے جانور ذبح کرتے تھے چونکہ اس میں زمانۂ جاہلیت کے رواج اور مشرکوں کے فعل سے

---

[۱] مظاہر حق ج ۱ ص ۵۰۷، مرقات ج ۳ ص ۳۰۷۔ [۲] مرقات ج ۳ ص ۳۱۴، ۳۱۵۔

مشابہت پائی جاتی تھی لہذا اسے بھی ممنوع ٹھہرادیا گیا۔ سدًا للذرائع۔ ورنہ اگر کوئی شخص کسی وقت کوئی جانور ذبح کرکے اس کا گوشت تقسیم کرے تو اسے ناجائز نہیں ٹھہرایا جاسکتا کیونکہ شریعت کے عام دلائل اس کی اجازت دیتے ہیں لیکن بعض اعمال وافعال کو دوسرے دل کی مشابہت کے باعث بھی ممنوع ٹھیرایا گیا ہے۔ انہی میں سے رجب کا یہ عتیرہ بھی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۱: عن ابی ھریرۃؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لا فرع ولا عتیرۃ قال والفرع اول نتاج کان ینتج لھم کانوا یذبحونہ لطواغیتھم والعتیرۃ فی رجب۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ اسلام میں کوئی فرع نہیں اور کوئی عتیرہ نہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ فرع سے مراد جانور کا وہ پہلا بچہ ہے جسے وہ اپنے بتوں کے لیے ذبح کرتے تھے اور عتیرہ رجب میں ہوتا تھا۔ بخاری و مسلم۔

شرح: امام خطابیؒ نے فرمایا ہے کہ قال کا قائل راوئ حدیث امام ابن شہابؒ زہری ہے لیکن امام بخاریؒ اور ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ قال کا قائل ابوہریرہؓ ہیں۔ مسلم میں مذکور ہے کہ یہ تفسیر راوی ابن رافع کی طرف سے ہے لیکن اقرب وارجح وہی ہے جو بخاری اور ترمذی نے فرمایا ہے۔

ابن الملکؒ نے فرمایا ہے کہ عتیرہ اس بکری یا ذبح کیے جانے والے جانور کا نام ہے جسے رجب کے مہینے میں بتوں کے لیے کیا جاتا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ نظر مانا کرتے تھے کہ اگر میرے اونٹوں کی تعداد سو ہو جائے گی تو میں رجب میں ایک اونٹ فلاں بت کے لیے فلاں جگہ ذبح کروں گا۔ اسلام میں ان دونوں قسم کے عتیرہ سے منع فرمادیا گیا۔ بلکہ رجب میں اگر خدا کے لیے بھی جانور ذبح کیا جائے تو اہل جاہلیت کے تشبہ اور مشرکانہ رواج کی مشابہت کی بنا پر اسے ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ؔ مظاہر حق ج ۱ ص ۵۱۱، مرقات ج ۳ ص ۳۱۵۔

باب صلاۃ الخسوف

علامہ علی القاری فرماتے ہیں کہ صاحب مشکوٰۃ نے خسوف کا لفظ لکھ کر اس سے مراد سورج گرہن اور چاند گرہن دونوں لیے ہیں حالانکہ سورج گرہن کے لیے کسوف اور چاند گرہن کے لیے خسوف استعمال ہوتا ہے اور اس باب کی سب احادیث چونکہ سورج گرہن کے بارے میں آئی ہیں۔ لہٰذا یا تو صرف صلاۃ الکسوف لکھنا مناسب تھا یا اس بناء پر کہ سورج گرہن اور چاند گرہن کی نماز کا حکم اکثر مسائل میں ایک ہی جیسا ہے باب صلوٰۃ الکسوف والخسوف کہنا زیادہ مناسب تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اور بعض وقع کسوف اور خسوف دونوں الفاظ ہم معنی بولے جاتے ہیں گو لغت اور استعمال فقہاء میں ان دونوں میں فرق ہے۔ شاید ان الفاظ کو صاحب مشکوٰۃ مترادف سمجھتے ہوں گے اسی لیے باب الخسوف رکھا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سورج گرہن اور چاند گرہن کی نمازیں جمادی الاخرۃ ۵ھ میں ادا فرمائی ہیں جیسا کہ صحیح ابن حبان میں ہے۔ علامہ ابن الہمام فرماتے ہیں کہ جمہور کے نزدیک صلوٰۃ الکسوف سنت ہے لیکن بعض نے اسے واجب بھی کہا ہے۔ علامہ ابن حجر فرماتے ہیں کہ یہ نماز سنت مؤکدہ ہے اور بعض نے اسے فرض کفایہ کہا ہے۔

صلوٰۃ الکسوف کی سنیت پر اتفاق کے بعد فقہاء امت میں اس کی کیفیت میں اختلاف ہوا ہے۔ امام شافعی نے دو رکعت اور ہر رکعت میں دو قیام اور دو رکوع کا مسنون ہونا بیان فرمایا ہے لیکن امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ دو رکعت تمام دوسری نمازوں کی مانند ہے۔

سید المحدثین علامہ انور شاہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں سورج گرہن صرف ایک مرتبہ ہوا تھا جیسا کہ محمود شاہ فرنساوی نے اپنی کتاب افادۃ الافہام فی تقویم الزمان میں تحقیق اور دلائل علم ہیئت سے ثابت کر دیا ہے اور تعدد رکوع کی روایات دو رکعات میں چھ رکوع تک پہنچتی ہے جیسا کہ طبری کی تہذیب الآثار میں ہے۔ اور میرے نزدیک راجح ترین یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رکعت میں فقط دو ہی رکوع کیے تھے اور باقی سب وہم ہیں۔ اور اصل میں یہ صحابہ کے فتاویٰ تھے جو مرفوع روایات میں مل جل گئے ہیں اور جن روایات میں ایک رکوع کا ذکر ہے ان میں ان

۱؎ مرقات ج ۳ ص ۳۱۷۔ ۲؎ مسوّٰی ج ۱ ص ۱۸۷۔ ۳؎ فیض الباری ج ۲ ص ۳۸۱۔

ان میں سے ایک رکوع پر استدلال نہیں کرتا بلکہ انہیں اختصار پر محمول گردانتا ہوں۔ ہاں صحابہؓ سے دو رکوع سے زائد بھی ثابت ہیں کیونکہ انہوں نے ایک سے زیادہ رکوع کو اجازت و تخییر پر محمول فرمایا تھا پس انہوں نے تین اور چار تک بھی جائز سمجھا جب تک کہ سورج گرہن جاتا نہ رہے۔

اور حنفیہ کی دلیل اس باب میں ابوداؤد کی قولی حدیث ہے۔ اور طحاویؒ نے حضرت مغیرہ بن شعبہ کا عمل ایک حدیث کے ضمن میں بیان فرمایا ہے کہ انہوں نے اپنے زمانے میں سورج گرہن کے وقت عام نمازوں جیسی نماز پڑھی اور ایک ہی رکوع کیا۔ حالانکہ وہ خود حضورؐ کے زمانے میں سورج گرہن کی نماز میں حضورؐ کے ساتھ شامل تھے اور صلوٰۃ الکسوف کے راوی بھی ہیں۔ ان کے اس عمل سے ثابت ہوا کہ زیادہ رکوع دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص تھے اور آپؐ پر نماز کی حالت میں ایسی واردات گزریں، ایسے انکشافات ہوئے اور عالمِ غیب کی بعض ایسی چیزوں کا مشاہدہ کرایا گیا جن کی وجہ سے آپؐ نے ایک سے زیادہ رکوع کیے تھے۔ حضورؐ نے خود تو ایسا کیا لیکن امت کو ایسا کرنے کا حکم نہیں فرمایا پس یہ چیز آپؐ کے ساتھ مخصوص تھی۔ مولانا شیخ الہندؒ نے فرمایا ہے کہ تعدد رکوع کی مثال سجدۂ تلاوت کی مانند ہے کہ ایک خاص داعیہ کی وجہ سے ایک سجدہ بڑھ گیا۔ اسی طرح حضورؐ نے اس نماز میں ایسے امورِ غیب کا مشاہدہ فرمایا تھا جو عام نمازوں میں نہیں ہوتا تھا اور کسی خاص نشان کے ظہور کے وقت جھک جانا شرع میں معروف ہے۔

ترمذی ج۲ ص۲۲۹ میں ہے کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو جناب ام المؤمنین میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی وفات کی خبر ملی تو وہ فوراً سجدہ میں گر گئے۔ اسی طرح روایات میں ثابت ہے کہ حضورؐ جب فتح مکہ کے موقع پر شہر میں داخل ہو رہے تھے تو کجاوے پر سر مبارک جھکا ہوا تھا۔ اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ایک موقع پر فوراً رکوع میں جھک جانا ثابت ہوا ہے۔ اور شیخ ابومنصورؒ نے ابوعبداللہ البلخیؒ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ صلوٰۃ الکسوف میں تعددِ رکوع کسوف کی وجہ سے نہیں ہوا تھا بلکہ یہ کچھ خاص قسم کے احوال تھے جو حضورؐ پر طاری ہوئے تھے اور ان کی وجہ سے حضورؐ نے زیادہ رکوع فرمائے تھے حتیٰ کہ احادیث میں تو یہاں تک آیا ہے کہ حضورؐ رکوع کی حالت میں آگے کو بڑھے گویا کسی چیز کو پکڑنا چاہتے تھے، پھر پیچھے ہٹے گویا کسی چیز سے بھاگ رہے تھے پس عین ممکن ہے کہ تعددِ رکوع ان احوال کی وجہ سے پیش آیا ہو (بدائع الصنائع) اور حنفیہ میں سے بعض نے یہ جو کہا ہے کہ حضورؐ نے غیر معمولی طور پر طویل رکوع فرمایا تو اگلی صف کے

لوگوں نے اٹھ اٹھ کر دیکھنا شروع کر دیا اور پچھلوں نے اسے تعدّد رکوع پہ محمول کر لیا۔ سو اگرچہ یہ بلسوط سرخسی میں بھی آچکا لیکن میرے نزدیک یہ بات نامناسب سی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

الفصل الاوّل

حدیث ۱ : عن عائشۃ رضی اللہ عنہا قالت ان الشمس خسفت علی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فبعث منادیا الصلوٰۃ جامعۃ فتقدم فصلی اربع رکعات فی رکعتین واربع سجدات قالت عائشۃ رضی اللہ عنہا ما رکعت رکوعًا قط ولا سجدت سجودًا قط کان اطول منہ ۔متفق علیہ۔

ترجمہ : حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ارشاد فرماتی ہیں کہ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں سورج گرہن ہوا تو آپؐ نے ایک منادی کرنے والا بھیجا جو پکارتا تھا "الصلوٰۃ جامعۃ" کہ نماز باجماعت ہونے والی ہے اس کے لیے جمع ہو جاؤ۔ پس حضورؐ آگے بڑھے اور دو رکعتوں میں چار رکوع اور چار سجدے فرمائے۔ حضرت ام المؤمنین نے فرمایا کہ میں نے کبھی اتنا لمبا رکوع اور اتنا طویل سجدہ ہرگز نہیں کیا۔ جتنا اس دن کیا تھا۔ بخاری ومسلم۔

شرح : امام بخاریؒ نے باب الصلوٰۃ فی کسوف الشمس میں سب سے پہلی حدیث حضرت ابوبکرہؓ کی روایت کی ہے جس میں تعدد رکوع کا کوئی ذکر نہیں آیا۔ حافظ ابن حجرؒ نے اقرار کیا ہے کہ امام بخاریؒ کا اشارہ اس طرف ہے کہ کسوف کی نماز میں ایک رکوع پہ اکتفاء کرنا جائز ہے اگرچہ کمال دو رکوع میں ہے اور وجہ استدلال یہ ہے کہ بخاریؒ نے اس نماز کو عام مطلق نمازوں پہ محمول کیا ہے جن میں صرف ایک رکوع ہوتا ہے اور اس طرح حنفیہ کی دلیل اس روایت سے مضبوط ہو جاتی ہے جس میں یہ الفاظ ہیں: فصلوھا کاحدث صلوٰۃ صلیتموھا الخ اِس احدث صلوٰۃ (قریب ترین نماز) سے مراد نمازِ فجر ہے اور اس میں ایک ہی رکوع ہے اور نمازِ کسوف کا خطبہ حنفیہ کے نزدیک سنۃ الصلوٰۃ میں سے نہیں ہے اگرچہ ہمارے ائمہ میں سے امام ابو یوسفؒ کے نزدیک یہ سنتِ صلوٰۃ میں سے ہے لیکن حنفیہ کا مسلک پہلا ہے اور حضورؐ کا

ؔ۱ بخاری مع فتح الباری ج ۴ ص ۵۵۷۔ فیض الباری ج ۲ ص ۳۸۲

خطبہ ایک ضرورت کی وجہ سے تھا جو احادیث میں مذکور ہے۔

فبعث منادیًا الصلوٰۃ جامعۃ ۔ امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ چونکہ عیدین میں بھی اذان نہیں ہوتی اس لیے ان میں بھی منادی ہونی چاہیئے تاکہ لوگ جمع ہو جائیں اور الصّلوٰۃَ اِغراء کی بنا پر منصوب ہے اور جامعۃً حال واقعہ ہوا ہے اور مطلب اس کا یہ ہے کہ انفرادًا نماز مت پڑھو اور چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں نماز مت پڑھو بلکہ سب سے بڑی جماعت میں پڑھنا۔ امام ابن الہمامؒ نے فرمایا ہے کہ تمام علماء کا اس پر اجماع ہے کہ نمازِ کسوف جامع مسجد میں یا عیدگاہ میں باجماعت پڑھنی چاہیئے اور اوقاتِ مکروہہ میں نہ پڑھی جائے اور جیسا کہ اوپر گزرا تعدّدِ رکوع دار قطنی اور ابو داؤد کی قولی حدیث میں نہیں ہے حضورؐ کی فعلی حدیث میں اس کا ذکر موجود ہے اور حنفیہ کے نزدیک یہ حضورؐ کی خصوصیت پر محمول ہے جیسا کہ مفصل پہلے گزر چکا ہے۔ واللہ اعلم۔

اربع رکعاتٍ سے مراد یہاں اربع رکوعاتٍ ہے۔

حدیث ۲ : وعنہا قالت جہر النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی صلاۃ الخسوف بقرأتہ ۔ متفق علیہ۔

ترجمہ : اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صلوٰۃ الخسوف میں بآوازِ بلند قرأت فرمائی تھی۔ بخاری و مسلم۔

شرح : اس سے قبل یہ تحقیق گزر چکی ہے کہ کسوف کا تعلق سورج سے اور خسوف کا تعلق چاند سے ہوتا ہے۔ اس روایت کے ظاہری الفاظ تو یہی بتاتے ہیں کہ چاند گرہن کی نماز کا ذکر ہے چونکہ وہ رات کو ہوتی ہے لہٰذا اس کی قرأت بالجہر ہوتی ہے اور صلوٰۃ الکسوف چونکہ دن کو ہوتی ہے لہٰذا اس کی قرأت بالخفاء ہوگی۔

امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کا مسلک یہ ہے کہ صلوٰۃ الکسوف میں قرأت مخفی ہونی چاہیئے اور امام ابو یوسفؒ، محمدؒ اور مالکؒ کا مسلک قرأت بالجہر کا ہے وہ، فرماتے ہیں کہ جس نماز میں خطبہ ثابت ہو وہاں قرأت بالجہر ہوتی ہے لیکن اوپر گزر چکا ہے کہ خطبہ صلوٰۃ الکسوف کے متعلقات میں سے نہیں ہے بلکہ ایک خاص ضرورت سے حضورؐ نے خطبہ دیا۔ پس اسرار بالقرأۃ ہی لازم آیا۔

[۴] حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ امام شافعیؒ نے ابن عباسؓ کے اس قول سے کہ جو

---

[۱] مرقات ج ۳ ص ۳۱۹، مظاہر حق ج ۱ ص ۵۱۲۔ [۲] مرقات ج ۳ ص ۳۱۹۔ [۳] فیض الباری ج ۲ ص ۲۸۶
[۴] فتح الباری ج ۴ ص ۵۶۹

اس سے اگلی حدیث کی روایت میں ہے) استدلال کیا ہے کہ قرأ نحوًمن سورۃ البقرۃ ابن عباسؓ کا یہ اندازہ اس لیے تھا کہ حضورؐ کی قرأت بالاسرار تھی ورنہ اس اندازے کی ضرورت نہ تھی۔ امام شافعیؒ نے ابن عباسؓ سے تعلیقًا یہ بھی روایت کی ہے کہ وہ کسوف کی نماز میں حضورؐ کے پہلو میں کھڑے تھے لیکن انہوں نے حضورؐ سے ایک حرف بھی نہ سنا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۳ : وعن عبد اللہ بن عباس قال انخسف الشمس علی عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فصلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والناس معہ فقام قیامًا طویلا نحوًا من قرأۃ سورۃ البقرہ ثم رکع رکوعًا طویلاً ثم رفع فقام قیامًا طویلا وھو دون القیام الاوّل ثم رکع رکوعًا طویلاً وھو دون الرکوع الاول ثم رفع ثم سجد ثم قام فقام قیاما طویلا وھو دون القیام الاول ثم رکع رکوعًا طویلا وھو دون الرکوع الاول ثم رفع ثم سجد ثم انصرف وقد تجلت الشمس فقال ان الشمس والقمر ایتان من آیات اللہ لا یخسفان لموتِ احد ولا لحیاتہٖ فاذا رأیتم ذلک فاذکروا اللہ قالوا یارسول اللہ رأیناک تناولت شیئًا فی مقامک ھذا ثم رأیناک تکعکعت فقال انی رأیت الجنۃ فتناولت منہا عنقودًا ولو اخذتہ لاکلتم منہ مابقیت الدنیا ورأیت النار فلم أر کالیوم منظرًا ورأیت اکثر اھلہا النساء قالوا بم یارسول اللہ قال بکفرھن قیل یکفرن باللہ قال یکفرن العشیر ویکفرن الاحسان لو احسنت الی احداھن الدھر ثم رأت منک شیئًا قالت مارأیت منک خیرًا قط متفق علیہ۔

ترجمہ : حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں سورج گرہن ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی اور لوگ بھی آپؐ کے ساتھ تھے۔ پس آپؐ نے ایک لمبا قیام فرمایا جو اندازاً سورۂ بقرہ کی قرأت جتنا طویل تھا۔ پھر آپؐ نے ایک طویل رکوع کیا

پھر سر اٹھایا۔ پھر ایک لمبا قیام فرمایا اور وہ پہلے قیام سے کم تھا پھر آپؐ نے ایک طویل رکوع فرمایا اور وہ پہلے رکوع سے کم تھا پھر آپؐ نے سر اٹھایا پھر سجدہ کیا پھر اٹھے تو طویل قیام فرمایا اور وہ پہلے قیام سے کم تھا پھر ایک لمبا رکوع کیا اور وہ پہلے رکوع سے کم تھا پھر سر اٹھایا پھر سجدہ کیا۔ پھر نماز سے فارغ ہو گئے اور سورج گرہن صاف ہو چکا تھا پھر حضورؐ نے فرمایا کہ سورج اور چاند اللہ تعالیٰ کی آیات میں سے دو نشانیاں ہیں جو کسی کی موت یا زندگی کی وجہ سے گرہن میں نہیں جاتیں۔ پس جب تم گرہن دیکھو تو اللہ کو یاد کیا کرو۔ لوگوں نے کہا یا رسول اللہؐ! ہم نے آپؐ کو بحالتِ قیام کوئی چیز پکڑتے دیکھا پھر ہم نے دیکھا کہ آپؐ پیچھے ہٹ گئے (اس کی وجہ کیا تھی؟) تو حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے جنت کو دیکھا تو اس میں سے ایک گچھا پکڑنے کا ارادہ کیا اور اگر میں اسے پکڑ لیتا تو تم اسے رہتی دنیا تک کھاتے رہتے اور میں نے دوزخ کو دیکھا اور میں نے آج جیسا نظارہ کبھی نہیں دیکھا اور میں نے اہلِ جہنم میں سے اکثر عورتوں کو دیکھا۔ لوگوں نے عرض کیا یا رسولؐ اللہ! یہ کس وجہ سے ہوا؟ حضورؐ نے فرمایا کہ ان کے کفر کی وجہ سے پوچھا گیا کہ کیا عورتیں خدا کا کفر کرتی ہیں؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ خاوند کا کفر (ناشکری) کرتی ہیں اور احسان کی ناشکری کرتی ہیں۔ اگر تم ان میں سے کسی کے ساتھ عرصہ تک (یا زندگی بھر) احسان کرو پھر وہ تم سے کوئی معمولی چیز دیکھے تو کہہ دے گی کہ میں نے تم سے کبھی کوئی بھلائی ہرگز نہیں دیکھی۔ بخاری و مسلم۔

شرح [1] نحواًمن قراءۃ البقرۃ۔ ان الفاظ سے امام شافعیؒ نے مخفی قرأت کا استدلال کیا ہے جیسا کہ ابھی گزرا۔ وھو دون الرکوع الاوّل یعنی ہر رکوع اور قیام اپنے قبل والے رکوع و قیام سے کم تر تھا۔ ایتان من آیات اللّٰہ۔ سورج اور چاند خدائے تعالیٰ کی آفاقی آیاتِ قدرت میں سے دو علامتیں ہیں کہ وہ حکمِ الٰہی سے مسخر کیے گئے ہیں ان میں بذاتِ خود کچھ طاقت اور قدرت نہیں پس وہ معبود کیسے ہو سکتے ہیں؟ اور نہ ان کا کسی کی زندگی اور موت سے تعلق ہے خود ان کی اپنی تخلیق و فنا بھی اسی خدائے محیی و ممیت کے قبضۂ قدرت میں ہے جو زندگی اور موت کا خالق و مالک ہے۔

فاذکروا اللّٰہ یعنی اگر نماز کا وقت ہو تو نماز پڑھو ورنہ تسبیح و تہلیل اور ذکر و تکبیر سے کام لو مثلاً اوقاتِ مکروہہ میں۔ اور یہ حکم صلوٰۃ و ذکر استحبابی ہے کیونکہ صلوٰۃ الکسوف

---

[1] مرقات ج ۳ ص ۳۱۱۔

بالاتفاق سنت ہے۔ اور وجہ ذکر وصلوٰۃ کی یہ ہے کہ قیامت میں بھی یہی ہو گا کہ سورج اور چاند بے نور ہو جائیں گے پس گرہن ایک طرح سے قیامت کی یاد دلاتا ہے اور یہ گھبراہٹ کا وقت بھی ہوتا ہے اور ذکر اللہ سے اطمینانِ قلب ہوتا ہے اور نماز سے آنکھوں کی ٹھنڈک حاصل ہوتی ہے لہٰذا ان چیزوں کو گھبراہٹ کے دور کرنے اور صبر و ثبات میں کافی دخل ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن نے صبر وصلاۃ کا ذکر کئی جگہ اکٹھا کیا ہے۔

رائیناك تناولت شيئا۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ حضورؐ کے سامنے عالم غیب کھل کر سامنے آگیا تھا اور آپؐ پر اس حالت میں کئی کیفیتیں گزری تھیں جن کی اصل حقیقت کو حضورؐ ہی جانتے تھے اس لیے حنفیہ نے کہا ہے کہ اس غیر معمولی کشفی حالت میں حضورؐ نے بار بار رکوع فرمایا لیکن کسی کو اس کا قولی حکم نہیں دیا۔ پس یہ چیز آپؐ ہی کے ساتھ خاص تھی۔[1]

عنقودًا۔ گچھا۔ یعنی جنت کے پھلوں مثلاً انگور کا گچھا۔ اور یہ جو فرمایا کہ اگر میں پکڑ لیتا تو تم اسے رہتی دنیا تک کھاتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جنت کی نعمتوں کو فناء و انقطاع نہیں ہے ایک دانہ کھاؤ تو اس کی جگہ فوراً دوسرا موجود ہو گا۔ اب سوال یہ رہ گیا کہ حضورؐ نے وہ پھل یا گچھا کیوں نہ پکڑ لیا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ شرعی تکلیف اور ایمان بالغیب کو باقی رکھنا مدنظر تھا۔ واللہ اعلم۔

اس حدیث کے ظاہر پر امام شافعیؒ کا عمل ہے کہ کسوف کی نماز میں دو رکعت میں چار رکوع اور چار سجدے ہیں۔ حنفیہ کا مسلک اور اس کی تقریر پیچھے گزر چکی ہے، دیکھ لی جائے۔ اس حدیث میں دونوں رکعات کے بیان میں سَجَدَ کا لفظ آیا ہے سجدوں کی تعداد نہیں بتائی گئی۔ سو یہ اختصار کی بناء پر ہے کیوں کہ سجدے تو ہر رکعت میں دو ہی ہوتے ہیں اس کے خلاف کہیں بھی کسی کے نزدیک ثابت نہیں لہٰذا راوی نے یہاں اختصار سے کام لیا کیونکہ وہ دراصل طولِ قیام اور طول و تعدد رکوع کو بیان کرنا چاہتا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۴: وعن عائشةؓ نحو حديث ابن عباسؓ وقالت ثم سجد فطال السجود ثم انصرف وقد انجلت الشمس فخطب الناس فحمد الله واثنى عليه ثم قال ان الشمس والقمر ایتان من ايات الله لا يخسفان لموت

---

[1] مظاہر حق ج ۱ صـ ۵۱۴، مرقات ج ۳ صـ ۳۲۰۔

احد ولا لحیاتہ فاذا رأیتم ذلک فادعوا اللّٰہ وکبروا وصلوا وتصدقوا ثم قال یا امۃ محمدٍ واللّٰہ ما من احد اغیر من اللّٰہ ان یزنی عبدہ او تزنی امتہ یا امۃ محمدٍ واللّٰہ لو تعلمون ما اعلم لضحکتم قلیلا ولبکیتم کثیرًا ۔ متفق علیہ ۔

ترجمہ: اور حضرتِ عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی عبداللہ بن عباسؓ کی مانند روایت آئی ہے اور حضرت ام المؤمنینؓ نے اپنی روایت میں فرمایا ہے کہ پھر آپؐ نے سجدہ فرمایا اور طویل سجدہ کیا۔ پھر آپؐ نے نماز ختم فرمائی اور سورج صاف ہو چکا تھا۔ پس آپؐ نے لوگوں سے خطاب فرمایا پس اللہ کی حمد وثناء بیان فرمائی پھر فرمایا کہ بلاشبہ سورج اور چاند اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں سے نشانیاں ہیں کسی کی موت یا زندگی کی وجہ سے انہیں گرہن نہیں لگتا۔ سو جب تم گرہن دیکھو تو اللہ سے دعا کرو اور اس کی بڑائی بیان کرو اور نماز پڑھو اور صدقہ دو۔ پھر آپؐ نے فرمایا اے امتِ محمدیہ! خدا کی قسم اللہ سے زیادہ اس بات پہ غیرت مند کوئی نہیں کہ اس کا بندہ یا اس کا بندہ یا اس کی بندی بدکاری کرے اے امتِ محمدؐ! واللہ اگر جو کچھ مجھے معلوم ہے تم بھی جان لیتے تو تم تھوڑا ہنستے اور زیادہ روتے۔ بخاری ومسلم۔

شرح[1]: اس حدیث کا مضمون گزشتہ حدیث جیسا ہی ہے صرف سجدہ کی درازی، خطبہ، دعا، تکبیر، نماز اور صدقہ کرنے کا ذکر اور بعض اور چیزیں جو خطبہ میں مذکور ہیں اس میں زائد ہیں اور غیرت کا اصل معنی ہے کسی کی شرکت کو ناپسند کرنا۔ اور خدا تعالیٰ کے متعلق جب غیرت کا استعمال ہو تو اس کا معنی یہ ہے کہ اسے اپنے اوامر ونواہی کی مخالفت سخت ناپسند ہے۔ اور جس طرح کوئی آدمی اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ اس کا غلام یا لونڈی بدکار ہو اللہ تعالیٰ بدرجۂ اولیٰ اس بات کو اپنے بندوں کے حق میں ناپسند فرماتا ہے۔

اور اس[2] حدیث میں فادعوا اللہ الخ جس قدر امر آئے ہیں جمہور کے نزدیک استحباب کے لیے ہیں۔ ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ ایسی حالت میں دعا ونماز وغیرہ کا حکم اس لیے ہے کہ فطرۃً ایسے خوفناک مواقع پر انسانی نفوس دنیا سے منہ پھیر لیتے اور

---

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۵۱۴ ۔ [2] مرقات ج ۳ ص ۳۲۱ ۔

دعا کی طرف راغب ہوتے ہیں لہٰذا دعا کی اجابت کی امید ہوتی ہے۔ وتصدّقوا۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ ایسے مواقع پر دراصل ان لوگوں کو ڈرانا اور اپنی جانب متوجہ فرمانا چاہتا ہے جو دولت وغیرہ کے نشہ میں بالعموم اس کی طرف سے غافل ہوتے ہیں اور معاصی پر دلیر ہوتے ہیں۔ یا امّۃَ محمدٍ۔ اس لفظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کی طرف نسبت کا تقاضا یہ ہے کہ احکامِ الٰہی کی نافرمانی نہ کی جائے اسی لیے وعظ وتذکیر کے موقع پر حضورؐ نے اس لفظ کو دہرایا ہے لو تعلمُون ما اَعلمُ۔ اللہ تعالیٰ کے غضب ومغفرت کا جو علم اور احوالِ آخرت کے جو انکشافات مجھے ہیں اگر تم پر ہو جائیں تو تمہاری خوشی مفقود ہو جائے اور خوف تم پر ایسا مسلط ہو کہ زیادہ وقت رونے میں گزارو یا ہنسی کی نسبت تمہارا گریہ زیادہ ہو جائے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۵: وعن ابی موسیٰؓ قال خسفت الشمس فقام النبی صلی اللہ علیہ وسلم فزعًا یخشیٰ ان تکون السّاعۃ فاتی المسجد فصلی باطول قیام ورکوع وسجود مارأیتہ قط یفعلہ وقال ھذہ الآیات التی یرسل اللہ لاتکون لموت احدٍ ولالحیاتہ ولکن یخوف اللہ بہا عبادہ فاذا رأیتم شیئاً من ذلک فافزعوا الی ذکرہٖ ودعائہٖ واستغفارہٖ۔ متفق علیہ

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ سورج گرہن ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ آپؐ کی گھبراہٹ دیکھ کر یہ خوف کیا جانے لگا کہ کہیں قیامت ہی نہ آگئی ہو۔ پس آپؐ مسجد میں تشریف لائے تو آپؐ نے اتنے لمبے لمبے قیام درکوع اور سجدے کے ساتھ نماز پڑھی کہ میں نے آپؐ کو کبھی ایسا کرتے نہیں دیکھا تھا۔ اور ارشاد فرمایا کہ یہ نشانیاں جو اللہ تعالیٰ بھیجتا ہے کسی کی موت یا حیات کی وجہ سے نہیں ہوتیں بلکہ ان سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے۔ پس جب تم ان میں سے کچھ دیکھو تو اس کے ذکر اور دعا واستغفار سے پناہ ڈھونڈو۔ بخاری ومسلم۔

شرح:[1] یخشیٰ ان تکون الساعۃ اگر بصیغۂ مجہول یُخشیٰ ہو تو معنی وہ ہے جو اوپر کیا گیا اور اگر بصیغۂ معروف یَخشیٰ ہو تو معنی یہ ہوگا کہ وہ آپؐ قیامت کے آجانے کا خوف کر رہے تھے'' اور یہ راوی کا اپنا اندازہ یا حضورؐ کی گھبراہٹ کو بتانے کے لیے

---

[1] مظاہر حق ج ا صـ ۵۱۵، مرقات ج ۳ صـ ۳۲۱

طرز بیان ہے۔ اور بہتر یہ ہے کہ اس صورت میں اسے محاوراتی کلام قرار دیا جائے کہ آپؐ کا ڈر اور گھبراہٹ گویا اس شخص کی مانند تھی جو قیامت سے ڈر رہا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دلائلِ شرع سے حضورؐ کو اس بات کا علم تھا کہ جب تک آپؐ موجود رہیں گے قیامت برپا نہیں ہوگی اور سورج گرہن، چاند گرہن، طوفان اور زلزلہ وغیرہ کے وقت حضورؐ کی گھبراہٹ لوگوں پر شفقت و رحمت کی بنا پر تھی کہ مبادا ان پر عذابِ خداوندی آجائے۔

یخوف اللہ بہما عبادہٗ کہ اصل قدرت اللہ ہی کی ہے اور وہ ہر طرح کے تغیرات و انقلابات کے برپا کرنے پر قادر ہے۔ نعمت دینا اور چھین لینا اسی کے دستِ قدرت میں ہے اور احادیث میں یہ جو بار بار آ رہا ہے کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا:۔ سورج اور چاند کا گرہن کسی کی زندگی یا موت سے وابستہ نہیں، اس کی وجہ اگلی احادیث میں آ رہی ہے کہ اتفاق سے اسی دن حضورؐ کے فرزند حضرت ابراہیم علیہ السلام وفات پا گئے تھے۔ بعض لوگوں نے سورج گرہن کو اس واقعہ سے وابستہ کر دیا تھا۔ حضورؐ نے ان کی اس غلط فہمی کو دور فرمانے کے لیے خطبہ دیا تھا۔ اور اس میں بڑے زور سے اس وہم کی نفی فرمائی تھی۔

علامہؒ ابن دقیق العیدؒ نے فرمایا ہے کہ اس کائنات میں مادی اسباب کے علاوہ کچھ مخفی، روحانی اسباب بھی کار فرما ہیں پس سورج اور چاند کا گرہن جن مادی اسباب ہیئت سے واقع ہوتا ہے ان سے ان روحانی اسباب کی نفی نہیں ہو سکتی اس لیے وہ لوگ جو مقربانِ بارگاہِ الٰہی ہوتے ہیں اور جن کی نگاہ ان روحانی اور مخفی اسباب پر ہوتی ہے وہ ایسے مواقع پر بہت گھبراتے اور پریشان ہوتے ہیں جیسا کہ آندھی اور طوفان کے وقت حضورؐ کی حالت ہوتی تھی۔

ع مقربان را بیش بود حیرانی

حدیث ۶ : وعن جابرؓ قال انکسفت الشمس فی عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوم مات ابراھیمؑ بن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فصلی بالناس ست رکعات باربع سجدات۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ : حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

ؔ مرقات ج ۲ ص ۳۲۲۔

کے زمانے میں سورج گرہن ہوا جس دن کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرزند ابراہیم علیہ السلام نے وفات پائی تو حضورؐ نے لوگوں کو چھ رکوع اور چار سجدوں سے نماز پڑھائی۔ مسلم۔

شرح: رکعات سے مراد یہاں رکوعات ہے جیسا کہ اوپر بھی گزر چکا ہے اور چار سجدات کا لفظ اس کا واضح قرینہ ہے کہ دو رکعتیں تھیں۔ بخاری و مسلم کی متفق علیہ روایتوں میں اوپر ہر رکعت میں دو رکوع کا ذکر گزر چکا ہے یہاں ہر رکعت میں تین رکوع آ گئے۔ روایت بھی مسلم کی ہے اور صحیح ہے۔

علامہ[1] شوکانیؒ نے نیل الاوطار میں اور نواب صدیق حسنؒ خاں بھوپالی نے السراج الوہاج میں فرمایا ہے کہ ان احادیث کا تعارض اٹھانا ممکن نہیں ہے پس صحیح ترین روایتوں کو ترجیح دیں گے اور دوسری روایات کو چھوڑ دیں گے۔ اور واقعات کا متعدد ماننا اس لیے صحیح نہیں کہ حضورؐ کے زمانے میں صرف ایک سورج گرہن ہوا ہے دوسرا بالکل پیش نہیں آیا۔

[2] محدثینؒ نے یہاں جو ترجیح کا طریقہ اختیار فرمایا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ کسوفِ شمس کی روایات میں اضطراب ہے چنانچہ مسلم کی اس حدیث میں تین تین رکوع آئے ہیں۔ مسلم کی اگلی روایات میں چار چار رکوع کا ذکر ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے تو سیدھی سی بات کہہ دی ہے کہ ایک رکوع والی قولی حدیث کو لے لو اور فعلی احادیث مضطرب ہیں اور اگر انہیں ترجیح بھی دو گے تو بھی یہ حضورؐ ہی کے ساتھ مخصوص ہیں اور خصوصیت کے کئی قرائن موجود ہیں جن میں سے بعض کا ذکر باب کی ابتداء میں کیا جا چکا ہے وہاں ملاحظہ کیا جائے۔ حضرت امام شافعیؒ اور دیگر اہل علم سے یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ اگر سورج گرہن دیر تک رہے تو ہر رکعت میں تین، چار یا پانچ رکوع بھی جائز ہیں۔ غالباً انہوں نے یہ طریقہ ان صحیح احادیث پر بھی عمل ہو جانے کے لیے اختیار فرمایا ہے۔ واللہ اعلم۔ لیکن سوال پھر بھی کیا جا سکتا ہے کہ ابتداء سے ہی کسوف کے اتنے طویل ہو جانے کا علم کیسے ہو سکے گا تاکہ اس کے مطابق تین، چار یا پانچ رکوع کیے جائیں؟ اسی لیے شافعیہ نے کہا ہے کہ مفتیٰ بہ قول وہی دو رکوع والا ہے لیکن امام نوویؒ نے اس دو سے زیادہ والے قول کو اختیار ...

حدیث ۷: وعن ابن عباسؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حین کسف الشمس ثمان رکعات فی اربع سجدات وعن علیؓ مثل ذلک۔ رواہ مسلم

---

[1] نیل الاوطار ج ۴ ص ۲۱۸، السراج الوہاج ص ۲۸۵ ج ۱۔ [2] مظاہر حق ص ۵۱۵ ج ۱، مرقات ص ۲۲۳ ج ۲۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورج گرہن کے وقت آٹھ رکوع اور چار سجدوں کے ساتھ دو رکعت نماز پڑھی. مسلم۔

شرح: اس روایت میں پہلی سب روایات کے برعکس ہر رکعت میں چار رکوع کا ذکر آیا ہے اور روایت یہ بھی صحیح مسلم کی ہی ہے۔ پس جو حضرات ترجیح کا طریقہ اختیار فرما کر دو رکوع والی روایات کو ترجیح دیتے ہیں وہ تھوڑی سی تکلیف اور فرما کر ایک ہی رکوع والی روایت کو کیوں اختیار نہیں فرما لیتے تاکہ یہ سارا جھگڑا ختم ہو جائے؟ دراصل حنفیہ نے یہ جو کہا ہے کہ حضورؐ کا رکوع تو ایک ہی تھا غیر معمولی اور خلافِ عادت اس طویل رکوع میں بعض لوگ اٹھ اٹھ کر دیکھتے ہیں اور پچھلے حضرات شمار کرتے چلے جاتے تھے کہ اب دو رکوع ہو گئے، اب تین ہوئے، اب چار ہو گئے تو اس قول کی کچھ نہ کچھ اصل ضرور معلوم ہوتی ہے ورنہ صحابہؓ کے یہ مختلف بیانات کیونکر سمٹے جائیں گے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۸: وعن عبد الرحمن بن سمرةؓ قال كنت أرتمي باسهم لي بالمدينة في حياة رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا كسف الشمس فنبذتها فقلت والله لانظرن الى ما حدث لرسول الله صلى الله عليه وسلم في كسوف الشمس قال فأتيته وهو قائم في الصلوٰة رافع يديه فجعل يسبح ويهلل ويكبر ويحمد ويدعو حتى حسر عنها فرأ سورتين وصلى ركعتين۔ رواه مسلم في صحيحه عن عبد الرحمن بن سمرة وكذا في شرح السنة وفي نسخ المصابيح عن جابرؓ بن سمرة۔

ترجمہ: حضرت عبدالرحمن بن سمرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں حضور صلی اللہ علیہ کی زندگی مبارک میں مدینہ میں اپنے تیروں سے تیراندازی کر رہا تھا کہ اچانک سورج گہنا گیا۔ پس میں نے تیر پھینک دیئے اور کہا کہ واللہ میں ضرور دیکھوں گا کہ سورج گرہن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ پس میں حضورؐ کے پاس آیا تو حضورؐ نماز میں کھڑے تھے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے ہوئے تھے۔ پس آپؐ نے سبحان اللہ، لا الہ الا اللہ، اللہ اکبر، الحمد للہ کہنا شروع کیا اور دعا مانگنے لگے یہاں تک کہ سورج کا اندھیرا جاتا رہا تو آپؐ نے دو سورتیں

پڑھیں اور دو رکعت نماز ادا فرمائی۔ مسلم نے یہ حدیث اپنی صحیح میں عبدالرحمن رضؓ بن سمرہ سے روایت کی ہے اور شرح السنہ میں بھی ایسا ہی ہے اور مصابیح کے نسخوں میں جابرؓ بن سمرہ سے روایت ہے۔

شرح: صلوٰۃ الکسوف[1] کی روایات کے اضطراب کا یہ اور نمونہ ہے اس میں اول تو راوی حدیث صحابیؓ کے نام میں ہی اضطراب ہے۔ پھر گزشتہ تمام روایات کے برخلاف حالتِ نماز میں ہاتھ اٹھانے، تسبیح وتہلیل اور تکبیر وتحمید کا ذکر ہے پھر یہ معلوم نہیں کہ دو سورتیں آیا دو رکعتوں میں پڑھی تھیں یا ایک ہی میں روایات کا اضطراب موجبِ ضعف ہوتا ہے اسی لیے حنفیہ کہتے ہیں کہ تعددِ رکوع والی روایات کا ترک لازم ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۹: وعن اسماءؓ بنت ابی بکرؓ قالت لقد امر النبی صلی اللہ علیہ وسلم بالعتاقۃ فی کسوف الشمس۔ رواہ البخاری۔

ترجمہ: حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی اسماء رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ یقیناً جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورج گرہن میں غلام آزاد کرنے کا حکم دیا تھا۔ بخاری۔

شرح: اسلام چونکہ غلامی کی رسم کو مٹانا چاہتا تھا اس لیے غلام آزاد کرنے کے بہت فضائل بیان فرمائے گئے اور ہر اہم موقع پر غلاموں کی آزادی کا حکم دیا گیا۔ یہ موقع بھی انہی میں سے ایک ہے۔ وجہ یہ ہے کہ غلاموں کی آزادی اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے غلام کو آزاد کرنے والا مالکِ حقیقی کے سامنے اپنی بندگی کو پیش کر کے گویا التجاء کرتا ہے کہ میری گردن کو دوزخ کی غلامی سے آزادی بخشی جائے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

باب سجود الشکر

[2] نماز سے باہر کا سجدہ کئی قسم کا ہے:۔

الف۔ سجدۂ سہو۔ یہ سجدہ نماز کے حکم میں ہے، اس کی مشروعیت میں شبہ نہیں۔

ب۔ سجدۂ تلاوت۔ اس کے دلائل بھی واضح ہیں لہذا اختلاف نہیں۔

ج۔ سجدۂ مناجات بعد از نماز۔ اکثر علمائے امت کے نزدیک اس کی کوئی اصل نہیں لہذا مکروہ ہے۔

د۔ سجدۂ شکر۔ جو کسی نعمت کے ملنے یا مصیبت کے دور ہونے پر کیا جاتا ہے

---

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۵۱۶، مرقات ج ۳ ص ۳۲۵۔ [2] مظاہر حق ج ۱ ص ۵۱۸۔

اس میں اختلاف ہے۔ امام شافعیؒ اور احمدؒ کے نزدیک سنت ہے امام محمدؒ کا قول بھی یہی ہے اور اس کے ثبوت بھی آثار و احادیث میں موجود ہیں۔ لیکن امام مالکؒ اور ابو حنیفہؒ کے نزدیک اکیلا سجدۂ شکر مکروہ ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں تو بے شمار ہیں وان تعدوا نعمۃ اللہ لا تحصوھا ہر نعمت پر اگر سجدے کا حکم کیا جائے تو موجب تکلیف ہوگا۔ اور جن لوگوں کے نزدیک یہ سجدہ ثابت ہے وہ کہتے ہیں کہ نعمتوں سے مراد نئی پیدا ہونے والی اور نئی ملنے والی نعمتیں ہیں جو کبھی کبھی واقع ہوں نہ کہ وہ نعمتیں جو دائم و قائم اور ثابت ہیں مثلاً وجود اور اس کے لوازم و توابع۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی گئی ہے کہ آپؐ نے ابوجہل لعین کے قتل کی خبر سن کر سجدہ فرمایا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جھوٹے نبی مسیلمہ کذاب کے قتل کی خبر پر اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ذو الثدیہ کے قتل کی خبر سن کر سجدہ کیا تھا۔ اور کعبؓ بن مالک صحابی نے جو غزدۂ تبوک سے پیچھے رہ گئے تھے اور جن کے حق میں سورۂ توبہ اتری، توبہ کی خبر سن کر سجدہ کیا تھا۔

علامہ علی القاریؒ نے[1] امام محمدؒ کے ساتھ ابو یوسفؒ کا نام بھی لیا ہے کہ وہ بھی اس مسئلہ میں اپنے ساتھی محمدؒ کے ساتھ ہیں اور سجدۂ شکر کے مسنون ہونے کے قائل ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

الفصل الثانی

اس سے قبل یہ عبارت لکھی ہے وھذا الباب خال عن الفصل الاول والثالث۔ فصل اوّل سے اس لیے خالی ہے کہ مصنف مصابیح امام بغویؒ اور صاحب مشکوٰۃ ہر دو کو صحیحین میں سے اس مضمون کی کوئی روایت نہیں مل سکی اور فصل ثالث سے بھی یہ باب خالی ہے یہ صاحب مشکوٰۃ اپنی طرف سے معذرت پیش فرما رہے ہیں۔ امام جزریؒ فرماتے ہیں کہ اس باب میں صاحب مصابیح نے صحاح میں سے کوئی حدیث بیان نہیں کی۔ اور جس قدر احادیث لائے ہیں حسان میں سے ہیں حالانکہ میں نے صحاح میں سے کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی متفق علیہ حدیث پائی ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت موصول ہونے پر کہ کعبؓ کی توبہ قبول ہے، کعبؓ سجدہ شکر میں گر گئے تھے۔ امام جزریؒ کا مطلب یہ ہے کہ بخاری و مسلم کی اس حدیث کو

---

[1] مرقات ج ۳ ص ۳۲۵

فصل اول میں لایا جا سکتا تھا۔ وَفوقَ کلِ ذی علمٍ علیم۔

حدیث ۱: عن ابی بکرۃؓ قال کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اذا جاءہ امر سرور او بشر بہ خر ساجداً شاکراً للّٰہ تعالیٰ۔ رواہ ابوداؤد والترمذی وقال ھذا حدیث حسن غریب۔

ترجمہ: حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب کوئی خوشی کی خبر یا دل خوش کن خبر آتی تھی تو اللہ تعالیٰ کا شکر یہ ادا کرتے ہوئے سجدہ میں گر جاتے تھے۔ اسے ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا اور ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن غریب ہے۔

شرح:[1] حافظ تورپشتی حنفی فرماتے ہیں کہ علماء کی ایک جماعت نے ظاہر حدیث سے استدلال کیا ہے اور کہا ہے کہ سجدۂ شکر مشروع ہے اور کچھ اور علماء نے اس کے خلاف کہا ہے اور وہ فرماتے ہیں کہ اس سجدہ سے مراد نماز کا سجدہ ہے نہ کہ اکیلا سجدۂ شکر۔ اور ان کی دلیل یہ حدیث ہے کہ جب فتح کی خوشخبری آئی یا ابوجہل کے قتل کی خبر ملی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بوقت چاشت دو رکعت نماز ادا فرمائی پس سجدۂ شکر سے مراد یہ نماز شکر ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے کہ ہر نعمت پر اگر سجدہ لازم کیا جائے تو ایک لمحہ کے لیے بھی فارغ وقت نہ ملے گا کیونکہ خدا تعالیٰ کی نعمتیں بے شمار ہیں اور کوئی گھڑی نئی آنے والی نعمتوں سے خالی نہیں۔ سب سے بڑی نعمت تو یہ زندگی ہے اور اس میں ہر سانس کا آنا ایک نئی نعمت ہے پس اگر ہر نعمت پر سجدہ ہے تو بڑا حرج واقع ہوگا لہٰذا یہ سجدہ سنت نہیں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۲: وعن ابی جعفرؓ ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم رأی رجلاً من النغاشین فخر ساجداً۔ رواہ الدار قطنی مرسلاً وفی شرح السنۃ لفظ المصابیح۔

ترجمہ: حضرت ابوجعفرؒ (محمد بن علی بن الحسینؓ الباقر) سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بونے شخص کو دیکھا تو سجدے میں گر پڑے۔ اسے دار قطنی نے مرسل طور پر روایت کیا ہے اور شرح السنۃ میں لفظ مصابیح کے مطابق ہے۔

شرح:[2] نغاش اور نغاشی اس شخص کو کہتے ہیں جو چھوٹے قد کا ہو، ناقص الخلقت

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۵۱۸، مرقات ج ۳ ص ۳۲۸۔ [2] مظاہر حق ج ۱ ص ۵۱۸، مرقات ج ۳ ص ۳۲۹

اور ضعیف الحرکت ہو۔ حضورؐ نے اس شخص کو دیکھ کر قدرتِ الٰہی کے عجیب ظہور کے پیش نظر بطور شکر سجدہ ادا فرمایا تھا کہ خدا کا شکر ہے اس نے ہماری خلقت پوری بنائی اور اعضاء صحیح و سالم بخشے ہیں۔ حضرت مظہرؒ فرماتے ہیں کہ سنت یہ ہے کہ جب کسی مبتلائے مصیبت کو دیکھیں تو سجدۂ شکر بجا لائیں کہ اس ذاتِ پاک نے اس بلا سے ہمیں عافیت بخشی ہے۔ اور یہ سجدہ پوشیدہ کرنا چاہیئے تاکہ وہ شخص رنجیدہ نہ ہو اور اس کی دل شکنی نہ ہو۔ لیکن اگر کسی فاسق کو دیکھیں تو بر ملا سجدۂ شکر کریں تاکہ وہ توبہ کرے اور فسق سے باز آ جائے۔ اور حضرت شبلیؒ سے منقول ہے کہ انہوں نے ایک دنیا دار کو دیکھا تو فرمایا:
الحمد للّٰہ الذی عافانی مما ابتلاك بہ "اللہ کا شکر ہے جس نے مجھے اس مصیبت سے بچایا جس میں تجھے مبتلا فرمایا ہے"۔

حدیث مرسل ہے اور اس کے راوی حضرت محمدؒ باقر ہیں۔ باقر ان کا لقب ہے جس کا لفظی معنی ہے "وسیع العلم"۔ یہ حضرت زین العابدینؒ بن الحسینؓ کے فرزند ارجمند تھے۔

حدیث ۳ : وعن سعدؓ بن ابی وقاص قال خرجنا مع رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من مکۃ نرید المدینۃ فلما کنا قریبًا من عزوزاء نزل ثم رفع یدیہ فدعا اللّٰہ ساعۃ ثم خرّ ساجدًا فمکث طویلا ثم قام فرفع یدیہ ساعۃ ثم خرّ ساجدًا فمکث طویلا ثم قام فرفع یدیہ ساعۃ ثم خرّ ساجدًا قال انی سألت ربی و شفعت لامتی فاعطانی ثلث امتی فخررت ساجدا لربی شکرًا ثم رفعت رأسی فسألت ربی لامتی فاعطانی ثلث اُمتی فخررتُ ساجدًا لربّی شکرًا ثم رفعتُ رأسی فسألتُ ربّی لِاُمّتی فاعطانی الثُّلُثَ الآخر فخررت ساجدا لربی شکراً۔ رواہ احمد و ابوداؤد۔

ترجمہ : حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم مکہ سے مدینہ کے ارادے سے جنابِ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے پس جب ہم عزوزاء نامی مقام کے قریب پہنچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سواری سے اتر پڑے۔ پھر آپؐ نے اپنے ہاتھ اٹھائے اور ایک گھڑی تک اللہ سے دعا کی پھر سجدہ میں گر پڑے پس کافی دیر تک سجدہ ہی میں رہے پھر اٹھے اور ایک

گھڑی تک اپنے ہاتھ مبارک اٹھائے پھر سجدہ میں گر پڑے پس کافی دیر سجدہ ہی میں رہے۔ پھر اٹھے تو اپنے ہاتھ مبارک اٹھائے ایک گھڑی تک۔ پھر سجدہ میں گر پڑے۔ ارشاد فرمایا کہ میں نے اپنے رب سے سوال کیا ہے اور اپنی امت کے لیے شفاعت کی ہے پس پہلی مرتبہ اللہ تعالیٰ نے مجھے میری ایک تہائی امت بخشی۔ پس میں اپنے پروردگار کے شکریہ کے لیے سجدہ میں گر گیا پھر میں نے سر اُٹھایا اور اپنے ربّ سے اپنی اُمت کے لیے دعا مانگی تو اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک تہائی امت عطا فرما دی۔ پھر میں شکر کرتے ہوئے سجدہ گر پڑا پھر میں نے اپنا سر اٹھایا تو اپنے رب سے اپنی امت کے لیے سوال کیا تو اس نے مجھے آخری تہائی بھی عطا فرما دی پس میں اپنے پروردگار کے شکریہ میں گر گیا۔ احمد، ابوداؤد۔

شرح [1] عمل کرنے والوں کے تین درجے ہیں: سابقین، متوسّطین اور گنہ گار۔ پہلی مرتبہ سابقین بالخیرات، یعنی جو نیکیوں میں سبقت لے جانے والے اور پورے عمل کرنے والے ہیں ان کی بخشش کا وعدہ ہوا۔ دوسری مرتبہ متوسّطین کی مغفرت ہوئی اور تیسری مرتبہ گنہگاروں کی۔ یہاں ایک اشکال ہے کہ بہت سی آیات و احادیث گنہ گاروں کے جہنم میں جانے اور عذاب پانے پر دلالت کرتی ہیں اور اس حدیث سے ساری امت کی بخشش معلوم ہوتی ہے پس اس حدیث کو ان آیات و احادیث سے کیسے مطابق کیا جائے گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس شفاعت و دعا سے جو مغفرت ہوئی اس سے مراد یہ ہے کہ پہلی قوموں کی مانند یہ امت ساری کی ساری خسف و مسخ اور دوسرے عذابوں سے محفوظ کی گئی ہے پس اس حدیث کا تعلق عذابِ آخرت سے نہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کا تعلق عذابِ آخرت سے ہی ہے اور وعدۂ خداوندی یہ ہوا کہ کچھ مدت عذاب پا کر حضورؐ کی شفاعت سے دوزخ سے نکالے جائیں گے غرض ہمیشہ کے عذاب میں مبتلا نہیں رہیں گے۔ اس امت کا عذاب گناہوں سے پاک کرنے اور تنقیہ و تہذیب کے لیے ہو گا نہ کہ عذابِ خلود۔ اسی طرح یہ امت وسوسوں کے قابلِ عذاب ہونے سے بھی بچا دی گئی ہے۔ اور خطا و نسیان ان سے اٹھا دیا گیا ہے۔ اور حضورؐ کی شفاعت اہلِ کبائر کے لیے قبلِ دخولِ نار بعدِ دخولِ نار بھی ثابت ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

عزوزاء نامی مقام مکہ شریف سے باہر جُحفہ کے قریب ایک گھاٹی ہے۔ اور بعض نے اسے عزوراء بھی کہا ہے لیکن صحیح تر عزوزاء ہی ہے۔

---

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۵۱۹، مرقات ج ۳ ص ۳۳۰، ۳۳۱۔

باب الاستسقاء

استسقاء[1] کا لفظی معنی ہے پانی مانگنا اور شرع میں اس کا معنی ہے قحط سالی کے موقع پر ایک مخصوص طریقے سے اللہ تعالیٰ سے بارش کی دعا کرنا۔ علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ نمازِ استسقاء کے لیے شکستہ حال اور عاجز ہو کر شکستہ لباس پہن کر پیدل تین دن تک نکلنا چاہیئے۔ مکہ مکرمہ اور بیت المقدس میں نمازِ استسقاء مسجدِ حرام اور مسجد بیت المقدس میں ہی ادا کرنی چاہیئے۔ علامہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر دعا و نماز کے باوجود بارش نہ ہو تو زیادہ سے زیادہ تین دن نمازِ استسقاء پڑھیں۔ علامہ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صحیح احادیث سے استسقاء کی تین صورتیں ثابت ہیں :-

الف۔ انفرادی یا اجتماعی دعا فقط : ابو عوانہ نے اپنی صحیح میں روایت کی ہے کہ ایک قوم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قحط سالی کی شکایت کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ گھٹنوں کے بل ہو جاؤ اور یوں کہو: یا رب یا رب۔ انہوں نے ایسا ہی کیا تو بارش ہو گئی۔ اور احادیث میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے احجار الزیت کے پاس نماز کے بغیر ہی بارش کے لیے دعا فرمائی تھی۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس قسم کی بہترین دعا وہ ہے جو نیک لوگوں کی طرف سے ہو۔

ب۔ دوسری قسم کی دعا اوسط دعا ہے اور وہ نمازوں کے بعد ہوتی ہے فرائض کے بعد ہو یا نوافل کے بعد ہو اور ہر دعا میں ایک ثابت بالشرع خطبہ بھی ثابت ہے۔

ج۔ استسقاء کا اعلیٰ درجہ وہ ہے جو نماز اور خطبہ سمیت ہو جیسے کہ ابھی آئے گا۔ اور استسقاء کا تکرار مستحب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ دعا میں زاری اور الحاح کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔ واللہ اعلم۔

علامہ سید انور شاہ الکشمیری فرماتے ہیں کہ نمازِ استسقاء کی قرأت حنفیہ کے نزدیک آہستہ ہونی چاہیئے اور امام صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک خطبہ مسنون نہیں لیکن صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک مسنون ہے اور عمل صاحبین رحمہما اللہ کے طریقے پر ہے۔ اور امام کے لیے چادر پلٹنا مستحب ہے اور لوگوں کے لیے نہیں۔ اور امام نووی رحمہ اللہ نے فتویٰ دیا ہے کہ امام کے حکم سے نمازِ استسقاء واجب ہو جاتی ہے۔ حنفیہ کے نزدیک بھی ایسا ہی ہے لیکن یہ وجوب بامر الامام ہے۔ اصل حیثیت اس نماز کی سنت کی ہے اور یہ وجوب طاری اور عارضی ہے اور اس کا تعلق اصل تشریع سے نہیں بلکہ امورِ انتظامیہ سے ہے۔ لیکن خلفائے راشدین کے احکام محض انتظامی احکام نہیں تھے بلکہ ان کی حیثیت تشریع سے نیچے اور انتظامی احکام کے اوپر

مرقات ج ۳ ص ۵۲۱ [1] فیض الباری ج ۲ ص ۳۷۷، ۳۷۸۔

یعنی بین بین کی ہے۔ کیونکہ کتاب و سنت نے ان کا درجہ و مقام بین بین رکھا ہے۔ بہت سی آیات و احادیث اس پہ دلالت کرتی ہیں مثلاً صحیح حدیث: اقتدوا با الذین بعدی ابی بکرؓ و عمرؓ۔ الحدیث۔

الفصلُ الاوّل

حدیث ۱: عن عبدؓ اللہ بن زید قال خرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالناس الی المصلیٰ یستسقی فصلی بھم رکعتین جھر فیھما بالقرأۃ واستقبل القبلۃ ید عو ورفع یدیہ وحول ردائہ حین استقبل القبلۃ۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو لے کر عید گاہ میں تشریف لے گئے۔ پس آپؐ نے انہیں دو رکعتیں پڑھائیں جن میں قرأت بآوازِ بلند پڑھی اور قبلہ رخ ہو کر دعا مانگی اور اپنے ہاتھ بلند کیے اور اپنی چادر اس وقت پلٹ دی جبکہ قبلہ رخ ہوئے تھے۔ بخاری و مسلم۔

شرح: راویٔ حدیث عبداللہؓ بن زید بن عاصم بن مازن انصاری ہیں۔ عبداللہ بن زید بن عبدربہ الخزرجی نہیں جنہوں نے خواب میں اذان دیکھی تھی۔ یہ عبداللہؓ بن زید مازنی وہی ہیں جنہوں نے وحشی بن الحرث سے مل کر مسیلمہ کذاب کو قتل کیا تھا۔

حضورؐ سے استسقاء کی دعا کئی طرح سے ثابت ہے ان میں سے ایک طریقہ یہ ہے جو اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے چونکہ حضورؐ نے اس پہ دوام نہیں فرمایا بلکہ کبھی صرف دعا مانگ لی لہٰذا احنفیہ اسے سنتِ مؤکدہ نہیں جانتے بلکہ محض مستحب سمجھتے ہیں۔ اسی طرح اس میں جہر بالقرأۃ اور اخفاء کا اختلاف بھی محض استحباب کا اختلاف ہے۔

وحوّل ردائہ۔ یہ چادر پلٹنا بطور تفاؤل تھا کہ ہم نے اپنی حالت بدل دی ہے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ تنگی کو آسانی سے اور قحط سالی کو سرسبزی سے تبدیل فرما دے گا اور تحویل کی کیفیت یہ ہے کہ دائیں ہاتھ سے چادر کے بائیں جانب کا نچلا کونہ پکڑے اور بائیں ہاتھ سے دائیں جانب کا نچلا کونہ پکڑے اور اپنے ہاتھوں کو پیٹھ کے پیچھے سے پھیرے جس سے کہ دائیں ہاتھ سے پکڑا ہوا حصہ دائیں کندھے کے اوپر اور بائیں ہاتھ سے پکڑا ہوا حصہ بائیں کندھے کے اوپر آجائے۔ اس طرح کرنے سے دائیں طرف بائیں و بالعکس اور نچلی طرف اوپر و بالعکس ہو جائے گی بمستدرکِ حاکم میں بقولِ حاکم ایک صحیح حدیث کے الفاظ یہ ہیں: وَحَوَّلَ

لہ مرقات ج ۳ ص ۳۳۱

ردائہ لیتحول القحط۔ اور طبرانی کی طوالات میں انسؓ کی حدیث ہے: وقلب ردائہ لکی ینقلب القحط الی الخصب۔ اور مسندِ حاکم میں ہے: لتتحول السنة من الجدب الی الخصب: اور یہ وکیعؒ کا قول ہے۔ واللہ اعلم۔

؎ امام شافعیؒ، ابو یوسفؒ اور محمد بن الحسنؒ کے نزدیک نمازِ استسقاء عید کی نماز کی مانند ہے اور امامِ مالکؒ کے نزدیک دو رکعت عام نمازوں کی طرح ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک استسقاء صرف دعا اور استغفار ہے اور اکثر احادیث میں صرف دعا اور استغفار کا ذکر آیا ہے نماز کا نہیں لہٰذا وہ کہتے ہیں کہ استسقاء میں نماز نہیں (یعنی مسنون نہیں کیوں کہ سنیت کے لیے دوام و مواظبت ضروری ہے اور وہ یہاں مفقود ہے) اور صحیح طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ امیر المومنین عمرؓ نے استسقاء فقط دعا و استغفار سے کیا تھا نماز نہیں پڑھی تھی اگر مسنون ہوتی تو ترک نہ کرتے اور انہیں معلوم نہ ہونا باوجود قربِ زمانہ کے اور واقعہ کی اتنی اہمیت کے نہایت بعید ہے اور علم کے باوجود ترک اس سے بھی بعید تر ہے اور علماء حنفیہ نے ابو حنیفہؒ کے اس قول کا مطلب کہ لا صلوٰۃ فی الاستسقاء یہ لیا ہے کہ نماز با جماعت وخطبہ وغیرہ مسنون نہیں۔ لوگ انفراداً نماز، دعا، استغفار وغیرہ کریں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ باجماعت نماز ناجائز ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ نماز باجماعت کو اس کی شرط اور سنتِ مؤکدہ نہیں ٹھہراتے۔ اس کے ساتھ ساتھ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس باب میں حنفیہ کا عمل صاحبینؒ کے قول پر ہے۔ اور پہلی رکعت میں سورۂ قٓ یا الاعلیٰ اور دوسری میں، اقتربت الساعة یا الغاشیہ پڑھنا افضل ہے۔

حدیث ۲: وعن انسؓ قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لایرفع یدیہ فی شیئ من دعائہ الا فی الاستسقاء فانہ یرفع حتی یری بیاض ابطیہ۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم استسقاء کے سوا اپنی کسی دعا میں ہاتھ نہ اٹھاتے تھے۔ نمازِ استسقاء میں اس قدر ہاتھ اٹھاتے تھے کہ آپؐ کی بغلوں کی سفیدی نظر آجاتی تھی۔ بخاری و مسلم۔

شرح ابوداؤد کی ایک مرسل حدیث میں ہے کہ حضورؐ استسقاء کے سوا کسی نماز میں ہاتھ بہت زیادہ نہ اٹھاتے تھے۔ اور انسؓ کی اس روایت کے الفاظ فانہ یرفع الخ بھی اسی پر دلالت کر رہے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ نفی رفع کی نہیں رفع بلیغ کی ہے اور جس نے اس حدیث سے استسقاء کے سوا ہاتھ اٹھانے کی نفی سمجھ لی ہے وہ راہِ صواب سے بہت

؎ مظاہر حق ج ۱ صفحہ ۵۲۰ ؎ فیض الباری ج ۲ صفحہ ۳۸۰، فتح الباری ج ۲ صفحہ ۵۵۴

دور جا پڑا ہے کیونکہ امام نووی نے دعا کے وقت ہاتھ اٹھانے کے ثبوت میں تقریباً تیس احادیث روایت کی ہیں اور یہ رفعِ بلیغ ابتہال و تضرع کی وجہ سے تھا۔ واللہ اعلم۔

علماءؒ نے فرمایا ہے کہ جتنا مقصد دشوار اور بھاری ہو اتنے ہی ہاتھ بھی بلند تر کرنے چاہئیں کیونکہ اس میں الحاح اور طلب کی شدت پائی جاتی ہے۔

حدیث ۳: وعنہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم استسقیٰ بظہر کفیہ الی السماء۔ مسلم۔

ترجمہ: اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بارش کی دعا کی تو اپنی دونوں ہتھیلیوں کی پشت سے آسمان کی طرف اشارہ فرمایا۔ مسلم

شرح: علماءؒ کہتے ہیں کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تفاؤلاً کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ حالت بدل دے جیسا کہ آپؐ نے چادر بھی اسی لیے پلٹی تھی۔ یا یہ اشارہ تھا کہ اللہ تعالیٰ بادل کو زمین پر ڈال دے گویا یہ اسی طرح ہے جس طرح کسی کی ہتھیلی میں پانی ہو تو وہ اسے زمین پر الٹ دے۔ اور علماء نے یہ بھی کہا ہے کہ جو شخص قحط وغیرہ اور دفع بلا چاہے وہ دعا میں ہاتھوں کی پشت اوپر کو کرے اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے کوئی نعمت طلب کرے وہ ہتھیلیوں کی اندرونی جانب اوپر کرے۔ امام احمدؒ روایت فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی چیز سے پناہ مانگتے تو الٹے ہاتھوں سے دعا کیا کرتے اور جب عام دعا کرتے تو سیدھے ہاتھوں سے مانگتے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۴: وعن عائشۃؓ قالت ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا رأی المطر قال اللّٰھم صیبًا نافعًا۔ رواہ البخاری۔

ترجمہ: ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بارش کو دیکھتے تو فرمایا کرتے: اے اللہ! موسلادھار بارش ہو اور مفید ہو۔ بخاری۔

شرح:[1] بارش کی یہی دو صفات مطلوب ہیں۔ کیونکہ اگر کافی نہ ہو تو مفید نہ ہوگی اور اگر حد سے بڑھ جائے تو مضر ہوگی لہٰذا دعا میں صیبًا کے ساتھ ساتھ نافعًا کا لفظ نہایت مناسب اور برمحل ہے۔ اور اس میں أسقنا یا أسئالك یا اجعلہ کا لفظ مقدر ہے۔ اور پہلا لفظ ایک روایت میں بھی آچکا ہے۔ واللہ اعلم۔

حدیث ۵: وعن انسؓ قال اصابنا ونحن مع رسول اللہ صلی اللہ

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۵۲۱، مرقات ج ۲ ص ۳۳۳۔ [2] ایضاً [3] مرقات ج ۲ ص ۳۳۳

علیہ وسلم مطر قال فحسر رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم ثوبہ حتی اصابہ فلنا یا رسول اللہ لم صنعت ھذا قال لانہ حدیث عہد بربہ۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ : حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے تو ہمیں بارش نے آلیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا کپڑا (سر پر سے یا پیٹھ پر سے) ہٹا دیا یہاں تک کہ آپؐ پر بارش ہو گئی تو ہم نے کہا یا رسول اللہ آپؐ نے یہ کیوں کیا ہے؟ فرمایا اس لیے کہ یہ اپنے رب کی طرف سے ابھی ابھی آرہا ہے۔ مسلم۔

شرح [۲]: یعنی اللہ تعالیٰ کی تکوین نے اسے ابھی ابھی پیدا فرمایا ہے اور یہ رحمت ہے۔ پس اس سے برکت حاصل کرنی چاہیئے۔ شارح[۳] طیبیؒ فرماتے ہیں کہ واضح تر بات تو یہ ہے کہ حضورؐ نے اپنا کپڑا سر مبارک سے ہٹایا تھا لیکن حاکم کی روایت میں خسر ثوبہ عن ظہرہ کے الفاظ آئے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے بارش کے متعلق فرمایا ہے: و انزلنا من السماء ماء مبارکاً۔ پس حضورؐ اس کی برکت سے حصہ لیتے تھے۔

علامہ علی القاریؒ نے حدیث عہد ربہ کی شرح میں لکھا ہے کہ یہ اللہ کے حکم سے ابھی ابھی اترا ہے پس اس کی حالت چھوٹے بچے، تازہ انگوری اور موسم بہار کی کلیوں جیسی ہے کہ یہ ابھی تک دنیا والوں سے ملا جلا نہیں اور گنہ گاروں کی مخالطت سے ابھی آلودہ نہیں ہوا۔ یا یوں کہو کہ یہ ایک جدید اور تر و تازہ نعمت ہے اور ہر جدید میں ایک لذت ہوتی ہے۔ یا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک ایلچی اور رحمت کے قاصد اور پیغامبر کی مانند ہے پس اس کی تعظیم و تکریم اور مہمان نوازی اور عزت افزائی واجب ہے۔

بابٌ فی الرّیاح

ہواؤں کا بارش سے بہت زیادہ تعلق ہے قرآن کہتا ہے: وارسلنا الریاح لواقح۔ الآیہ۔ اور ہم نے ہواؤں کو بادلوں سے باردار اور بوجھل بنا کر بھیجا"۔ ہوائیں قدرتِ خداوندی کا عظیم نشان ہیں۔ ان کے الٹ پھیر سے بہت سی تکوینی اور فطرتی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں، قرآن کا ارشاد ہے: و تصریف الریاح الآیہ۔ اور ہواؤں کے ادلنے بدلنے میں قدرتِ الٰہی کی عظیم نشانیاں ہیں"۔

[۱] مشکوٰۃ کے اکثر نسخوں میں یہاں صرف بابٌ کا لفظ ہے یعنی یہ باب پہلے باب کا

---

[۲] السراج الوہاج ص ۲۸۷ ج ۱۔ [۳] مرقات ص ۳۳۴ ج ۲۔ [۱] مظاہر حق ص ۵۲۳ ج ۱، مرقات ص ۳۴ ج ۳

تتمہ اور اسی کا لاحقہ ہے۔ ایک صحیح نسخہ میں "باب فی الریاح" اور ایک میں "باب الریاح" کا لفظ ہے۔ بہر حال ہواؤں کا ذکر استسقاء کے بعد نہایت مناسب ہے۔

الفصلُ الاوّل

حدیث ا : عن ابن عباسؓ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم نُصرتُ بالصبا واھلکت عاد بالدبور۔ متفق علیہ۔

ترجمہ : حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میری مدد پُروا ہوا سے کی گئی اور قومِ عاد کو پچھوا ہوا سے ہلاک کیا گیا۔ بخاری و مسلم۔

شرح [1] الصبا کو قبول بھی کہا جاتا ہے کیونکہ یہ مشرقی ہوا ہے اور کعبہ کے دروازے کے بالمقابل ہونے کی وجہ سے اسے قبول کہا گیا ہے اور الدبور سے مراد مغربی ہوا ہے جس سے قومِ عاد کو ہلاک کیا گیا تھا۔ اور حضورؐ کی مدد بادِ صبا کے ساتھ جنگ خندق، (غزوہ احزاب)، میں کی گئی تھی۔ شدید پُروا ہوا نے حملہ آور مشرکوں کے خیمے اکھاڑ دیئے ان کی ہانڈیاں الٹ دیں اور ان میں اضطراب وانتشار پیدا کر دیا تھا۔ اس ناگہانی آفت سے بچنے کے لیے وہ محاصرہ اٹھا کہ جدھر سینگ سمائے ادھر کو چل دیئے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ احزاب میں فرمایا فارسلنا علیھم ریحا وجنوداً لم تروھا الآیہ۔ اور بادِ صبا بادلوں کو اکٹھا کرنے اور بارش برسانے کا باعث بھی بنتی ہے یہ مغرب سے چلتی ہے اور قومِ عاد کو اس سے بالکل تباہ وبرباد کر ڈالا گیا تھا، قرآن کہتا ہے: فھل تریٰ لھم من باقیۃ۔ اور یہ عجیب مناسبت ہے کہ بادِ صبا — قبول — سے اہلِ قبول کی مدد فرمائی گئی لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت ورأفت کے پیشِ نظر مشرکین مکہ کو ہلاک نہیں فرمایا گیا کیونکہ یہ لوگ کچھ مدت بعد اسلام لانے والے تھے۔ اِن لوگوں پہ صبا مسلط کرنے میں یہ حکمت بھی پیش نظر تھی کہ ان کا جڑ پیڑ سے اکھاڑ پھینکنا مقصودِ الٰہی نہ تھا۔ واللہ اعلم۔

[2] جنگ احزاب میں حملہ آور قریش، غطفان اور یہود تھے اللہ تعالیٰ نے اہل اسلام کی اس موقع پہ خاص مدد فرمائی اور دشمنانِ اسلام خائب وخاسر ہوئے۔ یہ واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک واضح معجزہ بھی تھا۔ اور قومِ عاد بڑے بڑے قد آور جنگی مرد

---

[1] فتح الباری ج ۲ ص ۵۵۵، فیض الباری ج ۲ ص ۳۸۱۔ [2] مرقات ج ۳ ص ۲۴۴، مظاہر حق ج ۱ ص ۵۲۴

تھے اور پہاڑوں کو تراش تراش کر مکان بناتے تھے لیکن جب پچھوا ہوا کا عذاب آیا تو ان کے سر پھوٹ گئے، پیٹ پھٹ گئے اور انتڑیاں باہر نکل کر بکھر گئیں۔ اعاذنا اللہ من ذالک۔

حدیث ۲: وعن عائشۃ رضی قالت ما رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضاحکاً حتی أری منہ لہواتہ انما کان یتبسم فکان اذا رأی غیماً أو ریحاً عرف فی وجہہ۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی کھل کر ہنستے نہیں دیکھا کہ میں آپؐ کے کوّے دیکھ لیتی۔ آپؐ تو بس مسکرایا کرتے تھے۔ اور جب ابر یا آندھی کو دیکھتے تو ان کا اثر آپؐ کے چہرہ مبارک پر پہچانا جاتا تھا۔ بخاری ومسلم۔

شرح: بادل رحمت الٰہی کا باعث ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی زحمت وعذاب بھی ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح آندھی سے جانی ومالی نقصان مسلّم ہے پس حضورؐ کے تفکر کا باعث یہی امور ہوتے تھے۔ اور حضورؐ چونکہ رحمۃ للعالمین تھے لہٰذا لوگوں کے ضرر ونقصان کے خیال سے غمگین ہو جاتے تھے صلی اللہ علیہ وسلم۔ کثرتِ تبسم سے حضورؐ کا خوش مزاج اور عالی ظرافت ہونا ثابت ہوتا ہے اور زیادہ کھل کر نہ ہنسنے سے ایک طرف آپؐ کی اعتدال پسندی ثابت ہوتی ہے اور دوسری طرف معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ غافل اور بے پرواہ، لوگوں کی مانند نہ تھے بلکہ جلالِ الٰہی میں مستغرق رہتے تھے اور پھر لوگوں کے غم والم سے غمگین خاطر ہونا آپؐ کی رأفت ورحمت اور مخلوقِ خدا پر شفقت کو ظاہر کرتا ہے اور یہی چیزیں مل کر خُلقِ عظیم بن گئی تھیں۔

[۱] حافظ ابن حجرؒ عسقلانی فرماتے کہ مسندِ ابی یعلیٰ میں صحیح سند سے حضرت انس رضی کی روایت آئی ہے جس میں ہے کہ حضورؐ شدید آندھی کے وقت یہ دعا فرماتے تھے: اللّٰھم انی اسألک من خیر ما امرت بہ واعوذ بک من شر ما امرت بہ۔ اس دعا سے پتہ چلا کہ ایسے موقعوں پر حضورؐ کے سامنے پچھلی معذب امتوں کا نقشہ آجاتا تھا جس کی وجہ سے گھبراہٹ اور غمگینی کے آثار ظاہر ہوتے تھے۔

حدیث ۳: وعنہا قالت کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا عصفت الریح قال اللّٰھم انی اسألک خیرھا وخیر ما فیہا وخیر ما ارسلت بہ واعوذ بک من شر ما ارسلت بہ

---

[۱] فتح الباری ج ۴ ص ۵۵۵

واذا تخیلت السماء تغیر لونہ وخرج ودخل واقبل وادبر فاذا امطرت سری عنہ فعرفت ذلک عائشۃ فسألتہ فقال لعلہ یا عائشۃؓ کما قوم عاد: فلما رأوہ عارضا مستقبل اودیتہم قالوا ھذا عارض ممطرنا وفی روایۃ یقول اذا رأی المطر رحمۃ۔ متفق علیہ۔

ترجمہ: اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ جب تیز آندھی چلتی تھی توجناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کہا کرتے تھے: اے اللہ! میں تجھ سے اس کی بھلائی اور جو کچھ اس میں ہے اس کی بھلائی مانگتا ہوں اور جس کام کے لیے یہ بھیجی گئی ہے اس کی بھلائی مانگتا ہوں۔ اور میں تجھ سے اس کے شر اور جو کچھ اس میں ہے اس کے شر سے اور جس مقصد کے لیے یہ بھیجی گئی ہے اس کے شر سے پناہ مانگتا ہوں،، اور جب مطلع ابر آلود ہوتا تھا تو آپؐ کا رنگ بدل جاتا تھا۔ اور کبھی گھر کے اندر تشریف لے جاتے کبھی باہر تشریف لے جاتے تھے اور جب بارش ہو جاتی تو آپؐ کی یہ حالت جاتی رہتی تھی۔ پس عائشہؓ نے (جو خود حدیث بیان فرما رہی ہیں) آپؐ کی یہ کیفیت دیکھ کر آپؐ کی گھبراہٹ معلوم کر لی تو آپؐ سے اس کا سبب دریافت کیا تو فرمایا: اے عائشہؓ! کیا معلوم کہ یہ بھی اس بادل کی مانند ہو جس کے متعلق قومِ عاد نے کہا تھا کہ یہ بادل ہے جو ہم پر بارش برسائے گا جیسا کہ قرآن کی آیت میں ہے کہ جب انہوں نے اسے اپنی وادیوں کی طرف آتا دیکھا الخ۔ اور ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ جب بارش کو دیکھتے تو فرماتے کہ خدایا اسے رحمت بنا دے۔ بخاری ومسلم۔

تشریح[1]: قرآن پاک نے سورۂ احقاف میں قومِ عاد کی ہلاکت کا قصہ بیان فرمایا ہے کہ ان کی ہلاکت کے لیے جب آندھی آئی تو انہوں نے اسے بادل سمجھ کر خوشی کا اظہار کیا لیکن کچھ دیر کے بعد اس طوفان نے انہیں زیر وزبر کر ڈالا اور ان کا نشان تک نہ چھوڑا۔ پس حضورؐ کا غم اس بنا پر ہوتا تھا کہ آندھی اور طوفان باعثِ ضرر ونقصان بھی ہوتے رہے ہیں ان سے کہیں لوگوں کو زحمت نہ پہنچ جائے۔

حدیث ۴: وعن ابن عمرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مفاتیح الغیب خمس ثم قرأ ان اللہ عندہ علم الساعۃ وینزل الغیث۔ الآیہ۔ رواہ البخاری۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ

---

[1] مظاہر حق ج ۱ ص ۵۲۴، مرقات ج ۳ ص ۳۴۴

وسلم نے فرمایا کہ غیب کے خزانے (یا کنجیاں) پانچ ہیں پھر آپؐ نے یہ آیت آخر تک پڑھی: ان اللہ عندہ علم الساعۃ وینزل الغیث الآیۃ۔ کہ یقیناً قیامت کا علم اللہ ہی کے پاس ہے اور بارش وہی نازل فرماتا ہے بخاری۔

شرح [1]: پوری آیت یہ ہے ان اللہ عندہ علم الساعۃ وینزل الغیث ویعلم مافی الارحام وما تدری نفس ماذا تکسب غدا ط وما تدری نفس بای ارض تموت ان اللہ علیم خبیر ہ یقیناً اللہ ہی کے پاس ہے قیامت کا علم، اور وہی بارش برساتا ہے اور وہی جانتا ہے کہ پیٹوں میں کیا ہے اور کسی کو معلوم نہیں کہ کل کیا کرے گا اور کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کس سرزمین میں مرے گا۔ یقیناً اللہ ہی علم وخبر والا ہے — ان پانچ چیزوں کی کلیات کوئی نہیں جانتا سوائے اللہ تعالیٰ کے۔ اور بعض جزئیات کا علم بعض دفعہ معجزے، کرامت یا کسی مادی ذریعے یا علم وفن سے ہو سکتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۵: وعن ابی ھریرۃؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیست السنۃ بان لاتمطروا ولکن السنۃ ان تمطروا وتمطروا ولا تنبت الارض شیئاً۔ رواہ مسلم۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قحط یہ نہیں کہ تم پہ بارش نہ برسائی جائے بلکہ شدید قحط تو یہ ہے کہ بارش تو بار بار برسائی جائے اور زمین کچھ نہ اگائے۔ مسلم۔

شرح [2]: حدیث کا مطلب یہ ہے کہ لوگ تو قحط اسے سمجھتے ہیں کہ بارش نہ ہو حضورؐ نے فرمایا کہ اس سے بھی زیادہ شدید قحط یہ ہے کہ بارش تو خوب ہو لیکن فصل پیدا نہ ہو۔ کیوں کہ بارش نہ ہونے کی صورت میں تو مایوسی پہلے سے موجود ہوتی ہے لہٰذا قحط کی شدت اتنی زیادہ محسوس نہیں ہوتی جتنی اس صورت میں کہ بارشیں خوب ہوں لیکن اُگے کچھ نہیں۔ اور نہ اگنے کا باعث یا تو زمین کا کاشت کے قابل نہ رہنا ہے کہ پانی کھڑا رہا اور کاشت وغیرہ نہیں ہو سکی۔ یا وقت گذر گیا۔ یا فصلوں پہ شدید بارش ہوئی اور وہ تباہ و برباد ہو گئیں۔ غرض کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ اعاذنا اللہ من ذٰلک۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ وصفیہ وخیر خلقہ سیدنا ومولانا وشفیعنا محمدؐ وآلہ واصحابہ وازواجہ واتباعہ اجمعین الی یوم الدین برحمتک یا ارحم الراحمین۔

---

[1] مظاہر حق ج ا صـ ۵۲۵ مرقات ج ۳ صـ ۳۴۲۔ [2] مظاہر حق ایضاً، مرقات ایضاً